The ZAMANA, January 1942

زمانہ

مرتبہ دیا نراین نگم

جلد ۷۸	جنوری سنہ ۱۹۴۲ء	نمبر ۱

فہرست

تصویر: - پنڈت آنند نراین ملا، ایم۔ اے۔

زمانہ پریس کانپور سے شایع ہوا

(نمونہ سات آنہ)

سالانہ پانچ روپیہ

ممالک غیر سے آٹھ روپیہ

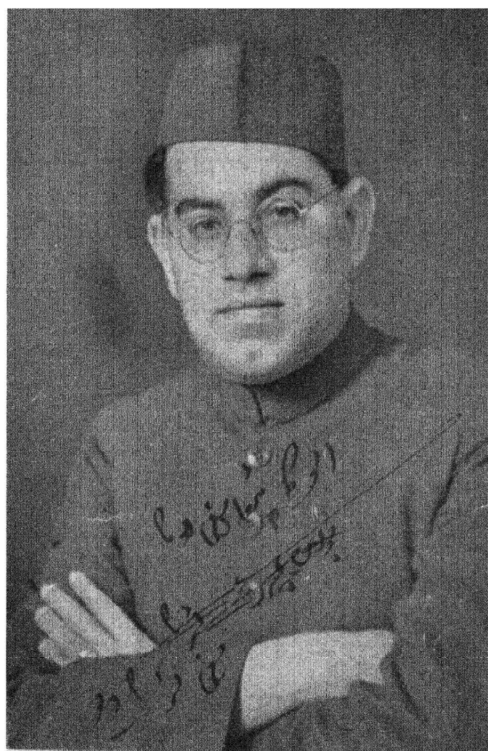
زمانے کے پرانے فائل

دفتر ہذا میں سنہ ۱۹۲۶ء سے پرانے فائل موجود ہیں۔ زمانہ کے تشنگان ادب خوب واقف ہیں کہ شمالی ہند کا یہ قدیم ترین اور مشہور رسالہ اڑتیس سال سے اردو زبان و ادب کی کسقدر انہماک و سرگرمی سے خدمت کر رہا ہے۔ اس کے نقادانہ مضامین اور گرانمایہ نظمیں ملک کے بڑے بڑے نقادوں سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں **زمانہ** کے پرانے فائل لائبریریوں میں رکھنے کے قابل چیز ہیں۔ صرف چند فائلیں باقی رہ گئی ہیں۔ خریداروں سے حسب ذیل رعایت کی جائے گی:۔

۱۔ بارہ سال کے مکمل سٹ کے خریدار سے تیس روپیہ
۲۔ چار سال کے خریدار سے تین روپیہ فی فائل
۳۔ ایک سال کے خریدار سے ۴؍ علاوہ محصول ڈاک

نوٹ :۔ آرڈر کے ہمراہ چوتھائی قیمت پیشگی بھیجنا چاہیے۔ فائل سنہ ۱۹۲۸ء میں جوبلی نمبر باقی نہیں ہے۔ اگر کوئی فائل میں کوئی پرچہ کم ہوگا تو اسکی قیمت وضع کردیجائیگی سنہ ۱۹۰۷ء سے سنہ ۱۹۲۵ء تک مختلف پرچے بھی آرڈر آنے پر مل سکتے ہیں

منیجر زمانہ کانپور سے طلب فرمائیے



پنڈت آنند نراین ملا لکھنوی

زمانہ

جلد ۷۸ — جنوری سنہ ۱۹۴۲ع — نمبر ۱

"گاتھا" کا عروض

از مسٹر سلیم جعفر

ایران پر پرچم اسلام لہرانے کے بعد ایک ادیب نے لکھا کہ ایران میں مسلمانوں کے آنے سے پہلے شعر نہ تھا۔ صدیوں تک یہ خیال دنیا میں قائم رہا۔ خود ایرانی اور غیر ایرانی اس قابل نہ تھے کہ اس کی تردید کرتے۔ مصالحہ موجود تھا۔ غلطی فوراً رفع کی جا سکتی تھی۔ لیکن تحقیقات کے تنگ وسعت دائرہ نے لبوں پر مہر خاموشی لگا دی۔ کوئی مخالفت کے لئے قلم اٹھاتا تو کس بنا پر۔ رفتہ رفتہ زمانے نے ترقی کی۔ تشنگانِ علم کے اکتساب کی حدود میں صرف اسی ملک کے علوم داخل نہ رہے جو ان کے وطن میں پڑھے پڑھائے جاتے تھے۔ انھوں نے پھیل کر غیروں کے علوم اپنے دامن میں لے لئے۔ پہلے پہل یورپ نے اس طرف قدم اٹھایا۔ اس نے پارسیوں کی مذہبی کتابیں پڑھ کر فیصلہ کیا کہ ایران میں اسلام سے پہلے شعر تھا۔ خود ایرانیوں کا ادب اتنا تباہ و برباد ہو چکا تھا کہ اس سے مدد لینا ممکن نہ تھا۔ اس لئے دعوے کو سنسکرت کی مدد سے مستحکم و استوار کرنے کی کوشش کی۔ تحقیق و تدقیق کے لئے فقط یہی ایک دروازہ کھلا تھا۔ قومیات کا مطالعہ بتا چکا تھا کہ ایرانیوں اور ہندوستانیوں کے بزرگ ایک ہی سرزمین سے اٹھ کر ایران و ہندوستان میں پہونچے۔ ہندوستانیوں کا ادب قدیم اپنی پوری شان و شوکت سے جلوہ گر تھا۔ دونوں کا ادبیات اس قدر مطابق و مماثل تھا، ان کا مذہب اس قدر یکساں تھا کہ اس کا نتیجہ فقط یہ نکلتا تھا کہ دونوں گروہ جنھوں نے مختلف وقتوں میں ترکِ وطن لیا

غنائی کا لحاظ نہ کیا جاتا تھا۔"

"ویدوں کے بہت ہی ابتدائی اصناف شعر میں اس قسم کے توازن لحنی (Rhythm) کے موجود ہونے سے معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر اس میں اور اوستا کی غیر غنائی (Non-quantative) نظم میں بہت فرق تھا۔"

"ہم نے جو ہشت رکنی اور دوازدہ رکنی نظمیں زمان قبل وید میں فرض کر لی ہیں۔ وہ بہت کچھ اوستا کی غیر غنائی نظموں سے ملتی جلتی ہیں کیوں کہ قریب قریب سارے کے سارے توازن لحنی کہیں نہ کہیں ملتے ہیں۔ تاہم یہ مسئلہ ابھی بہت توضیح و تشریح کا محتاج ہے۔"

اقتباسات بالا سے صاف صاف ظاہر ہے کہ جو کچھ گاتھا کے عروض کی نسبت عروض وید کی بنا پر کہا جائے گا قابل قبول اور بعید از حقیقت نہ ہوگا۔ در اصل رگوید کے اصول عروض کا عروض گاتھا پر اطلاق دانطباق ہی اس راہ میں شمع ہدایت کا کام دے سکتا ہے کیونکہ ایک کی قدامت کا دامن دوسرے کی قدامت سے بندھا ہوا ہے۔ ایرانیوں اور ہندوستانیوں کے جدامجد ایک ہی تھے، اُن کا ادبیات ایک ہی تھا اور اُن کا دینیات ایک ہی تھا۔

بقول آرنلڈ ویدک بحروں کے تین جزو ہیں۔ مصرع (Verse) قطعہ (Stanza) اور نظم یا بھجن (hymn)۔ مصرع میں اکثر آٹھ جزو یا اصول (Syllables یا अक्षर) ہوتے ہیں جس کو مثمن کہنا چاہیئے۔ کبھی کبھی بارہ یا گیارہ جزو بھی ہوتے ہیں۔ اس طرح کے مصرع کا نام اثنا عشری رکھنا بہتر ہوگا مثمن مصرع کا اُصول آخر کبھی کبھی گرادیا جاتا اور وہ مسبّع ہو جاتا ہے۔ اس کا نام مثمن مکسوف مناسب ہوگا یا صرف مسبع ہی سہی۔ اثنا عشری مصرعے بھی بہت ملتے ہیں جن کا ایک جزو یا اُصول "وقفہ" سے پہلے یا پیچھے حذف کر دیا جاتا ہے اُنھیں معشّر یا عشری کہنا چاہیئے۔

جن قطعات کا رواج عام ہے وہ یہ ہیں۔ انُشٹُبھ (अनुष्टुभ) جس میں چار مثمن مصرعے ہوتے ہیں ترِشٹُبھ (त्रिष्टुभ) جس میں چار گیارہ جزے مصرعے ہوتے ہیں۔ جگتی (जगती) چار اثنا عشری مصرعوں سے بنتا ہے۔

قطعات میں مصرعوں کی پابندی نہیں ہے۔ ایک قطعہ میں چار سے کم یا زیادہ مصرعے ہو سکتے ہیں۔ مثلاً گایتری (गायत्री) میں تین۔ پنگتی (पंक्ति) میں پانچ اور مہاپنکتی (महापंक्ति) میں چھ مصرعے ہوتے ہیں۔ ترِشٹُبھ کے تین مصرعوں سے بحر وِراج (विराज) پیدا ہوتی ہے اور دو معشّر مصرعوں کا نام دوِپدا وِراج (द्विपदा विराज) ہے۔

مثمن اور اثنا عشری مصرعے ملا کر بھی قطعات بنائے جاتے ہیں اور اُن میں چار سے سوا تک اُصول یا اجزا ہو سکتے ہیں۔ ان میں اہم یہ ہیں۔ اُشنِہہ (उष्णिह) ککُبھ (ककुभ) ستوبرہتی (स्तोबृहती) اور اَتیشٹی (अत्यष्टी)۔ پرگاتھ (प्रगाथ) رگوید میں بہت کم آیا ہے۔ یہ ستوبرہتی قطعہ میں ککبھ یا برہتی قطعہ کے میل سے پیدا ہوتا ہے۔

آرنلڈ نے جو کچھ لکھا ہے وہ درحقیقت اُن کا اپنا بات کہنے کا ڈھنگ ہے ورنہ پنگل چھند سوترم (पिंगल छन्द-सूत्रम्) میں پنگلا چاریہ (पिंगलाचार्य्य) نے جو کچھ کہا ہے یہ اس کا خلاصہ ہے۔ آرنلڈ کا ماخذ غالباً انکرمنی (अनुक्रमणी) ہے۔ آرنلڈ مصرع سے چل کر اُس کے اُصول بیان کرتے ہیں۔ اور اسی مصرع کی تعداد سے بحروں کے نام بتاتے ہیں۔ پنگلاچاریہ بحر کے کل اُصول یا اجزا بتا کر اُن کے مصرعوں کی تعداد معین کرتے ہیں جس سے ہر مصرع کے اجزا کی تعداد خود بخود مقرر ہو جاتی ہے۔ زحافات وغیرہ جو تعدادِ اصولِ مصرع میں تبدیلیاں پیدا کرتے ہیں، دونوں انھیں اصل بحر کی اقسام میں داخل کرتے ہیں۔ اور مختلف بحروں کے مصرعے ملا ملا کر جو بحریں بنائی گئی ہیں اُن کے بارے میں دونوں کا ایک ہی مسلک ہے۔ دونوں کے اصولوں میں جو ظاہری فرق ہے وہ اتنا ہی سا ہے کہ ایک مصرع کو اساس و بنیاد مانتا ہے اور دوسرا اجزائے مصرع کو لیکن اس طریق کار سے کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔

آرنلڈ کے خیال سے ویدوں اور بالخصوص رگوید کی بحروں کا مدار انھیں چند باتوں پر ہے۔ مگر پنگل چھند سوترم دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وید کے متعلق اور بہت سی بحریں ہیں۔ ان میں باصطلاح عروض عربی اُصول و رکن بھی ہیں۔ جب تک وہ وید کے دائرہ میں بند رہتی ہیں اُن میں صرف اُصول (अक्षर) ہوتے ہیں۔ رکن (गण) نہیں ہوتے لیکن وہی بحریں ویدوں کے علاوہ سمرتی، پران، تاریخ وغیرہ میں برتی جائیں تو پابند رکن ہوتی ہیں۔

اُصول حرف دو طرح کے مانے گئے ہیں۔ خفیف (लघुवर्ण) اور طویل (गुरु वर्ण) ایک حرفِ متحرک اصولِ خفیف اور ایک حرفِ متحرک مع ایک یا دو حرفِ ساکن (خواہ وہ حرف صحیح ہوں یا حرف علت۔ نون غنہ ہو یا ہائے مختفی) کے طویل کہلاتا ہے۔ طویل کو باصطلاحِ عروضِ عربی "سببِ خفیف" کہہ سکتے ہیں جسے اصطلاح عروض عربی میں وَتد کہتے ہیں وہ سنسکرت کے ایک اصول خفیف اور ایک اُصول طویل کا مجموعہ ہے۔ وتد متوسط یعنی ایک متحرک کے ساتھ دو ساکن مثلاً لفظ چار۔ ایک اصولِ طویل کا اعتبار رکھتا ہے انھیں اصولِ طویل و خفیف سے گن (गण) بنائے گئے ہیں۔ ویدک (वैदिक) اور لوکِک (लौकिक) دونوں چھندوں کے ارکان تین تین اُصول یا اجزا سے بنتے ہیں۔ صرف آریہ چھند کے

گن چار چار حروف مفردہ (लघुवर्ण) سے بنائے جاتے ہیں۔ خواہ وہ حروف مرکب سے جو دو حروف مفردہ کا اعتبار رکھتا ہے۔ بنے ہوں یا چار حروف مفردہ سے۔ ویدک اور لوکک چھندوں کا خاص فرق و امتیاز ہی یہ ہے کہ ویدک چھندوں کا مدار کلیۃً حروف اور وقفہ (यति) پر ہے اور لوکک چھندوں میں گو تعداد اصول نظر انداز نہیں کی گئی مگر اس میں گنوں اور اُن کے ایک خاص ترتیب سے رکھنے پر زور دیا گیا ہے مثلاً بیتالیہ (बेतालीय) اس کے پہلے اور تیسرے مصرع میں ۱۴ حروف مفردہ اور دوسرے اور چوتھے میں ۱۶ حروف مفردہ ہوں گے کہ ہر مصرع کے آخر میں ایک گن (रगण = S I S) اور ایک حرف مرکب (गुरु वर्ण) کا ہونا لازمی ہے۔ ایک بات اور بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مصرع کے پڑھنے میں چند اُصول ادا کرنے کے بعد ٹھہرنا پڑتا ہے۔ اسے سکتہ یا وقفہ (यति) کہتے ہیں۔

سنسکرت عروض میں وزن حقیقی موجود ہے۔ مراد یہ ہے کہ جس طرح عربی عروض میں ارکان بحر کی جاتی ہیں، سنسکرت میں بھی گن یا ارکان ہیں، جن کا عمل دائرۂ وید سے نکل کر شروع ہوتا ہے یعنی سنسکرت میں تین طرح کی بحریں ہیں۔ (۱) ویدک یا دینی (वैदिक) جو مخصوص وید ہیں۔ (۲) لوکک یا دنیاوی (लौकिक) جو دنیاوی ادب میں برتی جاتی ہیں۔ اور (۳) وہ بحریں جو دونوں میں مشترک ہیں۔ یعنی دینی اور دنیاوی دونوں طرح کے ادب میں کام آتی ہیں۔ گن ان میں سے صرف دنیاوی عروض میں آتے ہیں۔ چونکہ مصرعوں میں اعادہ ارکان باعث سرود و ترنم سمجھا گیا ہے۔ اور ویدک نظموں میں بلا قید اعادہ کام لیا گیا ہے۔ اس لیے ان کو وزن حقیقی سے خارج سمجھنا چاہیے۔ لیکن ان میں بھی سرود و ترنم ہے۔ اور الفاظ اور اجزائے الفاظ کی ترتیب ایسی رکھی گئی ہے جس سے لے یا خوش الحانی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لیے اگر وزن حقیقی کا مدار محض ترنم پر ہے۔ تو یہ دعویٰ بے بنیاد ہوگا کہ ویدوں کے عروض میں وزن حقیقی نہیں ہے۔

اب گاتھا کے قطعات پر اصول مذکورہ کا اطلاق کر کے یہ دیکھنا ہے کہ وہ ویدک عروض سے ملتے ہیں یا لوکک سے۔ ایرانی ادیب پور داؤد نے فارسی میں گاتھا کا ترجمہ کیا اور اُس پر ایک بسیط دیباچہ لکھا ہے۔ عروض کے متعلق لکھتا ہے

"گاتا عبارت است از قطعات منظومیکہ درمیان نثر باشند۔ گاتائے اوستا نیز اصلاً چنین چیزے بودہ است ہمیں مناسبت موردل بود این آن است کہ گاتا نامیدہ شد یعنی سرود و نظم و شعر اما نہ شعر یکہ شبیہ بہ اشعار حالیہ ایران کہ مبتنی بر عروض عرب است باشند۔ بلکہ نزدیک است بہ اوزان اشعار سائر اقوام ہند و آریائی است مانند رگ وید۔ کتاب مقدس برہمنان۔ ہر بند شعر سہ یک قطعہ ساختہ شدہ بواسطۂ عدد بیت ہا و آہنگ ہا (Syllables) و سکتات کہ در جائے معین ہر بیت

قرار دادہ شد یادآور قطعات وید است - جائے تردد نیست کہ منظوم گاتا و وید ہر دو از یک ریشہ و بُن می باشد۔"

یہ ترجمہ ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا ہے اور اُس وقت تک جو کچھ جرمنی - فرانسیسی اور انگریزی میں لکھا جا چکا تھا اُس سے استفادہ کر کے لکھا گیا ہے - صرف ایک کتاب جو دوران طباعت شائع ہوئی وہ بچ رہی - اس لئے اس رائے کو مستشرقین یورپ کی رائے مان کر گاتھا کے عروض کی وید کے عروض سے تطبیق کی کوشش کرنی چاہیئے - مگر اس کوشش سے پہلے یہ دریافت کرنا ضروری ہے کہ رگوید میں کون کون سی بحریں آئی ہیں - بقول آرنلڈ اس میں تمام مشہور و معروف بحریں آگئی ہیں - یہاں اُن سب کے دکھانے کی ضرورت نہیں، صرف یہ دکھانے کی کوشش کیجائیگی کہ گاتھا میں جو بحریں برتی گئی ہیں وہ رگوید میں آئی ہیں یا نہیں۔

یہ پہلے ہی کہا جا چکا ہے کہ ویدک عروض میں بحر کا تعین - اصول - تعداد اصول - اور تقسیم تعداد اصول در مصارع پر مبنی ہے - اصول چونکہ وہ جزو لفظ ہے جو یکبارگی منہ سے نکلے - اس لئے عروض حروف ملفوظ یا اُن حصص صوت کو کبھی نہیں چھوڑتا - جو کسی اُس مجموعۂ اصوات کا ایک فرد ہوتے ہیں - جو شئے واحد پر دلالت کرتا ہے - لیکن عروض رگوید سے عروض گاتھا کی تطبیق میں یہ دقت پیش آتی ہے کہ اس میں سے جزو لفظ (अक्षर) چھوڑنے پڑتے ہیں -

مستشرقین یورپ کا خیال ہے اور جو اوستا اور سنسکرت جانتے ہیں وہ اس کو اپنے دل سے نکال بھی نہیں سکتے - کہ اگر چند قوانین صوتی کے مطابق گاتھا کے قطعات کی آوازیں بدل دی جائیں تو وہ اعلیٰ درجہ کی قدیم سنسکرت بن جاتی ہے - چنانچہ جرمن مستشرق گیلڈنر نے اس خیال کی تائید میں گاتھا کے ایک قطعہ کی سنسکرت بنا کر دکھائی ہے - ذیل میں وہ قطعہ مع اجزا دکھایا جاتا ہے :-

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

मत् वः पदाहि या प्रश्रुता इडायाः
परि गचाइ मेधः उत्तानं हस्तः
आत् व ऋतेन रथस्य च नमसा
आत् वो वसोर् मनसः सूनृतया

اس قطعہ کی نسبت کانگا - پور داؤد اور ایران لیگ[1] بمبئی کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ اس کی بحر کے ہر مصرع میں گیارہ اُصول ہیں اور وقفہ یا سکتہ چار اور سات اصول کے درمیان ہے. چونکہ یہ قطعہ رباعی یا مربع ہے اس لئے اس میں کل ۴۴ اصول ہونے چاہئیں اور اس کا تعلق بحر ترشٹبھ سے ہے.

گاتھا اور اس کے سنسکرت ترجمہ دونوں سے صاف صاف ظاہر ہے کہ تعداد اصول (अक्षर) بڑھ گئی - ایک تو سنسکرت کے ترجمہ پر زیادہ اعتبار نہیں کر سکتے کیونکہ اس صورت میں آوازوں کی کمی و زیادتی کا امکان ہے، دوسرے اس کو مدنظر رکھکر جو عروض معیّن کیا جائے گا وہ دراصل سنسکرت کے شلوک کا عروض ہوگا. اور اُس کا کسی ویدک چھند کے مطابق ہونا اس دعوے کے لئے ناکافی ہے کہ وہ گاتھا کا چھند ہے - یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ گاتھا کے قطعات غلط پڑھنے سے غلط نتیجہ نکالا گیا ہے - جو تلفظ اس قطعہ کا اس مضمون میں مانا گیا ہے اُس کی بنا اول تو خود خطِ اوستا پر ہے جس کا ایک ایک حرف سنسکرت کی طرح مع اعراب لکھے جانے کی وجہ سے امکانِ غلطی خارج از قیاس ہے. دوسرے حرف ذاتی کوشش ہی پر اعتماد نہیں کیا گیا ہے - ہندوستان کے قریب قریب سارے پارسی اپنی کتب مقدسہ گجراتی حرفوں میں پڑھتے ہیں چنانچہ کانگا نے اُن کی آسانی کے لئے گاتھا وغیرہ کو گجراتی حرفوں میں شائع کر دیا ہے. گاتھا کا یہ ایڈیشن اس قدر مقبول ہوا ہے کہ ۱۸۹۵ء سے اب تک پانچ بار نکل چکا ہے - اس گجراتی گاتھا میں اس قطعہ کا جو تلفظ بتایا گیا ہے وہ ہندی حروف میں پیش کیا جاتا ہے. تاکہ ناظرین خود فیصلہ کرلیں کہ یہ دعویٰ غلط ہے یا صحیح کہ غلط تلفظ سے استدلال نہیں کیا گیا.

मन् वांओ पदांइश् या फ्रस्त्रूता इज़् याओ
पइरि जसाइ मज़्दा उस्तानं ज़स्तो
अत् वांओ अषा अरेद्र व्याचा नेमंघ्हा
अत् वांओ वंघेहउशे मनंघ्हो ह् नरेतांता

اس تلفظ کی بنا پر یہ قطعہ جگتی (जगती) اور اَتِ جگتی (अति जगती) کی اُس قسم سے جسے پرَہرشنی (प्रहर्षिणी) کہتے ہیں مرکب ہے - لیکن یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں کیونکہ رگوید میں بھی اس قسم کا امتزاج ملتا ہے - مگر اس امتزاج کے بعد وقفہ کا جھگڑا باقی رہتا ہے - اس کا محلِ وقوع کہاں ہے، ترشٹبھ میں تو چار اور سات حرفوں کے درمیان وقفہ آتا ہے. جگتی میں زیادہ تر مصرع کے آخر میں ہوتا ہے اس کی کسی قسم میں بھی اس طرح کا وقفہ نہیں - پرہرشنی میں تین اور دس اصول کے درمیان وقفہ آتا ہے - غرض

[1] یہ پارسیوں کی ایک انجمن ہے جس کے دائرۂ عمل میں مذہبی و معاشرتی سرگرمیاں داخل ہیں۔

یہ کہ جو اصول عام طور سے رہنمائے تعیینِ بحر ہیں اُن کا اطلاق کسی قابل اطمینان نتیجہ پر نہیں پہونچنے دیتا۔

علمائے مشرق و مغرب کی تائید کی صرف ایک ہی صورت نظر آتی ہے یعنی طریقِ اخراج از دیاد پر عمل کیا جائے اس کی دو صورتیں ہیں۔ پہلی یہ کہ تصریف یعنی حالت فاعلی و اضافی وغیرہ کے لئے اسموں وغیرہ میں جو لاحقے لگائے جاتے ہیں اُنہیں بوقتِ تقطیع نظر انداز کر دیا جائے۔ مثلاً ﺎ ﺳﻮﺳـ ﺩ ﻭﺳﺪ (पदाइश) میں آخری تین حرف لاحقہ ہیں۔ اس لئے پہلے دو حرفوں کو ایک اصول اور باقی چار حرفوں کو ایک اصول مانا جائے اور اس کی تاویل یوں کی جائے کہ بروئے قواعد اوستا سد حرفِ علت مرکب اور سنسکرت کے ऐ کے برابر ہے اور اگر اس لفظ کو سنسکرت میں بدلا جائے تو یہ पदे ہوگا جس میں صرف دو ہی اصول (अक्षर) ہیں دوسری صورت یہ ہو کہ جن حروف صحیح کے پہلے بروئے قواعد اوستا بے وجہ حروف علت وغیرہ بڑھا دیے جاتے ہیں۔ اُن حروفِ علت وغیرہ کو تقطیع سے حذف کر دیں۔ مثلاً ﻩ ﺳﺪ ﺍﺩ (पइरि) کے دو جزو یا اصول اس طرح مانے جائیں کہ پہلے تین حرفوں میں سے تیسرا حرف تقطیع سے حذف کر کے اسے ایک جزو مانیں اور باقی دو حرفوں کو ایک جزو اور اس کو سنسکرت کے पारि سے ملا دیں جس کے محض دو جزو اُصول یا (अक्षर) مانے گئے ہیں۔

ایران لیگ نے اَہُنَوَدگاتھا کے پہلے قطعہ کی جو تقطیع بھیجی ہے اُس میں اِسی اُصولِ اخراج ازدیاد پر عمل کیا ہے۔ چنانچہ ﻭﺍﺳﺪ ﺳﻮ ﻭ ﺩﻭﺳﺪ (वधह उशा) کو دو اُصولوں میں تقسیم کیا ہے۔ اور ﻩ ﺳﮯ ﺩ ﺍ ﺩ ﺩ ﺳﻪ ﻭ (वोउरवीम) کو تین اُصول میں۔ اس طرح کہ چوتھے حرف (د) کو جو پانچویں حرف (ا) کے پہلے بروئے قواعد اوستا آیا ہے نظر انداز کیا اور باقی کے دو حرفوں کے جزو اس طرح کئے ہیں (د + ددسہ و) یعنی قواعدی ترکیب کی وجہ سے جزو اول کا (د) جو جزو دوم کے (دد) میں مدغم ہو گیا تھا اسے بوقتِ تقطیع جدا کر دیا۔ یہ روش بظاہر صرف اس وجہ سے اختیار کی گئی کہ حرف زائد کو نظر انداز کرنا بہتر ہے ورنہ اگر تلفظ پر نظر ہوتی تو حرف زائد کو جو اپنے ساکن ما بعد کو متحرک کر کے ایک جزو یا اصول بن جاتا ہے۔ نہ گراتے کیونکہ یوں بھی تقطیع میں فرق نہیں پڑتا۔ اس کو بھی آرنلڈ کی تقلید پر محمول کیا جا سکتا ہے جس سے انحراف روا نہ سمجھا گیا۔ چونکہ حروف ملفوظ کا حذف کسی زبان کی تقطیع میں جائز نہیں اس لئے طریق اخراج ازدیاد ہمیں سنسکرت کے عروض سے قریب تر تو کر دیتا ہے لیکن عروضِ اوستا تک نہیں پہنچاتا۔

کھینچ تان کر اس قطعہ کے یعنی جس سے گیلڈ نے بحث کی ہے۔ چوالیس[۴۴] اصول بنائیے اور مصرعوں کی تعداد کے لحاظ سے اس میں چار اور سات حرفوں کے درمیان وقفہ مان کر اسے بھَرمَرَ وِلِسِتَا (अमरविलसिता) ہی تسلیم کر لیا لیکن ابھی تو اس کے ترنُّم ہونے میں ایک آنچ کی

کسر ہے - پنگلا چاریہ جی کہتے ہیں :-

यस्य पादे मकारभकार नकार लकार गकारा स्तद् वृत्तं

"भ्रमरविलसिता" नाम ।

اس قطعہ میں گنوں کی شرط کہاں پوری ہوئی - ایک ہی مصرع کی کیفیت دیکھئے - پنگلا چاریہ کے مطابق ترتیب اصول یوں ہونی چاہیئے۔

म भ न ल ग

SSS SII III I S

قطعہ زیر بحث کے پہلے مصرع کی ترتیب یہ ہے۔

[illegible]

یعنی

त म म ग ग

SSI SSS SSS S S

یہ تو تِرشٹبھ کے کسی قسم کے مصرع سے نہیں ملتی۔

گیلڈنر نے سپنتمد گاتھا کے باب چہارم قطعہ ہشتم کی سنسکرت بنائی تھی اور اب تک جو بحث کی گئی ہے اُسی پر مبنی تھی - اب ایران لیگ نے "آہنوَد" گاتھا کے باب اول قطعہ اول کی جو تقطیع بھیجی ہے مجملاً اُس کی کیفیت دکھائی جاتی ہے تاکہ معاملہ صرف بدیسی کوششوں کے دکھانے ہی تک نہ رہے بلکہ دلیسیوں کی کوششوں کا بھی حال معلوم ہو جائے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ہندی حرفوں میں بھی جو گجراتی حرفوں کی نقل ہے ملاحظہ ہو۔

अ हया यासा नमंघ् हा उस्तानज़स्तो रफेध्र हया

मैन्यउश् मज़्दाअ्रो पोउर्वीम स्पेन्तहया अषा वीस्पेंग् ष्योथ्नाँ

वंघ् हेउश् रत्नूम् मेनघ् हो याँ ख़्ष्नेवीषा गेउशचा उर्वानेम्

ایران لیگ نے یہ اقرار کر کے کہ ہمارے علمار نے عروض اوستا کی طرف کما حقہٗ توجہ مبذول نہیں فرمائی

اوران کا علم محض تقطیعِ مصراع اور تعیّنِ وقفہ تک محدود ہے کہا ہے کہ قطعہ بالا کی بحرَ اشٹی (अष्टि) سے مشابہ ہے۔

اِس تقطیع میں وہ تمام رعایتیں موجود ہیں جو گیلڈنز کے قطعہ کی تقطیع کے وقت کی گئی تھیں۔ ایران لیگ نے یہ کہہ کر کہ "یہ قطعہ بحر اشٹی سے مشابہ ہے" بچاؤ کا ایک پہلو رکھ لیا ہے تاہم اس کے اشٹی سے مشابہ ہونے میں شک ہے۔ اگر تعداد مصراع کے لحاظ سے اس کا نام رکھا جائے تو اس کو اُشنہ بلکہ گایتری جس کے اکثر تینوں مصرعوں میں تعدادِ اصول برابر ہوتی ہے، کہنا چاہیئے۔ اگر تعدادِ اصول فی مصرع اور وقفہ کا لحاظ کیا جائے تو رِشبھ گج وِلستا (ऋषभगज विलासता) کہنا چاہیئے۔ مگر اس سے دو باتیں مانع ہیں، ایک تو اس بحر میں چار مصرع سولہ سولہ اُصول کے ہوتے ہیں یعنی بحر میں ۶۴ حروف یا اُصول ہوتے ہیں، دوسرے اگر بحر کے کل تعدادِ اصول کا خیال رکھا جائے تو یہ جگتی آرشی (जगती आर्षी) ہوتی ہے۔ مگر اس صورت میں بارہ بارہ اُصول ہر مصرع میں ہونے چاہئیں۔ اس کے علاوہ جگتی کی دو ایک قسموں کو چھوڑ کر سب میں وقفہ مصرع کے آخر میں آتا ہے یہاں وقفہ سات اور نو اصولوں کے درمیان مانا گیا ہے اور اسی بنا پر اس کو اشٹی (رشبھ گج ولستا اس کی ایک قسم ہے) کہا گیا ہے۔ رگوید میں جو ایسے قطعات مثلث ملتے ہیں جن میں بارہ بارہ اُصول ہیں۔ آرنلڈ نے انھیں جگتی میں شامل کر کے اُن کا نام مثلث جگتی رکھا ہے مگر یہ انھیں کا ایجاد ہے۔ ایک اور دقت ہے، اشٹی میں گنوں کی قید ہے۔ کھینچ تان کر گن بھی بنا دیئے جائیں تو بھی شرط پوری نہیں ہوتی کیونکہ وہ مقررہ گنوں کی ترتیب نہ ہوگی۔

سطور بالا میں کہا گیا ہے کہ گاتھا میں جو بحریں آئی ہیں اور وہ رگوید میں بھی ملتی ہیں دکھائی جائیں گی۔ اب تک گاتھا کے دو بابوں کی بحروں سے سیر حاصل بحث ہو چکی ہے۔ باقی کے تین بابوں کی بحروں سے اگر بحث کی گئی تو وہ بھی اسی طرح کی ہوگی اِس لئے بخوفِ طوالت صرف مصرع اول قطعہ اول باب دوم کی تقطیع اور دکھائی جاتی ہے۔ اور بحث کو وقس علی ھذا کہہ کر ختم کیا جاتا ہے۔

[illegible]

उश्ता अह्माइ यह्माइ उश्ता कह्माइचीद्

اگر اصولِ اخراج ازدیاد پر عمل نہ کیا جائے تو اس میں چودہ اصول ہوتے ہیں جن کے گن یوں بنتے ہیں۔

म　र　र　म　ल　ग

SSS　SIS　SIS　SSS　I　S

کہتے ہیں کہ یہ قطعہ ترشٹبھ کی ایک قسم ہے۔ مگر پنگلا چاریہ نے ترشٹبھ کی جتنی قسمیں بتائی ہیں اُن میں ایک قطعہ کی تعدادِ اصول ۴ ۴ یا ۳ ۴ ہے۔ یہاں ایک ہی مصرع میں چودہ اصول موجود ہیں۔ ہم اس

کو شکّری (शक्करी) کی شاخ اَپرَاجِتا (अपराजिता) ماننے کو تیار ہیں۔ لیکن ایک تو اس میں بجائے پانچ کے چار مصرع ہونے چاہئیں دوسرے اپَراجتا میں گنوں کی ترتیب یہ ہے:۔

न न र स ल ग
III III SIS IIS I S

تیسرے وقفہ سات سات اُصولوں کے درمیان ہونا چاہیئے نہ کہ چار اور سات کے درمیان یہ نہ ہو تو مصرع کے آخر میں۔

آرنلڈ کا بیان ہے کہ شکوَری (शाक्करी) میں گیارہ گیارہ اصول کے پانچ مصرع ہوتے ہیں یہ تو شٹیھ کی توسیع ہے اور ویدک زمانہ میں اکثر اور زمانۂ مابعد میں گاہے گاہے اس قسم کے قطعات پائے جاتے ہیں۔ وشوکوش اور شبد ساگر دونوں شکّری کو شکوری کا مرادف بتاتے ہیں۔ مونیر ولیم کی لغات سنسکرت اور انگریزی میں لکھا ہے کہ غلطی سے شکوری کو شکّری کہتے ہیں۔ ویدوں میں آٹھ آٹھ اصول کے سات مصارع ایک ایک قطعہ میں ہوتے تھے جن کو سپت پدا (सप्त पदा) کہتے تھے۔ لیکن زمانہ مابعد میں جس قطعہ میں چار مصارع چودہ چودہ اصول کے ہوں اسے اس نام سے موسوم کیا گیا۔ مثلاً بسنت تلکا (बसन्त तिलका) اب فیصلہ اس پر آن ٹھہرا کہ کس کو مانا اور کس کو نہ مانا جائے۔ آرنلڈ کو مان لیں تو بھی یہ بحر ترشٹیھ نہیں بلکہ شکوری یا شکّری کی ایک قسم ہوئی اور ارکان و وقفہ کی چول پھر بھی ٹھیک نہیں بیٹھتی۔

درحقیقت گاتھا کا منظوم ہونا تو اس بنا پر مسلّم ہے کہ اس میں مصارع ہیں، توازن ہے اور ہر مصرع میں اُصول کی تعداد مقررہ ہے لیکن سنسکرت کی اس حد تک تقلید کرنی روا نہیں کہ عالمگیر اصولِ عروض سے انحراف کی نوبت آجائے۔ چونکہ مسلّمہ یہ ہے کہ گاتھا یا اوستا ویدوں کے آس پاس کی تصنیف ہے اور ویدک عروض۔ ارکان کے قصّہ سے پاک ہے اس لئے اس میں محض اُصول کو مدنظر رکھنا چاہیئے خواہ مخواہ سنسکرت کی تقلید نہ کرنی چاہیئے۔

فرمودۂ اقبال

مرید پیرِ خرابا تیانِ خود بیں شو! نگاہِ او ز عقاب گرسنہ تیز تر است
ز خاکِ خویش طلب آتشے کہ پیدا نیست تجلّیٔ دگرے، در خورِ تماشا نیست
آتش از نالۂ مرغانِ حرم گیر و بسوز آشیانے کہ نہادی بہ نہالِ دگراں

(علامۂ اقبال)

موسمِ گل

(از منشی جگیشور ناتھ ورما بیتاب بریلوی، بی۔اے، ایل ایل۔بی)

آگیا موسمِ گل رنگِ تمنا لے کر
بھیگی بھیگی لبِ ساحل سے ہوا آتی ہے
اسی موسم میں تمنائیں جواں ہوتی ہیں
چمنِ حسن کی منھ بند کلی کھلتی ہے
عالمِ شوق تجلی سے بھرا ہوتا ہے
گونجنے لگتی ہے نغموں کی صدا کانوں میں
اک سراپائے چمن بن کے بہار آتی ہے
کچھ عجب رندی و مستی کا سماں ہوتا ہے
اک نئی شان جوانی میں نظر آتی ہے
زیورِ گل سے لدی رہتی ہے ڈالی ڈالی
گدگداتی ہوئی غنچوں کو ہنسی آتی ہے
لہلہاتی ہوئی پودوں پہ بہار آتی ہے
پر لگا دیتی ہے بیباک حیا جھولوں میں
چھیڑ کا طور نیا رنگ نیا ہوتا ہے
مہک اٹھتی ہے جہاں بور کے آنے سے فضا
مست و بیخود لبِ جو بربط و مینا لے کر

رہزنِ ہوش و خرد کیف کی دنیا لیکر
رقص کرتی ہوئی موجوں میں گذر جاتی ہے
کچھ حسیں کیفیتیں وردِ زباں ہوتی ہیں
شوخیِ نازِ تبسم سے گلے ملتی ہے
دل کا ہر زخم نئے سر سے ہرا ہوتا ہے۔
آگ بھر جاتی ہے بجھتے ہوئے ارمانوں میں
اس بھرے گھر میں دلہن بن کے بہار آتی ہے
ہمہ تن کیف ہر اک پیر و جواں ہوتا ہے
نشۂ حسن میں لہرا کے ابھر آتی ہے
زر لٹاتی ہے شباب آتے ہی بالی بالی
جو گرہ دل میں پڑی تھی وہ کھلی جاتی ہے
کھلکھلاتی ہوئی سرسوں پہ بہار آتی ہے
تولی جاتی ہے جوانی کی ہوا پھولوں میں
خود نمائی کا ہر اک ڈھنگ نیا ہوتا ہے
آسمانوں کو ہلا دیتی ہے کوئل کی صدا
حسن ہوتا ہے عیاں عشق کا سودا لے کر

آنکلتے ہیں پئے سیر حسینوں کے پرے
کوئی ایسے میں تمھیں یاد کرے یا نہ کرے



دورِ جدید

(از پروفیسر سنت پرشاد مدہوش، ایم۔ اے)

خودی کا دور ہے اور بیخودی کم ہوتی جاتی ہے
یہ محفل تو وہی ہے دلکشی کم ہوتی جاتی ہے

چھلک آتے ہیں آنسو اب تو ہر عنوانِ راحت پر
اُداسی بڑھتی جاتی ہے خوشی کم ہوتی جاتی ہے

تراشی جائے گی کب شاہدِ آفاق کی مورت
زمانہ بت شکن ہے، آذری کم ہوتی جاتی ہے

رگڑ رگڑ کر ایڑیاں دم توڑنے والی ہے یہ دنیا!
نظامِ دہر کی بھی زندگی کم ہوتی جاتی ہے

پیامِ مرگ سن کر کچھ تو جنبش سی ہوئی پیدا
دمِ آخر تو شاید بےحسی کم ہوتی جاتی ہے

کہاں خوابِ گراں باقی ہے اب اہلِ تعیش کا
کھلی جاتی ہیں آنکھیں نیند بھی کم ہوتی جاتی ہے

نہ وہ جامہ نہ عمامہ نہ دستارِ فضیلت ہے
سُکڑ کر خودبخود اے قیصری کم ہوتی جاتی ہے

تبسم سا تو باقی ہے مگر جو زہر خندہ تھا
حریفوں کے لبوں پر وہ ہنسی کم ہوتی جاتی ہے

بڑھے گا قافلہ انسانیت کا پائے ہمت سے
ہے جوشِ رہ نوردی، رہبری کم ہوتی جاتی ہے

اُٹھے ہیں خوابِ غفلت سے عوام انگڑائیاں لیکر
ہیں آثارِ نمو، افسردگی کم ہوتی جاتی ہے

اُٹھے انگڑائیاں لے کر تو کچھ چونکے بھی وحشت سے
کہ شاید خواب دیکھا زندگی کم ہوتی جاتی ہے

بھنور میں پڑ کے آیا بے نیازِ ناخدا ہونا
بنی ہے جان پر تو بزدلی کم ہوتی جاتی ہے

خود اپنے دم سے دنیا ہے سمجھ میں جب سے یہ آیا
جہاں میں بیکسوں کی بیکسی کم ہوتی جاتی ہے

مسلسل تھرتھری سے شکلِ استقلال پیدا ہے
جو پہلے ضعف تھا وہ کپکپی کم ہوتی جاتی ہے

مگر ہاں رہ نوردی کے لئے ہے رہبری لازم
ہراساں کیوں نہ ہوں گر رہبری کم ہوتی جاتی ہے

جنونِ مادیت پر ابھی روحانیت چُپ ہے
وہ زورِ کفر ہے پیغمبری کم ہوتی جاتی ہے

حیاتِ نَو کی سانسوں کی بھی مدہوش آس رکھتا ہے
اِسی باعث جفائے جاں کنی کم ہوتی جاتی ہے



پنڈت انند نراین مُلّا

(صابر اعظمی" ایک ترقی پسند ادیب و شاعر کے قلم سے)

پنڈت برج نراین چکبست کے بعد ترقی پسند شاعروں میں نمایاں حیثیت رکھنے والے صرف چند ہی لوگ رہ گئے تھے۔ اقبال فلسفیانہ شاعری کی وادی میں خودی کی دھونی رمائے بیٹھے تھے، عزیز اور صفی مذہب کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ جوش نے البتہ تمام قیود سے آزاد ہونے کی کوشش اور تلاش منزل میں بیخوف وخطر آگے بڑھنے کے جذبے کا اظہار کیا۔ مگر جوش کی شاعری ان کی زندگی کی طرح متصادم نظریوں اور متضاد باتوں کا مجموعہ نظر آتی ہے۔ مثلاً ابتدا میں جوش کے یہاں ٹیگور کی روحانیت اور اُن کے رجحانات سے متاثر ہونے کے ثبوت ملتے ہیں، مگر بعد میں وہ روحانی فضاؤں سے گھبرا کر زندگی کی تلخ حقیقتوں کی شدت کا احساس کرنے لگے۔ اگرچہ زندگی کا جو تخیل انھوں نے اشعار کے ذریعے پیش کیا ہے وہ نیم سرمایہ دارانہ ہے اور اُن کے نظریات زندگی باہم متصادم بھی ہو جاتے ہیں۔ پھر بھی بحیثیت مجموعی ناممکن ہے کہ ترقی پسند شاعروں میں جوش کو ایک بہت بلند اور ممتاز درجہ دیا جائے۔

اِن لوگوں کے علاوہ جنھیں خوش قسمتی سے اخبارات اور رسائل کے ذریعے اکثر ہمارے سامنے آنے کا موقع ملتا رہا، کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو شہرتِ عام اور بقائے دوام" کے دنیاوی دربار میں کوئی نمایاں جگہ نہ پا سکے حالانکہ ان کے یہاں جوہرِ ذاتی کی کمی نہ تھی مگر کچھ اُن کی بے پروائی اور کچھ اردو داں طبقہ کی بدمذاقی نے انھیں گوشۂ گمنامی میں ڈال رکھا ہے۔ پنڈت انند نراین مُلّا بھی انھیں میں سے ایک ہیں۔

مُلّا نے کچھ تو شعر گوئی میں سست رفتاری سے کام لیا اور کچھ یہ بھی تھا کہ انھوں نے پبلک تک پہونچنے اور اپنا پیغام پہونچانے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی۔ ہمارے شاعروں اور ادیبوں میں جو اس بیسویں صدی میں وضع قدیم کے مطابق انکسار بیجا سے کام لینے کے عادی ہو گئے ہیں یہ عجیب وغریب خامی ہے کہ وہ غلط یا صحیح یہ سوچ کر بیٹھ جاتے ہیں کہ "پیاسا کنوئیں کے پاس جاتا ہے، کنواں پیاسے کے پاس نہیں آتا"۔ مگر یہ مثل ہر محل اور موقع پر صحیح ثابت نہیں ہوتی ہے۔ کاش وہ یہ سمجھ سکیں کہ قناعت کے مارے ہوئے رجعت پسند ہندوستانیوں میں پیاس کا احساس پیدا کرانے کی ضرورت ہے، پہلے پیاس کا احساس پیدا ہو جائے تو کنوئیں کا سوال آئے۔

بہر حال انند نراین مُلّا بھی اسی انکسار کے فریب میں مبتلا معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ ابھی تک انھوں نے اپنے کو زیادہ تر لکھنؤ اور قرب وجوار کے مشاعروں تک محدود رکھا ہے۔ ادھر کئی سال سے اُن کا کلام "زمانہ" میں ضرور

کبھی کبھی شائع ہو جاتا ہے۔ اور وقتاً فوقتاً لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے بھی وہ اپنا کلام سناتے رہتے ہیں۔ لیکن ابھی تک وہ اُردو داں عوام تک نہیں پہونچ سکے ہیں۔

دو سال ہوئے مجھے مُلّا سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ دورانِ گفتگو میں کچھ شعر و شاعری پر بھی بحث ہوئی، اس ملاقات کا مجھ پر یہ اثر ہوا کہ مجھے اُن سے یہ استدعا کرنا پڑی کہ وہ مجھے اپنا مجموعۂ کلام دیکھنے کے لئے دیدیں اور دو تین مرتبہ دوڑ دوڑ کے مجھے اُن کی دو بیاضیں دستیاب ہوئیں

مُلّا کے کلام میں چند باتیں اتنی نمایاں ہیں کہ کوئی سرسری دیکھنے والا بھی ان سے نظر نہیں بچا سکتا۔ اُنھوں نے زیادہ تر غزلیں اور چند نظمیں کہی ہیں۔ غزلوں میں اُنھوں نے ایک ترقی پسند رنگ اختیار کیا ہے، اُن کی غزلیں زیادہ تر چکبست کی خصوصیتوں کی حامل ہیں۔ غزلوں کے علاوہ بھی مُلّا پر چکبست کا بہت کافی اثر ہے۔ مثلاً ملّا نے حیات و حُسن کا جو تخیّل پیش کیا ہے وہ چکبست کے تخیّل کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ ان کے یہاں حیات کا تخیّل منزل کے تعینات سے آزاد ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ 'حیات' برابر ارتقائی منزلیں طے کرتی رہتی ہے، اس لئے اس کی آخری حد متعیّن نہیں کی جاسکتی۔ اُن کے نزدیک 'حُسن' اس قابل ہے کہ اس سے محبت اور والہانہ محبت کی جائے یہ محبت صنفی کشش سے بڑھکر روحانیت کی سرحدوں میں قدم رکھنے لگتی ہے، مگر اس کے باوجود وہ حُسن کو صرف ظاہری خوبیوں تک محدود سمجھتے ہیں اور باطنی خوبیوں کی چھان بین میں وقت صرف کرنا بیکار جانتے ہیں۔ اس مضمون میں اُن کے اُن تمام نظریات، میلانات اور رجحانات سے نظموں کی تنقید کے سلسلے میں خاص طور پر بحث کی جائے گی۔

مُلّا کی نظمیں سرسری طور پر تین حصّوں میں تقسیم کی جاسکتی ہیں:۔

(۱) وہ نظمیں جن میں 'حیات' کا تخیّل پیش کیا گیا ہے۔

(۲) وہ نظمیں جن میں "قومیت" اور "انقلاب" کا تخیّل پیش کیا گیا ہے۔

(۳) وہ نظمیں جن میں "حُسن" "محبت" اور "اخلاق" کا تخیّل پیش کیا گیا ہے۔

(۱) جن نظموں میں مُلّا نے حیات کے تخیّل کو شاعرانہ لباس میں پیش کیا ہے اُن میں اُن کی نظم جامِ حیات خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس نظم کو شاعر نے تین حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ ہر حصہ انسانی زندگی کے ایک مخصوص دَور سے تعلق رکھتا ہے۔ چنانچہ اس نظم میں اِنھیں حیات کی تین منزلوں کا عکس نظر آتا ہے۔ اِن منزلوں کو وہ "زندوں" کی اصطلاح میں "کف" "مے" "اور دُرد" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ "کف" سے مُلّا نے وہ دَور زندگی مراد لیا ہے جب انسان کی تمام خواہشات اور اعمال کا مرکز خود اُس کی ذات ہوتی ہے۔ تمناؤں کے دَور کا یہ عالم ہوتا ہے کہ انسان بڑے سے بڑے خطرات اور اہم ترین مصائب اور شدائد کو برداشت کرنے کے لئے صرف

اس وجہ سے آمادہ ہو جاتا ہے کہ اس کی تمنا پوری ہو جائے اور دلی مراد بر آئے۔ گویا ملاؔ کے نزدیک یہ زندگانی کا وہ دورِ دورہ ہے جب زندگی "ابلنے" لگتی ہے۔ اس عہدِ حیات کے بارے میں اُن کے خیالات کا اندازہ اِن اشعار سے ہو سکتا ہے :۔

دَور گردوں کو مری مرضی پہ چلنا چاہیئے
اُس کو میرے ہر اشارے پر بدلنا چاہیئے

آفتابِ زندگی دنیا ہے جس کی منتظر
اس کو میرے مشرقِ دل سے نکلنا چاہیئے

مستحق ہو جائے گی پھر زیست کہلانے کی زیست
پہلے میرے شوق کے سانچے میں ڈھلنا چاہیئے

چاہیے پھر بہہ جائے اُس کے ساتھ خونِ زندگی
دل میں جو کانٹا چُبھا ہے وہ نکلنا چاہیئے

زندگی اُس کی ہے خطروں میں کٹے جس کی حیات
موت کی آغوش میں ہستی کو پلنا چاہیئے

زندگی کا دوسرا دور جسے ملاؔ "ے مے" سے تشبیہ دیتے ہیں، وہ ہے جب اپنی ہستی کی مرکزیت سے زیادہ انسان کے پیشِ نظر انجام رہنے لگتا ہے۔ جب اس کی نظر ذرائع اور وسائل سے ہٹ کر مقامِ صدر پر جم جاتی ہے۔ اور جب وہ مذاہب اور رسم و رواج کے قیود کو توڑنے کے لئے بھی اس لئے آمادہ ہو جاتا ہے کہ اُس کا مقصد اور مُدعائے دلی حاصل ہو جائے۔ پہلا دَور زندگی جسے "کف" کے نام سے ملاؔ نے یاد کیا ہے۔ وہ صرف آرزو اور بلند بانگ خواہشوں کا دَور تھا۔ اُس وقت انسان کی صرف یہ خواہش تھی کہ جو ہم چاہتے ہیں وہ ہو جائے چاہے جس طرح بھی ہو یہ "سُبکسارانِ ساحل" کا گروہ ہے جس نے ابھی تک عملی دنیا میں قدم نہیں رکھا ہے۔ اس کے برعکس دوسرا گروہ وہ ہے جو اپنی زندگی کا پہلا دَور ختم کر چکا ہے۔ اب اُسے واقعات کو واقعات سمجھ کے اُن کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے، مگر وہ ڈر کے پیچھے نہیں ہٹتا اور نہ گھبرا کے بھاگنے کا ارادہ کرتا ہے بلکہ وہ "موجوں میں گھر کر غرق ہو جانے کو بہتر سمجھتا ہے۔ اِسی کو ملاؔ اپنے الفاظ میں یوں بیان کرتے ہیں :۔

جوئے شیرِ آرزو ہر دل میں ہے، رازِ حیات
اپنی جاں تک کوہ کن بن کر اُسے لانے میں ہے

تو نہ سمجھا ہے نہ سمجھے گا کبھی ساحل نشیں
کیا مزا موجوں میں گھر کر غرق ہو جانے میں ہے

نورِ ہستی سامنے ہے چشمِ دل عُریاں تو کر
ایک بار اے ڈرنے والے جراتِ عصیاں تو کر

مُلاؔ نے حیات کے تیسرے دَور کا جو نقشہ کھینچا ہے اُس میں یاس کی وہ ڈراؤنی شکل نظر آتی ہے کہ وہ لوگ جو ابھی تک اپنے کو جوان سمجھے ہوئے ہیں۔ اُس کو بار بار پڑھنے سے گریز کریں گے۔ اِس دَور کو ملاؔ "درد" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ دَور جسے انحطاط کا زمانہ کہنا چاہیئے۔ اپنی ہمت شکن خصوصیتوں کے اعتبار سے ہمارے لئے زیادہ قابلِ اعتنا نہ ہوتا ہم اس کی کوئی خاص فکر بھی نہ کرتے۔ لیکن ملاؔ نے اس کے متعلق جو رائے ظاہر کی ہے وہ ہمیں اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ اس پر ایک سرسری سی طرح نگاہ ڈالی جائے۔ ملاؔ کہتے ہیں کہ :۔

وہ ارادے سب ترے جوشِ فراواں کیا ہوئے — اپنی دنیا خود بنا لینے کے ارماں کیا ہوئے؟

زیست ظالم زیست نے ایک ایک کرکے چُن لئے — میری اُمیدوں کے وہ گلہائے خنداں کیا ہوئے؟

درد بڑھتا ہی گیا عمرِ رواں کے ساتھ ساتھ — درد کو درماں بنا لینے کے ساماں کیا ہوئے؟

کچھ گلِ پژمردہ باقی ہیں فقط اب یادگار — وہ اُمنگوں کے پھلے پھُولے گلستاں کیا ہوئے؟

ہمتِ جوشِ جوانی بن گئی اب مصلحت — کیا ہوئے دنیا سے وہ لڑنے کے پیماں کیا ہوئے؟

خونِ دل کی کیفِ مستی میں روانی اور ہے
اصلِ ہستی اور ہے خوابِ جوانی اور ہے

مُلّا آخری دورِ حیات کی اُن تصویروں سے عمداً چشم پوشی کرتے ہیں جو جسمانی طاقتوں کے گھٹنے سے پژمردگی کے رنگ ہی میں نہیں رنگ جاتیں بلکہ جن میں فکر و عمل کی شفق آلود سُرخیاں پورے طور سے نمایاں رہتی ہیں۔ اُن کی اُمیدوں کے پھُول ہنستے ہی رہتے ہیں اور جو درد کی شدت کے احساس کے باوجود "اپنی دنیا خود بنا لینے کا ارماں" بھی رکھتے ہیں۔ ان تصویروں میں صرف چند مرجھائے ہوئے پھُول ہی نظر نہیں آتے بلکہ کچھ ایسی کلیاں بھی دکھائی دیتی ہیں جو ہنسنے کے لئے تیار بیٹھی ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ بڑھاپا مصلحت کوشی کا زیادہ قائل ہوتا ہے لیکن زندگی کے سمندر میں نرم و گرم دونوں دھارں کا موجود ہونا ضروری ہے، ورنہ زندگی کی گاڑی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ مُلّا نے زندگی کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے اس بات کا خیال نہیں رکھا کہ بچے، جوان اور بوڑھے الگ الگ زندگی کا کوئی مکمل تخیل پیش نہیں کر سکتے۔ زندگی ایک تاریخی دور کی مکمل تصویر ہے جس طرح ایک تصویر میں مختلف رنگوں کے اجتماع اور اُن کی ہم آہنگی سے تصویر کا مکمل تخیل آنکھوں کے سامنے آتا ہے۔ اُسی طرح زندگی کی تصویر میں بچے، بوڑھے اور جوان مختلف رنگوں کی نوعیت رکھتے ہیں۔ شاعر اور فلسفی کا کام اِن رنگوں کو الگ کرکے اُن کی جداگانہ تشریح نہیں ہے بلکہ مختلف رنگوں میں ہم آہنگی پیدا کرنا اُن کا مقصد ہونا چاہیے۔ مُلّا نے بیمار زندگی پر نازک ترین آلوں سے عمل جرّاحی انجام دیا ہے لیکن اس عمل کے بعد جب وہ مختلف اعضا کو مختلف اصلیتیں اور حقیقتیں ماننے لگتے ہیں، تو ایک فن کار کو فریاد کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اسی لئے ہمیں مُلّا کے اس استدلال سے اتفاق نہیں ہے کہ "اصلِ ہستی اور ہے، خوابِ جوانی اور ہے" اصلِ ہستی اور جوانی کے درمیان کوئی خطِ فاصل نہیں کھینچا جا سکتا۔

لیکن مُلّا حیات کے اس تخیل کو ناقابلِ ترمیم نہیں سمجھتے بلکہ وہ اپنی نظم "اولوالعزمی" میں ایک جگہ خود کہتے ہیں کہ

"عاشقِ صادق مآلِ شوق سے ڈرتا نہیں — رہروِ کامل کبھی مُڑ کر نظر کرتا نہیں"

پھر بھی مُلّا کے یہاں حیات کا جو مابعدالطبیعیاتی تخیل ہے وہ انھیں اُن کے اُسی اصول کی طرف لے جاتا ہے۔ مُلّا پر ٹیگور کے تخیلِ حیات کا بہت اثر ہے، اور وہ کائنات کی حقیقتوں سے گھبرا کر یا اُن سے عمداً منھ موڑ کر روحانی

فضاؤں میں پرواز کرنے لگتے ہیں۔ لیکن ٹیگور اور ملا ہندوستان کے فلسفیانہ رجحانات کے دو مختلف ددر سے تعلق رکھتے ہیں اسی وجہ سے ملا تھوڑی دیر کے لئے مادیت کی طرف جھکتے ہیں پھر تھوڑے وقفے کے بعد اپنے مرکز عقیدت یعنی روحانیت کی طرف چلے جاتے ہیں۔ انھیں روحانی فضاؤں ہی میں گھر کا سا سکون ملتا ہے مثلاً وہ اپنی نظم "اولوالعزمی" میں جہاں دعوتِ عمل دیتے ہیں وہاں اس کی بھی تلقین کرتے ہیں کہ "خدا کا نام لے" اور "شکوۂ تقدیر کر" ۔ وہ کہتے ہیں کہ:۔

بندۂ تدبیر بن کر شکوۂ تقدیر کر　　　"آرزو" کی قبر پر "امید" پھر تعمیر کر
اپنی ہمت کی کمر کس اور خدا کا نام لے　　　زندگی کی جد میں ناکامیوں سے کام لے

لیکن وہ زندگی جو ممکنات میں مقید ہے ملا کے نزدیک کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتی۔ وہ اس دل کو دل نہیں کہتے جو ممکنات تک محدود رہے۔ وہ انسانی ولولوں کو ماورائے ممکنات جانے کے لئے اس طرح ابھارتے ہیں:۔

کشمکش میں دہر کی مٹنے نہ دے تو اپنی ذات　　　چاہے سب کچھ جائے پر جانے نہ پائے دل کی بات
دل ہی کیا جس کی امنگیں ہوں اسیر ممکنات　　　اہل ہمت دے رہے ہیں تجھ کو یہ درسِ حیات

گوہر مقصود پنہاں سینۂ انساں میں ہے
زندگی کا راز تیری طاقتِ عصیاں میں ہے

ملا کے یہاں اسی لئے روحانیت کی فضائیں گوشہ گیروں سے نہیں، تارک الدنیا ہستیوں سے نہیں بلکہ باعمل لوگوں سے آباد نظر آتی ہیں ہمیں ملا کے اس فلسفہ سے اختلاف کے باوجود، ان کی شاعری کے نتائج سے اختلاف نہیں اپنے اپنے زمانے میں روحانی رہنماؤں نے بڑے بڑے انقلابی کام کئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اُنھوں نے اپنے عہد میں انقلاب پیدا کرنے کی جو کوشش کی تھی وہ اپنے وسائل و ذرائع کے اعتبار سے قابلِ تقلید نہ سہی لیکن اپنے انجام کے لحاظ سے ہماری ہمدردیوں اور تعریفوں کی ضرور مستحق ہے۔ ملا کی شاعری میں جو انجام پیش نظر رکھا گیا ہے وہ وہی ہے جو دوسرے ترقی پسندوں کا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ جہاں آج کل کے ترقی پسند شعرا دنیا کی تمام حقیقتوں کو مادیات کا لباس پہنانے کی جدوجہد کرتے ہیں، وہاں ملا روحانیت کے قدیم راگ بھی سناتے جاتے ہیں۔ ہم زندگی کی داستان کو دنیا پر ختم سمجھتے ہیں، اور اگر تھوڑی دور اور آگے بڑھتے بھی ہیں تو برکلے کی طرح زندگی کو ایک غیر محدود اور مسلسل دھارا مان کر ذہنی افکار کو عقلیات سے آزاد بنا کے Intuitionism کے دامن میں پناہ لیتے ہیں۔ لیکن ملا کی روح کا اضطراب بتاتا ہے کہ وہ کسی اور دنیا کی تلاش میں ہیں جیسا کہ وہ اپنی نظم "اضطراب روح" میں کہتے ہیں کہ:۔

دل میں انساں کے جو اک کیفیتِ سیماب ہے　　　کوئی جلوہ اور داماں عدم میں ہے نہاں

ے Berkley

خم دینا پر نہیں ہے زندگی کی داستاں روح کیا اپنے وطن کی یاد میں بیتاب ہے

یا اسی مضمون کو نظم "ترانۂ گناہگار" میں اس طرح ادا کرتے ہیں:-

نقش بر آب ہوں مگر عشق کا رازدار ہوں ہوں تو ذرا سی مشتِ خاک، برق سے ہمکنار ہوں

تو بھی بجھا نہ پائے گا جس کو میں وہ شرار ہوں ہستی بے ثبات ہوں، جلوۂ پائدار ہوں

جس میں ہے شانِ کردگار میں وہ گناہگار ہوں

لیکن ملّا کے یہاں سب سے زیادہ امید افزا چیز یہ ہے کہ اُن کے یہاں فلسفیانہ شکوک کی پوری گنجائش ہے، بعض وقت تو وہ اپنے نظریہ حیات پر خود ہی شک کرنے لگتے ہیں۔ اور زندگی کی گوناگوں حقیقتوں کی تلاش کی دُھن میں اکثر اس منزل پر شک کرتے کرتے پہونچ جاتے ہیں جو تمام ترقی پسند جماعتوں کے نزدیک زندگی کی صحیح اور حقیقی منزل ہے۔ مثال کے لئے اُن کی نظم "انسان" پیش کی جا سکتی ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ:-

کون ہے میرے سوا مالک افلاک و زمیں نور فردا ہے نہاں جس میں وہ میری ہے جبیں

قصۂ دہر میں لیکن مجھے معلوم نہیں اہرمن ہوں کہ سلیماں ہوں کہ خاتم کا نگیں

طور ہوں جذبۂ موسیٰ ہوں کہ فرعون ہوں میں

لب خاموش بتا دے یہ مجھے کون ہوں میں

اپنی تقدیر کا بندہ بھی ہوں مختار بھی ہوں طالب دید بھی ہوں کشتۂ دیدار بھی ہوں

دردِ الفت کا مسیحا بھی ہوں، بیمار بھی ہوں محفلِ دہر میں ساقی بھی ہوں میخوار بھی ہوں

بندگی دل میں کبھی ہے تو ہے الحاد کبھی

باغ فردوس کبھی گلشنِ شداد کبھی

وارثِ دہر کہیں یہ دلِ شیدا تو نہیں؟ خضرِ ظلماتِ جہاں نورِ تمنا تو نہیں؟

زندگی نام کہیں ذوقِ طلب کا تو نہیں؟ رازِ ہستی دلِ عاشق کا تقاضا تو نہیں؟

بحر کہتے ہیں جسے ہم کہیں ساحل ہی نہ ہو؟

راہ اب تک جسے سمجھے ہیں وہ منزل ہی نہ ہو؟

یہی شکوک آگے چل کر ملّا کا مستقل فلسفۂ حیات بن سکتے ہیں، جس میں یقیناً حیات کو مطمئن کرنے کی تمام صورتیں موجود ہونگی۔ درحقیقت ملّا ابھی زندگی کی اس منزل پر نہیں پہونچے ہیں جہاں انسان حاکمانہ رعب و جلال سے اپنے فیصلہ پر جم جاتا ہے اور ترمیم و تنسیخ کے دروازے بند کر کے ضد اور ہٹ کی نیند سوتا ہے۔ اس لئے ہمیں ملّا کی شاعری کا مستقبل بہت امید افزا اور شاندار معلوم ہوتا ہے۔

(۲)

گذشتہ سطور میں ملّا کے فلسفۂ حیات کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ اب ہم اُن کی ایسی نظموں پر ایک نظر ڈالیں گے جن میں قومیت اور انقلاب کا تخیّل پیش کیا گیا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک بات خاص طور سے یاد رکھنے کے قابل ہے اور وہ یہ ہے کہ ملّا ہی پر منحصر نہیں بلکہ تمام موجودہ شاعروں کے ذہن میں قومیت اور انقلاب کا جو تصور ہے وہ سائنٹیفک ہونے کے بجائے زیادہ تر رومانوی ہے حالانکہ اکثر نقاد اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ ہمیں انقلاب کا سائنٹیفک پہلو زیادہ اُجاگر کرکے دکھانا چاہیئے مجھے اس رائے کی اصابت میں اس بنا پر کوئی شبہ نہیں ہے کہ اُن کے ذہن میں معیاری انقلابی شاعری کی جو تصویر ہے وہ نامکمل یا غلط ہے لیکن مجھے اس رائے کے درست و برمحل ہونے میں ضرور کچھ شکوک ہیں۔

اکثر گوشوں سے غلط یا صحیح طریقہ پر یہ صدائیں آرہی ہیں کہ ہمارے ادب کو کسی خاص ملک کی ادبیات کا خاکہ بن جانا چاہیئے۔ خاص طور سے اسپین، چین اور روس کی ادبیات پر زور دیا جاتا ہے۔ ایسے مشیرانِ ادبی اس بات کو ہمیشہ نظرانداز کرجاتے ہیں کہ مختلف ممالک کے سیاسی، معاشرتی، معاشی اور ادبی ماحول مختلف ہوتے ہیں اور ہر جگہ کی ضروریات بھی جداگانہ ہوتی ہیں۔ اس لئے انقلابی یا ترقی پسند شاعری کے لئے ناممکن ہے کہ ہر جگہ یکساں اصول پر گامزن ہو۔

ہندوستان کے تمام ادبی ذخیروں کو دیکھ جایئے مختلف سیاسی اداروں کی ادبیات میں جو چیز آپ کو سب سے زیادہ نمایاں نظر آئے گی وہ رومانویت ہے۔ ہندوستانی فلسفہ ہندوستانی مذاہب، ہندوستانی روایات، ہندوستانی تعمیرات اور آثار قدیمہ غرض ہر جگہ آپ کو ایک رومانوی فضا ملے گی۔ اس وقت ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ ایسا کیوں ہے؛ بلکہ صرف یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ہندوستانی زندگی کے ہر شعبے میں یہ رومانویت غالب ہے۔ سب سے قطع نظر ہندوستان کی سیاسی تحریکوں ہی کو لیجئے۔ سنہ ۱۹۲۰ء کی تحریک آزادی ہو یا ۱۹۳۱ء کی ہر جگہ وہی رومانیت کارفرما نظر آتی ہے۔ یہ عدم تشدد، ترکِ موالات، ستیاگرہ، قانون شکنی، مَون برت رومانویت کے بہترین مظاہرے نہیں تو کیا ہیں۔ پھر بھی کون انکار کرسکتا ہے کہ یہ سب تحریکیں اپنی اپنی جگہ پر زبردست انقلابی تحریکیں تھیں، اور موجودہ ماحول میں اب بھی یہ انقلابی جراثیم رکھتی ہیں۔ غرض ہندوستان کی تمام ترقی پسند سیاسی جماعتیں آج بھی انھیں رومانی تحریکوں کی انقلابی قوت آزمانے کے لئے بےچین نظر آرہی ہیں۔

جب گرد و پیش کا یہ ماحول ہو تو اُس شاعر کی کیا خطا ہے جو اس رومانویت کو اپنی انقلابی نظموں کا پس منظر بناتا ہے لیکن اگر یہ کوئی قصور ہے تو ملّا بھی قصوروار ہے۔

ذیل میں ملّا کی چند نظموں کے اقتباسات درج ہیں:۔

ستانے کو ستالے آج ظالم جتنا دل چاہے مگر اتنا کہے دیتے ہیں فرزانے وطن میں ہم

ہمیں یہ فخر حاصل ہے پیامِ نور لائے ہیں — زمیں پہلے پہل چومی ہے جس نے وہ کرن ہم ہیں
سلائے گی ہمیں خاکِ وطن آغوش میں اپنی — نہ فکرِ گور ہے ہم کو نہ محتاجِ کفن ہم ہیں
بنا لیں گے ترے زنداں کو بھی ہم غیرتِ محفل — لئے اپنی نگاہوں میں جمالِ انجمن ہم ہیں
زمانہ کر رہا ہے کوششیں ہم کو مٹانے کی — ہلا پاتا نہیں جس کو وہ بنیادِ کہن ہم ہیں

فدائے ملک ہونا حاصلِ قسمت سمجھتے ہیں — وطن پر جان دینے ہی کو ہم جنت سمجھتے ہیں
کچھ ایسے آگئے ہیں تنگ ہم کنجِ اسیری سے — کہ اب اس سے تو بہتر گوشۂ تربت سمجھتے ہیں
وطن کا ذرہ ذرہ ہم کو اپنی جاں سے پیارا ہے — نہ ہم مذہب سمجھتے ہیں نہ ہم ملت سمجھتے ہیں
غلامی اور آزادی بس اتنا جانتے ہیں ہم — نہ ہم دوزخ سمجھتے ہیں نہ ہم جنت سمجھتے ہیں

محبانِ وطن کا نعرہ

اُن کی دوسری نظم "نعرۂ انقلاب" اپنی نوعیت کے اعتبار سے موجودہ دور کی ایرانی شاعری سے بہت ملتی جلتی ہے اور بحر میں بھی وہی ایرانیت ہے۔ لیکن مضامین کے اعتبار سے بھی موجودہ زمانہ کے کسی نوجوان انقلابی شاعر کی نظم معلوم ہوتی ہے:-

(۱)

انقلاب زندہ باد!
آیتِ ایمانِ ما
انقلاب زندہ باد

شوق ہوا بے حجاب
ختم ہوا دورِ خواب
آگیا روزِ حساب
قوم کا چمکا شباب
زندہ باد انقلاب
انقلاب زندہ باد

(۳)

فتنہ و شر تا بکے
دورِ قمر تا بکے
طاعتِ زر تا بکے
خونِ ہنر تا بکے
زیر و زبر تا بکے
انقلاب زندہ باد

(۲)

سرخیِ عنوانِ ما
جذبۂ پنہانِ ما
ہم دل و ہم جانِ ما
گوہرِ دامانِ ما

(۴)

جہل و کدورت مٹا
شانِ رعونت مٹا
جوشِ خصومت مٹا

زعمِ حکومت مٹا
رنج و صعوبت مٹا
انقلاب زندہ باد

(۵)

دُور ہو سب ایک بار
تفرقۂ روزگار
مفلس و سرمایہ دار
بندہ و با اختیار
کشمکشِ گیرو دار
انقلاب زندہ باد

(۶)

توڑ پرانا نظام
دائرۂ خاص و عام
بندشِ قوم و مقام
دے یہ جہان کو پیام
لے کے اخوت کا نام
انقلاب زندہ باد

(۷)

پھر سے لگا ایک چمن
سرو و گل و یاسمن
قمریِ شیریں دہن
جب ہو وہاں نغمہ زن
گونجے فضائے وطن
انقلاب زندہ باد

(۸)

صبح ہو جب آشکار
از طرفِ کوہسار
گل کو سنائے ہزار
یہ خبرِ خوشگوار
وعدۂ فصلِ بہار
انقلاب زندہ باد

(۹)

سہل کُن مشکلات
قوم کی راہِ نجات
دہر کا رازِ حیات
فلسفۂ کائنات
لاکھ سخن ایک بات
انقلاب زندہ باد

اسی طرح اُن کی نظم "ہم لوگ" ہے:

سرخیِ انقلاب ہیں ہم لوگ　　عنفوانِ شباب ہیں ہم لوگ
تیرہ و تار غم کی راتوں میں　　مژدۂ آفتاب ہیں ہم لوگ
شبِ حسرت میں تشنہ کاموں کی　　خوابِ جام و شراب ہیں ہم لوگ
موت کے حملہ ہائے پیہم پر　　زندگی کا جواب ہیں ہم لوگ

کون آنکھیں ملائے گا ہم سے — جلوۂ بے نقاب ہیں ہم لوگ
قوم کا دل ہلا دیا ہم نے — نالۂ مستجاب ہیں ہم لوگ
سونے والوں کو کر دیا بیدار — اک پریشاں سا خواب ہیں ہم لوگ
جن کے مٹنے میں بھی ہے اک تعمیر — وہی خانہ خراب ہیں ہم لوگ
کام ناکامیوں سے لیتے ہیں — کس قدر کامیاب ہیں ہم لوگ
کوئی ہم سا نہیں زمانے میں — آپ اپنا جواب ہیں ہم لوگ
ایک روشن سی جس کی ہے تعبیر — وہی دھندلا سا خواب ہیں ہم لوگ
جانتے ہیں کسی کی تاب جفا — پھر بھی جینے کی تاب ہیں ہم لوگ
زیست کا ماحصل ہے عہد شباب — اور جانِ شباب ہیں ہم لوگ

کون دے گا صدا پہ اپنی صدا
نعرۂ انقلاب ہیں ہم لوگ

ان نظموں کے اقتباسات پیش کرنے کے بعد ہم اپنے اصلی مبحث پر آتے ہیں۔ اوپر کہا جا چکا ہے کہ ہر ملک اور ہر دور کی چند انفرادی خصوصیات ادبی معیار بنانے کے راستے میں حائل ہوتی رہتی ہیں، اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ ادبیات کے معاملے میں کوئی عالمگیر او ہمہ گیر اصول نہیں بن سکتا۔ درحقیقت ادبیات میں بہت سے اصول ہمہ گیر ہیں اور بنائے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کا اظہار کچھ ایسے نہج سے ہوتا ہے کہ بظاہر وہ متضاد نظر آنے لگتے ہیں۔ او مقصد کی ہم آہنگی کے باوصف حصول مقصد کے ذرائع کے اختلاف کی وجہ سے ادبی معیار کا آہنی قلعہ مسمار ہونے لگتا ہے۔

اس لئے یہ تسلیم کرنے کے بعد کہ روس اور چین میں ادب کا جو معیار قائم ہو گیا ہے وہ ہر ملک میں رائج ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے، ہم یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ کسی خاص ملک میں انقلاب اور وطنیت کا جو رائج الوقت تخیل ہے اس سے کنارہ کشی اور روسی یا چینی معیار کی پیروی ہی ایک شاعر کو انقلابی شاعر بنا سکتی ہے یہی وجہ ہے کہ ہم ملا کے بارے میں یہ رائے ظاہر کرتے وقت کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے کہ ملا اگر اپنی تمام تر توجہ انقلابی شاعری پر مبذول کریں تو وہ بہت اچھے انقلابی شاعر بن سکتے ہیں

ملا کی نظم "دو حقیقتیں" پڑھنے کے بعد ممکن ہے بعض لوگ ملا پر یہ الزام لگائیں کہ وہ مادی حقائق سے گریز کر کے روحانی گلزاروں کی سیر کرنے لگتے ہیں۔ لیکن محض اس بنا پر آجکل کے انقلابی ادب میں ہم ملا کو کوئی جگہ دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

ایک خاص بات اور بھی ہے یعنی ملّا کے یہاں وہ نزاع (Conflict) نہیں ملتی جو ہمیں نظام کی خرابیوں کے دُور کرنے پر آمادہ کرتی اور اُبھارتی ہے، اور اگر یہ نزاع پیدا بھی ہوتی ہے تو وہ کسی اخلاقی یا روحانی تفریح گاہ کے دامن میں پناہ لینے کی سوچنے لگتے ہیں۔ ملّا کے یہاں اگر یہ بات نہ ہوتی تو وہ اب سے بہت پہلے انقلابی شاعری کے "عالمگیر" اُصولوں کو مان چکے ہوتے۔ اور وہ اسی پر کاربند ہوکر موجودہ دَور کے حسّاس ترین شاعر کے فرائض انجام دیتے ہوتے۔

ملّا کے موجودہ رنگ نظم گوئی پر کوئی اعتراض کئے بغیر ہم اس خواہش کا اظہار ضرور کردینا چاہتے ہیں کہ ملّا روحانیت اور مادّیت کے جھگڑوں سے چھٹکارا حاصل کرکے اگر خود زندگی کی نزاعوں کو موضوعِ نظم بنائیں تو کہیں بہتر ہو۔ ملّا کے یہاں وطنیت کا جذبہ شدت کے حدود تک پہونچا ہوا ہے، اُنھیں افسانہ ہائے ماضی کے دُہرانے میں لطف آتا ہے۔ اُنھیں اپنی وطنی بزرگیاں گنانے میں مزا ملتا ہے۔ بعض اوقات ان کی وطن پرستی جارحانہ شکلیں اختیار کرنے لگتی ہے۔ اس وطن پرستی کے کامیاب مظاہرے اُن کی نظم "نوروز" اور "زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!" میں موجود ہیں، مگر میری نگاہیں اس وطن پرستی کو بین الاقوامی جذبۂ اخوّت کے پس منظر میں دیکھنے کی متمنّی ہیں۔

آخر میں ہم دو چار لفظ ملّا کے حُسن، محبت اور اخلاق کے تخیّل کے بارے میں بھی کہنا چاہتے ہیں۔ اس کے اعادے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ ملّا کا تخیّل رومانی اور روحانی ہے۔ انھیں اسی فضا میں لطف وسکون ملتا ہے ٹیگور کی اور صوفیانہ شاعری کے اثرات ملّا کے یہاں بہت ہیں۔

اس ضمن میں اُن کی "پرستارِ حُسن" خاص توجہ کی مستحق ہے، چنانچہ ہم اسی کے چند بند ذیل میں نقل کرتے ہیں

آرزوئیں دل کی ساری بےخبر تھیں مستِ خواب ۔۔۔ جانتا تھا کون کہتے ہیں کسے جوشِ شباب
یک بیک تونے رُخِ پُرنور سے اُلٹی نقاب ۔۔۔ اِک نظر میں ہاتھ سے جاتی رہی تسکین وتاب

غنچۂ دل اِک اشارے سے ترے کِھلنے لگا
مجھ کو رازِ آفرینش کا پتہ ملنے لگا

میں نے پہلے تجھ سے بچنے کی بہت تدبیر کی ۔۔۔ دل کے بہلانے کو دنیا اِک نئی تعمیر کی
جب نہ یوں مانا تو پھر دھمکی بھی دی تعذیر کی ۔۔۔ بیڑیاں اس کو پنھائیں عقل کی زنجیر کی

تو مگر میرے خیالوں میں بھٹکتا ہی رہا
آرزو بن کر کلیجے میں کھٹکتا ہی رہا

حُسن سے میری غرض جز خوبیِ صورت نہیں ۔۔۔ جز پرستش کے مرے دل کی کوئی حاجت نہیں
گرمیِ شوقِ تمنا سے مجھے رغبت نہیں ۔۔۔ حُسن کے بندے جو ہیں وہ بندۂ الفت نہیں

پاک نیت ہو تو جھگڑے عشق میں پڑتے نہیں
شمع کی الفت میں پروانے کبھی لڑتے نہیں

حُسن جس پر ختم ہو ایسی تو صورت ہی نہیں — جو نہ ہو محوِ طلب انساں کی فطرت ہی نہیں
ہو نہ گلشن میں جو آوارہ وہ نکہت ہی نہیں — ایک کی ہو کر رہے جو وہ طبیعت ہی نہیں

دل ہے پیشارائے چمن اس کی محبت عام ہے
شہد کی مکھی ہے یہ ہر گل سے اس کو کام ہے

اِس نظم سے بھی جو بات خاص طور سے ظاہر ہوتی ہے وہ مُلّا کی ذہنی نزاع ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ مادّیت کی طرف آنا چاہتے ہیں مگر اُن کی روحانیت راستہ روکتی ہے۔ صرف "جرأتِ رندانہ" کی ضرورت ہے اور ہمیں اُمید ہے کہ مُلّا صاحب اسی جرأت سے کام لیں گے۔

کلامِ ممتاز

(از مسٹر گلونت سنگھ ممتاز)

روحِ عمل

فضائے لامکاں جولانگہ من — زمین و آسماں گردِ رہِ من
سوئے تکمیل ہر دم رہ سپارم — کرانِ بیکراں منزل گہِ من

درسِ عمل

ترا گر جاوداں ماندن ہوس ہست — ہوائے عافیت از سر بدر کن
بہ میدانِ مصافِ زندگانی — مجو کنجِ اماں سینہ سپر کن

تعلیم یافتہ جوانوں سے

(از مسٹر راج بلدیو راج، ایم۔اے۔ ٹی۔ اے)

اے جوانانِ وطن، گلہائے رعنائے چمن،
اے وطن کی روشنی، روشن چراغانِ وطن
درسگاہوں سے سند لے کے تم آئے تو ہو
دل میں لاکھوں جگمگاتی حسرتیں لائے تو ہو
علم کہتے ہی نہیں الفاظ کی پہچان کو
علم وہ ہے جو بتائے زیست کے عرفان کو
علم انسانوں کی خدمت کے سوا کچھ بھی نہیں
اک تخیل ہی تخیل ہے خدا کچھ بھی نہیں
روزمرہ زندگی میں ہم کو آتا ہے نظر
جس کو کہتے ہیں بشر یکسر ہے محتاجِ بشر
فاقہ کش جھکتے ہیں جا کر منعموں کے روبرو
منعموں کی حاکموں کے ہاتھ میں ہے آبرو
صاف بازارِ جہاں کا راستہ ملتا نہیں
بھیڑ انسانوں کی اتنی ہے خدا ملتا نہیں
اور حقیقت میں خدا رکھتا ہے گر کوئی وجود
کیوں ہے پھر اس کے چہیتوں پر بلاؤں کا ورود؟

کوئی ظالم باپ بیٹوں کو ستا سکتا نہیں
یہ عمل میں کیا، تصور میں بھی آ سکتا نہیں

اک تصور سا یوں ہی لیکن دلِ سوزاں میں ہے
جس کو کہتے ہیں خدا وہ پردۂ انساں میں ہے
یہ چمن، یہ کھیت، یہ ایوان یہ سڑکیں، یہ پل
یہ مشینوں کی گرج، یہ مضطرب لوہے کا غل
یہ ہوائی گاڑیاں، یہ مسکراتے باد باز
یہ سمندر کے جگر پر تیرنے والے جہاز

عقلِ انساں خام ہے، اور خام انساں کیا کہے
چاند سورج بھی ہوں گل بوٹے کسی انسان کے

وقت ہے اب اس طرح روشن کرو بزمِ خیال
جس سے دیکھو اپنی آنکھوں آدمیت کا کمال
علم تعمیرِ غلامی کے لئے ہرگز نہیں
علم توقیرِ غلامی کے لئے ہرگز نہیں
علم سے کھلتا ہے دل میں عشق و آزادی کا باب
عشق و آزادی کے بل پر زندگی ہے کامیاب

آج کا جو کام ہے چھوڑو نہ کل کے واسطے
یاد رکھو علم ہوتا ہے عمل کے واسطے

جذباتِ فراق

(از پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری - ایم - اے)

دیکھتے دیکھتے اُتر بھی گئے
اُن کے تیر اپنا کام کر بھی گئے

عشق کی کچھ ہوا لگی جب اُنھیں
کچھ اڑا رنگ کچھ نکھر بھی گئے

حسن پر بھی کچھ آ گئے الزام
گو بہت اہلِ دل کے سر بھی گئے

یوں بھی کچھ عشق نیک نام نہ تھا
لوگ بدنام اُس کو کر بھی گئے

کچھ پریشاں سے اہلِ دید بھی تھے
گیسوئے یار کچھ بکھر بھی گئے

آپ کے انتظار میں جو تھے
آپ آتے رہے وہ مر بھی گئے

آج اُنھیں مہربان سا پاکر
خوش ہوئے اور جی میں ڈر بھی گئے

اُن کو ڈھونڈھیں کہاں، کہ اپنے ساتھ
لے کے وہ اپنی رہ گذر بھی گئے

حسن کو کون روک سکتا ہے
وہ اگر کچھ لحاظ کر بھی گئے

بات میں اور بات آئی نکل
گر کبھی اُن کی بات پر بھی گئے

عشق میں روٹھ کر دو عالم سے
نیا عالم ملا جدھر بھی گئے

عشق کو انتظارِ طوفاں ہے
چڑھے دریا جو تھے، اُتر بھی گئے

ہم تھے کچھ بے قرار پہلے سے
اور وہ کچھ بے قرار کر بھی گئے

جن کو اُس آنکھ نے خراب کیا
کچھ وہ بگڑے بھی کچھ سنور بھی گئے

دیکھتے رہ گئے ہم اُن کی نظر
اور وہ اقرارِ وصل کر بھی گئے

حسن کو بھی نہیں ہے بار جہاں
قافلے عشق کے اُدھر بھی گئے

تھی وہی بیخودیِ حسن، اور وہ
یاد بھولے ہوؤں کو کر بھی گئے

کیا بتائیں زمین کی رفعت
بارہا آسمان پر بھی گئے

گُل کھِل اُٹھے بوقتِ عہدِ وفا
قطرے شبنم کے کچھ بکھر بھی گئے

ہوں ابھی گوشِ برصدا، اور وہ
زیرِ لب کہہ کے کچھ مکر بھی گئے

کس لئے کم نہیں ہے دردِ فراق
اب تو وہ دھیان سے اُتر بھی گئے

گجرات کا ایک نامور شاعر

(از حضرت پروانہ بریلوی)

یورپ کے قرونِ وسطیٰ کے صوفی شاعروں (Mystic Poets) کی طرح ہندوستان میں بھی میرابائی کبیر، چیتن، تکارام وغیرہ بھگتی کے شاعر ہوئے ہیں۔ انھیں میں پندرھویں صدی کے گجراتی شاعر نرسنہا مہتا کا بھی شمار ہے جن کے مذہبی گیتوں اور بھجنوں کی عظمت کا تمام ہندوستان معترف ہے۔

تعجب ہوتا ہے کہ اُس وقت کے مذہبی اداروں کے خلاف کسی شاعر کو بھی صدائے احتجاج بلند کرنا گوارا نہ تھا۔ برخلاف اس کے انگلستان میں اس کی اکثر مثالیں ملتی ہیں۔ جب مذہب نے ادب پر کافی دخل پا لیا تو چاسر (Chaucer) اور لینگ لینڈ (Langland) جیسی انقلاب پسند ہستیوں سے خاموش نہ رہا گیا چاسر نے "کنٹربری کی کہانیوں"[1] کے افتتاحیہ میں اور لینگ لینڈ نے اپنی جمہوریت پسند شبابی[2] شاعری میں اس کا اظہار کیا۔ نرسنہا مہتا کی شاعری میں کسی حد تک اچھوت اُدھار" کی روح پائی جاتی ہے۔ "ایک مقتدر آدمی کا جنازہ" شاہد ہے کہ مہتا کے طنز نگار قلم میں بھی وہ زور اور اثر ہے جس کے لئے سوِفٹ (Swift) انگلستان ہی میں نہیں بلکہ دنیائے ادب میں حیاتِ ابدی پا چکا ہے۔ پرمانند نے نرسنہا مہتا کی زندگی کی شیئیت پسندانہ تصویروں کو اور "مقتدر دنیا" سے اُس کے ناگزیر تصادم کو نہایت لطیف پیرایہ میں لکھا ہے۔ مہتا کی زندگی سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دنیا کے نظامِ عمل، ظاہری رسومات اور ریاکاری سے تنگ آ گیا تھا، اسی لئے اسکی طنزیات میں خارِ مغیلاں کی چبھن ہے اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ :-

"ننھے ننھے نکیلے کانٹوں کا ایک گچھا نگل گیا ہوں میں"

زمانہ نے کروٹ بدلی۔ روح میں بیداری اور ذہنوں میں انقلاب کی لہریں موجیں مارتی ہوئی آگے بڑھیں موجودہ بے راہ روی اور رسمی شاعری کے خلاف باغیانہ آواز بلند کرنے کے لئے بیدار مغز شاعر پیدا ہو گئے۔ "طنزیات" کے میدان میں حدِ نظر تک دل فریب مناظر نظر آنے لگے۔ آکھا نے اِس میدان میں آکر کوسِ لمن الملک بجایا۔ سترھویں صدی میں وہ اس کا واحد مردِ میدان ہے۔ آکھا گیتا کا مصنف اپنی دقیق فلسفیانہ نظموں کی وجہ سے نکتہ رس، ادب شناس طبقہ پر چھایا ہوا ہے، اور پبلک اس کو ایک بے باک طنز گو اور "آکھا کے تازیانے"

---

[1] The Canterbury Tales.

[2] Pastoral Poems.

کا مصنف خیال کر کے قدر و منزلت کرتی ہے۔ آکھا، میرا بائی اور نرسنہا مہتا کے برخلاف ایک فلسفی تھا اسے رسمی مذہبی موضوعات سے کوئی دلچسپی نہ تھی، اُس کی تمام زندگی "گیان" حاصل کرنے میں گزری، جس کا ذکر دیدوں میں کیا گیا ہے۔ اُس کی بیشتر شاعری ویدانتی لہر میں لکھی گئی ہے۔

آکھا کے دل میں مذہبی اداروں، خانقاہوں، مہنتوں اور سادھوؤں کے لئے قطعی جگہ نہ تھی، وہ انھیں حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا، اور اُن سے بہت ہی رُکھائی سے پیش آتا تھا، اُس نے اپنی نفرت پر پردۂ ابہام نہیں ڈالا اور اُس کے طنزیات اس کی شاہد ہیں :۔ وہ ایک جگہ لکھتا ہے کہ:۔

"گوکل ناتھ کو اپنا گرو بنا کر مجھے احساس ہوا کہ میں ایک ایسے پُرانے پُجاری کا حلقہ بگوش ہوگیا جو کسی سے اُس کی ساری دولت چھین لے اور مذہب کو ہاتھ نہ لگائے، کیا ایسا گرو کوئی بھلائی کر سکتا ہے۔"

اس کے ردِّ عمل کے لئے وشنو اس کے پُجاری سے ملا جو بہت بڑے رئیس اور موروثی سجادہ نشین تھے۔ وہ انھیں خضرِ رہِ طریقت بنانے گیا تھا۔ لیکن ان کے یہاں کا برتاؤ دیکھکر اُسے سخت صدمہ ہوا، اور واپس آکر اُس نے وہاں کی تہذیب کا مضحکہ اُڑانا شروع کیا "پُجاری نے میری طرف دیکھا، لیکن کوئی پرواہ نہ کی" پُجاری نے آکھا کو پہچان لیا۔ لیکن چونکہ آکھا اب وہ موٹی اسامی نہ تھا جس کی ایسی جگہ بڑی آؤ بھگت ہوتی ہے، اس لئے وہ وہاں سے نکال دیا گیا جہاں ایک مرتبہ پہلے اُس کا "خوش آمدید" کہہ کر استقبال کیا گیا تھا، اور وہ دعوت کھا چکا تھا۔ دربان نے اُس سے کہا "آکھا تو ایک رئیس، سیٹھ تھا، تم کیسے آکھا ہو سکتے ہو۔

بیشتر شہروں میں جہاں وہ گیان حاصل کرنے گیا، اُسے بے حقیقت، خود نما، جاہل، سادھو، سنیاسی ملے جو دولت کی لالچ میں اندھے اور عورتوں کے بھوکے تھے" بیشتر ایسے تھے جو اپنے آپ کو گرو کہلواتے تھے لیکن لاعلمی اور نکبت کی گہرائیوں میں پڑے غوطے کھا رہے تھے، اسی قسم کے ایک سادھو کے متعلق آکھا لکھتا ہے کہ:۔

وہ اپنے آپ کو 'گرو' سمجھتا ہے ؟
لیکن اپنے گلے میں ایک بھاری پتھر
باندھ کر کوئی کیسے تیر سکتا ہے ؟

اور ایسا گرو دوسروں کو کیونکر بچا سکتا ہے !

آکھا کے نزدیک مذہبی رسومات، فرقہ پرستی اور مذہبی ادارے گیان حاصل کرنے میں ممد و معاون نہیں بلکہ مزاحم و مانع ہوتے ہیں یہ تمام چیزیں آہنی بیڑیاں ہیں، جو انسان کا قدم "گیان" اور "بھگتی" کی طرف نہیں اُٹھنے دیتیں۔ انسان "گیان" کی روشنی حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن یہ بڑھکر اُس کا پاؤں پکڑ لیتی ہیں اور بہت جلد اُسے گمراہ کر کے تاریکی اور ادبار کی خوفناک پستیوں میں ڈال دیتی ہیں۔ رسمی مذہب پرستی کے متعلق وہ کہتا ہے کہ:۔

"کسی زمانہ میں ایک بیوقوف ہر پتھر کو خدا سمجھ کر سجدہ کرتا تھا،
اُس کے کان آکھا، سُنتے سُنتے بہرے ہو گئے،
لیکن پھر بھی اُسے 'گیان' کا عارفانہ نور نہ مل سکا!"

آکھا کا عقیدہ تھا کہ جھوٹے خداؤں اور فرضی دیوتاؤں کو سجدہ کرنے اور پوجنے سے نجات نہیں ملتی، اگر انسان کو واقعی خدا کی تلاش اور 'گیان' کی خواہش ہے تو اُسے خدا کو پہچاننے سے پہلے اپنی پوشیدہ عظمتوں سے آگاہ ہونا چاہیئے۔ اپنی خودی کو بلند کرنا چاہیئے۔ اور اتنا بلند کرنا چاہیئے کہ خدا خود پکار اُٹھے "بتا تو کیا چاہتا ہے" علامہ اقبال نے بھی اس خیال کی طرف اشارہ کیا ہے، اور یہی فلسفہ ہے جس نے ان کی شاعری کی وسعتوں کو دَورِ حاضرہ کی سرحدوں سے آگے بڑھا کر حدودِ دوام سے ملا دیا۔

کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلّی زار میں آباد ہو (اقبال)

آکھا پتھر کے جھوٹے خداؤں کا بھرم اور جھوٹی عبادت کا راز اس طرح افشا کرتا ہے :۔

"صدہا برس گذر گئے،
تلک لگاتے ہوئے،
تسبیح گھس کر خستہ حال ہو گئی،
پاؤں جاتراؤں کو جاتے جاتے تھک کر چُور ہو گئے،
لیکن ایشور کی پھر بھی قربت حاصل نہ ہوئی۔"

آکھا کی شاعری دراصل اُس کے ذاتی احساسات اور قلبی واردات کا عکس ہے۔ معرفت (گیان) کی مسلسل تلاش و جستجو نے اُسے زہراب ناکامی سے روشناس کرا کے اُسے طنز گوئی کی طرف مائل کیا۔ پیدائش اور پیشہ کے لحاظ سے ایک سُنار تھا مگر دنیا کے مکرو فریب کا مقابلہ نہ کر سکا اور کم سنی ہی میں سب کچھ چھوڑ کر دنیا سے منہ موڑ لیا بہن کی موت کا زخم ہنوز تازہ تھا اس لئے سادھو سنتوں کی آغوش میں پناہ گزین ہوا جن میں سے بیشتر بے حقیقت لاف زن، جاہل، بدکار، حریص اور طامع نکلے۔ اس طرح کے پے در پے تجربوں نے اُسے اس جھوٹی دنیا سے اُٹھا کر حقیقت اور سچائی کے تجلّی زار میں لا کھڑا کر دیا۔ وہ بہت جلد اس قابل ہو گیا کہ اس جھوٹی دنیا کی زبوں حالی اور مکاری کو حقیقت کی دُوربین سے دیکھ سکے۔ ایک عورت نے جسے وہ اپنی بہن سے کم نہ سمجھتا تھا اُسے بہتان لگائے۔ کہتے ہیں کہ اس وجہ سے اس کو جیل کی بہت شکن تکلیفیں جھیلنی پڑیں۔ چنانچہ اسی مصیبت نے اسے طنز گوئی پر مجبور کیا اُس کے دل سے شعلے اُٹھنے لگے جو سماج اور سوسائٹی کو بھسم کر دینا چاہتے تھے اسکے لفظوں سے آگ برسنے لگی، جو عیاشی

دغا، فریب، بدکاری اور مکاری کے نظر فریب تار و پود کو جلا کر خاک سیاہ بنا دینے کی طاقت رکھتی تھی۔ اُس نے اپنے آتشیں راگوں میں اپنے دل کی گرمی بھر دی اور اپنی اس شعلہ فشانی سے آگ لگا دی، دنیا اور دنیا والوں کی آنکھیں کھول دیں اور انھیں سیدھا اور صاف راستہ دکھا کر انسان بنا دیا۔

آکھا کی طنزیہ شاعری، لینگ لینڈ (Langland) کی طرح صاف، واضح، پُرزور اور سادہ پابندیوں سے آزاد ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس کی بنیاد ذاتی احساسات اور زندگی کے انقلابات پر رکھی گئی ہے جنھیں وہ پُرزور طریقہ سے اپنے خاص شاعرانہ انداز میں عوام تک پہنچاتا ہے۔ عوام کو دنیا کے انقلابات اور وقتی تغیرات و تبدلات سے آگاہ کر دینا ہی اُس کا مسلک ہے اور یہی اُس کی شاعری! اس کے باوجود اُس کے کلام میں کہیں کہیں براؤننگ (Browning) کا اغلاق اور ابہام بھی موجود ہے۔ جس کی وجہ شاید یہ ہے کہ وہ شاعری میں اُن دقیق مسائل کو حل کرنا چاہتا تھا جن میں خود بالیدگی اور پختگی پیدا نہیں ہوئی تھی، لیکن اُس کی "طنزیات" کی مقبولیت اُس کی حقیقی شاعری اور فنی قابلیت کا پتہ دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کے اکثر شعر گجرات میں زبان زد خاص و عام ہی نہیں بلکہ اَن پڑھ دیہاتیوں کے زبان و دہان سے نغمۂ الہام بن کر نکلتے اور فضائے عالم میں گونجتے ہیں۔ اسکی مقبولیت اور شہرت کو دیکھکر ہم کہہ سکتے ہیں کہ دنیا اُس شاعر کی طرف ضرور کھنچ آئے گی۔ اُس کے حیات افروز نغمہ کو لبیک کہے گی اور اُس کے رفعت آشنا قدموں کے ساتھ بام ترقی کی طرف مائل بہ پرواز ہوگی جو نظیر اکبرآبادی کی طرح عوام کو اُن کے حقائق زندگی کی طرف متوجہ کرنے کے لئے انھیں حقایق کو اپنی نغمہ سرائی کا موضوع منتخب کرتا ہے۔

نغمۂ بے ساز

(مسٹر ڈی پی بیدل آشفتہ)

راس آئی نہ خوشی، غم سے نہ ہے ساز مجھے
وجہ صد ناز ہے، جینے کا یہ انداز مجھے

خوار کرتی نہ مری حسرتِ پرواز مجھے
کاش ملتا قفسِ زیست کا دَر باز مجھے

پھر سناؤ تو وہی نغمۂ بے ساز مجھے
پھر ذرا دو تو سہی غیب سے آواز مجھے

بہر نظارے ہی گئی لوٹ کے سامانِ حیات
ہر ادا کر ہی گئی کشتۂ انداز مجھے

پسِ پردہ بھی کوئی راہنما ہے میرا
ہونے دیتی نہیں گم غیب کی آواز مجھے

تھک گیا بادیہ پیمائے محبت ہو کر
نظر آیا کہیں انجام نہ آغاز مجھے

بے خودی کیا مری لذت کشِ بیداد نہ تھی
کس لئے ہوش میں لائی نگہ ناز مجھے

گونج سی کیا ہے یہ ویرانۂ دل میں پیدا
دے رہا ہے کہیں کشتہ کوئی آواز مجھے

اِلتجا

(از جناب الطاف مشہدی)

حریمِ ناز سے چلمن کو اب اُٹھا بھی کہیں — مری نگاہ کو بیباکیاں سکھا بھی کہیں
شرارِ عشق سے سوزِ دروں بڑھا بھی کہیں — جبینِ شوق میں سجدوں کو تلملا بھی کہیں
اِس اُجڑے باغ پہ بن کر بہار چھا بھی کہیں

مجھے وہ یاد ہے گلشن میں گنگنانا ترا — وہ میرے پاؤں کی آہٹ سے چونک جانا ترا
اُتر کر آنکھ کے رستے سے دل میں آنا ترا — اُسی ادا سے نگاہوں میں پھر سما بھی کہیں
اِس اُجڑے باغ پہ بن کر بہار چھا بھی کہیں

وہ سحر بار ترانے جو یاد آتے ہیں — تو کائنات کے ذرّے بھی گنگناتے ہیں
جگر کے درد کو کچھ اور بھی بڑھاتے ہیں — تھپک کے سوزِ محبت کو اب سلا بھی کہیں
اِس اُجڑے باغ پہ بن کر بہار چھا بھی کہیں

ترے بغیر جہاں میں کہیں قرار نہیں — اور اپنی زیست کا بھی کوئی اعتبار نہیں
خزاں کا جس پہ تسلط ہو وہ بہار نہیں — گزر رہی ہے جوانی بس اب تو آ بھی کہیں
اِس اُجڑے باغ پہ بن کر بہار چھا بھی کہیں

فلک پہ تیرے تجسس میں گھوم آتا ہوں — تجھے سمجھ کے ستاروں کو چوم آتا ہوں
نظر فروز مناظر پہ جھوم آتا ہوں — تو میرے حجلۂ دل میں سمٹ کے آ بھی کہیں
اِس اُجڑے باغ پہ بن کر بہار چھا بھی کہیں

ترے فراق میں اب جاں سے جا رہا ہوں میں — حیات و موت کا جھگڑا چکا رہا ہوں میں
نقوشِ ہستیِ فانی مٹا رہا ہوں میں — تو بن کے عہدِ گزشتہ مجھے لبھا بھی کہیں
اِس اُجڑے باغ پہ بن کر بہار چھا بھی کہیں

تو اب بھی دل کے پھپھولوں کو گدگداتی ہے — نشے سے چور ستاروں میں مسکراتی ہے
مرے خیال میں تنویر بن کے آتی ہے — یہ ایک پردہ ہے اور درمیاں! اٹھا بھی کہیں

اِس اُجڑے باغ پہ بن کر بہار چھا بھی کہیں

قبائے صبر کو اب تار تار کرتا ہوں — ترے حضور میں سجدے نثار کرتا ہوں
اب اپنے عشق کو میں کامگار کرتا ہوں — گزر گئی ہیں جو باتیں اُنھیں بھلا بھی کہیں
اِس اُجڑے باغ پہ بَن کر بہار چھا بھی کہیں

نوائے حقیقت

(از حضرت محوی صدیقی لکھنوی)

آہ وہ نالہ غم دل کی جو تفسیر نہیں — حیف اس آہ پہ جو درد کی تصویر نہیں
کچھ ہمیں کشتۂ نیرنگیِ تحریر نہیں — کس کے لب پر گلۂ کاتبِ تقدیر نہیں
آگیا دیکھ کے کیوں غش مرے غمخواروں کو — تابشِ داغِ جگر، حسن کی تنویر نہیں
اے اجل شکر ہے تونے مجھے آزاد کیا — طوق گردن میں نہیں، پاؤں میں زنجیر نہیں
غمِ دُنیا نہ سہی، صدمۂ ہجراں ہی سہی — کون اِس غمکدۂ دہر میں دلگیر نہیں
ہو گیا حوصلۂ جرمِ وفا اور بلند — جان سے کس کو عزیز آپ کی تعزیر نہیں
گردشِ چشمِ فسوں ساز پھر آخر کیا ہے — یہ اگر گردشِ تقدیر کی تصویر نہیں
شمعِ بالیں بھی ہے خاموش، شبِ غم بھی اُداس — غالباً ہوش میں اب عاشقِ دلگیر نہیں
سب گلے مٹ گئے اس حسنِ تبسم کی قسم — رنجِ بیداد نہیں، شکوۂ تقدیر نہیں
زخم بھی پھوٹ بہے، اور ٹپک بھی نہ رہی — جی بہلنے کی مرے اب کوئی تدبیر نہیں
تیرے سلجھانے سے دیوانے یہ کیا سُلجھیں گے — پیچ تقدیر کے ہیں، حلقۂ زنجیر نہیں
جان باقی ہے مرے دل کی تمنا میں ہنوز — اے فلک کیا ترے ترکش میں کوئی تیر نہیں
کیا ہے، پھر، تو ہی بتا، گر ترا شاداب شباب — جانِ کشمیر نہیں، خلد کی تصویر نہیں
اپنے چہرے سے ہٹادی ہیں کسی نے زلفیں — اہلِ ایماں کو اب اندیشۂ تکفیر نہیں

دلِ رنجور کا ناسور کہیں بھر جائے
آہ محویؔ! کہیں ایسی کوئی تدبیر نہیں

(ایک قصہ)

"ہولی میں سب معاف ہے"

از شریمتی شیورانی دیوی (مسز پریم چند)

(۱)

خلق سنگھ ہولی میں بڑا ہُڑدنگ مچاتے تھے، شراب پی کر دروازے دروازے پر جا کر کبیر گاتے چھوٹی بڑی سب عورتوں سے بھابی کا ناتا جوڑتے اور دل لگی کرتے، اور پندرہ بیس دن پہلے ہی سے گاؤں کے دس پانچ لونڈوں کو لے کر ان پر رنگ ڈالنے لگتے، بیچاریوں کا گھر سے نکلنا مشکل ہو جاتا۔ ایسی ایسی بھدی، نکمی اور گندی باتیں بکتے کہ کان کے کیڑے جھڑ جاتے۔ لیکن وہ گالیاں اور گیت کبیر کے پردوں کی شکل میں ہوتی تھیں۔ اس لئے ہنسی مذاق میں اُڑ جاتی تھیں۔ آخر کار عورتوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ حضرت کو ٹھیک کر دینا چاہیئے۔ ایسا اُلو بنایا جائے کہ سب شیخی بھول جائیں۔

شکنتلا نے کہا "آج میں گھر سے نکلی تو ایسی پچکاری ماری کہ سارے کپڑے شرابور ہو گئے"۔

آشا دیوی بولیں "ابھی ہولی کو دس دن ہیں مگر اُس نے ابھی سے ہُڑدنگ مچا رکھی ہے"۔

سُبھدرا اُن کی سرغنہ تھی، خلق سنگھ سے چھوٹی تھی، لیکن آج خلق سنگھ نے اُس کو پکڑ کر اُس کے مُنہ میں گلال مَل دیا تھا۔

شکنتلا نے سبھدرا سے پوچھا "تو کیا تدبیر سوچی ہے تم نے سبھدرا؟"

سبھدرا:- "ہولی کے دن ہی بتاؤں گی"۔

"تب تک اُسے ہُڑدنگ مچانے دو گی"

"ہاں مچانے دو نگی"

"کتنے ہی ہاتھ جوڑے لیکن مانتا ہی نہیں"

"دوسرے مرد بھی تو خوش ہوتے ہیں"

"اپنے گھر والے تک تو بولتے ہی نہیں، کہتے ہیں ہولی میں سب معاف ہے"۔

(۲)

آج ہولی کی رات ہے، مردوں نے سارے دن کیچڑ، رنگ، عبیر، گلال اُڑایا ہے اور بارہ بجے رات

تک چوتال اور پھاگ گانے کے بعد سو رہے ہیں۔ کسی نے ایک نشہ کا رنگ جمایا ہے تو کسی نے دو کا اور کسی نے تین کا۔ خلق سنگھ کی صورت تو آج دیکھنے کے قابل تھی، جیسے کوئی سالم مچھلی مسالے میں سوندھ دی گئی ہو۔ عورتوں کو آج انھوں نے ایسے ایسے بروے سنائے کہ بیچاری مارے شرم کے پانی پانی ہو ہو گئیں۔ خلق کو بروے جوڑنا بھی آتا ہے اور وہ ہر عورت کے نام سے الگ الگ بروے بھی بنائے ہیں۔

رات کے تین بجے ہوں گے، سارے گاؤں میں سناٹا چھایا ہوا ہے، مرد نشے سے چُور سو رہے ہیں، عورتیں جن کا سارا دن پکوان بنانے اور مہمانوں کو کھلانے میں گذرا تھا اب اطمینان سے کھانا کھا کر لیٹی تھیں، کہ یکایک خلق سنگھ کے دروازے پر کئی آدمیوں کے جمع ہونے کا شور سُنائی دیا، اور کواڑ کھٹکھٹائے جانے لگے۔

خلق سنگھ کی بیوی نے اُن کو جھنجھوڑ کر جگاتے ہوئے کہا "کوئی کواڑ کھٹکھٹا رہا ہے۔"

خلق سنگھ نے مشکل سے آنکھ کھول کر کہا "جا کر دیکھو کون ہے، مجھ سے تو نہیں اُٹھا جاتا۔"

"اتنی رات کو میں جاؤں گی کواڑ کھولنے، کون ہو کون نہو، مجھ سے کہتے شرم نہیں آتی!"

"تم بڑی بے رحم ہو للتا، کہتا ہوں کہ مجھ سے اُٹھا نہیں جاتا، اُٹھا بھی تو گر پڑوں گا، میری رانی، ذرا کھول کر دیکھ لو۔"

"مجھے ڈر معلوم ہوتا ہے، اتنے زور سے دروازہ پیٹ رہے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے توڑ ہی ڈالیں گے۔"

"واہ رے ڈر! میں تو جاگ ہی رہا ہوں، اتنی رات گئے کون سالا آیا ہے، اپنی خیر چاہتی ہو تو جا کر دیکھ آؤ، میں اُٹھوں گا تو دو ایک کی خبر لئے بنا نہ رہوں گا۔"

للتا نے کانوں پر ہاتھ دھر کر کہا "نا دیّا۔ نا میں نہ جاؤں گی، مجھے تو معلوم ہوتا ہے کئی آدمی ہیں سب باتیں کر رہے ہیں۔"

"اچھا تو پھر میں ہی جاتا ہوں، پھر نہ کہنا کہ مار پیٹ کیوں کی"

اپنا موٹا ڈنڈا اُٹھا کر ٹھا کر صاحب لڑکھڑاتے گرتے پڑتے دروازے پر آئے اور بولے "کون سالا کواڑ بھڑ بھڑا رہا ہے؟"

باہر سے آواز آئی "سالے نہیں تمھارے بہنوئی ہیں، کواڑ تو کھولو۔"

خلق سنگھ نے کواڑ کھولے تو معلوم ہوا کہ کوئی بیس آدمی منھ پر نقاب ڈالے ڈنڈا لئے کھڑے ہیں۔ کاٹو تو لہو نہیں، سارا نشہ ہرن ہو گیا۔ سمجھ گئے ڈاکو ہیں، اب جان کی خیر نہیں۔

ڈاکوؤں کے سرغنہ نے حکم دیا "اسے پکڑ کر مشکیں باندھ دو، اور تم سے کہتے ہیں خلق سنگھ اگر منھ سے ایک لفظ بھی نکلا تو زبان کاٹ لی جائے گی۔ آج اس گاؤں میں ہمارا پڑاؤ ہے، پتّن کا نام سُنا ہے! ہم

اُسی گروہ کے آدمی ہیں، آج ہولی ہے، ہماری بیبیاں یہاں سے ایک ہزار کوس پر ہیں، ہمارے سردار تین نے حکم دیا ہے کہ اس گاؤں سے پچیس سپاہیوں کے لیئے پچیس عورتیں پکڑ لاؤ۔ ساری دنیا ہولی منارہی ہے کیا ہماری ہولی یوں ہی جائے گی۔ تم اس گاؤں کے مکھیا ہو تم کو تین عورتیں دینی ہونگی، بولو منظور ہے؟"

خلق سنگھ کے گھر میں تین عورتیں تھیں، بیوی، بہن اور بیوہ بھاوج۔ ضرور کسی گاؤں کے آدمی نے بھید بتایا ہے، ورنہ اس کو ہمارے گھر کی عورتوں کی گنتی کس طرح معلوم ہوتی۔ اس بات سے ان کا خون کھول اُٹھا۔ کڑک کر بولے:۔

"میں اس گاؤں کا مکھیا نہیں ہوں"

سردار نے کہا "جھوٹ بولتا ہے، سالا۔ اس کے گھر سے چار عورتیں نکالو"

خلق سنگھ اپنے کو گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے بولے "میرے گھر میں چار عورتیں کہاں ہیں"

"پھر کتنی عورتیں ہیں؟"

"تم کو مطلب؟ پچاس ہیں؟"

"تو پچاسوں کو لے چلو، ہمارا ایک ایک سپاہی دو دو رکھے گا"

یہ کہتا ہوا وہ گھر میں گھسا، اُس کے ساتھی بھی خلق سنگھ کو پکڑے ہوئے اندر گھس گئے۔

سردار نے کہا "اس گھر میں جتنی عورتیں ہوں سب اچھے اچھے کپڑے پہن کر اسی دم نکل آئیں، اور ہمارے ساتھ چلیں، نہیں تو ہم زبردستی نکال لے جائیں گے۔ ہمارے ساتھ چلنے میں کوئی تکلیف نہ ہوگی بس گھنٹے دو گھنٹے میں ہمارا دل بہلا کر چلی آئیں، ڈرنے کی کوئی بات نہیں، ہم مردوں کے دشمن ہیں مگر عورتوں سے محبت کرتے ہیں"

تینوں عورتیں گہنے کپڑے سے لیس تھیں، آکر سر جھکائے آنگن میں کھڑی ہو گئیں۔

خلق سنگھ آپے سے باہر ہو کر بولے "تم سب کیوں نکل آئیں۔ اندر جا کر کواڑ بند کر لو اور کھڑکی کھول کر باہر سے گاؤں والوں کو پکارو"

ڈاکو سردار بولا "خبردار! اگر کوئی ایک قدم بھی ہلا ورنہ خلق سنگھ کی خیریت نہیں، اگر کسی نے شور مچایا تو اپنی عزت کھوئے گی، ہم بیس جوان ہیں، ہتھیار بند، گاؤں والے ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ جب تک ہمیں کوئی مجبور نہ کرے ہم کسی کے ساتھ بُرائی نہیں کرنا چاہیئے۔

خلق سنگھ نے دانت پیستے ہوئے کہا "بھلے آدمیوں کی عزت آبرو بگاڑنا چاہتے ہو اور کہتے ہو کہ ہم

کسی کے ساتھ بُرائی نہیں کرنا چاہتے ؟

"اگر عورتوں کے ساتھ دل بہلانے اور ہنسی مذاق کرنے سے تمھاری عزت بگڑتی ہے تو تم روز ہی اپنی عزت بگاڑتے ہو ؟"

"میں دوسروں کی عورتوں سے نہیں بولتا"

"عورتیں تو دوسروں ہی کے گھروں سے آتی ہیں ؟"

"ہم بیاہ کر لاتے ہیں"

"ہم بھی دو گھنٹے کے لئے بیاہ کر لیں گے"

"یہ بدفعلی ہے، بُرا کام ہے"

"تم کرو تو بدفعلی اور بُرا کام نہیں، ہم کریں تو بُرا کام"

یہ کہہ کر ڈاکو سردار نے تینوں عورتوں کو ساتھ چلنے کا حکم دیا، اور تینوں چُپ چاپ تیار ہوگئیں

خلق سنگھ دانت پیس کر بولے "اری منہ میں کالک لگانے والیو! چھاتی میں چُھری گھونپ کر مر کیوں نہیں جاتیں، دوڑ کر کنوئیں میں کیوں نہیں کود پڑتیں، تمھاری ماؤں نے کیسی بہادری سے اپنی لاج بچائی تھی، کیا تم اتنی بے شرم ہوگئی ہو کہ ان پاپیوں کے ساتھ چلنے کو تیار ہوگئیں، بے حیاؤ"

لَلِتا نے سہمے ہوئے کہا "یہ تم کو پکڑلے جائیں گے"۔

خلق سنگھ نے جوش میں آکر کہا "مجھے پکڑلے جائیں، کچھ غم نہیں۔ مجھے مار ڈالیں کچھ غم نہیں، تمھاری عزت میری جان سے کہیں پیاری ہے"

ڈاکو سردار نے تین جوانوں کو اشارہ کیا، تینوں لپک کر عورتوں کے پاس پہونچ گئے اور اُن کو پکڑ کر سینہ سے لگانے اور طرح طرح سے محبت جتانے لگے۔ خلق سنگھ سُرخ لوہے کی طرح پگھل کر پانی ہوگئے ٹھکرائی خاک میں مل گئی، گڑگڑانے لگے۔ ہاتھ جوڑ کر بولے "سردار صاحب! ہماری عزت نہ بگاڑیئے، ایشور چاہیں گے تو اس دھرم کا آپ کو بہت بڑا اجس ملے گا۔ میرے گھر میں جو کچھ ہے وہ لے لیں، ایک ایک تنکا اُٹھالیں لیکن عورتوں کو چھوڑ دیں۔ مرجاؤں گا سردار! کہیں مُنہ دکھانے کے لایق نہ رہوں گا"۔

سردار ہنسا — "تم چاہتے ہو کہ دَیا اور دَھرم کے پیچھے ہم اپنی ہولی چھوڑ دیں، ہم بہت کریں تو اتنا کر سکتے ہیں کہ دو عورتوں کو چھوڑ دیں مگر ایک کو تو لے ہی جائیں گے، ایک کو تو برہما کے کہنے سے بھی نہ چھوڑیں گے، بولو جلدی ؟

اِس سے تو اچھا ہے گولی مار دیجئے سردار!"

"چُپ رہو، ہماری بات کا جواب دو"

"سردار! ...."

"چپ رہو، ہماری بات کا جواب دو۔"

خلق سنگھ نے بیوہ بھابی کی طرف دیکھا، "بھابی گھنٹے بھر کے لئے تم اِن کے ساتھ چلی جاؤ، اپنی بہنوں کی لاج بچاؤ۔ ایک کے پیچھے دو کی جان بچتی ہے۔ ان کے ساتھ کوئی تکلیف نہ ہوگی۔"

بھابی نے اینٹھ کر کہا "تو اپنی بہن کو کیوں نہیں بھیج دیتے، مجھے آرام نہیں چاہیئے۔ بڑے آئے کہیں کے، جیسے میں ہی مفت کی ہوں۔"

خلق سنگھ نے خوشامدانہ لہجہ میں کہا "یہ اپنا دھرم ہے بھابی، اس کا خیال تو کرو، چمپا (بہن) کا ابھی بیاہ ہونا ہے۔"

بھابی ذرا بھی نہ پسیجیں "اِنھیں میں سے کسی کے ساتھ بیاہ کر دینا، کیا ہرج ہے!"

سردار بولا "ہم کسی سے بیاہ نہیں کرتے۔ بس گھنٹے دو گھنٹے رکھ کر بہت سا روپیہ دیکر چلے جاتے ہیں"

خلق سنگھ نے چمپا کی طرف دیکھا "چمپا! کہتے ہوئے شرم آتی ہے، لیکن اس مصیبت کو کسی طرح ٹالنا ہی ہے۔"

چمپا تن کر بولی "کیا کہتے ہو دادا، تمھیں لاج نہیں آتی؟"

"لاج تو ایسی آتی ہے کہ دھرتی پھٹ جائے اور میں اُس میں سما جاؤں۔ لیکن یہ بپتا کیسے ٹلے گی؟"

"للتا بھی تو کھڑی ہیں، اُن سے کیوں نہیں کہتے؟"

خلق سنگھ نے للتا کی طرف نہ تو دیکھا اور نہ اُس سے کچھ کہا۔ سردار سے بولے۔ "حضور نے دیکھ لیا میں کہہ سُن کر ہار گیا، اب میرا کوئی اختیار نہیں، آپ جو چاہیں کریں۔"

"تو نے اپنی بیوی سے کیوں نہیں کہا؟"

"اگر حضور کے گھر میں بیوی ہے تو مجھ سے یہ سوال نہ کریں۔"

سردار نے دیویوں کی طرف دیکھکر کہا "اچھا دیویو! میں نے تمھیں چھوڑ دیا۔ میں تمھیں زبردستی نہ لیجاؤنگا مجھے تم پر رحم آتا ہے۔ شرط یہی ہے کہ تم ایک لہنگا اور چُنری لاکر خلق سنگھ کو پہنا دو اور یہ خوب سج کر پیشں ناچیں، ہم سب ان کا ناچ ہی دیکھکر اپنی ہولی منالیں گے۔"

تینوں عورتیں خوش خوش لہنگا اور چُنری لے آئیں اور خلق سنگھ کو پہنا دیا۔ سب جوان ہنستے اور

تالیاں بجاتے تھے اور خلق سنگھ چیخیں مار مار کر روتے تھے۔

سردار نے کہا "چوڑیاں بھی لاؤ"

لیکن ٹھاکر خلق سنگھ کے ہاتھ کی چوڑیاں وہاں نہ نکلیں۔

سردار :- "اچھا سیندور لا کر اس کی مانگ میں ڈال دو"

للتا نے سیندور لا کر شوہر کی مانگ بھر دی، ٹھاکر خلق سنگھ رو دیئے:

سردار :- "کیوں روتے ہو دوست، ایک دن تم نے بھی تو اِس عورت کی مانگ میں سیندور ڈالا تھا وہ اس طرح نہ روئی تھی بلکہ خوش ہوئی تھی"

خلق سنگھ روتے ہوئے بولے "اس سے تو کہیں اچھا تھا کہ تم مجھے گولی مار دیتے"

سردار نے ڈانٹ کر کہا "اچھا، اب تمھارا ناچ ہوگا، خلق سنگھ!"

"مہاراج! کرپا کیجئے"

"ہم کچھ نہیں سُننا چاہتے، تمھیں ناچنا ہوگا"

آنگن میں لالٹین جل رہی تھی، خلق سنگھ ناچنے لگے، اب تک اُنھوں نے دوسروں کو بنایا تھا آج وہ خود ہی بنائے جا رہے تھے۔ پہلے تو وہ کچھ دیر تک جھجکتے رہے پھر کھُل کر ناچنے لگے۔ سردار کے کہنے سے اُنھوں نے بزت کیا، اُچھلے، کودے، آنکھیں مٹکائیں۔ خلق سنگھ نے بغیر جھجکے ہوئے سب کچھ کیا۔ شاید وہ دکھانا چاہتے تھے کہ ہم مرد ہیں، اگر ناچنے پر اُتر آئیں تو اچھی طرح ناچ بھی سکتے ہیں۔

ابھی خلق سنگھ ناچ ہی رہے تھے کہ ڈاکوؤں نے یکایک اپنی پگڑیاں اور نقابیں اُتار کر پھینک دیں، ٹھاکر خلق سنگھ بھوچکا رہ گئے۔ یہ سب اُسی گاؤں کی عورتیں تھیں، اُنھوں نے پہچانا، شکنتلا، سُبھد آشا اور نہ جانے کون کون

شکنتلا نے تالی بجا کر کہا "ہاں ہاں، رُک کیوں رہے ہو، ناچتے جاؤ چاروں طرف گھوم گھوم کر دیکھ لی تمھاری ٹھکرائی، کہو کیسی رہی؟"

خلق سنگھ کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ وہ لپک کر اپنی کوٹھری میں گھُس گئے، اور اندر کواڑ بند کر لیئے۔

سالِ نَو

(از مولانا محمد یعقوب خاں، کلام۔ بی۔ اے)

سالِ نو، اے سالِ نو! آنے کو تو آیا ہے تُو   سچ بتا کیا کیا تحائف خوشنما لایا ہے تو
ننھی بوندیاں خوشبو سے مہکیں خوشگوار
بالیاں پکتی ہوئیں، اور لہلہاتے کِشت زار
مُسکراتے پھول اور نغماتِ مرغانِ بہار!
ساتھ لے کر کیا نئی سرگرمیاں آیا ہے تو   سچ بتا کیا کیا تحائف خوشنما لایا ہے تو
چلچلاتی دھوپ میں وہ سایۂ ابرِ بہار
وہ جوہی اور موتیا کی بوئے خوش اور فرح بار
وہ پپیہا اور کوئل کی صدا گویا مَلار؟
نغمہ ہائے موجِ دریا کو بھی سُن آیا ہے تو   سچ بتا کیا کیا تحائف خوشنما لایا ہے تو
چاندنی راتیں، منوّر دن، سنہری صبح و شام
جگمگاتے وہ ستارے، اور وہ ماہِ تمام
یعنی پُر اسرار مشرق کے مناظر سحر کام؟
جلوہ صلح و امن کا آنکھوں سے دیکھ آیا ہے تو   سچ بتا کیا کیا تحائف خوشنما لایا ہے تو
جب لڑائی بند ہو کر صلح کے دن آئیں گے
ظالموں کی ہار سے ظلم و ستم مِٹ جائیں گے
امن کے ڈنکے بجیں گے سب ترانے گائینگے
گیت آزادی کا ہندوستاں کی سُن آیا ہے تو؟   سچ بتا کیا کیا تحائف خوشنما لایا ہے تو

---

[1] اول ہفتہ جنوری سنہ ۱۹۳۲ء کے بمبئی کرانیکل میں سالِ نو کے متعلق ایک دلکش انگریزی نظم شائع ہوئی ہے۔ یہ دلآویز اشعار اسی نظم کو پڑھکر ایڈیٹر "زمانہ" کی فرمایش پر لکھے گئے ہیں۔ (امنہ)

تنقید کتب

آیات و نغمات

یہ کتاب شاعر اعظم حضرت جوش ملیح آبادی کی دلکش نظموں اور دلپذیر رباعیوں کا ایک جدید مجموعہ ہے جو مکتبۂ اُردو لاہور نے خاص اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ حضرت جوش کی شاعری تعریف و توصیف سے مستغنی ہے۔ ان کی ہر نظم جوش و خروش سے معمور اور ہر رباعی حکمت و فلسفہ سے بھرپور ہوتی ہے۔ ہر نظم موتیوں کی لڑی اور ہر رُباعی پھلجھڑی ہوتی ہے۔ جوش کی پختہ مشقی کا یہ عالم ہے کہ ہر لفظ اپنی جگہ پر اٹل اور ہر مصرعہ بے بدل ہوتا ہے۔ کوئی نظم ایسی نہیں جس میں خود حضرت جوش کی روح جاری و ساری نہ ہو۔ دراصل جوش کے آیات مُردہ روحوں کے لئے "قم باذنی" کا حکم رکھتے ہیں۔ اور اُن کے نغمات افسردہ دلوں کو تازگی بخشتے ہیں۔ اخلاقیات پر اُتر آتے ہیں تو حکیمانہ تعلیم دیتے ہیں، مثلاً:-

اے دوست دل میں گردِ کدورت نہ چاہیئے
اچھے تو کیا، بُروں سے بھی نفرت نہ چاہیئے
کہتا ہے کون، پھُول سے رغبت نہ چاہیئے
کانٹے سے بھی مگر تجھے وحشت نہ چاہیئے

کانٹے کی رگ میں بھی ہے لہو سبزہ زار کا
پالا ہوا ہے وہ بھی نسیمِ بہار کا

کیا زورِ بیان اور کیسی پیاری زبان ہے۔ اسی مضمون کا ایک شعر حضرت جگر مرادآبادی کا بھی ہے:-

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں

دنیا کو اکثر حضرات زندان اور جہنم سے تشبیہ دیتے ہیں، مگر اس بادۂ کہنہ کو حضرت جوش نے مینائے جدید میں کس خوبصورتی سے ڈھالا ہے:-

خاک پر نوحۂ پیہم کی لگی ہیں مُہریں
زیست پر دیدۂ پُرنم کی لگی ہیں مُہریں
دفترِ عیش پہ بھی غم کی لگی ہیں مُہریں
ذرّہ ذرّہ پہ جہنم کی لگی ہیں مُہریں

پھر بھی دنیا پہ ہے جنت کا گماں کیا کہنا

مشہور انگریز شاعر ولیم کاوپر کی نسبت یہ کہا گیا ہے کہ وہ فنِ شعر میں اتنا مشاق اور پُرگو تھا کہ جھاڑو کی سینخ جیسی حقیر چیز پر بھی نظم کہہ دیتا تھا۔ یہی حال حضرت نظیر اکبرآبادی کا بھی تھا، جوش بھی کسی سے کم نہیں ہیں

کہیں خالی بوتل پڑی مل گئی تو اُن کا دل بھر آیا اور کہنے لگے۔

ٹیس سی اک ہو رہی ہے قلبِ حق آگاہ میں　　کیا بتاؤں ہمنشیں کیا شے پڑی ہے خاک میں
کیوں نہ چھا جائے دھواں سا مطلعِ ادراک پر　　بادۂ رنگیں کی بوتل، اور ٹھنڈی خاک پر
آہ اے خاموش دیوی، شب کو تیرے سامنے　　کتنے رنگیں راگ ہونگے، کتنے شیریں قہقہے
حیف اے قصرِ بلوریں، تجھ پہ اور گرد و غبار　　جس میں کل تک معتکف تھی دخترِ ابرِ بہار
شب کہ محفل میں تری شورِ رباب و چنگ تھا　　راستی تھی، راگنی تھی، روشنی تھی، رنگ تھا

یہ نظم طویل ہے صرف پانچ شعر مربوط کر کے پیش کر دیئے گئے ہیں۔ ورنہ بوتل کے لئے جو جو نادر تشبیہات حضرت جوش نے لکھی ہیں ان کا لطف کتاب کے مطالعہ سے حاصل ہو سکے گا۔ کیونکہ کلامِ جوش کا مجموعہ جواہرات کا ایک بیش بہا خزانہ ہے، ہر نظم لطیف و دلچسپ ہے۔ سب نظمیں جلی قلم سے بہت خوشخط لکھی گئی ہیں، چھپائی صاف و نفیس، کاغذ دبیز، ضخامت تقریباً ساڑھے تین سو صفحات، قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ، ملنے کا پتہ:- مکتبۂ اردو لاہور

خطوط محمد علی[1]

مشہور اصحاب خصوصاً لیڈروں اور ادیبوں کے خطوط میں بعض تعلیمی خصوصیات ہوتی ہیں، اور ان سے لکھنے والے کی زندگی کے حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ان کے زمانہ کی سیاسی تحریکوں کا بھی بہت کچھ حال معلوم ہو جاتا ہے۔ مولانا محمد علی مرحوم ادیب بھی تھے اور سیاسی لیڈر بھی، ان کے مضامین کا مجموعہ تو پہلے ہی شائع ہو چکا ہے ان کے خطوط باقی تھے جن کا فراہم کرنا مشکل تھا۔ مگر اب پروفیسر محمد سرور صاحب بی۔ اے کی کوشش سے یہ مشکل حل ہو گئی۔ اور جامعہ ملیہ کی بدولت یہ خطوط شائع ہو گئے ہیں۔ اس مجموعہ کے بعض خطوط اس سے پہلے بھی چھپ چکے تھے۔ لیکن بعض غیر مطبوعہ ہیں۔ مہاتما گاندھی کے نام جو خط ہے اُس کے مطالعہ سے تحریک ترک موالات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ نواب محسن الملک کے نام خطوط میں نوک جھونک بھی ہے۔ نواب صاحب جاورہ کے نام کا خط جیل خانہ سے لکھا گیا تھا غرض یہ خطوط دلچسپ اور قابل دید ہیں۔ لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ، ضخامت ۲۴۰ صفحات۔

کیا خوب آدمی تھا[2]

یہ اُن گیارہ تقریروں کا چھوٹا سا مجموعہ ہے جو آل انڈیا ریڈیو دہلی سے ہندوستانی ادب و سیاسیات کے گیارہ درخشاں ستاروں کے بارے میں نشر کی گئی تھیں۔ ان کے نام نامی ہی موضوع کے اہم اور دلچسپ ہونے کے ضامن ہیں۔ ان تقریروں میں مولانا راشد الخیری، مولانا حالی، مولانا نذیر احمد، مولانا محمد علی، علامہ اقبال، سر راس مسعود، حکیم اجمل خاں

[1] قیمت دو روپیہ، ملنے کا پتہ:- مکتبۂ جامعہ ملیہ دہلی۔
[2] مطبوعہ حالی پبلشنگ ہاؤس۔ کتاب گھر دہلی، قیمت ۱۲؍

ڈاکٹر ملا انصاری، حضرت داغ، حضرت چکبست اور منشی پریم چند کے سے اساطین ادب و سیاست کے وہ نجی حالات و واقعات بیان کئے گئے ہیں جو مُلّا واحدی، خواجہ عبدالمجید، خواجہ غلام السیّدین، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی مولانا عبدالماجد دریا آبادی اور حضرت بیخود دہلوی ایسے اُردو کے مشہور و معروف ادیبوں نے بچشم خود ملاحظہ فرمائے ہیں۔ اس لئے یہ تقریریں حقیقی طور پر "سِرّ دلبراں" بزبانِ دیگراں نہیں، بلکہ بزبانِ یاراں ہیں!

ہم حالی پبلشنگ ہاؤس کو ان تقریروں کو کتابی صورت دینے پر مبارکباد دیتے ہیں۔ یہ کتاب اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی لائبریریوں میں رکھنے کے قابل ہے۔ کتابت و طباعت اور جلد بندی سب اچھی ہے۔

جزیرۂ سخنوراں[1]

یہ ایک دلچسپ مزاحیہ افسانہ ہے جس میں فاضل مصنف مسٹر غلام عباس سب ایڈیٹر "آواز دہلی" نے نہایت شگفتہ اور دلکش پیرایہ میں اُردو کے "شعرائے کرام" کا مضحکہ اُڑایا ہے۔ فاضل مصنف نے افسانہ کا بنیادی خیال مشہور فرانسیسی ادیب موسیو آندرے موروا کی ایک طنزیہ تصنیف سے لے کر اپنے پلاٹ کا میدان بحر ہند کے ایک فرضی جزیرہ میں قائم کیا ہے، جہاں کی آبادی کے صرف دو طبقے تھے، ایک شعراء اور دوسرا مداح۔ حضرات شعرا کو ہر قسم کا عیش و آرام حاصل تھا باقی محنت مزدوری کرنے والے لوگ اپنی کمائی سے شاعروں کے کفیل ہوتے تھے۔ جزیرہ کا انتظام جمہوری تھا۔ فسانہ کی جان ایک مشاعرہ ہے جس کا لطف اسی وقت اُٹھایا جا سکتا ہے جب یہ کتاب پڑھی جائے۔ ریلوے میں یہ کتاب بہت عمدہ رفیق سفر ثابت ہوگی۔ لکھائی، چھپائی صاف کاغذ عمدہ۔

یارانِ میکدہ[2]

یہ کتاب مولوی عبدالشکور ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی (علیگ) بریلی کالج کے بارہ[3] مزاحیہ مضامین کا دلچسپ مجموعہ ہے اس کا طرز بیان اس قسم کا ہے جسے انگریزی میں "کیریکچر" Caricature یعنی "خاکہ اُڑانا" کہتے ہیں۔ ان مضامین میں فاضل مصنف نے نہ اپنے دوست مولوی کو چھوڑا ہے اور نہ حافظ جی کو، اور پنڈت جی کی بھی خبر لی ہے۔ آخری مضمون "سکینہ" ایک دلچسپ ڈرامہ ہے۔ لکھائی چھپائی، کاغذ رسمی، ضخامت چھوٹی تقطیع کے ڈیڑھ سو صفحات

نئی تعلیم کا آئینہ[4]

یہ سبق آموز کتاب منشی رام پرشاد ماتھر بی۔ اے ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر کی تصنیف ہے جس میں فاضل مصنف نے تعلیم کے

---

[1] قیمت ایک روپیہ، ملنے کا پتہ:۔ کتاب خانہ ہزار داستان ۲۴ بازار نئی دہلی،
[2] ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی۔ [3] قیمت ڈیڑھ روپیہ، ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ جامعہ ملیہ دہلی،
[4] قیمت ڈھائی روپیہ:۔ ملنے کا پتہ:۔ منشی رام پرشاد بی۔ اے ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر ۱۶ سر دھنی دیبی لین۔ مقبول گنج کٹرہ۔ لکھنؤ۔

قدیم و جدید طریقوں کا مقابلہ کرکے دونوں کے حسن و قبح ظاہر کردیئے ہیں، اور دیہات اور دور افتادہ اسکولوں کی خامیاں اور کمزوریاں بھی دلچسپ طریقہ سے بیان کرکے اُن کو رفع کرنے کی ترکیبیں بتائی ہیں۔ تعلیم دینے کے جدید طریقے سکھائے ہیں یہ تمام باتیں اس قدر سلیس اور عام فہم زبان میں بتائی گئی ہیں کہ کتاب میں ایک دلچسپ ناول کا لطف پیدا ہوگیا ہے آخر میں طلبا کی ذہانت کا امتحان لینے کے لئے جو سوالات درج کئے گئے ہیں وہ بھی بہت مفید اور پرلطف ہیں۔ بہرحال اس کتاب میں تعلیمی زندگی کا ہر شعبہ دکھا کر طلبا اور اساتذہ کی موجودہ زندگی کا نمونہ پیش کردیا گیا ہے۔ اس کی لکھائی چھپائی اور کاغذ بھی عمدہ ہے، ضخامت ۲۲×۱۸ سائز کے تقریباً پانسو صفحات۔

ایک معلم کی زندگی[1]

یہ کتاب جو دو حصوں میں شائع ہوئی ہے جامعہ ملیہ دہلی کے مدرس مولوی عبد الغفار صاحب مدھولوی کی آپ بیتی ہے جسے پڑھنے سے یہ حقیقت بھی روشن ہوجاتی ہے کہ جو لوگ اپنی مدد آپ کرتے ہیں اُن کی خدا بھی مدد کرتا ہے۔ کتاب کے پہلے باب میں مولوی صاحب نے اپنی سوانح عمری اُس وقت تک بیان کی ہے جب آپ ۱۹۲۳ء میں جامعۂ ملیہ میں پہونچے۔ اس کے بعد جو کچھ لکھا ہے وہ دراصل خود جامعۂ ملیہ کی اکیس سال کی تاریخ ہے کتاب دلچسپ اور اس کا اسلوب بیان بھی عمدہ ہے۔ جامعۂ ملیہ کے بہت سے فوٹو بھی ہیں جن سے کتاب کی دلچسپی میں بہت اضافہ ہوگیا ہے۔ لکھائی چھپائی، کاغذ، جلد عمدہ، ہر حصہ کی ضخامت تقریباً پونے پانچ سو صفحات۔

ممالک اسلامیہ کی سیاست[2]

اس پر از معلومات اور دلچسپ کتاب میں مسٹر عشرت حسین صدیقی بی۔ اے نے اسلامی ملکوں مصر، ترکی، عرب، شام، فلسطین، کویت، بحرین، عدن، عراق، ایران، افغانستان، طرابلس، تیونس، الجزائر، مراکش وغیرہ کے جدید حالات، وہاں کی قومی تحریکات اور عام رجحانات پر بحث کرنے کے بعد "اسلامی ممالک اور یورپ کی حکومتیں" اور "اسلامی ممالک اور موجودہ جنگ" پر روشنی ڈالی ہے۔ چونکہ موجودہ جنگ یورپ، مصر، لیبیا، عراق، شام، و ایران تک پھیل چکی ہے، اور ابھی اس کے شعلے نہ معلوم کہاں کہاں تک پہونچیں، اس لئے حالات جنگ سمجھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت مفید ہوگا۔ کتاب محنت سے لکھی گئی ہے اور کتب خانوں و لائبریریوں میں رکھے جانے کے قابل ہے۔ لکھائی چھپائی، کاغذ سب عمدہ، ضخامت ڈھائی سو صفحات سے زائد۔

بحر الکاہل کی سیاست[3]

مشرق میں جاپان کے جنگ چھیڑ دینے سے بحر الکاہل، اُس کے جزیروں اور اُن ملکوں کا جو اس کے ساحل پر

[1] قیمت ہر دو حصہ پانچ روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ جامعہ ملیہ دہلی۔
[2] قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ جامعہ ملیہ دہلی
[3] قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ جامعہ ملیہ دہلی

واقع ہیں کا حال معلوم کرنا نہایت ضروری ہوگیا ہے۔ اس لئے ہم خوش ہیں کہ امین خالدی صاحب نے یہ کتاب لکھکر وقت کی اس اہم ضرورت کو بڑی خوش اسلوبی سے پورا کردیا ہے۔ اس میں بحرالکاہل کا جغرافیہ بیان کرکے اس کی اہمیت اور اس کا بحراوقیانوس یعنی اٹلانٹک سے مقابلہ کیا گیا ہے۔ اور چین۔ جاپان۔ برطانیہ۔ امریکہ اور جزائر شرق الہند کی ڈچ گورنمنٹ کی پالیسی اور جاپان، برطانیہ، و امریکہ کے تعلقات اور مفادات وغیرہ سے مفصل بحث کی گئی ہے بحرالکاہل کے ملکوں میں نسلی امتیازات، اُس کے ہوائی راستے اور جنگی امکانات پر بھی بخوبی روشنی ڈالی گئی ہے۔ جن سے مشرق کی جنگ کے واقعات سمجھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت مفید ہوگا۔ زبان صاف اور عام فہم ہے البتہ کہیں کہیں ایک ہی بات کی بار بار تکرار ہوگئی ہے۔ تاہم کتاب وسیع مطالعہ کے بعد بڑی محنت سے لکھی گئی ہے آخر میں سولہ نقشے بھی دئیے گئے ہیں جن سے یہ کتاب اور بھی قابل قدر ہوگئی ہے۔

دوسری جنگ عظیم سے پیشتر کی دُنیا (ہندی) یعنی دوتیہ مہایُدھ سے پہلے کے یوروپ کا سنسار (حصۂ اول)

یہ دیکھکر خوشی ہوتی ہے کہ ہمارے ملک کے تجارت پیشہ اصحاب بھی اب تحقیق و تفتیش سیر و سفر اور مطالعہ و مشاہدہ کی ضرورت سے کماحقہ واقف ہو رہے ہیں اور واقف ہی نہیں وہ موجودہ دنیا کی تحریکوں اور اُس کے ترقی یافتہ طریقوں سے پورا فائدہ اُٹھانے پر تُل گئے ہیں پچھلے چند سال کے اندر ہمارے صوبہ متحدہ کے جو خاص خاص تجار یوروپ وغیرہ کا مفصل سفر کرکے کاروبار کے نئے طور و طریق سیکھ آئے ہیں اُن میں کانپور کے مشہور کارخانہ دار لالہ رام رتن گپتا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آپ نے سب سے پہلے ۱۹۳۳ء میں یورپ کا سفر کیا اور مسلسل سال بھر تک یورپ کے مختلف ملکوں کی کاروباری حالت کا عمیق مشاہدہ کیا۔ دوسری مرتبہ آپ ۱۹۳۶ء میں پھر یورپ گئے اور گو اس دفعہ خانگی حالات سے مجبور ہوکر اُن کو جلدی واپس آنا پڑا لیکن اس مختصر سفر میں بھی آپ برابر اپنے تجربات میں اضافہ کرنیکی کوشش کرتے رہے۔ پہلے سفر میں تو انھوں نے باقاعدہ روزنامچہ لکھا تھا جسے وہ کتابی صورت میں شائع کرنا چاہتے تھے۔ لیکن دوسرے سفر کے بعد اُنھوں نے یہ ارادہ تبدیل کردیا اور اپنے تجربات و تاثرات کو مجموعی حیثیت سے قلمبند کرکے عنوان بالا سے ایک مستقل کتاب تیار کرلی۔ اسمیں مختلف ملکوں کی تاریخی۔ تمدنی اور تجارتی حالات پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے اور ناظرین کی دلچسپی کے لئے بہت سی تصویریں بھی دیدی ہیں۔ لائق مصنف نے محض سطحی حالتیں بتانے پر اکتفا نہیں کی بلکہ ہر جگہ ہر بات کی تہ پر پہونچنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً انگریزوں کے متعلق آپ کا خیال ہے کہ جمہوریت کے زبانی دعووں کے باوجود درحقیقت قدامت پرست اور سرمایہ دارانہ ذہنیت رکھتے ہیں جسکا اثر اُنکی روزمرہ باتوں میں بہت نمایاں رہتا ہے۔ گپتا جی خود بھی سرمایہ دار ہیں اس لئے وہ روسی نظام کے زبردست مدّاح نہیں ہوسکتے تاہم آپ نے سرزمین روس اور اُسکے نظام اور کارخانوں کے حالات نہایت تفصیل و تحقیق اور بے لوثی سے بیان کئے ہیں مسٹر گپتا نے روس کے مزدوروں کی حالت بہت اچھی اور طمینان بخش پائی اور کارخانوں کو غیر معمولی ترقی کی حالت میں دیکھا۔ گپتا جی کا خیال ہے کہ سرمایہ دارانہ اصولوں کے مطابق بھی اسی قسم کے حالات پیدا کئے جاسکتے ہیں۔ مگر امر واقعہ یہ ہے کہ اس سے پہلے کبھی سرمایہ دار نظام حکومت میں عوام کو وہ سہولتیں حاصل نہیں ہوئیں اور وہ ترقیاں کرنیکے موقعے نہیں ملے جو روس کے باشندوں کو میسر ہیں۔ مسٹر گپتا فرانس کی عیش پسندی کے شاکی ہیں، ظاہری بناؤ سنگھار سے قطع نظر آپ ڈنمارک کی عورتوں کو خوبصورت ترین سمجھتے ہیں۔ ان چھوٹی باتوں کے تذکرے سے ہمارا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ مسٹر گپتا نے اپنے سفر میں چھوٹی بڑی سبھی باتوں کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ اسی سے اُن کا یہ سفرنامہ بہت دلچسپ اور قابل دید ہے۔

قیمت ڈھائی روپیہ ۲/۸ ملنے کا پتہ:- لالہ رام گوپال گپتا۔ بہاری نواس۔ کانپور

رفتارِ زمانہ

نئے سال کی آمد کے ساتھ ہی جنگ بھی ہندوستان کے قریب آگئی ہے اور اس وقت لوگوں کی نگاہیں مشرق بعید پر لگی ہوئی ہیں۔ جاپان کی سرتوڑ کوشش ہے کہ قبل اس کے کہ امریکہ اور برطانیہ کی جنگی تیاریوں کی تکمیل ہو وہ ملایا، فلپائن اور جزائر ڈچ شرق الہند پر اپنا قبضہ جمالے تاکہ ان ممالک کے بحری و ہوائی اڈوں پر اس کا قبضہ ہوجائے اور اس طرح بحرالکاہل میں اسکی پوزیشن مستحکم ہوجائے اور وہ امریکہ اور برطانیہ کے آئندہ حملوں کا آسانی سے مقابلہ کرسکے اور اس کے علاوہ ان علاقوں کی کچی پیداوار بھی جاپان کے ہاتھ آجائے جس کی اُسے سخت ضرورت ہے۔ قدرت نے ملایا اور ہالینڈ کے جزائر شرق الہند کو ٹین، ربڑ اور پٹرول کی نعمت سے مالامال کیا ہے چنانچہ دنیا کا اسّی فیصدی ربر ملایا ہی میں پیدا ہوتا ہے، اسی طرح سے تمام دنیا کی ٹین کی بیشتر کانیں ملایا ہی میں ہیں۔ جزائر شرق الہند میں ان چیزوں کے علاوہ پٹرول کی بہت بڑی مقدار پائی جاتی ہے۔ چنانچہ جاپان ملایا میں برابر بڑھتا جارہا ہے اور ملایا کے بڑے بڑے شہر پنانگ، اپوہ اور کوالالمپور پر جاپان کا قبضہ ہوچکا ہے، اور اب جاپانی فوج پورے زور و شور کے ساتھ سنگاپور کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اس وقت تک وہ سنگاپور سے ستّر میل کے قریب پہونچ گئے ہیں اور اس مشہور و معروف بحری اڈے کو جس کو مضبوط و مستحکم بنانے میں برطانیہ نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے خشکی کی راہ سے تسخیر کرنا چاہتے ہیں۔ جاپانی حملے کی موجودہ رفتار کو دیکھتے ہوئے یہ اندیشہ پیدا ہوگیا ہے کہ چند ہی دنوں میں سنگاپور کو چھوڑکر تمام ملایا پر جاپان کا قبضہ ہوجائے گا ممکن ہے کہ طبروق کی طرح سنگاپور بھی مقابلہ کرتا رہے لیکن اگر خدانخواستہ سنگاپور بھی ہاتھ سے نکل گیا تو اس سے نہ صرف بحرالکاہل ہی میں برٹش اقتدار کو سخت دھکا لگے گا بلکہ بحر ہند کا راستہ بھی جاپان کے لئے کھل جائے گا۔

اس وقت، برما کے جنوبی حصے میں بھی جنگ شروع ہوگئی ہے۔ رنگون پر بھی کئی سخت ہوائی حملے ہوچکے ہیں، لوئر برما کے صوبہ تناسرم میں بھی جاپانیوں کو کچھ کامیابی حاصل ہوئی ہے اور تواٹے پر اُن کا قبضہ ہوگیا ہے۔ یہ بھی خبر آئی ہے کہ مولمین سے ساٹھ میل جنوب کی طرف مرواڑی کے قریب سیام (تھائی لینڈ) کی فوج بھی برما میں گھس آئی ہے اور اس وقت یہاں سخت لڑائی ہورہی ہے۔ فلپائن کا دارالسلطنت منیلا بھی جاپان کے ہاتھ آگیا ہے، امریکن فوج منیلا کے مغرب میں جاپانیوں کا مقابلہ کررہی ہے لیکن جاپانیوں کا دباؤ بڑھ رہا ہے

شمالی بورنیو اور سواراک میں بھی جاپان کے قدم جم گئے ہیں اور ڈچ جزیرہ تارکان پر بھی جہاں پٹرول بہت بڑی مقدار میں موجود ہے جاپانی قابض ہوگئے ہیں۔ نیوگینی سماترا اور دوسرے جزیروں پر اور مولمین اور رنگون پر بھی جاپانیوں کی سرگرمیاں جاری ہیں۔ جاپان کی اس مسلسل کامیابی کی وجہ مشرق بعید میں اتحادیوں کی ہوائی بحری اور فوجی طاقت کی کمزوری بتائی جاتی ہے جاپان کا فاصلہ ان مقامات سے کچھ کم نہیں ہے لیکن اس جنگ میں جاپانی ایسے طیارہ بردار جہاز استعمال کررہے ہیں جو ہوائی جہازوں کے لئے اڈوں کا بخوبی کام دیتے ہیں

مسٹر چرچل آخری ہفتہ دسمبر ۱۹۴۱ء میں واشنگٹن تشریف لے گئے تھے اور وسط جنوری ۱۹۴۲ء میں وہاں سے واپس آگئے ہیں

اُن کے دورانِ قیامِ امریکہ میں واشنگٹن میں اتحادیوں کی کئی کانفرنسیں ہوئیں جن میں تمام جنگی مسائل پر بہت کچھ غور و خوض ہوا ماہرانِ فن سے مشورے کئے گئے اور اتفاقِ رائے سے جنگ کا آئندہ پروگرام مرتب کر لیا گیا ہے مختلف میدانوں کے متعلق امریکہ اور برطانیہ کی مشترکہ کارروائیاں بھی طے ہو چکی ہیں۔ غرض کئی اہم فیصلے ہوئے ہیں جن کا اثر جلد ہی نظر آنا چاہیئے۔ دو باتیں ابتک ظہور میں آ چکی ہیں اول یہ کہ پریسیڈنٹ امریکہ اور مسٹر چرچل دونوں نے بحر الکاہل کے سارے رقبے کو ایک فوجی افسر کے زیرِ کمان رکھنا طے کر لیا چنانچہ جنرل ویول جنھیں ہندوستان کی سپہ سالاری کی اہم ذمہ داری سنبھالے ہوئے ابھی چھ ماہ سے زیادہ نہیں ہوا تھا متحدہ فوجوں کے کمانڈر انچیف مقرر کر دیئے گئے ہیں اور اُنھوں نے اپنے نئے عہدے کا چارج بھی لے لیا ہے۔ آپ اس وقت برطانیہ کے بہت بڑے فوجی سردار ہیں اور اس جنگ میں بھی سلطنت کی شاندار خدمات انجام دے چکے ہیں، آپ کو موجودہ لڑائی کا بہت کافی تجربہ حاصل ہے۔ اس لئے یقین ہے کہ آپ نے اس نئی ذمہ داری کو سوچ سمجھکر ہی قبول کیا ہے۔ ہم کو یہ بھی بھروسہ رکھنا چاہیئے کہ آپ نے برطانیہ اور امریکہ دونوں سے اس میدانِ جنگ کے لئے ہر قسم کی ضروری اور کافی کمک پہونچنے کا اطمینان کر لیا ہوگا۔

دوسرا اہم واقعہ جو مسٹر روز ویلٹ اور مسٹر چرچل کے باہمی مشوروں کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے برما کی حفاظت کیلئے مارشل چیانگ کائی شیک کی ماتحتی میں چینی فوج کا برما میں آنا ہے۔ مارشل ممدوح اور اُن کے چینی جوانمرد آج چھ سال سے جاپان کا قافیہ تنگ کئے ہوئے ہیں جاپانیوں کی تمام جنگی کارروائیاں چینی سپاہیوں کے حوصلوں کو پست نہ کر سکیں اور شاید وہ اُن کے حملوں کا جواب دینا بھی جان گئے ہیں۔ برما کے ساتھ چین کا مفاد بھی وابستہ ہے۔ کیونکہ اس وقت برما روڈ ہی کے ذریعہ کھوکھا کا جنگی ساز و سامان چین پہونچ رہا ہے۔ اس لئے اُمید کرنا چاہیئے کہ یہ عمدہ تدبیریں ہمارے لئے ضرور مفید ثابت ہونگی، چینی فوج کے حوصلے بڑھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ باوجود اس کے کہ ہانگ کانگ بھی اس وقت جاپان کے قبضے میں آ گیا ہے چینی فوج جاپانیوں کے حملوں کا منھ توڑ جواب دے رہی ہے اور چانگ شا کے قریب چینیوں کے ہاتھوں جاپانیوں کو شکست فاش کھانا پڑی۔ اس معرکے میں ہزارہا جاپانی سپاہی تہ تیغ ہوئے اور بہت سا جنگی سامان بھی چینیوں کے ہاتھ آیا۔ صوبہ ہونان میں چینیوں کو قابلِ قدر کامیابیاں حاصل ہو رہی ہیں۔

مسٹر چرچل کے دورۂ امریکہ کا ایک اور فائدہ یہ ہوا ہے کہ واشنگٹن میں جنگ کے متعلق چھبیس حکومتوں کا ایک اہم معاہدہ ہو گیا ہے جس کے رو سے یہ سب ملک اپنی پوری طاقت سے اس وقت تک جنگ جاری رکھیں گے جب تک کہ محوری طاقتوں کا کس بل نہ نکل جائے۔ اور جب صلح کا وقت آئے گا تو سب ساتھ مل کر صلح کریں گے کوئی حکومت جرمنی یا اُس کے ساتھیوں سے علحدہ صلح کی بات چیت نہ کرے گی۔ جرمنی نے بھی پچھلے ماہ برلن میں چھوٹی بڑی تیرہ طاقتوں کے نمایندوں کو جمع کر کے ان سے اسی قسم کا اقرارنامہ کیا تھا۔ مگر یہ معاہدہ اس اقرارنامہ سے کہیں زیادہ اہم اور وسیع ہے۔

امریکہ کے جنگ میں شامل ہونے کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا ہے کہ پریسیڈنٹ روز ویلٹ اور اُن کی پالیسی کے تمام مخالفین جن میں بعض ایسے مقتدر لوگ بھی شامل ہیں جو ابھی تک جرمنی کے حامی اور امریکہ کے لڑائی میں شرکت کے سراسر خلاف تھے جاپان و جرمنی کے اعلانِ جنگ کے بعد متفق و متحد ہو کر امریکہ کی جنگی طاقت بڑھانے اور جرمنی پر فتح پانے کے درپے ہو گئے ہیں۔

پریسیڈنٹ روز ویلٹ نے بھی دل کھول کر اپنے اتحادیوں کی مدد کا بیڑہ اُٹھایا ہے۔ چنانچہ اُن کی تحریک پر امریکن کانگریس نے جنگ کے لئے چھپن ارب ڈالر صرف کرنے کی منظوری دی ہے اس بیش قرار رقم سے امریکہ اور اتحادیوں کے لئے جو سامانِ جنگ

تیار ہوگا اس کی تفصیل یہ ہے

ہوائی جہاز	ساٹھ ہزار	جنگی فولادی گاڑیاں	پینتالیس ہزار
ہوا مار توپیں	بیس ہزار	تجارتی جہاز	اسی لاکھ ٹن وزنی

یہ تو ۱۹۴۲ء کا پروگرام ہے ۱۹۴۳ء میں سوا لاکھ ہوائی جہاز، پچھتر ہزار فولادی گاڑیاں - ۳۵ ہزار ہوا مار توپیں اور ایک کروڑ ٹن وزن کے تجارتی جہاز تیار ہونگے۔

امریکہ نے انگلستان کے بچاؤ کے لئے بھی پانچ لاکھ فوج بھیجنے کا تہیہ کیا ہے - دیگر محاذ جنگ پر بھی امریکن فوج لڑائی میں حصہ لے گی - اور امریکہ کی فوجی امداد کی بدولت انگریزی فوج بھی دوسرے میدانوں میں داد شجاعت دے سکے گی۔

امریکہ نے برطانیہ کے علاوہ روس کو بھی پوری امداد دینے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے ۔ اس کڑا کے کے جاڑے میں روسی جس ہمت و استقلال و جوانمردی سے جرمن حملہ آوروں کو پسپا کر رہے ہیں اس سے وہ ہر آزادی پسند ملک اور ہر بہی خواہ انسانیت شخص کی امداد کے مستحق ہو گئے ہیں۔

روسیوں کے فوجی کارناموں نے تمام دنیا میں اُن کے نظام تمدن کی ساکھ قائم کر دی ہے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جرمنی کے اس قدر شدید حملوں کے باوجود ابھی تک کہیں سے روسیوں کے ہمت و حوصلے میں کوئی فرق نہیں آیا ہے اور نہ تمام مملکت روس میں کسی شخص کو اپنے وطن سے غداری کا خیال پیدا ہوا ہے - دوسرے یوروپین ملکوں کے بہت سے لوگ حملہ آور جرمنوں سے مل گئے، مگر روس کا ہر متنفس اپنے وطن کو دشمن کے پنجے سے چھڑانے پر تُلا ہوا نظر آ رہا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کو اس وقت کامیابی پر کامیابی ہوتی جاتی ہے اور گو اس وقت روس کی جرمن فوجوں کی کمان خود ہٹلر نے لے لی ہے اور وہ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہے لیکن ابھی تک جرمنوں کو کسی مقام پر اپنے قدم جمانے کا موقع نہیں ملا بلکہ برابر پسپا ہونا پڑ رہا ہے نتیجہ یہ ہے کہ لینن گراڈ کے رقبہ میں دریائے والکھو (Volkh) کے مشرقی کنارے سے جرمن بالکل بیدخل ہو چکے ہیں - اور ماسکو لینن گراڈ ریلوے کا علاقہ بھی پھر روسیوں کے ہاتھ آگیا ہے - ماسکو کے رقبہ میں بھی روسی سپاہ جرمنوں کو پیچھے بھگائے چلی جاتی ہیں - اور تازہ ترین خبر یہ ہے کہ روسی فوج نے مجائسک کا شہر جرمنوں سے واپس لے لیا ہے - مجائسک ماسکو سے ساٹھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے یہاں جرمن قبضہ ہو جانے سے ماسکو کو سخت خطرہ پیدا ہو گیا تھا مگر اب یہ پھر روس کے ہاتھ آگیا ہے - اس کے معنی یہ ہیں کہ ہٹلر کی ایک لاکھ چیدہ اور منتخب فوج ماسکو کے اُتر دکھن کی طرف پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئی ہے - ان لڑائیوں میں جرمنی کو سخت نقصانات بھی اُٹھانا پڑے، جرمن سپاہ کو ایسی مشکلات سے سامنا کرنا پڑا جس کے لئے وہ تیار نہ تھے - اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اب اُن کے حوصلے پست ہونے لگیں گے بغرض روس نے اپنے مسلسل اور یلغارانہ حملوں سے جرمنی کے جنگی پروگرام کو بہت کچھ ملیامیٹ کر دیا ہے - یہی وجہ ہے کہ جہاں چند دنوں پہلے جرمن ریڈیو روس کی سرخ فوج کی تباہی و بربادی کے راگ گا رہا تھا اب جرمن اخبارات روس کی بیشمار تازہ دم سپاہ کا ذکر کر رہے ہیں!

صحرائے افریقہ میں بھی انگریزی فوجوں نے مصر کے سر سے حملہ کے تمام خطرات دُور کر دیئے ہیں - جرمن جرنیل رومل کو لیبیا کے علاقہ سے پیچھے ہٹنا پڑا اور بندرگاہ سولم اور حلفایہ جیسے اہم مقامات پر برطانوی فوج کا قبضہ ہو گیا ہے اور ہزارہا قیدی اور بہت سا سامانِ جنگ بھی ان کے ہاتھ آگیا ہے - اب جنرل رومل نے El Aqeria کے مقام پر آکر دم لیا ہے - اور اگر برطانوی فوج نے اسے یہاں سے بھی

ہٹنے پر مجبور کیا تو پھر طرابلس کے صحرائی سڑک کی طرف رُخ کرنا پڑیگا۔ لیبیا کے معرکوں میں بھی یہ بات بخوبی ثابت ہو گئی کہ کافی ساز و سامان کے ساتھ اگر مقابلہ کیا جائے تو جرمن فوج کوئی ناقابل تسخیر فوج نہیں ہے۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ ان ناکامیوں کے بعد ہٹلر اہل جرمن پر اپنا رسوخ قائم رکھنے کی کیا تدبیر کرتا ہے۔ کیونکہ محض جاپان کی فتوحات سے جرمنوں کو تشفی نہیں ہو سکتی ہے۔ اسی لئے پچھلے دنوں جرمنی، اٹلی، جاپان کے فوجی نمایندوں کی ایک کانفرنس منعقد کیگئی تھی جس میں کہا جاتا ہے کہ محوری طاقتوں نے مختلف محاذوں پر مشترکہ جنگ کا آئندہ نقشہ طے کیا ہے، مگر ابھی تک اس کی بابت کوئی بات صحت کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی ہے۔ البتہ آسٹریلیا کے ہوائی وزیر نے ۲۲ جنوری کو نیو گینی کے علاقہ پر جاپانی حملہ کا اندیشہ ظاہر کیا ہے اس کے معنی صاف یہ ہیں کہ جاپان عنقریب آسٹریلیا پر حملہ کرنے والا ہے۔ اسپین سے اس ہفتہ خبر آئی ہے کہ فرانکو نے اپنی فوج کو منتشر ہونے کا حکم دیدیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہٹلر فی الحال جبرالٹر پر حملہ کا ارادہ نہیں کر رہا ہے۔

ان دنوں آسٹریلیا میں سخت تشویش پھیلی ہوئی ہے۔ آسٹریلیا کے وزیر اعظم مسٹر کرٹن نے اپنے ملک کے بچاؤ کے متعلق براہ راست صدر امریکہ سے امداد مانگی ہے۔ ابھی تک برطانوی نوآبادیوں کے لئے ممالک غیر سے براہ راست بات چیت کرنا ممنوع تھا لیکن ضرورت قانون قاعدہ کی پابند نہیں ہوتی، اس لئے جنگ آئینی اختیارات میں غیر معمولی توسیع کا باعث ہو رہی ہے۔ کناڈا نے بھی امریکہ سے اپنے تعلقات پہلے کے بہ نسبت بہت زیادہ گہرے کرلئے ہیں اور یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اب وہ برطانیہ کے بہ نسبت امریکہ سے قریب تر ہو گیا ہے۔ آسٹریلیا والوں کو بھی خیال پیدا ہو رہا ہے کہ اُن کے مفاد امریکہ سے وابستہ ہیں اور وہ اس وقت ضرورت پر امریکہ سے امداد کی توقع رکھنے لگے ہیں۔ غرض اس جنگ کی بدولت سلطنت برطانیہ اور اُس کی نوآبادیاں امریکہ کے ساتھ ایک نئی یک جہتی پیدا کر رہی ہیں جس کا اثر بہت دُور رس اور دیرپا ہوگا۔ ہندوستان میں بھی امریکہ کو بڑے صنعتی مرکز کھولنے کا موقع مل رہا ہے۔

جنوبی افریقہ کی پارلیمنٹ میں ڈاکٹر ملان نے برطانوی حکومت سے قطع تعلق کرکے ملک میں ایک آزاد جمہوری نظام قائم کرنے کی تجویز پیش کی تھی مگر یہ چار دن کے سرگرم مباحثہ کے بعد کثرت رائے سے (۹۰ بمقابل ۴۳) مسترد ہو گئی۔

اس فیصلے سے ثابت ہوتا ہے کہ گو اس وقت جابجا لوگوں کے دلوں میں طرح طرح کی تشویش اور وسوسے پیدا ہو گئے ہیں لیکن باہمی اتفاق اور اتحاد کی ضرورت بخوبی محسوس کی جا رہی ہے۔ موجودہ حالات میں برطانیہ عظمٰی کے لئے تھوڑی سی دُور اندیشی اور اُلو العزمی سے کام لینے کی اشد ضرورت ہے یعنی روس اور چین کے ساتھ اپنے تعلقات اور گہرے کرنے کے ساتھ ساتھ برطانیہ کو ہندوستان اور برما کے لوگوں کے سیاسی جذبات کے ساتھ بھی عملی حیثیت سے اپنی ہمدردی کا فوری ثبوت دینا چاہئیے۔ ہندوستان کے ساتھ تو خیر کئی قباحتیں لگی ہوئی ہیں لیکن برما میں نہ قلیل تعداد جماعتوں کا کوئی سوال ہے اور نہ والیان ریاست ہی کا کوئی قصہ ہے تعلیم اور تمدن کی حیثیت سے بھی اہل برما اہل ہند سے کہیں بہتر حالت میں ہیں۔ مگر مدبران برطانیہ نے برما کی حیثیت میں بھی کوئی ذرا تبدیلی کرنا پسند نہیں کی حالانکہ برما کی طرف سے اُس کا وزیر اعظم یوسا اسی غرض سے بیس ہزار میل کا طولانی سفر طے کرکے بہزار خرابی انگلستان گیا تھا لیکن وہاں سے اُسے مایوس ہونا پڑا۔ اب گورنمنٹ نے جاپانیوں سے تعلقات پیدا کرنے کے الزام کے ساتھ اُسے امریکہ میں نظر بند کرلیا ہے۔ کہتے ہیں کہ یوسا نے برما کی آزادی کے متعلق صدر امریکہ سے بھی امداد چاہی تھی۔ وہ لندن سے واپس ہوتے

ہوئے ہنولولو پہنچے تھے کہ جاپان نے جنگ کا اعلان کر دیا جس پر وہ ہنولولو سے امریکہ آ گئے۔ اور یہاں برطانوی گورنمنٹ نے اُسے روک لیا۔ مزید حالات معلوم ہوئے بغیر اس واقعہ پر کوئی رائے زنی ممکن نہیں۔ تاہم اس ناگوار واقعہ سے تمام ماتحت ملکوں میں برٹش گورنمنٹ کے طرزِ عمل کے متعلق غلط فہمی پیدا ہونا لازمی ہے۔

ہندوستان کی آئینی ترقی کا مسئلہ سالہا سال سے چھڑا ہوا ہے مگر ابھی تک اس کے حل ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے ہیں اور موجودہ زمانہ کا سب سے بڑا سانحہ یہ ہے کہ اس وقت بھی جب جنگ ہندوستان کے اس قدر قریب آگئی ہے کانگریس اور مسلم لیگ دونوں حکومت کی جنگی کوششوں میں حصہ نہیں لے رہی ہیں۔ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے اپنے پچھلے اجلاس بردولی میں مہاتما گاندھی کو اُنھیں کی درخواست پر کانگریس کی تنہا ذمہ داری سے آزاد کر کے ۱۹۴۰ء والی پالیسی کا پھر اعادہ کیا ہے۔ اس ماہ وارد ھا میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں پھر یہ ریزولیوشن غیر معمولی کثرت رائے سے منظور ہو گیا ہے نتیجہ یہ ہوا کہ مہاتما جی نے کانگریس کی طرف سے محدود ستیہ گرہ کی جو تحریک جاری کر رکھی تھی وہ اس ریزولیوشن کی بدولت قطعاً مسدود ہو گئی اور کانگریس کو ملکی حفاظت کی ذمہ داری لینے میں اب کوئی تکلف باقی نہیں رہا یعنی اب جنگی امداد دینے میں وہ کسی اخلاقی عذر کا سہارا نہیں لے سکتی ہے بلکہ اگر برطانیہ ملکی آزادی اور آئینی حقوق کے متعلق اس کا اطمینان کر دے اور اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے پر مستعد ہو جائے تو کانگریس جنگی کوششوں میں پورے طور پر حصہ لینے کے لئے تیار ہے مسٹر راجگوپال آچاریہ اس تحریک کے بانی مبانی ہیں اور دوسرے محبانِ وطن نے ان کو اس نئی پالیسی کو کامیاب بنانے کا پورا موقعہ دیدیا ہے۔ گاندھی جی نے اپنے تینوں پرچے جنھیں اُنھوں نے ستیہ گرہ جاری کرنے کے وقت بند کر دیئے تھے پھر جاری کر دیئے ہیں۔ اور ہر جگہ کانگریسمینوں کو یہ ہدایت دیدی ہے کہ ہوائی حفاظت کی تدبیروں میں گورنمنٹ کی کوئی مزاحمت نہ کی جائے۔ بلکہ جہاں تک ہو سکے مدد دی جائے۔ برطانیہ کو محبانِ ملک کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کا اس سے بہتر اور کون موقعہ ہو سکتا ہے۔ اُنھیں ان حالات سے فائدہ اُٹھا کر کانگریس کے ساتھ ضرور معاملہ کر لینا چاہیئے۔ ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو کنور سر جگدیش پرشاد اور ملک کے بہت سے لبرل مدبّروں نے بھی مسٹر چرچل وزیرِ اعظم سے براہِ راست اپیل کی ہے کہ وہ اس نازک وقت کی ضروریات کو محسوس فرما کر ملکی نظامِ حکومت میں فوری طور پر ضروری تبدیلیاں منظور کر لیں جن سے اہلِ ملک کے اندرونی وسوسے دُور ہو جائیں اور وہ اس جنگ کے دوران ہی میں ملکی انتظام اور جنگی مدافعت کی تمام ذمہ داریاں اپنے سر لے سکیں اس اپیل میں کئی اہم تجویزیں پیش کی گئی ہیں ہم اس وقت ان کے متعلق کچھ کہنا فضول سمجھتے ہیں کیونکہ برطانیہ کی خواہش اور توجہ ہوگی تو تمام مسئلے حسن و خوبی کے ساتھ طے ہو جائیں گے اور ملک میں سیاسی بے چینی کا نام و نشان بھی باقی نہ رہیگا مسٹر چرچل نے امریکہ سے واپسی کے بعد عنقریب اس اپیل پر توجہ دینے کا وعدہ کیا ہے۔ دیکھئے اس توجہ فرمائی کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ ہندوستان کو پیغامِ وفا ملتا ہے یا مایوسی ہی کا سامنا ہوتا ہے!

دنیائے علم و ادب کیلئے پچھلا سال خاص طور پر منحوس ثابت ہوا۔ ہندوستان کے فلسفی شاعرِ اعظم ٹیگور کی موت کے بعد وجہ دنیا کیلئے ایک سانحہ عظیم کے بمنزلہ ہے) دو موتیں خاص طور پر افسوسناک ہوئیں۔ مہا مہوپادھیا وڈیاساگر ڈاکٹر سر گنگا ناتھ جھا ایم۔ اے۔ ڈی لٹ ایل۔ ایل۔ ڈی۔ سابق وائس چانسلر الہ آباد یونیورسٹی جن کا پچھلے ماہ الہ آباد میں انتقال ہو گیا۔ ہندو فلسفہ اور سنسکرت کے زبردست عالم تھے

جنکے علمی تبحر اعلیٰ تصانیف و بیش بہا تراجم کا ہندوستان اور یورپ کے علمی حلقوں میں سکّہ بیٹھا ہوا ہے شروع سے لیکر آخر تک آپکی زندگی ذاتی قابلیت کسر نفسی بلند خیالی اور پاکیزگی کا ایک قابل قدر نمونہ تھی۔ اگلے زمانہ کے اعلیٰ ترین پنڈتوں کے بہترین اوصاف آپکی ذات گرامی میں جمع ہوگئے تھے۔ یونیورسٹی کے سب سے بڑے عہدہ دار ہو جانے پر بھی آپ کے مزاج اور برتاؤ اور طرز زندگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ طالب علموں اور استادوں دونوں کے ساتھ آپکا برتاؤ ہمیشہ بزرگانہ محبت و شفقت کا رہا اور ایسے موقعوں پر بھی جب آپکے ہمعصر سختی کی ضرورت محسوس کرتے تھے آپ اپنے طبعی بُردباری اور فطری نیک نفسی کا ثبوت دیتے رہے۔ دراصل آپ اگلی ہندو تہذیب کے ایک اعلیٰ نمونہ تھے۔ وائس چانسلری سے کنارہ کش ہوتے ہوئے آپنے یونیورسٹی کے استادوں کو یہ الوداعی نصیحت کی تھی کہ انھیں ہمیشہ طالب علمی کی زندگی بسر کرنا چاہیئے یہ نصیحت محض زبانی نہ تھی بلکہ اخیر دم تک آپ خود بھی اس پر عامل رہے۔ غرض آپکی وفات سے ہندوستان کا ایک بڑا سنسکرت عالم اور نیک نفس پنڈت اُٹھ گیا۔

لاہور میں نامور آرٹسٹ مس امرت شیرگل کا صرف اٹھائیس سال کی عمر میں انتقال بھی ایک سانحۂ عظیم ہے۔ جب سے ہندوستان میں فن مصوری کی ازسرنو ترقی ہونا شروع ہوئی کسی ماہر فن کو اتنی کم عمری میں ایسا کمال فن نصیب نہیں ہوا۔ جیسا کہ شملہ کے سردار امراؤ سنگھ کی اس صاحبزادی نے چند ہی سال کی مشق و محنت میں حاصل کر لیا تھا۔ یہ ہنگرین ماں کے بطن سے بڈاپسٹ میں ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئی تھیں۔ فن تصویر کی ابتدائی تعلیم انھوں نے پیرس کے مشہور ماہران فن کی زیرنگرانی ہوئی تھی مگر ہندوستان آکر جب انھوں نے یہاں کے مناظر دیکھے اور اجنتا کے غاروں کی صناعیاں ملاحظہ کیں تو اُن کے فن میں ہندوستانی اسپرٹ کی ادائیں نمودار ہونے لگیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آگے چلکر اُن کی مصوری اس مقدس سرزمین کے روحانیت کی ترجمانی کرلے گی۔ اُنھوں نے لاہور میں مستقل طور پر بود و باش بھی اختیار کر لی تھی۔ مگر مشیّت ایزدی کے سامنے کسی کا بس نہیں اور تین مہینہ ہی کے اندر پیام اجل آگیا اور وہ تمام آرزوئیں جو ترقیِ فن کے متعلق آپ کی ذات سے وابستہ تھیں خاک میں مل گئیں۔ افسوس!

اس سال کی شروعات بھی کچھ اچھی نہیں ہوئی ہے۔ ۸ جنوری سنہ ۴۲ء کو رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری صاحب کی وفات ۶۷ سال کی عمر میں دہلی میں ہوئی ہے تاہم اس حادثہ سے خاص طور پر افسوسناک ہے کہ آپ نے حال ہی میں حیدرآباد دکن کی وزارت چھوڑ کر وائسرائے کی توسیع شدہ کونسل کی ممبری محض اس لئے قبول کی تھی کہ اس نازک وقت میں آپ مجموعی حیثیت سے ملک کی اہم سیاسی خدمات انجام دے سکیں۔ چنانچہ آپ نے صیغۂ معلومات اور اطلاعات کا چارج لیتے ہی ملکی اخبارات کے ساتھ شگفتہ تعلقات کی بنیاد مضبوط کرنا شروع کر دی تھی۔ آپ ہندو مسلمانوں کی سیاسی کشمکش کا بھی خاتمہ کرکے ملک کے سامنے آئینی ترقی کے راستے کھول دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ راسخ الخیال مسلمان ہونے کے باوجود آپ ادنیٰ مذہبی تعصّبات سے ہمیشہ بالا رہے۔ اسلام کے علاوہ آپ ہندو مذہب اور ہندو فلسفہ کی عظمت کے تہ دل سے قائل تھے۔ چنانچہ آپ ہی کی حسن کوشش اور سعی سفارش سے اعلیحضرت حضور دکن ویرا نے شانتی نکیتن اور آروِند و گھوش کے پانڈیچری آشرم کو ایک ایک لاکھ روپیہ کے گراں قدر عطیے دلئے۔ آپ یوگی راج آروِند و گھوش کے بڑے معترف اور مداح تھے۔ اور تقریباً ہر سال اُن کے درشنوں کو پانڈیچری جایا کرتے تھے۔ اس پیرانہ سالی میں حضور وائسرائے کی کونسل کی ممبری قبول کرنیکا اصلی مقصد ملک کی سیاسی گتھی سلجھانا تھا۔ افسوس یہ مقصد پورا نہ ہو سکا اور آپ راہی ملک بقا ہو گئے۔ بہرحال کیا بلحاظ قابلیت اور کیا باعتبار دیگر اوصاف دل و دماغ آپکا شمار ملک کے خاص افراد میں تھا، اور آپ کی وفات سے ملک کی آئینی جد و جہد کو نقصانِ عظیم پہونچا ہے۔

زمانہ

جلد ۷۷ — فروری سنہ ۱۹۴۲ء — نمبر ۲

نیرنگِ حسن
یا
نایکا بھید

(از مسٹر سلیم جعفر)

اُن بہی خواہانِ اُردو میں سے جو اس کی ترقی اور توسیع کے لئے کوشاں ہیں بعض کا خیال ہے کہ ہندی شاعری ہمیں اس کی حدود کے توسیع میں مدد دے سکتی ہے۔ ہم اس کی طرز بیان سے ادائے خیالات میں جدت پیدا کر سکتے اور اس کے استعارات و تشبیہات سے چمن سخن کی آراستگی و پیراستگی میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ اس گروہ کی خدمت کے خیال سے میں نے اس کی جرأت کی ہے کہ ہندی شاعری کی کچھ خصوصیتیں منظرِ عام پر لاؤں۔ چنانچہ سردست اس کی ایک خصوصیت جسے نایکا بھید کہتے ہیں ہدیۂ ناظرینِ "زمانہ" ہے۔ فی الحال تصویر کا صرف ایک ہی رخ دکھایا جا رہا ہے لیکن مصروفیتوں سے فرصت ملی اور "زمانہ" یہ بارِ گراں اُٹھا سکا تو اس کے تین اور پہلو بھی اسی رسالہ میں پیش ہونگے وہ تین پہلو یہ ہیں (۱) تصورِ حسن جس میں محبوب کا سراپا بیان کیا جائے گا (۲) حسنِ قدرت جس میں موسموں کی دل فریبیاں دکھائی جائیں گی، اور (۳) مذاقِ شعر جس میں شعر کی دہ قسمیں جنھیں ہندی میں رس کہتے ہیں بیان کی جائینگی

سرسوتی[1] کے لاڈلوں نے اپنی پیاری ماتا کو اپنی سُریلی آوازیں ایک خاص انداز سے سُنا کر ہی اپنے سپوت ہونے کا ثبوت نہیں دیا بلکہ اُس میں خوبیاں اور باریکیاں پیدا کر کے اُن کی دل آویزی اور دلکشی میں اضافہ کر کے

---

[1] सरस्वती علم کی دیوی

بھی اپنے سُیوگ ہونے کا اظہار کیا ہے۔ اتنا ہی بہت تھا مگر اُن کی شوخ طبیعتوں کی وسعتِ پرواز اتنی تنگ نہ تھی، اُنھوں نے اپنی کوششوں کے دائرہ میں موضوع طبع آزمائی کو بھی شامل کرلیا۔ جدت نے انھیں صرف فصاحت و بلاغت ہی کی پُرخار وادیوں میں سے گزرنے پر مجبور نہیں کیا بلکہ اُن کی قوتِ انتخاب کا بھی ناقدانہ امتحان لیا۔ اس نے دیکھنا چاہا کہ ناطقہ کی دلکش اور رنگین ایجادوں اور اس پری پیکر میں مناسبت ہے یا نہیں جس کے لئے وہ اوجِ تخیّل سے عالمِ محسوسات میں لائی گئی ہیں۔ میں نہیں کہتا کہ اور ملکوں کے فلک پیمایانِ ادب کی ترنم ریزیوں میں یہ چیز ضمناً بھی نہیں پائی جاتی۔ لیکن جہاں تک میرا علم ہے اُن کی جولانیاں اس قسم کی قید و بند سے آزاد ہیں انھیں اس کا بدیہی احساس نہیں کہ اُن کی نواسنجیاں اپنی تسخیر و تاثیر کے لئے کیفیاتِ زمانی کی ویسے ہی دست نگر ہیں جیسے کہ موسیقی اپنی سحر آفرینی کے لئے۔ یہ فخر ہندی ہی کو حاصل ہے کہ اُسکا شیوۂ بیان جب حُسن کی لطافتوں میں ڈوبا ہوا مستانہ نغمہ سرا ہوتا ہے تو اُس کی کیفیات مدہوشانہ کا اظہار ہمیشہ اُس مسرت و انبساط کو آغوش میں لئے ہوتا ہے جو منت کشِ زمان ہیں۔ ہندی کا شاعر محاسن و معائب کلام ہی کو پیش نظر نہیں رکھتا ہے اس کا بھی پاس و لحاظ کرنا پڑتا ہے کہ جن کیفیاتِ حُسن کا وہ نقشہ کھینچنا چاہتا ہے اُن کا غارتگر ایمان کے سن و سال سے بھی کوئی تعلق ہے یا نہیں۔ اس مختصر سی تمہید کے بعد ناظرین کو اس رنگستان تشریح و تفصیل میں داخل ہونے کی دعوت دی جاتی ہے جس کی پہنائیوں کو وہی اُلوالعزم طے کرتے ہیں جو تشنگی علم کی تسکین کے لئے ہمالیہ کی حوصلہ شکن بلندیوں پر چڑھنے سے نہیں ڈرتے۔

نایکا (नायका) وہ نازنین جس کا نظارۂ جمال سرور انگیز ہو۔

है करतार की कारीगरी सु लखी निहि की यह रीति नई है।
स्यामता बिन्दु करी प्रथमे निहि में पुनि अंकुरताई ठई है॥
नीचे तें ऊंचे उरोज भए अंग अंगन ओप अनूप दई है।
काम महीप के मंदिर में कलसा धरिके पुनि नेंव दई है॥

قدرت کی حیرت انگیز صناعی ہے! پہلے دنیا بھر کی سیاہی لے کر ایک نقطہ بنایا اور پھر اُس میں قوتِ نمو بھردی، پستان نے پستی سے بلندی کا رخ کیا اور عضو عضو ضوئے حسن سے جگمگا اٹھا، گویا کام دیو (عشق کا دیوتا) کی بارگاہ میں کلس رکھکر اُس کی (بارگاہ کی) بنیادیں مستحکم کی ہیں[1]۔

نایکا کی تین قسمیں ہیں، یہ تقسیم اس کے مرجعِ محبت پر مبنی ہے۔

سوکیا (स्वकीया) شوہر پرست وہ مہ جبین جو اپنے شوہر کے نشۂ محبت میں سرشار ہو۔

जानति सौति अनीति है, जानति सखी सुनीति

[1] لفظی ترجمہ کی کوشش نہیں کی گئی ہے، لیکن خیالِ شاعر پیش کرنے کی کوشش سے بھی پہلو تہی نہیں کی گئی۔

गुरु जन जानति लाज हैं, पीतम जानति प्रीति ॥

غضب کا انداز ہے جس کی چار ہستیاں اپنی اپنی ذہنیت کے مطابق تعبیر کر رہے ہیں۔ اس نازنین کو سوت (دشمن) بے شعور سمجھتی ہے اور سکھی (دوست) باشعور۔ بزرگ (حفظ مراتب کے دلدادہ) شرم پر محمول کرتے ہیں اور شوہر (گرفتارِ الفت) محبت پر۔"

غالب مرحوم فرماتے ہیں:۔

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی ۔۔۔ دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

اس ادا سے اُس ادا کا پلّہ کتنا بھاری ہے! کہاں دو کہاں چار!!

پَرکیا (परकीया) مفتونِ غیر جو کسی نامحرم پر مٹی ہو یعنی

रही अचल सी है मनो, लिखी चित्र की आहि।

तजे लाज डर लोक को, कहो बिलोकति काहि ॥

ذرا اس محوِ خیالِ یار کو دیکھنا جسے تن بدن کی سُدھ بدھ نہیں، یوں کھڑی ہے گویا نقش دیوار ہے! شرم و خوفِ خلق سے بے نیاز کسے دیکھ رہی ہے۔

تمہارے عاشق کو کیا ہوا ہے نہ منہ سے بولے نہ سر سے کھیلے ۔۔۔ وہ نقش دیوار بن رہا ہے نہ منہ سے بولے نہ سر سے کھیلے

سَامانیا یا گنکا (सामान्या या गनिका) حسن فروش طمعِ زر کے سبب سب سے محبت کرتی ہے،

गेंदा गुलदावदी गुलाबन के पुंज मंजु कंज कुन्द कोमल कमोदिनी कलित केर। जाही जुही मालती चमेली गन अनगन वाटिका सघन बन उपवन चारो फेर ॥ कहे परताप और तोसी हैं पियारी कौन ताते लखि तोहि हठि राखी हिये निबेर। और फूल सूल सम लागत निहोरे मोहि माधवी मधुर फूल आली क्यों न लावे हेर ॥

ذرا حسنِ طلب کو دیکھئے:۔

گیندا، گل داؤدی، گلاب کے دل لبھانے والے پھولوں کے ڈھیر کے ڈھیر لگے ہیں۔ کنول کُند۔ نازک نیلوفر۔ کیسر۔ جاہی۔ جوہی۔ مالتی۔ اور چنبیلی کے پھولوں سے راستے گھنے جنگل اور باغیچے پٹے پڑے ہیں، اس پر بھی تیوری چڑھی ہوئی ہے۔ دل باختہ حیران کہ یہ سب سامان طرب انگیزی سے کیوں قاصر ہے۔ خیال آتا ہے کہ محبوب آتشِ رقابت میں جل رہا ہے۔ خوشامد سے کہتا ہے کہ دنیا میں تیرا ثانی نہیں۔ نازک دل خواہ مخواہ سپند آتشِ رشک ہے جرمِ ناز سے صدا آتی ہے یہ سب گُل خار ہیں۔ مادھوی ہی ایک پھول ہے جسکی اس بارگاہ

عـــہ موازنہ مقصود نہیں

میں قدر ہے۔

دنیا بھر کے پھولوں سے نفرت ہے صرف مادھوی (اس کے معنی دولت کے بھی ہیں) پسند ہے۔

اس تقسیم کے بعد پھر بال کی کھال کھینچی گئی ہے اور وجوہ مختلفہ کی بنا پر الگ الگ نام رکھے گئے ہیں۔ پہلے سوکیا کی قسمیں بیان کی جاتی ہیں۔ اس کے بعد اوروں کی بیان کی جائیں گی۔

باب اول، سُوکیاّ نایکا

اِس نایکا کی تعریف ابھی کی جا چکی ہے۔ عمر کے لحاظ سے تین قسمیں کی گئی ہیں۔

(ا) مُگدھا (मुग्धा) دوشیزگی رخصت آثار شباب نمایاں ہیں:۔

मृगन की मीनन की चंचलाई चखन में, मोतिन की हीरन की
जोति है रदन में। ओठन में आई है मिठाई सब सिमिटि के,
दाख में न ऊख में न स्वाद सरदन में॥ महाकबि आलम के
खुले हैं बिसाल भाल, रातो दिन राजति मसाल सी सदन में।
बिधना गुलाब कैसो अरक उतार मानो चन्द की निकाई राखी
प्यारी के बदन में॥

آنکھوں میں ہرنوں اور مچھلیوں کی شوخی، اور دانتوں میں ہیرے اور موتیوں کی چمک دمک ہے۔ دنیا بھر کی شیرینی سمٹ کر ہونٹوں میں آ گئی۔ اب انگور، اکھ اور سردوں میں مٹھاس کہاں۔ کشادہ پیشانی کھلی ہوئی ہے جس کی ضو رات دن گھر کو منور رکھتی ہے۔ گویا قدرت نے عرق گلاب کی طرح ماہتاب کا حسن کشید کر کے اس نازنین کے روئے تاباں میں رکھ دیا ہے۔

(ب) اَگیاتَ یَووَنَا = (अज्ञात यौबना) زمانِ شباب آ گیا مگر انھیں خبر نہیں۔

फूली कुंज क्यारिन में मालती मयंक लसी पानि में लिये तें दुति
चम्पकनि लीनी क्यों। संग की सहेलिन की कटि जो निहारे देखों
मेरी दिन राति जाति होति कटि छीनी क्यों॥ ग्वाल कबि चुम्बक
अचानक दबाय, हार माल की मिलाय पे सुबास रस भीनी क्यों।
देख नथुनी में रज राजत दुनी में बीर मेरी नथुनी में चुनी तीनि पोहि दीनी क्यों॥

باغ کی کیاریوں میں پھولی ہوئی تو مالتی چاند سی معلوم ہوتی ہے، لیکن ہاتھ میں آتے ہی اس میں چمپئی چمک کہاں سے آ جاتی ہے! سہیلیوں کی کمر تو ویسی کی ویسی ہی ہے، میری کمر کیوں رات دن پتلی ہوتی جاتی ہے! (عالم حیرت میں اچانک ٹھوڑی دبا کر) ہار کو سونگھتی ہوں تو اس کی خوشبو بھی کچھ کم ہی سی معلوم ہوتی ہے! نتھنی کی چمک دمک بھی جاتی رہی ہے! آخر اس میں تین موتی کیوں پروئے گئے۔ اللہ

اللہ ری حیرت! کیا سادگی ہے!

اپنے سینہ کی ابھر سے تنگ ہیں وقتِ شباب   کہتے ہیں سینہ کے اندر کس نے پتھر رکھ دیا

(ج) گیاتَ یَوونا (ज्ञात यौबना) انھیں خبر ہے کہ جوانی دوانی آ ہو چکی حسن تقنۂ آرائش و جلوہ ہے

छाती लागी उचनि सकोचन सकान लागी, खान लागी पानन उतान रस
बतियां। कटि लागी घटनि झटनि चढ़ि जान लागी, बैन लागी नटनि
जगन लागी रतियां ॥ चाह लागी चलन सुधारन अलक लागी जेब लागी
जगन पगन लागी गतियां। नैन लागी फेरन निहोरन सरवीन लागी
मन लागी चोरन पढ़न लागी पतियां ॥

سینہ ابھارنے، شرمانے، پان کھانے، محبت کی باتیں کرنے لگی۔ کمر پتلی ہونے، کوٹھے پر چڑھنے، چندرانے راتوں کو جاگنے لگی۔ اٹھکھیلیاں کرنے، زلفیں سنوارنے لگے حسن دمکنے لگا پاؤں اٹھلانے لگے، آنکھیں مٹکانے سکھیوں کو دیکھنے، دل چرانے اور چھٹیاں پڑھنے لگی۔

حسنِ بے پردہ خریدارِ متاعِ جلوہ ہے   آئینہ زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے

نَوُوڑھا (नवोढा) شعورِ شباب کے بعد اس کی لذت یابیوں کا دور دورہ شروع ہوتا ہے بستِ شباب یعنی مکدھا کہ صہبائے عشرت کی تلخیاں اڑاتی اور اس کی رنگ رلیاں شرماتی ہیں، وہ اس عشرت کدہ سے کوسوں دور بھاگتی ہے۔ ابتدائے عشق کی رنگینی کس قدر ہوش ربا ہے!

ल्याई सखी नवला को मोराय धरे द्दग द्वारन लों कैरटी ज्यों। देखत
ही मनमोहन को भई पानिप में गड़ि बूढ़ि घटी ज्यों॥ प्यार भरी अंकवारि
पसारि बिहारी को ज्यों। रिखिनाथ ठटी ज्यों। यों निकसी करकुंडल
तें नट कुंडली तें कटि जात नटी ज्यों ॥

سکھی نے حجاب سا دے کر بزمِ یار میں بیو بٹھا دیا، پیتم کو دیکھتے ہی ڈری اور پسینہ پسینہ ہو گئی۔ پیتم نے بیباکانہ بڑھ کر آغوشِ محبت میں جا جکڑ لیا۔ مگر وہ اس حلقہ سے اس طرح نکل گئی جیسے نٹنی نٹ کی کنڈلی سے نکل جاتی ہے۔

وِشرَبدَہ نَوُوڑھا (विश्रब्धनवोढा) رم و ابرام وحشت و دہشت رخصت، صحبتِ ناز و نیاز ہے۔

गौनो भयो दिन द्वैक भयो कछु सुन्दर नेह दुहूं में नवीनो। खेलत काम
कलोलन में ललना को सरूप लला लखि लीनो ॥ दोऊ उरोज दबे
तिय के तब एक ही [illegible] सनै यह कीनो। रोई रिसानी डरी थहरानी
चकी अकुलानी चितै हंस दीनो ॥

گونے کو دو چار دن ہوئے ہیں، خلوت میں شوق مصروفِ گستاخی و بیباکی تھا کہ رخِ دل فریب نے جھلک دکھا کر متاعِ صبر و قرار لوٹ لی، بیباکانہ سینہ سے سینہ مل گیا، بزمِ ناز کیفیاتِ بہم کی جلوہ گاہ بن گئی، کوئی رو دیا، روٹھا، ڈرا، کانپا

گھبرایا، مگر اسی عالم میں کہیں آنکھ سے آنکھ مل گئی، سارے گلے تمام ہوئے۔ لبوں پر تبسم نے نمودار ہو کر پروانۂ معافی عطا کر دیا[1]

مَدْھیَا (मध्या) اب ایک قدم اور آگے بڑھا۔ شرم و حیا، محبت و الفت کا پلّہ برابر ہے اس درمیانی منزل کا منظر ہی انوکھا ہے۔

ललना लजीली उर कामहू ते कीली नीली सारी में लसै ज्यों घटा कारी बीच दामिनी। कहै ब्रजचद हुती संग में सहेलिन के हेरत हंसत बतरात हंसगमिनी॥ तौलों तहां गेह में सुनाह आयो नेह भरो बैठ गयो ताको लखि बैठ गई भामिनी कंत हेरे साम्हे तब अंत हेरे चंदमुखी, अंत हेरे कंत तौ न अंत हेरे कामिनी॥

شرم ہے، عشق کی بے قراری ہے۔ نیلی ساری زیب تن ہے، معلوم ہوتا ہے سیاہ بادلوں میں بجلی چمک رہی ہے۔ سہیلیوں کے ساتھ مصروفِ ناز باتیں چہلیں ہو رہی ہیں۔ اسی اثنا میں پیتم آجاتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر ایک طرف ہو بیٹھتی ہے۔ جب وہ سامنے دیکھتے ہیں تو نظر پھیر لیتی ہے، لیکن جب ان کی نظر اپنی طرف نہیں ہوتی تو شربت دیدار سے جویائے تسکین ہوتی ہے۔

پُرَوڑھا (प्रौढा) یہ وہ بیباک سیکش ہیں جو بادہ خواری میں نہایت چست و چالاک ہیں جرأتِ رندانہ سے کام لیتی ہیں۔

रति बिपरीत मे रमाँत मृगनैनी बाल कुन्दन की बेली ऐसी सिसकि सिकुर जात। बेनी कवि कहै बिहसांति बतराति बिज्जु छटा लौं दुहारि घनस्याम तन दुरि जात॥ मोतिन की लरैं अलकावलि के तरे परे उघर मुखौ न मुखचंद छवि दुरि जात। ससि मानो पीछे डार आड़ो पांति नारन की तम की जमाति सों उघर लरि मुरि जात॥

کندن کی بیل کی سی غزالیں چشم خلافِ رسم نشاط اندوزی کے وقت سسکیاں بھرتی اور بدن چراتی ہے ہنستی باتیں کرتی ہے اور جیسے بجلی بادلوں سے نکل اور کوند کر انھیں میں غائب ہو جاتی ہے یہ بھی گھنشیام کے جسم سے لپٹ کر اس میں مل جاتی ہے۔ زلفوں کے نیچے چھپی ہوئی موتیوں کی لڑیاں کھل جاتی ہیں مگر عضوئے رُخِ تاباں ان کی چمک دمک کو دبا دیتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے ماہتاب سیاہ انجم کو پیچھے چھوڑ کر فوجِ ظلمات سے لڑ کر لوٹ رہا ہے ضبط و خودداری ختم ناز و تمکنت کا زمانہ ہے۔ مَدْھیَا اور پُرَوڑھا دونوں اپنے اپنے طور پر مغرور ناز کر رہی ہیں۔

مَدْھیَا دھیرَا (मध्या धीरा) اشارۃً و کنایۃً اظہارِ ناراضگی ہے مگر دل سرشارِ الفت ہے۔

لہ Forgive & forget کی شاید ہی اس سے بہتر مثال ملے۔

घोरघटा घहरै नभमण्डल तैसिय दामिन की दुति जागत धावत धूर भरे धुरवा मुरवा गिरि शृङ्गन पै अनुरागत॥ फैली नई हरियारी निहारि संजोगिन के हियरा अनुरागत। रीति नई रितु पावस मे बृजराज लखे रितुराज सों लागत॥

گھنگھور گھٹائیں اُمنڈتی چلی آتی ہیں، بجلی چمک رہی ہے، بادل آسمان پر دوڑ رہے ہیں اور مور جھنکار تے ہیں ہر طرف نئی نئی ہریالی پھیلی دیکھکر دل میں ولولے اُٹھتے ہیں۔ پتیم کیا ستم ہے کہ برسات میں ان پر نظر پڑتی ہے تو "بسنت کی کیفیت دکھائی دیتی ہے"

مَدْھیَا اَدْھیرا (मध्या अधीरा) وہ پہلا قدم تھا کہ اشارہ کنایہ سے کام لیا جاتا تھا، اب دلیری پیدا ہوگئی اور اس حدتک کہ ادب وآداب بالائے طاق۔ اپنے تیہے اور رشک وحسد میں کسی بات کا خیال نہیں

औरन के ढिगते न टरौ नित बातन ही हमें राखत टारे। औरन के संग राति बिताय हमे सुख देत हो आन सकारे॥ औरन सों तुम साचई हो हम से रहो झुठई ब्योत बिचारे। लागत औरन की छातियां तुम पायन लागत आनि हमारे॥

رقیبوں کے پہلو سے جدا نہیں ہوتے اور ہمیں اُڑان گھائیاں بتائی جاتی ہیں۔ رات پہلوئے غیر میں بسر کرکے صبح تسکین دی جاتی ہے۔ اوروں سے صدق وصفا اور ہم سے کذب وافترا۔ سینہ سے لگے کسی کے اور قدموں سے ہمارے

مَدْھیَادھیرادھیرا (मध्या धीराधीरा) یہ بےبسی وبےکسی کا سماں ہے۔ ضبط سے کام لیا جاتا ہے لیکن چشم نم زبانِ حال سے اظہار ناراضگی کرتی ہے۔

कीजियत प्यारे आज तेरे पर तेरी सौंह तन मन धाम तोपै दीजियत वार वार। कहै पदमाकर सुदेख मृगनैनी दृग आंसु भरि आये बिन गुन के निहार हार॥ नैनन तें आंसू टरि परे ते कपोलन कपोलन तें गिरे ते उरोजन पै बार बार। बड़े बड़े मोती मीन देत रजनीसे रजनीस मनो देत संभुसीस पर ढार ढार॥

پیارے تمھاری جان کی قسم آج تم پر تن من دھن سب نچھاور کرنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ کہہ کر جو پیتم پر نظر پڑی تو غزالیں چشم نے پیتم کے سینہ پر بے تاگے کا ہار دیکھا، آنکھیں ڈبڈبا آئیں آنسو ڈھلک کر رخسار پر اور رخسار سے سینہ پر بار بار گرے، گویا حوت نے قمر کو بڑے بڑے موتی دیئے اور قمر نے انھیں شنبھوجی پر نثار کردیا۔

پْرَوڑھَا دھیرا (प्रौढ़ा धीरा) یہ کیش بیباک ہے طعن وتشنیع سے دریغ نہیں مگر پیتم کی تذلیل بھی گوارا نہیں، باوجودیکہ علامات صحبتِ اغیار صریح نظر آرہے ہیں۔

बैठी तिया मनिमन्दिर में चहुंओरन पुंज प्रभा के पसारे। काम सों स्याम महा अभिराम अनन्द सों आय तहां पग धारे॥ आपको हाथन सों तन

में सब साजि के साज सिंगार सिंगोरे । सुंदरि आज नई छन में इक छिन तोछन ते न निहारे ॥

جسم کی چمک دمک سے سارا گھر بقعۂ نور بنا ہوا ہے۔ پتیم نشۂ الفت میں سرشار شاداں و فرحاں آتے ہیں۔ خواہشِ فزونیِ حسن

دوست مائل مشاطگی کرتی ہے لیکن عجیب بات ہے کہ مہ جبین آج انھیں ایک نظر غلط انداز سے بھی دیکھنا نہیں چاہتی۔ چشمِ یار

کو نظارہ سے پرہیز ہے۔

پُرَوڑھا آدھیرا (प्रौढ़ा अधीरा) لیجئے بیبا کی نے ہاتھ پاؤں نکالے، پتیم پر پھولوں کی چھڑیاں پڑنے

لگیں، محض طعن و تشنیع پر قناعت نہیں۔

जो के अंग अंग की निकाई निरखत आली बारने अनङ्ग की निकाई कीजियतु है। कहै मतिराम जाकी चाह ब्रजनारिन को देह असुवान के प्रवाह भीजियतु है ॥ जाके बिन देखे न परत कल तुमहू को जाके बैन सुनत सुधा सों पीजियतु है। ऐसे सुकुमार पियनन्द के कुमार को यों फूलन के मालन की मार दीजियतु है ॥

جس کے حسن پر کام دیو (عشق کا دیوتا) کا حسن صدقہ جس کا ہجر برج کے بتان طناز کو بحرِ اشک میں غرق رکھتا ہے

جس کا شوقِ دید خود تمھیں بیقرار رکھتا ہے جس کی صدا تمھارے کانوں کے لئے "فردوسِ گوش" ہے، ایسے پیکرِ حسن کو کوئی

یوں پھولوں سے مارتا ہے؟ (سکھی کا مقولہ)

پُرَوڑھا دھیرا دھیرا (प्रौढ़ा धीरा धीरा) عشرت سرور انگیز نہیں بلکہ تاسف خیز ہے جھڑکیاں ہیں

گھڑکیاں ہیں، ناراضگی اشاروں اور حرکتوں دونوں سے ظاہر کی جاتی ہے۔

छबि छलकन भरी पीक पलकन त्यों ही श्रम जलकन अलकन अधिकाने चू । कहै पदमाकर सुजान रूपखान तिथा ताकि ताकि रही ताहि आपही अजाने है ॥ परसत गात मनभावन के भावती की गई चढ़ि भौहें रही ऐसी उपमाने द्वै । मानो अरविन्दन पै चन्द को चढ़ाय दीनी मानो कमनैन बिन रादो की कमानें द्वै ॥

جسم میں ادائیں بھری ہیں، پلکوں میں پیک لگی ہے، کسل سے پسینہ آ آ کر زلفوں سے ٹپک رہا ہے۔ نازنین

یہ انداز دیکھ کر تجاہل عارفانہ سے کام لیتی ہے۔ پتیم کا ہاتھ لگتے ہی کمان ابرو چڑھ گئے۔ معلوم ہوتا ہے کنولوں پر چاند

جھک آیا ہے یا پیہ انداز نے بن رودے کی دو کمانیں چڑھا دی ہیں۔

یہ تعلقات باہمی کی کرشمہ زائیاں تھیں، اب رقیب بھی منظر پر آ گیا۔ جیشٹھا (जेष्ठा) منظورِ نظر

اور کنشٹھا (कनिष्ठा) محرومِ التفات۔

एक पलिका पै बैठी सुन्दरि सलोनी दोऊ चाहि के छबीलो छैल आइ रति केलि धर।
चिन्तामनि कहै आन बैठो ढिग पीतम पै काहू सों कछू न कहि सकत दुहू के डर ॥
सुख के दिखायबे को एक को दिखायो नाह विपरीत रति को सरूप लिखि चित्र पर।
जौलों एक सकुचन आंख मूंदि रही तौलों प्यारे प्रानप्यारी के कुचन पर धारयो कर ॥

یہ پتیم شبستانِ عشرت میں ایک پیاری کے پہلو میں محوِ راز و نیاز ہے کہ دوسری بھی آ بیٹھی مگر دونوں کے خوف نے لبوں پر مہرِ سکوت لگا دی۔ اظہارِ شوق

کے لئے پتیم نے عشرتِ خلافِ رسم کی تصویر بنا کر دکھائی اُس نے شرم سے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر کیا تھا موقع مل گیا جھٹ دستِ گستاخ سینہ تک جا پہونچا۔

فلسفۂ حیات

(از مسٹر شیام نراین سریر بی۔اے)

"زمانہ" کی ابتدائی جلدوں میں ہندو فلسفۂ حیات کے متعلق منشی سورج نراین صاحب مہر دہلوی مرحوم کی متعدد نظمیں شائع ہوئی ہیں۔ مہر صاحب کو ہندو فلسفہ اور مغربی فلاسفی دونوں پر یکساں عبور حاصل تھا۔ اس لئے اُن کی نظمیں ہندو فلسفہ کے قدر دانوں کے لئے خاص طور پر دلچسپ ہوتی تھیں۔ اب ایک مدت دراز کے بعد ہمارے دوست مسٹر شیام نراین صاحب سریر اکبرآبادی نے آفرینش عالم کے متعلق ہندو معتقدات کی توضیح و تشریح میں قلم اٹھایا ہے۔ نظم ذیل میں انھوں نے اس نازک مسئلہ کے مختلف پہلو ناظرین "زمانہ" کے سامنے پیش کئے ہیں۔ (ا۔ز)

دورِ اول

اب تو ہی تو ہے، چمن تیرا ہے، نکہت تیری
سبزہ تیرا ہے، روش تیری ہے، رنگت تیری

گل میں بُو ہو کے سمائے وہ ہے وحدت تیری
باغِ عالم کو جو مہکائے وہ کثرت تیری

تیری وحدت سے زمانے کو پریشانی ہے
تیری کثرت مرے آئینے کی حیرانی ہے

نور ہی نور ہے، گردش ہے نہ چکر کوئی
شکل ہی شکل ہے، مرکز ہے نہ محور کوئی

حسن ہی حسن ہے، دل ہے نہ دلبر کوئی
کیف ہی کیف ہے، مے ہے نہ ہے ساغر کوئی

ناز و اندازِ ازل غنچۂ خاموش میں ہے
طفلِ معصوم کوئی نیند کے آغوش میں ہے

دوسرا دور

ہے طوفاں، حرمِ ناز میں ہے
موج آسا جزر و مد مرے انداز میں ہے

نغمۂ سازِ انالحق مری آواز میں ہے
جو نہو بند وہ آواز مرے ساز میں ہے

صنعتِ گلشنِ امکاں میں ہے ندرت میری
ناز قادر کو ہے جس پر وہ ہے قدرت میری

ذات کُل کیا ہے، مرے جز کی حقیقت کیا ہے
بحر کیا چیز ہے، امواج کی کثرت کیا ہے

پھول کہتے ہیں کسے، پھول کی نکہت کیا ہے
ہوش کی شکل ہے کیا، کیف کی صورت کیا ہے

ہستیِ کُل میں نظر آتی ہے ہستی میری
بادۂ روح میں پہنچ آئی ہے مستی میری

تیسرا[5] دور ہے اور کیف فراوانی ہے — یہ ہی آغاز بنائے چمنِ فانی ہے
رنگِ نکہت ہے کہ عکسِ گلِ لاثانی ہے — حسنِ فطرت ہے کہ آئینۂ سبحانی ہے

نخلبندانِ ازل کی چمن آرائی ہے
رحمتِ مطلعِ کُل بن کے بہار آئی ہے

دورِ چوتھا ہے تو بدلا ہے عجب رنگِ نہاں — صورتِ عرش ہے اب حسنِ نگارِ دوراں
پانچویں دور میں ہوتی ہے پَوَن روحِ رواں — اگنی پھر آکے چھٹے[6] دور میں ہے شعلہ فشاں

مہر، مریخ، زمیں، ماہ، ستارے دیکھو
شش جہت آتشِ قدرت کے نظارے دیکھو

آگ جب کم ہوئی، گھنگھور گھٹائیں چھائیں — بارشیں خوب ہوئیں، ٹھنڈی ہوائیں آئیں
بحرِ ذخار کو موجوں کی ادائیں بھائیں — مچھلیاں روح کی کشتی کو سجا کر لائیں

آب میں خاک[9] کی تصویر نظر آتی ہے
ہست میں نیست کی تحریر نظر آتی ہے

خاک سے[10] سبزہ، تو سبزہ سے ہے صحرا پیدا — پھر ہوا آب و صدف سے دُرِ یکتا پیدا
ہو گیا قلزمِ ذخار میں کچھوا[11] پیدا — اور تھا خاک میں باراہ[12] کا جلوا پیدا

کچھ مہک اپنی اڑا دی گلِ ریحاں بنکر
جوش آیا تو رہا شیرِ نیستاں بنکر

آخرش دشت بنے، باغ پھلے، بن پھولے — گھر کو خس پوش کیا ڈال کے لکڑی پولے
رنج و غم، صبر و قناعت میں سراسر بھولے — بن کے باسی ہوئے اور آم پہ ڈالے جھولے

تھے نہ بلوان، مگر بل کی بہت لیتے تھے
پستہ قد تھے پہ قدم دھرتے تھے[13] باون گز کے

دل جو ہوتا ہے کبھی گردشِ قسمت سے ملول — کھلکھلا پڑتے ہیں ہم سوچ کے قدرت کا اصول
فکر و فاقے سے کہاں واسطہ رکھتے ہیں فضول — سر پہ رہتا ہے سدا رحمتِ باری کا نزول

رات، تاریک گپھاؤں میں بسر ہوتی ہے
رام کے نام کے جپتے ہی سحر ہوتی ہے

---

۵ آفرینشِ عالمِ فانی کا آغاز یہاں سے ہوتا ہے۔

۶ سے ۱۲ تک مچھ، پرتھوی، وشدھی، کچھپ، باراہ، نرسنگھ اور باون اوتار کی پیدائش کا ذکر ہے۔ (ا۔ ز)

ہے سماں وید کا، جو جنتر و سخن ہوتے ہیں — واک بھی چار ہیں، چار انتھ کرن ہوتے ہیں
یگ بھی ہیں چار تو چار اُن کے چرن ہوتے ہیں — آشرم چار ہیں، اور چار ورن ہوتے ہیں۱

آشرم اول

برہمچریہ کا چلن رنگِ سحر میں دیکھو
زندگانی کی پھبن پہلے پہر میں دیکھو

رنگِ گرہست میں یہ چار ورن ہوتے ہیں — پاٹھ پوجن جو کریں، وہ برہمن ہوتے ہیں
کشتری وہ ہیں، جو آمادۂ رن ہوتے ہیں — ویش وہ ہیں جو تجارت میں مگن ہوتے ہیں
شدر کا کام ہے، ہر شخص کی خدمت کرنا
خاکساری میں برہمن پہ بھی سبقت کرنا

ہے پہر تیسرا اور وان پرستی کے مزے — مست ہیں شغلِ گرہستی سے کنارہ کرکے
ماہرِ یوگ کوئی ہے، کوئی حرفت میں بڑے — فردِ حکمت میں کوئی ہے، کوئی جوتش میں چڑھے
لوک، پرلوک کی راہوں کو دکھا دیتے ہیں
آدمی زاد کو انسان بنا دیتے ہیں

رنگِ سنیاس ہے حسنِ شفقِ شامِ حیات — کون کہتا ہے کہ اب ختم ہوا نامِ حیات
دن جو ڈھلتا ہے تو دیتا ہے یہ پیغامِ حیات — بیٹھکر محفلِ عرفاں میں پیو جامِ حیات
کنجِ خاموش میں آرام خدارا کر لو
اپنی ہستی کا ذرا آپ نظارا کر لو

یہ وہ ہے دورِ حقیقت کی بڑھی ہے مستی — بامِ افلاک سے اونچی ہے زمیں کی پستی
رنگِ توحید میں ڈوبی ہے فضائے ہستی — موت مہنگی ہے، حیاتِ فنافی الحق سستی
پھول کھلتا ہے تو کھلتی ہے کٹی سادھو کی
غنچے غنچے میں سمادھی ہے کسی سادھو کی



۱۵ چار آشرموں کو دن کے چار پہر سے مناسبت دی ہے۔ برہمچریہ پہلا، گرہست دوسرا وان پرست تیسرا، اور سنیاس بمنزلہ پہر چہارم ہے۔

اُردو ادب پر طوائفوں کا اثر

از پنڈت آنند نراین مُلّا، ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی)

گزشتہ دَور کے حالات اور واقعات تو تاریخ سے بخوبی معلوم ہو جاتے ہیں۔ لیکن وہ واقعات کیوں رونما ہوئے، اور وہ کون سی باتیں تھیں جو پسِ پردہ اُن واقعات کی ذمہ دار تھیں، اُس کے لئے تاریخ کے صفحات کافی نہیں ہوتے۔ اور ہمیں اُس دَور کے تمدن اور معاشرت کا بھی جائزہ لینا پڑتا ہے۔ ہمارے لئے اُس زمانہ کے ادب کا گہرا مطالعہ کرنا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ادب زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے، اور اگر ایک دَور کا ادب بغور دیکھا جائے تو اُس زمانے کے لوگوں کے احساسات اور خیالات، اُن کی رسوم اور عقیدے، اُن کے ذہنی اور جذباتی رُجحانات، سب کا عکس اور تصویر صاف اور نمایاں نظر آتی ہے۔ کیونکہ ادب کے لئے ناممکن ہے کہ وہ زندگی سے متاثر نہ ہو۔ کسی شاعر اور ادیب کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنے ماحول سے بالکل علیحدہ ہو جائے۔ اس لئے یہ سمجھنے کے لئے کہ اُردو ادب پر طوائفوں نے کیا اثر ڈالا، ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم پہلے یہ سمجھ لیں کہ ہماری معاشرت میں طوائفوں کی کیا جگہ تھی۔

قدرت نے جہاں عورت کو جسمانی اعتبار سے مرد سے کمزور بنایا ہے، وہاں اُسے حیات کی مشکلوں کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک فوقیت بھی دی ہے۔ وہ اپنے جسم ہی کو ذریعۂ معاش بنا سکتی ہے، اور جہدِ زیست کی بازی میں اسے داؤں پر لگا سکتی ہے۔ عورت کا اولین پیشہ یہی تھا اور آج بھی جبکہ عورت مرد کے بہت کچھ ہمدوش آگئی ہے، اُس کے لئے زیست کی مشکلوں کو آسان بنانے کا اس سے بہتر دوسرا طریقہ نہیں۔ مختلف ملکوں میں اس جسم فروشی کے طریقے مختلف ہیں، اور مختلف مذہبوں نے مختلف رسموں کے حسین لباس پہنا کر اور شادی کا پاک اور مقدس نام دے کر اس حقیقت کو چھپانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ہر ملک میں آج بھی بہ کثرت ایسی عورتیں ہیں جو بغیر کوئی حسین نقاب پہنے ہوئے بالاعلان اپنا اولین پیشہ کر رہی ہیں۔ اکثر ملکوں کے جھوٹے اور مصنوعی تمدن نے اُنھیں معاشرت کا جزو قبول کرنے سے گُریز کیا ہے۔ لیکن ہندوستان کے جس دَور کا ہم ذکر کر رہے ہیں اُس وقت کی معاشرت میں اُن کی ایک اہم اور مستقل جگہ تھی۔

؎ یہ مضمون دسمبر گذشتہ میں لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے براڈکاسٹ کیا گیا تھا اور اب ڈائرکٹر صاحب اسٹیشن مذکور کی عنایت سے ہدیۂ ناظرینِ زمانہ ہے۔

اُنیسویں صدی میں شمالی ہندوستان کے اُس حصے میں جہاں اُردو رائج تھی مسلمانوں کا راج تھا۔ دہلی میں شاہانِ مغلیہ تھے اور لکھنؤ میں شاہانِ اودھ۔ سیاسی اقتدار یا فوجی طاقت دونوں میں سے کسی کو نصیب نہ تھی۔ کیونکہ دونوں ایسٹ انڈیا کمپنی کے باجگذار اور نمک خوار تھے۔ ایسی صورت میں جب کہ شاہی خزانے بھرے ہوئے تھے اور لوگوں کے پاس باپ دادوں کی چھوڑی ہوئی دولت کافی تھی شہزادوں رئیسوں اور امیروں کا عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کے سوائے دوسرا کام نہ تھا۔ روز نئے سامانِ نشاط اور تفریح کی ضرورت ہوتی تھی۔ ایسی صورت میں اربابِ نشاط کی خاص قدر ہونا لازمی تھا۔ لیکن جس وجہ سے کہ وہ ہماری معاشرت پر چھائی ہوئی تھیں اس کی وجہ محض امرا کی عیاش مزاجی نہ تھی بلکہ پردہ کی رسم۔

پردہ ہندو اور مسلمان دونوں میں نہایت سختی سے رائج تھا۔ کسی رئیس شریف زادے کو اپنی ماں اور حقیقی بہن کو چھوڑ کر کسی اور عورت کو جو کہ خادمہ یا نیچ قوم نہ ہو دیکھنے کی نوبت نہ آتی تھی۔ شادی حالانکہ صغیر سنی میں ہو جاتی تھی لیکن اس میں اُس کی پسند کا کوئی سوال نہ تھا، کیونکہ شادی کے بعد ہی بیوی کی صورت دیکھنا نصیب ہوتی تھی۔ شادی در اصل دو خاندانوں کے خوشگوار تعلقات کو مستحکم اور استوار بنانے کے لئے کی جاتی تھی نہ کہ دو دلوں کا تقاضہ پُورا کرنے کے لئے۔ یہی وجہ تھی کہ شادی کرنے والے افراد کی طبیعت سن، اخلاق یا رُجحانات کا کوئی خیال نہ کیا جاتا تھا۔ اکثر خاوند اور بیوی کی عمر میں کافی فرق ہوتا تھا۔ شادی کے بعد بھی بیوی سے اختلاط برتنے کی اجازت نہ تھی، بڑوں کے سامنے خاوند کی مجال نہ تھی کہ بیوی سے ہنس کر بول سکے۔ بیوی کی قدم قدم پر نند اور بھاوجیں پاسبانی کرتی تھیں۔ اور اگر اُس نے اشارۃً یا کنایتاً خاوند سے ملنے کا شوق ظاہر کیا تو وہ بے حیا قرار دی جاتی تھی۔ گویا ہماری معاشرت میں خاوند بیوی کا کسی کے سامنے ایک دوسرے سے کسی قسم کا اظہارِ محبت کرنا بُرا اور مذموم سمجھا جاتا تھا۔ ایسی حالت میں نہ تو جوان لڑکا جس کے دل میں ہزاروں ارمان ہوتے تھے محبت کا کوئی مناسب تقاضا کر سکتا تھا اور نہ ایک رسم کی پابند اور سہمی ہوئی کم عمر نادان لڑکی اُس کا کوئی مناسب جواب دے سکتی تھی۔

لیکن انسانی فطرت کو نہ رسم تبدیل کر سکتی ہے اور نہ مذہب قید کر سکتا ہے۔ بھوک اور پیاس کو چھوڑ کر عشق انسان کی فطرت کا سب میں زبردست تقاضا ہے۔ کسی تندرست نوجوان کو محض ایک روحانی ہم آہنگی کا حسین خواب دکھا کر تسکین نہیں دی جا سکتی۔ ہماری سماج کا خلافِ فطرت دباؤ صرف یہاں تک کامیاب ہوا کہ اُس نے عشق و محبت کے جنسی لوازمات کو گھروں سے نکال دیا۔ اُس نے بازاروں میں نشو و نما پائی۔ بیویوں نے رفتہ رفتہ اِن باتوں کو جن سے جنسی خواہشات مشتعل ہوتی ہیں ترک کر دیا اُنھوں نے کوشش کی کہ وہ دیویاں بن جائیں، وہ فخر سے اپنے بارے میں کہنے لگیں۔

عشق کا حال بیسوا جانیں ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں

اِس کا نتیجہ جو ہونا تھا وہی ہوا۔ ہمارے اکثر نوجوان شریف زادوں کے دل پر پہلی بجلی ایک طوائف سے آنکھیں چار کرنے کے بعد گری۔ اُن کے جنسی شعور نے ایک طوائف کی آغوش میں آنکھیں کھولیں بیوی محض خاندان چلانے کا ذریعہ رہ گئی، لیکن اُن کی جذباتی دنیا کی مالک طوائف بن گئی۔

عشق و محبت کا جو تعلق شاعری اور ادب سے ہے وہ ظاہر ہے۔ خصوصاً ایسے دور میں جبکہ شاعری صرف نشاط اور تفریح کا ذریعہ تھی۔ وہی طوائف جو ہماری معاشرت میں ہمارے عشقیہ جذبات کی تنہا مالک بن چکی تھی۔ ہمارے ادب کی بھی معشوق بن گئی۔ اگر آپ غور سے ادب کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہمارے افسانوں، مثنویوں اور غزلوں کے معشوق میں طوائف کا کردار اور اُس کے خدوخال بہ خوبی نمایاں ہیں۔ معشوق کا ہرجائی پن اور بے وفائی، رقیبوں کا ہجوم، کبھی ظلم و ستم، کبھی لگاوٹ کی باتیں، شوخی اور طراری ناز او رغمزے، یہ ہو بہو ایک طوائف کی تصویر آنکھ کے سامنے لے آتا ہے۔ اکثر شاعر اور ادیب جو کچھ کہتے یا لکھتے تھے اس میں اسی معاشرت کا خاکہ نظر آتا ہے۔ آجکل کے پڑھنے والے اُن کے کلام پر اکثر یہ اعتراض کرتے ہیں، کہ وہ مبتذل رکیک اور مخرب اخلاق ہے۔ لیکن وہ اپنی نظر کافی دُور تک نہیں لے جاتے، کیونکہ یہ قصور شاعروں اور ادیبوں کا نہیں ہے بلکہ اس دور کی معاشرت کا ہے۔ جس کے وہ سچّے نمایندے تھے۔

طوائفوں کے ساتھ عشق و محبت کے جذبات وابستہ ہونے کی وجہ سے ہمارے ادب پر ایک اثر اور بھی پڑا طوائف ظاہر ہے کہ ایک پیشہ ور عورت ہوتی ہے، اُس سے پاک محبت کی اُمید کرنا حماقت ہے۔ ایسی حالت میں محبت پر ہوس پرستی کا غالب آ جانا لازمی تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ہمارے ادب میں جس محبت کا ذکر ہے اُس میں جنسی ترغیب روحانیت پر چھائی ہوئی ہے۔ محبت کی وہ رفعتیں جہاں دو دل ایک ذہنی اور جذباتی آویزش کی وجہ سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں اس کے نغمے ہمارے ادب میں سنائی نہیں دیتے۔ ہماری عشقیہ شاعری زیادہ تر معاملہ بندی پر ختم ہو جاتی ہے۔ اور چونکہ اس زمانے کی ساری کائنات عشقیہ شاعری ہی ہے لہٰذا ہمارے ادب میں ایسے شاہکار نہیں ملتے جن کو دوسری زبانوں کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکے۔

طوائفیں معاشرت کا یہ راز بھی بخوبی سمجھ گئی تھیں کہ کسی مرد کے دل پر ایک مدت تک قابو پانے کے لئے محض اس کی جنسی آسودگی ہی کافی نہیں بلکہ اس میں تہذیب، خوش سلیقگی، شیریں زبانی، حُسن کی آرایش، اور نشست و برخاست کے حیلہ آداب کو کافی دخل رہتا ہے لہٰذا اُن کی یہی کوشش رہتی تھی کہ وہ مردوں کے لئے محض سامانِ عشق ہی نہ ہوں بلکہ ایک حد تک ان کے واسطے نشاط اور تفریح کا سامان بھی مہیا کریں اس کوشش میں کامیاب ہونے کے لئے اُنھیں اپنی تعلیم و تربیت کا بھی کافی خیال رکھنا پڑتا تھا۔

مرزا محمد ہادی صاحب رُسوا کی معرکۃ الآرا کتاب "اُمراؤ جان آدا" میں جو کہ طوائف کی سچی سوانح عمری کہی جاتی ہے، ان تمام باتوں کا ذکر ہے جو ایک طوائف کو سیکھنا پڑتی تھیں۔ رقص اور موسیقی میں تو وہ اتنی ماہر ہوتی تھیں کہ اس فن کو انھوں نے بالکل اپنا ہی لیا تھا۔ شعر و سخن سے بھی ذوق ہونا لازمی تھا۔ بعض طوائفیں اُس زمانے کے مشاعروں میں بھی شریک ہوتی تھیں۔ پوشاک میں بھی تراش خراش یہی نکالتی تھیں، اور اپنے وقت کے فیشن کی موجد ہوتی تھیں۔ خاص خاص طوائفوں تک تو ایسے ویسے آدمی کی رسائی آسان نہ تھی جس طرح کہ برطانوی اُمرا کے لڑکے اپنی تعلیم پر جلا دینے کے لئے یورپ کی سیاحی کے لئے بھیجے جاتے تھے اُسی طرح ہمارے رئیس زادے آداب محفل سیکھنے کے لئے کسی مشہور طوائف کے سپرد کئے جاتے تھے۔ گویا ایک طوائف کا مکان تہذیب کا ادارہ تھا۔ خاندانی طوائفوں کی زبان ادبی اعتبار سے مستند سمجھی جاتی تھی۔ رئیسوں کے لئے جہاں شانِ ریاست برقرار رکھنے کے لئے گھوڑے گاڑی مُصاحب وغیرہ ضروری تھے وہاں کسی نہ کسی طوائف سے وابستگی بھی لازمی تھی۔ اس معاشرت کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے ادب میں تصنّع اور تکلف حد سے زیادہ دخیل ہو گیا جس سے ادب بھی ایک "طوائف" بن کر رہ گیا، وہی ظاہری حُسن، وہی آرائش اور نمائش، وہی حسین لباس، لیکن فطری جذبات کی وہی کمی۔ ہمارے اشعار کے الفاظ حسین، جملے چُست اور بندشیں دلکش لیکن مصنوعی جذبات کے حامل اور بے روح۔

طوائفوں نے ہمارے چند مخصوص اصنافِ سخن کو رائج اور مقبول بنانے میں بھی بہت بڑا حصّہ لیا۔ گزشتہ زمانے میں نہ تو اتنے تعلیم یافتہ لوگ تھے اور نہ اتنے اخبار اور رسالے، نہ ٹاکیز تھیں اور نہ ریڈیو، شعرا کی شہرت کا دار و مدار صرف مشاعروں کی کامیابی پر یا کسی مشہور خوش گلو طوائف کا ان کی غزل کسی صاحبِ ذوق شہزادہ یا رئیس کی محفل میں گا دینے پر تھا۔ شاعر اپنی معراجِ شہرت اور حاصلِ زندگی یہی سمجھتا تھا کہ اس کی شہزادوں کے دربار تک رسائی ہو جائے۔ تاکہ عمر بھر روٹیوں کا سہارا ہو جائے۔ تسنیم لکھنوی کے بارے میں روایت بیان کی جاتی ہے کہ شاہ اودھ کے دربار میں ایک طوائف اُن کی غزل جس کا مطلع ہے :-

جب نہ جیتے جی مرے کام آئے گی　　کیا یہ دُنیا عاقبت بخشائے گی

گا رہی تھی۔ بادشاہ سُن کر بہت محظوظ ہوئے اور پوچھا کہ یہ تسنیم کون ہیں، اور اس طرح تسنیم کا دربار اودھ میں پہلی غائبانہ تعارف ہوا۔ ایسی صورت میں وہ اصنافِ سخن جن کو موسیقی سے خاص لگاؤ تھا زیادہ رائج اور مقبول ہو گئیں۔ غزل کا اور اصنافِ سخن سے مقبولیت میں اس قدر زیادہ بڑھ جانے کا بڑی حد تک راز یہی ہے کہ وہ گانے کے لئے سب سے زیادہ موزوں تھی۔ اِسی طرح شاہانِ اودھ کے زمانہ میں مرثیوں کے فروغ پانے میں طوائفوں کی سوز خوانی کا بھی ایک حد تک اثر تھا۔

گو اس کی اصل وجہ شاہانِ اودھ اور اُن کے درباریوں کا امامیہ مذہب تھا، لیکن وہ خاص اصنافِ سخن

جو اس معاشرت سے ظہور پذیر ہوئی ریختی ہے۔ ریختی دراصل ایک طوائف کے خیالات اور جذبات کی ترجمانی کرتی ہے، اور غالباً ایک طوائف اور تماش بین کے تعلقات ہی اس صنف سخن کے ایجاد کے محرک ہوئے۔ اکثر مصوروں نے تصویروں کے ذریعہ سے راگ اور راگنیوں کے روپ اور بھاؤ کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ دورِ گذشتہ کے اُردو ادب کے روپ اور بھاؤ کو جب ہم تشکیل دینا چاہتے ہیں تو ہماری نظر کے سامنے ایک نیم برہنہ حسین رقاصہ کی تصویر آتی ہے، جو خوبصورت پوشاک اور زیور سے لدی ہوئی ہے اور گت پر ناچ رہی ہے، جس کے گرد تماش بینوں کا ہجوم ہے، جس کی زبان پر مصنوعی عشقیہ بول ہیں، جن کو باری باری سے ہر تماش بین کو وہ بھاؤ کے ساتھ بتارہی ہے۔ جس کی نظر میں ہر ایک کے لئے ایک پیام ہے۔ جو اُن کی آتش ہوس کو بھڑکا رہا ہے۔ لیکن جس کے ہونٹوں پر ایک خفیف طنز آمیز تبسم ہے، کیونکہ اُس کا دل سرد ہو چکا ہے، اور اس میں کسی فطری جذبہ کی چنگاری کے مشتعل ہونے کی صلاحیت نہیں۔

تنقید کتب

حدیثِ ناتمام

پنڈت دلیسراج ترما آبر سیابی کی نظموں غزلوں اور رباعیوں کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ ابر صاحب کی تخئیل بلند ہے الفاظ فصیح اور ترکیبیں چسپت استعمال کرتے ہیں۔ رباعیوں اور قطعات میں حکمت و فلسفہ کی چاشنی بھی ہے۔ شروع میں اعجاز صدیقی صاحب اڈیٹر رسالہ "شاعر" کا لکھا ہوا ایک دیباچہ ہے جس میں داد تنقید دی گئی ہے۔ لکھائی چھپائی کاغذ اچھے۔ چھوٹی تقطیع کے ۹۶ صفحات ضخامت۔ قیمت ۱۲ر بارہ آنہ۔ ملنے کا پتہ قصر الادب آگرہ۔

ہندوستانی کھیل

اس دلچسپ کتاب کو ہندوستانی کھیلوں کی ایک چھوٹی سی انسائیکلوپیڈیا کہنا چاہیئے۔ اس کے چھ ابواب میں مولوی الطاف علی صاحب نے کمرے کے کھیل، گلی کوچہ کے کھیل، میدان کے کھیل، دو دو چار چار کے کھیل اور جماعت کے کھیل اور دوڑیں سبھی کچھ بیان کر دیئے ہیں اس میں بعض ایسے کھیل بھی بیان کئے گئے ہیں جن سے اکثر ناظرین واقف بھی نہ ہونگے۔ بہت سے کھیل مضحکہ انگیز بھی ہیں اور بہت سے ایسے بھی جن میں بچوں کی جسمانی ورزش کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ بہرحال اس چھوٹی سی کتاب میں فاضل مصنف نے بچوں کی دنیا کے لئے عجیب وغریب دلچسپی کا سامان پیدا کر دیا ہے۔ لکھائی چھپائی کاغذ سب اچھے، انگریزی جلد، چھوٹی تقطیع۔ ۱۰۰ صفحات۔ قیمت عہ ایک روپیہ آٹھ آنہ، ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی۔

ہمالیہ سے خطاب

(از مولوی منظور الحق کلیم اعظم گڈھی)

ہمالیہ تجھے تیری بلندیوں کی قسم
رشی جو تجھ میں ہیں اُن سب کی نیکیوں کی قسم
جو تجھ میں رہتے ہیں سب دیو دیویوں کی قسم
تری بہشت فضا، سبز وادیوں کی قسم
بتا! کہ ہند کو کیوں فیض بار کہتے تھے
اس اُجڑے دَیر کو تاجِ دیار کہتے تھے

وجود تیرا تھا انساں کے ہوش سے پہلے
نمود تھی تری اس چشم و گوش سے پہلے
تو ہمنوا تھا زبانِ سروش سے پہلے
تو مستِ نغمہ تھا اس نائے و نوش سے پہلے
بتا تو کیا یہی ہندوستاں کا عالم تھا
اسی طرح سے غلامی کا اس کو ماتم تھا

اِک آئی ٹھنڈی ہوا جس کو آہِ سرد کہیں
صدا اِک آئی کہ جس کو نوائے درد کہیں
کہیں نہ کوہ اسے اہلِ درد مرد کہیں
زبانِ حال سے کہنے میں اس کو فرد کہیں
کہا نہ پوچھ کہ ہے طول داستانِ الم
ہے انقلاب مسرت کی داستانِ ستم

ہماری آنکھوں نے اوج و کمال دیکھا ہے
ہماری آنکھوں نے دسرتھ کا لال دیکھا ہے
وہ پانڈو کورو کی جنگ اور مآل دیکھا ہے
وہیں سے ہند کا ہم نے زوال دیکھا ہے
ہماری آنکھ نے یاں بزمِ معرفت دیکھی
کمالِ اوج پہ پہونچی ہر اک صفت دیکھی

جہاں کو درسِ محبت یہیں سے ملتا تھا
جہاں کو درسِ اخوت یہیں سے ملتا تھا
جہاں کو جامِ نصیحت یہیں سے ملتا تھا
جہاں کو تمغۂ عزت یہیں سے ملتا تھا
یہی وہ گھر ہے جہاں آدمی سنورتے تھے
اسی مقام کے سکّے کھرے اُترتے تھے

جو انقلاب ہوا کیا بیاں ہو کہنے سے
سمجھ لے سوزِ دروں چشمِ تر کے بہنے سے
کلیجہ ہو گیا پتھر ستم کے سہنے سے
نہ رہنا میرا مناسب تھا میرے رہنے سے

ہزار چشم سے آنسو مرے نکلتے ہیں
یہ ندیاں نہیں اشکوں کے دھارے چلتے ہیں

درسِ اِتحاد

(از حضرت عروج زیدی بدایونی)

ہر جگہ تیغ و سناں ہے، ہر جگہ تیر و تفنگ
خون رُلواتی ہے مجکو ہندو و مسلم کی جنگ

ایک ہی خالق ہے سب کا ایک ہی رزاق ہے
ایک قدرت کے نمونے نقش ہائے رنگ رنگ

بھائی بھائی ہو کے بھی یہ برسرِ پیکار ہیں
جامۂ ہستی بھی اب اولادِ آدم پر ہے ننگ

دونوں انساں ہیں مگر رکھتے ہیں حیوانی شعار
ایک شیرِ تند خو ہے دوسرا خونی پلنگ

جس کسی میں آپ دیکھیں جذبۂ بغض و حسد
یہ سمجھ لیں لگ گیا آئینۂ ایماں کو زنگ

اختلافاتِ نظر پہ دشمنی بے سود ہے
ایک کو پیارا ہے کوثر دوسرے کو موجِ گنگ

اپنی آپس کی عداوت سے بنے ہیں یہ غلام
اپنے ہاتھوں کر رہے ہیں عرصۂ ہستی کو تنگ

رنجشِ باہم نے دُنیا ہی بدل دی ہند کی
اب وہاں شورِ فغاں ہے جس جگہ بجتا تھا چنگ

تا کجا ہندوستاں میں ہندو و مسلم فساد
رحم کر ان کی زبوں حالی پہ اے ربّ العباد

رُباعیاتِ فانی

بجھتی ہی نہیں شمع جلے جاتی ہے
کٹتی ہی نہیں رات ڈھلے جاتی ہے
جاری ہے نفس کی آمد و شد فانی
سینے میں چھری ہے کہ چلے جاتی ہے

ناکامِ ازل کی کامرانی معلوم
قسمت میں نہ ہو تو شادمانی معلوم
جینے سے مراد ہے نہ مرنا شاید
ورنہ فانی کی زندگانی معلوم

میر حسن بحیثیت غزل گو

(از محمد ریاض الحق ایم۔اے)

دنیا میں کثرت سے ایسے لوگ گزرے ہیں جو زندگی کے مختلف شعبوں کے رمز شناس اور کامل تھے لیکن اُن کی قابلیت اور کمال کو کسی ایک شعبہ سے متعلق کرکے اتنا اچھالا گیا کہ اُن کی دوسری صلاحیتوں پر غور کرنے کا خیال تک فنا ہو گیا گو کہ دوسری حیثیتوں سے بھی وہ کسی کم قدر و توجہ کے مستحق نہ تھے۔ اُن کے ایک کمال نے دوسرے کمالوں پر اس طرح پردہ ڈالا کہ لوگوں کو اُن کے دیگر نظریات کی طرف رجوع ہونے کا احساس تک نہ رہا۔

ذیل میں ایک ایسے ہی صاحبِ کمال سے بحث ہے جو اُردو شاعری کی ایک صنف کا خدا، پیغمبر اور امام سبھی کچھ مانا گیا ہے۔ برسوں پہلے حسن کی تعریف و توصیف میں وہ وہ فلک شگاف نعرے لگائے گئے جن کی صدائے بازگشت آج تک فضا میں گونج رہی ہے، مخالفوں کے دل و دماغ پر حسن کی عظمت اور رعب و داب قائم کرنے کے لئے لمبی لمبی تقریریں ہوئیں، تنقیدیں لکھی گئیں، ایک دو نہیں سیکڑوں کتابیں تصنیف ہوئیں یہاں تک کہ آج وہ اس مملکت کا واحد تاجدار اور مطلق العنان بادشاہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ کسی کی ہمت و مجال نہیں، جو اس سے آنکھ ملا سکے، کسی میں اتنی تاب و طاقت اور اہلیت نہیں جو اس کی برابری کا دعویٰ کر سکے۔ مگر زمانے کی ناقدری اور تنگ نظری پر افسوس ہوتا ہے کہ آج اُسی مطلق العنان تاجدار، اُسی خدا، پیغمبر اور امام کی دوسری حیثیت سے دربان کے برابر بھی وقعت اور عزت نہیں۔ کاملین کا تو ذکر ہی کیا، دوسرے درجے کے شعراء کی فہرست میں بھی اس کا نام نظر نہیں آتا۔ معاذ اللہ کہاں وہ محبت و عقیدت اور کہاں یہ بے نیازی، کہاں وہ جوش و خروش کہاں یہ بے حسی، کہاں وہ قدر و منزلت کہاں یہ گمنامی۔

میرا مطلب اُردو کے مشہور شاعر و مثنوی نگار میر حسن دہلوی سے ہے۔ کون ہے جو مثنوی نگار کی حیثیت سے اِن سے واقف نہیں؟ ہر زبان پر ان کا کلمہ جاری ہے۔ ان کی قادر الکلامی، فطرت شناسی اور زباندانی کا سکہ ہر دل پر ثبت ہے اور ہر کہ و مہ کی زبان پر ان کے اشعار جاری ہیں۔ اُن کی مثنوی "سحر البیان" کی جس قدر تعریف و توصیف کی گئی شاید اُس کی نظیر اُردو شاعری میں نہ مل سکے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ اُنھوں نے اس صنف میں جو کمال پیدا کیا وہ کسی کو نصیب نہ ہوا۔ ان کو سفرِ آخرت اختیار کئے ہوئے قریب قریب ڈیڑھ سو سال گزر چکے ہیں مگر ابھی تک نہ ایسا مثنوی نگار پیدا ہوا اور نہ آئندہ ہونے کی اُمید ہے۔ ان کی

شہرہ آفاق مثنوی کی خود اُن ہی کے الفاظ میں یہ شان ہے کہ:۔

نہ ایسی ہوئی ہے نہ ہوگی کبھی

لیکن بہت کم لوگ ہوں گے جو ان سے بہ حیثیت غزل گو بھی واقف ہوں۔ بعض حضرات کو تو یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ حسن نے غزلیات کا ایک دیوان بھی مرتب کیا مگر ان کا یہ تعجب اور حیرت بجا ہے، اُن کی مثنوی کو اس درجہ فروغ حاصل ہوا کہ غزل گوئی ماند پڑ گئی اور لوگوں کے ذہن اس طرف متوجہ نہ ہو سکے کہ یہ شخص غزل بھی اچھی اور بہت اچھی کہہ لیتا ہے۔ غزل گو شعرا میں جو شہرت و نمود میر تقی میر کو حاصل ہوا اُس سے سب محروم رہے کون ہے جو سرتاج الشعرا کا بندۂ بے درم نہیں! اُن کے درد بھرے نغموں میں کچھ ایسا سحر اور اثر تھا کہ ہر کس وناکس ان کا گرویدہ ہو گیا اور دوسروں کی نالہ وزاری کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ غرضکہ میر صاحب کے درد میں ہر شخص کچھ اس طرح شریک ہوا کہ اس کو دوسروں کا احساس تک نہ رہا۔ وہ بھول گئے کہ بعض غم نصیب حسرت و یاس کے مارے تباہ حال لوگ اور بھی ہیں جن کی دُکھ بھری کہانیاں بھی توجہ کی محتاج ہیں۔ ایک دور تھا جب میں بھی میر سے کچھ اسی طرح متاثر تھا، اُن کے کلام کے آگے دوسروں کا کلام روکھا پھیکا اور بے اثر معلوم ہوتا تھا، غزل گو کی حیثیت سے میرے دل میں حسن کی کوئی وقعت نہ تھی۔ لیکن جب ان کا دیوان نظر سے گزرا اور اُس کا بغور مطالعہ کیا تو جیسے دنیا ہی بدل گئی، دن بدن ان کی عظمت کا سکہ دل پر جمنے لگا۔ ایک بار نہیں متعدد بار ان کا کلام پڑھا اور عجب حظ اُٹھایا۔ کہیں میر صاحب کا مزہ پایا تو کہیں درد، سوز اور سودا کا انداز جھلکتا نظر آیا۔ اس کو غزلیات کا دیوان نہیں گلدستۂ رنگا رنگ پایا جس میں طرح طرح کے پھول گندھے اپنی خوشبو پھیلا رہے تھے۔ بات یہاں تک پہونچی ہے تو دل کا تقاضا ہے کہ حسن کی غزل گوئی کے بارے میں مزید گفتگو کی جائے۔ لہٰذا سطور ذیل میں اُن کے کلام پر بالتفصیل بحث کرکے یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ ان کو غزل گو شعرا میں کونسا درجہ مل سکتا ہے۔

میرا عقیدہ ہے کہ کسی شاعر کے کلام کا تنقیدی مطالعہ کرنے سے پیشتر اس کے متعلق کچھ جان لینا ضروری ہے۔ اس ماحول اور سوسائٹی کا خاکہ ذہن میں ہونا چاہیئے، جس میں رہ سہہ کر اُس نے اپنی زندگی گزاری ہے۔ ایک حد تک ان نظریات اور رجحانات کا جان لینا بھی ضروری ہے جو کسی خاص واقعہ یا سانحہ کی وجہ سے اس کے کلام پر اثر انداز ہوئے۔ اِن تمام چیزوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ذیل میں اس ماحول کی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی، جس میں میر حسن نے آنکھ کھولی، پرورش پائی اور زندگی گزاری۔

ماحول میر حسن بارھویں صدی ہجری میں پیدا ہوئے، جس زمانے میں اُن کی تربیت ہو رہی تھی مغلیہ سلطنت برسر اقتدار تھی لیکن نظام بگڑ چکا تھا۔ سلطنت کی جڑیں کمزور ہوتی جا رہی تھیں، بادشاہ صرف نام کا شہنشاہ

ہ گیا تھا، امرا اور رؤسا خود مختار نواب بنتے جا رہے تھے، خانہ جنگیوں کا دور دورہ تھا، لہذا دوسری قوموں
فائدہ حاصل کرنے کا اچھا موقعہ ملا اور ہر طرف سے دہلی پر حملے ہونے لگے۔ نادر شاہ حملہ آور ہوا اور دلّی
تاراج کرکے اپنے وطن سدھارا، ہر چہار طرف مرہٹوں نے اپنی لوٹ مار اور ظلم و تعدّی سے قیامت برپا کر رکھی
ی کہ احمد شاہ درّانی نمودار ہوا اور دلّی کے گلی کوچوں کو ایک بار پھر نادر شاہی قتل و خون اور غارتگری کی تصویر
ھنا پڑی۔ حکومت کی رہی سہی دولت اس لٹیرے کی نذر ہوئی اور سلطنت کی حالت بد سے بدتر ہوتی
ی۔ شہنشاہ نے دار الخلافہ چھوڑ کر الہ آباد میں قیام کیا اور مرہٹوں کی امداد سے نظام سنبھالا۔ اسی زمانے
ور اسی عہد میں دلّی کے ایک محلہ میں میر غلام حسن نامی ایک شخص پیدا ہوا جو بعد کو ادبی دنیا میں حسن کے
م سے موسوم ہوا۔ اس نے نظام سلطنت کی ابتری کے واقعات کانوں سے نہیں سُنے بلکہ ان کی چلتی
پھرتی تصویریں اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ جب دلی میں ہر طرف پریشانی، مصیبت اور نکبت کے آثار
نمودار ہوئے تو بڑے بڑے شعرا اور اُدبا نے فیض آباد اور دوسری ریاستوں کا رُخ کیا۔ حسن بھی
سی پر آشوب زمانہ کے ہاتھوں فیض آباد پہونچے اور نواب سالار جنگ اور اُن کے بیٹے کی سرکار سے
البستہ ہو گئے۔ حسن شاعر تھے اور حساس دل رکھتے تھے۔ دلّی کی تباہی، بربادی اور زبوں حالی کے نقشے
ن کی نظروں سے گزر چکے تھے۔ ان تمام حالات اور واقعات اور مشاہدات کا ان کے دل پر گہرا اثر
ا۔ چنانچہ دوسرے شعرا کی طرح اُن کے کلام میں بھی حسرت و اندوہ کی لہر سرایت کر گئی۔ قرائن سے پتہ
چلتا ہے کہ ان کی زندگی بھی کچھ ایسی خوشحالی سے نہ گزری، چنانچہ ان سب باتوں کی وجہ سے ان کے کلام
ں یاس و حسرت، دنیا سے بیزاری اور نفرت اور اسی قسم کی دوسری چیزیں پیدا ہو گئیں۔

ان کے معاصرین میں میر۔ سودا۔ درد۔ مظہر جانِ جاں۔ ضیا اور سوز قابلِ ذکر ہیں۔ انھوں نے ان
سب کی صحبتیں اُٹھائیں، اور بڑی حد تک ان سے متاثر بھی ہوئے جس کا ثبوت ان کے کلام میں موجود ہے۔
شاعری میں ان کو میر ضیا سے تلمذ حاصل تھا مگر اُستاد کے رنگ کو بخوبی نبھا نہ سکنے کی وجہ سے میر۔ درد اور
ر سودا کا تتبع کرنے لگے۔ چنانچہ اس کا تذکرہ اپنے کلیات کے دیباچہ میں کیا ہے۔ ان اساتذہ کی پیروی سے
ن کے ہاں ایک حیرت انگیز تنوع اور ہمہ گیری پیدا ہو گئی ہے۔ ان کے گلستان غزل گوئی میں طرح طرح اور
ع بنوع کے بھینی بھینی اور میٹھی خوشبو والے پھول مہکتے نظر آتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے کلام
ں اساتذہ کی خصوصیات کے سوا دوسرا رنگ نہیں۔ ہر شخص اپنی ایک انفرادیت رکھتا ہے اور حسن کا بھی ایک
فرادی رنگ تھا جس کے متعلق آگے بحث کی جائے گی۔

شاعری زبان اور خیال کے موزوں مجموعہ کا نام ہے۔ لہذا کسی شاعر کے کلام سے بحث کرتے وقت یہ

دونوں چیزیں پیش نظر ہونا ضروری ہیں۔ ذیل میں حسن کے کلام کو زبان یا لفظی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔
میر حسن کی زبان نہایت سادہ سلیس، لطیف اور فصیح ہے، البتہ کہیں کہیں ایسے الفاظ بھی ملتے ہیں جو آج متروک ہیں۔ میر، سودا اور درد کے ہاں بھی ایسے الفاظ بکثرت پائے جاتے ہیں لیکن ان سے ان حضرات کی استادی پر حرف نہیں آ سکتا اور نہ ہم ان کو متروک الفاظ کے استعمال پر مورد الزام بنا سکتے ہیں۔ زمانے کے انقلاب کے ساتھ ہر چیز میں رد و بدل ہوتا چلا آیا ہے اور زبان بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔ آج جو کچھ ہم بولتے ہیں بہت ممکن ہے آنے والی نسلیں اس کو غیر فصیح قرار دے کر ترک کر دیں۔ متروکات کو نظر انداز کر کے حسن کے کلام پر نظر ڈالئے تو اس کی سلاست، روانی اور لطافت آپ کا دل موہ لے گی۔ 'نیں کیا' 'نیں کہا' 'دیکھوں ہوں' 'دیکھے ہے' 'پرے' اور 'ٹک' وغیرہ الفاظ اس حسن و خوبی سے استعمال کئے ہیں کہ متروک ہونے کے باوجود بھلے لگتے ہیں۔ انھیں الفاظ کا طفیل ہے کہ ان کے ہاں میر کی سی دلآویزی، لطافت، نرمی اور گھلاوٹ پیدا ہو گئی ہے۔ وہ مٹی کی جگہ 'ماٹی' ہمیشہ کی جگہ 'نت' دیوانے کی جگہ 'دِوانے' کبھی کی جگہ 'کبھو' کب تک کی جگہ 'کب تئیں' بد دماغ کی جگہ 'بے دماغ' استعمال کرتے ہیں۔ مگر کلام سُبک نہیں ہونے پاتا بلکہ اس میں عجب کیف پیدا ہو جاتا ہے۔

نت دست ہوس کو تو جھکا لینے کو اس کے ۔۔۔ "ماٹی" سے سب آلود ہے اسباب جہاں کا
بھیجوں ہوں زلف و رخ پہ محمد کے "نت" درود ۔۔۔ میں نے کیا ہے ورد یہی صبح و شام کا
بت خانے میں چل بیٹھ یا کعبہ میں حسن اب ۔۔۔ یوں کب تلک 'دِوانے' تو در بدر پھرے گا
وہ ملکِ دل کہ اپنا آباد تھا 'کبھو' کا ۔۔۔ سو ہو گیا ہے تجھ بن اب وہ مقام ہُو کا
یہ سب اپنے خیالِ خام تھے تم تھے 'پرے' سب سے ۔۔۔ جو کچھ سمجھے تھے ہم تم کو یہ سب اپنا توہم تھا
دور میں اپنے الٰہی رہے گا 'کب تئیں' یوں ۔۔۔ بادہ شیشے سے جدا شیشے سے پیمانہ جدا
طبع نازک کے ہاتھ سے اپنے ۔۔۔ عمر بھر میں تو 'بے دماغ' رہا

وہ زبان پر کامل قدرت رکھتے تھے، ثقیل سے ثقیل الفاظ استعمال کرتے ہیں لیکن فقروں کے دروبست سے ان میں ایسا لوچ پیدا کر دیتے ہیں کہ ان کے ثقل کا احساس تک نہیں ہوتا۔ مشکل سے مشکل قوافی اس خوبی سے باندھتے ہیں کہ بدمزگی کے بجائے شعر میں اچھا خاصہ لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً:۔

وہ ملکِ دل کہ اپنا آباد تھا کبھو کا ۔۔۔ سو ہو گیا ہے تجھ بن اب وہ مقام ہُو کا
لایا غرور پہ یہ عجز و نیاز تجھ کو ۔۔۔ تیرا گنہ نہیں کچھ ادل سے میں ہی جُو کا
کس مستِ ناز نے کل میخانے پہ نگہ کی ۔۔۔ دیوار و در تلک بھی جو واں کا چھک رہا تھا

خورشید ہی پر اپنے سنکر ہوا فلک تو | یاں داغِ دل بھی اپنا اِک دن چمک رہا تھا

اسی طرح مشکل ردیفیں بھی استعمال کرتے ہیں، لیکن واہ ری قدرت کہ صفائی اور سادگی میں فرق نہیں آتا:-

اُفتادگی جو چاہے تو رکھ ہوش نقش پا | آئینہ خاکساروں کا ہے دوش نقش پا

کم حوصلہ ہیں ہم کو کہاں دید کی نظر | ہے مصلحت جو ہم سے ہے روپوش آشنا

ایک دم ناقہ کو ٹھہرا تا نہیں مجنوں کے پاس | خار آجائے الٰہی سارباں کے زیر پا

کوہ و صحرا سے تو گھبرا کے لے آیا تھا مجھے | لے چلا پھر دلِ وحشی تو وہیں مجھکو کیا

سوداؔ کی طرح انھوں نے بھی اپنے اشعار میں ہندی الفاظ کے استعمال سے زبان کو گنگا جمنی بنایا ہے سچ یہ ہے کہ حضرت سوداؔ کے بعد اگر کسی نے ہندی الفاظ کو حسن وخوبی سے برتا ہے تو وہ حسنؔ ہی ہیں مثال کے لئے ذیل کے شعر ملاحظہ ہوں:-

دیکھ گر ہے یہی الٹی تو بھلا آج سے ہے | ہم نے الفت کا تری نام ونشاں چھوڑ دیا

جاتا تھا اُس کی کھوج میں میں بے خبر چلا | مارے اسی نے ٹوک کے پوچھا کدھر چلا

دیکھ دروازے سے مجھکو وہ پری رُو ہٹ گئی | دیکھتے ہی اس کے میری جان بس چٹ پٹ گئی

پردے ہی پردے میں دل کو خاک کر ڈالا مرے | اس ادا سے وہ پری رو منھ پہ لئے گھونگھٹ گئی

عام اور فرسودہ مضامین کو اس انداز سے نظم کرتے ہیں کہ ان میں جدت پیدا ہو جاتی ہے اور شعر کا لطف بڑھ جاتا ہے۔ معشوق کو "جان" اور "جاناں" سب نے کہا ہے، مگر وزا حسنؔ کا اسلوب بھی ملاحظہ ہو ؎

یاں تلک گھر کر گیا دل میں کہ بس | رفتہ رفتہ جان سے جاناں ہوا

عشق کی گم گشتگی اور بیخودی پامال مضمون ہے مگر حسنؔ نے بالکل نئے ڈھنگ سے باندھا ہے ؎

دل، حسنؔ ایسے گُم ہوئے کہ سدا | ایک کو ایک کا سُراغ رہا

اسی طرح ذیل کے اشعار میں جدتِ ادا نمایاں ہے ؎

نکل اے جان اب دل سے کہ صاحب خانہ آتا ہے | ترا تو دل ہی اُٹھنے کو نہیں کیا یہ بھی گھر جانا

کس منھ سے میرے یار کے ہوتا ہے روبرو | چہرے کے داغ اپنے تو مہتاب دیکھنا

ماہرینِ معنی وبیان نے صنائع وبدائع کو کلام کا زیور قرار دیا ہے، جیسے ایک خوبصورت عورت سنگھار پٹار سے اور زیادہ حسین معلوم ہوتی ہے، اسی طرح تشبیہ، استعارہ اور دیگر صنائع لفظی سے کلام کا حُسن

بڑھ جاتا ہے اور اُس میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر ان سب محاسن کے باوجود اگر ان کے استعمال میں غلو کیا جاتا ہے تو کلام میں معائب پیدا ہو جاتے ہیں، اور شعر لفظی بازیگری کے سوا کچھ نہیں رہ جاتا۔ اُردو تمام شاعروں نے کم و بیش اس سامان افزائش حُسن سے کام لیا ہے، اور بعض تو اس قدر حد سے گزر گئے ان کے شعر معمہ اور چیستان ہو کر رہ گئے۔ حسن نے بھی اپنے کلام کو صنائع سے زینت بخشی، مگر سلامتی طبع کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ بات ذہن نشین کرنے کے لئے یہاں صرف اُن کی نرالی اور اچھوتی تشبیہیں پیش کی جاتی ہیں جن سے حقیقت خود آشکارا ہو جائے گی ؎

نکھے کپڑوں میں یوں ہے جلوہ گر اُس کا بدن		دھوپ جیسے شام کی ہو اور سحر کی چاندنی

لے جائے جیسے غنچۂ پژمردہ کو صبا		یوں آہ لے کے لختِ جگر تہ بہ تہ گئی

روئے سپید نے نمک اس میں ملا دیا		کیفیت اب رہی نہیں جامِ شراب میں

اُٹھا بالوں کو چہرے سے دکھا دے چاند سا مکھڑا		سرِ شام آج آتا ہے نظر تنہا مجھے تارا

اپنے عقدے کسی طرح نہ کھلے		کس دل آزار کی جبیں ہیں ہم

اُس شوخ کے جانے سے عجب حال ہے میرا		جیسے کوئی بھولے ہوئے پھرتا ہے کچھ اپنا

اِنسان سے برابر لغزشیں ہوتی ہیں، اور میرا تو یہ عقیدہ ہے کہ جس شخص سے غلطی نہ ہو وہ انسان ہی نہیں۔ میر حسن بھی آخر انسان ہی تھے، آسمان سے اُترے ہوئے فرشتہ نہ تھے کہ اُن سے غلطی نہ ہوتی۔ چنانچہ بعض اوقات غلط زبان استعمال کر جاتے ہیں۔ جہاں تک میرا علم ہے لفظ "چشم" دہلی اور لکھنؤ دونوں جگہ کے شعراء نے مؤنث ہی باندھا ہے مگر حسن نے مذکر لکھا ہے:۔

مجھے بھی حسن سوجھتا ہے غرض		ڈبو دے گا یہ چشمِ نم آپ کا[عہ]

یا مثلاً یہ شعر:۔

لبِ نوخط کی ترے بوسۂ شیریں کی طلب		کیا کرے کوئی کہ وہ حلوۂ[عہ] بے دُود نہیں

دوسرے مصرعہ میں حلوۂ بے دود نظم کیا ہے، حلوائے بے دُود چاہیئے۔

بسا اوقات سوقیانہ زبان بھی استعمال کر جاتے ہیں، اور ایسے الفاظ نظم کر دیتے ہیں جو عام و مبتذل لوگوں کی زبان پر رہتے ہیں اور مہذب حضرات ان کا استعمال خلاف تہذیب جانتے ہیں:۔

میں نے جو کہا مجھ پر کیا کیا نہ ستم گزرا		بولا کہ "ابے" تیرا روتے ہی جنم گزرا

عہ ہمارے نزدیک یہاں "چشمِ نم" باضافت نہیں ہے بلکہ بغیر اضافت ہے یعنی شاعر نے "نم چشم" کو باضافت مقلوب استعمال کیا ہے۔ اور چونکہ "نم" مذکر ہے اس لئے یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس نے غلطی کی۔ (ا۔ ز) عہ یہ محض تصرف شاعرانہ ہے (ا۔ ز)

کہیں کہیں بھونڈی تشبیہیں بھی مل جاتی ہیں، مثلاً:۔

منھ دیکھتے ہی اس کا کچھ پھوٹ ہی بہا اب　　پھوڑا یہ میرے دل کا کیا آہ پک رہا تھا

سطور بالا میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے، وہ کلام حسن کا لفظی تجزیہ ہے۔ اب ذرا معنوی پہلو پر بھی نظر ڈال لیجئے اور دیکھیئے کہ ان کے ہاں کیا کیا جواہر پارے بھرے ہوئے ہیں۔

میر کا رنگ | ان کی بیشتر غزلوں میں میر کا رنگ غالب ہے۔ کہا جاتا ہے میر صاحب کا کلام داخلی ہے۔ اس میں انتہائی درد و اثر اور سوز و گداز پنہاں ہے۔ ان کی زبان نرم، میٹھی اور سادہ ہوتی ہے، لیکن انھی نرم میٹھے اور سادہ الفاظ میں نشتروں کی سی آبداری ہوتی ہے جس سے سامع کے دل پر ایک چوٹ سی لگتی ہے۔ مثلاً:۔

سرہانے میر کے آہستہ بولو　　ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا　　دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

اُن نے پہچان کر ہمیں مارا　　منھ نہ کرنا اِدھر تغافل تھا

دیدنی ہے شکستگی دل کی　　کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

حسن نے میر کے تتبع میں جو شعر کہے ہیں اُن کی زبان میں بھی شیرینی، سادگی اور گھلاوٹ کے ساتھ ساتھ نشتروں کی سی آبداری ہے۔ میرا تو یہ دعویٰ ہے کہ اگر ان اشعار کو میر کے دیوان میں شامل کر دیا جائے تو لوگ ان کو میر کے کلام سے علحدہ نہ کر سکیں گے۔ ۵

تیرا حسن یہ رونا یوں ہی اگر رہے گا　　ظالم تو پھر کسی کا کاہے کو گھر رہے گا

جب سے جدا ہوا وہ شوخ تب سے مجھ کو　　نت آہ آہ کرنا اور زار زار رونا

تمھیں بھی یاد آتے ہیں وہ دن کہ کوئی دن　　ہمارے حال پہ کیا کیا ترحم اور تفضّل تھا

رو رو کے کیا ابتر سب کام مرے دل کا　　کھویا مری آنکھوں نے آرام مرے دل کا

اپنی طرف سے ہم نے تم سے بہت نبھایا　　پر آہ کیجئے کیا تم نے ہمیں نہ چاہا

وصل ہوتا ہے جن کو دنیا میں　　یا رب ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں

کیا ان اشعار میں میر کی سی مسکینی نہیں جو شاعر کے مظلوم ہونے کا راز فاش کر رہی ہے؟ کیا ان میں وہ درد و اثر، سوز و گداز اور یاس و حسرت نہیں جو میر کا مخصوص انداز ہے؟ کیا ان سے ہمارے دلوں پر چوٹ نہیں لگتی؟ کیا یہ ایک مظلوم کی فریاد اور درد بھری صدا نہیں جو ایک دُکھ بھرے غم کے مارے دل سے بے اختیار نکل پڑی ہے؟ ہے اور ضرور ہے ——— !

ؔ شاعر صنعت مراعات النظیر لایا ہے اِس لئے قابل گرفت نہیں۔ (ا۔ز)

کہتے ہیں میر کے بعض شعر ایسے ہیں گویا وہ چپکے چپکے اپنے دل سے باتیں کر رہے ہیں، حسن کے یہاں بھی اس قسم کے شعروں کی کمی نہیں، مثال کے طور پر چند شعر نقل کئے جاتے ہیں :-

کر دں شکوہ تو یے وسواس میں اس کے نہ آنے کا نہ دھڑکا مرے دل میں گر اس کے روٹھ جانے کا
وساطت سے کسی کی جیب کے بھی چاہا نہ کچھ ورنہ کیا تھا ڈھب تو یاروں نے بہت اس سے ملانے کا
حسن تو ہر کسی سے حالِ دل کہتا پھرے ہے کیوں عبث بدنام ہوگا اور نہیں کچھ اس میں پانے کا
ملامت ہی کریں گے اور اُلٹی تجھکو ہنس ہنس کر کوئی احوال پر تیرے نہیں افسوس کھانے کا

سودا کا رنگ کبھی کبھی حسن کے اشعار میں سودا کا انداز دکھائی دیتا ہے۔ مشہور ہے کہ سودا کی شاعری انبساطی ہے، درد والم سے اُن کو واسطہ نہیں، ظرافت اور خوش طبعی اُن کی جان ہے۔ ہشاش بشاش آدمی تھے خود بھی ہنستے اور دوسروں کو اپنے رنگین کلام سے ہنساتے۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ وہ ظرافت، ہنسی اور شوخی کے پردے میں اپنے غموں کو چھپا کر دل کی تسکین کرتے تھے۔ ان کے خیالات میں علو اور الفاظ میں شان ضرور ہوتی ہے، لیکن درد کی کسک سے خالی نہیں ہوتے۔ حسن بھی جب کبھی روتے روتے تھک جاتے تو دل بہلانے کی خاطر سودا کی طرح تانیں اڑانے لگتے۔ اور وقتی طور پر اُن کے کلام میں بھی وہی مستی و جوش، ترنگ اور شوخی پیدا ہو جاتی ہے ؎

حاصل اس باغ کے آنے کا تو ہے دید بھلا گلشنِ ہستی کا ہم کیونکہ تماشا نہ کریں
گئے وہ دن جو کسی کی ہمیں سُدھ رہتی تھی اب تو سب ذکر فلاں ابنِ فلاں چھوڑ دیا
ترے دل سے تو مجھے بات یہ لگتی ہے بعید تو نے کس دل سے حسن کو مری جاں چھوڑ دیا
دم رُکتا ہوا آتا ہے لب تک مرے غم سے عقدے ترے ہیں لیکہ مرے تارِ نفس میں

جب کبھی سوز کا چربہ اُتارتے ہیں تو وہی معاملہ بندی نزاکت اور چٹکلے بازی کرنے لگتے ہیں مثلاً

کیا مُسکرا کے ٹالے ہے اب پھر کب آئیے گا دل بے قرار ہوتا ہے کچھ تو قرار کر
بزم شراب ہے اور تنہا ہے یار مہرو پردے ہی میں تو اپنا منہ آفتاب رکھنا
مجھ سے ہوا نشے میں ہم آغوش آشنا یارب اسی طرح رہے بے ہوش آشنا

دیکھ دروازے سے مجھکو وہ پری رو ہٹ گئی دیکھتے ہی اس کے میری جان بس چٹ پٹ گئی
پردے ہی پردے میں دل کو خاک کر ڈالا مرے اس ادا سے وہ پری رو منھ پہ لئے گھونگھٹ گئی

درد کا رنگ میر کے بعد حسن اگر کسی دوسرے شاعر سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں تو وہ میر درد ہیں۔ درد

ب صوفی منش بزرگ تھے، ان پر جو گزرتی وہی نظم کے پردے میں ظاہر کر دیتے۔ مگر حسن نہ تو صوفی تھے اور درویشوں سے ان کو کوئی خاص تعلق تھا۔ ان کی غزلیات میں تصوف کے جو نکات ملتے ہیں وہ محض یما اور درد کی تقلید میں نظم کئے گئے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ درد تک نہ پہونچ سکے۔ البتہ اپنے مقصد میں میاب ضرور ہوئے۔

تصوف کا ایک اہم مسئلہ ہے کہ "موجود حقیقی" سے تمام کائنات پیدا ہے۔ حسن نے اس نکتہ کو یوں یان کیا ہے۔

تو ہے تو مری جان و دل و جسم ہے ورنہ　　کیسا یہ دل اور کیسا یہ جی اور میں کہاں کا

صوفیوں کا عقیدہ ہے کہ خدا ہم میں موجود ہے، وہ ہم سے بیگانہ نہیں، لہذا اگر ہم اس کو نہ پاسکیں تو ارے فہم کا قصور ہے۔ حسن بھی اسی خیال کی ترجمانی کرتے ہیں ؎

بیگانہ ہے یاں کون اور اپنا ہے یہاں کون　　ہے سب یہ عقیدہ مرے ہی وہم و گماں کا

(رضا و تسلیم)

مرضی ہو جہاں اس کی وہی جا ہمیں بہتر　　مشتاق دل اپنا نہیں کچھ باغ جناں کا

(بے ثباتیِ دنیا)

جس عالم ہستی کو سمجھتے تھے بہار آہ　　آخر کو جو دیکھا تو وہ موسم تھا خزاں کا

اگر انسان پیدا نہ ہوتا تو خدا ہوتا، دیکھئے اس کو کس خوبی سے نظم کیا ہے:۔

کرتا میں حسن قدس کے عالم ہی میں پرواز　　ہستی کا اگر اپنی گرفتار نہ ہوتا

(مسئلہ جبر)

کوئی دیتا نہیں اس بت کو دل کچھ اپنی خواہش سے　　جو یوں مرضی خدا کی ہو تو پھر بندے کا کیا کہنا

سیاتی عنصر | یہاں تک حسن کا وہ کلام پیش کیا گیا جو اساتذہ کے تتبع میں ہے، اب ذرا اُن کے جوہر ی پر نظر کیجئے۔ وہ فطرتِ انسانی سے بخوبی واقف تھے، اور مسائل نفسیاتی میں کافی دخل رکھتے تھے بسا کہ ان کی مثنوی "سحر البیان" سے بخوبی واضح ہے۔ جس طرح مثنوی میں نفسیاتی عنصر جگہ بجگہ نمایاں ہے ا طرح غزلیات میں بھی اس کی کمی نہیں۔ کہتے تو ہیں معمولی سی بات مگر نہایت نپی تلی اور فطرت کے مطابق ا وجہ سے اُن کا کلام اور زیادہ مؤثر ہو جاتا ہے۔

تو گرفتاری کے باعث مضطرب صیاد ہوں　　لگتے لگتے جی قفس میں بھی مرا لگ جائے گا

یہ شعر نفسیات میں ڈوبا ہوا ہے، روزانہ زندگی میں ہر شخص گوناگوں واقعات و عجائبات سے دوچار
لیکن جب وہ ان کا عادی ہو جاتا ہے تو اُس کا بات بات پر متعجب ہونا ختم ہو جاتا ہے۔ مثال کے لئے اس شخص
کو لیجئے جس نے عیش و عشرت میں آنکھ کھولی اور پرورش پائی ہو، عمر کے کسی حصہ میں اگر اس پر کوئی وقت پڑ
تو پھر اس کی پریشانی کا عالم نہ پوچھئے۔ مگر رفتہ رفتہ دو چار دس پانچ مصائب برداشت کر کے جب وہ مشکل
اُٹھانے کا عادی ہو جائے گا تو اُس کی تمام گھبراہٹ اور پریشانیاں ختم ہو جائیں گی اور معمولی معمولی مص
سے بالکل متاثر نہ ہو گا۔ بالکل یہی بات اس شعر میں ادا کی گئی ہے جس کو غالب نے بعد میں اس طرح ادا کیا۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج　　مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

جس جا پہ تم نے باتیں کی تھیں کھڑے ہو اک دن　　جب دیکھتا وہ جا گہ بے اختیار رونا

یہ شعر بھی بالکل فطرتِ انسانی کے مطابق ہے، جب کسی شخص کا کوئی عزیز ساتھی یا محبوب بچھڑ جاتا ہے ا
عرصہ تک اس سے ملاقات کی نوبت نہیں آتی تو اسے محبوب کی چیزوں سے محبت سی ہو جاتی ہے۔ جہاں کہیں
بیٹھتا اُٹھتا تھا عاشق بھی اپنا وقت وہیں گزارنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ اس کی یاد میں ہر دم محو رہے۔ اکثر ا
ہوتا ہے کہ کسی مقام کو دیکھکر جہاں کبھی دونوں مل کر بیٹھے تھے۔ ان پچھلی مسرتوں اور صحبتوں کا خیال آ جاتا ہے
تو بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ حسن کہتے ہیں کہ جس جگہ معشوق نے ان سے کھڑے
باتیں کی تھیں اب جدائی کے عالم میں جب وہ نظر کے سامنے آ جاتی ہے تو بے اختیار رونا آ جاتا ہے۔ شعر
سچائی سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔

اسی طرح کا یہ شعر ہے ؎

درد کی بات تھوڑی سی بھی لگتی ہے بہت　　ہو رہا ہے بسکہ مدت سے دل اپنا گداز

انفرادیت | ہر انسان اور مخلوق کی شخصیت میں کوئی نہ کوئی خصوصیت ایسی ضرور ہوتی ہے جو اس کو دوسرو
ممتاز کرتی ہے، اسی خصوصیت کا نام انفرادیت ہے۔ اُردو میں سیکڑوں ہزاروں شاعر گزرے ہیں، اور یہ بھی
جانتے ہیں کہ اُردو شاعری میں فارسی کا چربہ اُتارا گیا ہے۔ وہی فارسی مضامین اور خیالات ہیں جن کو ہر شاعر اُرد
جامہ پہنا کر پیش کرتا ہے۔ اسی حیثیت سے تمام شعرا کا کلام قریب قریب یکساں نظر آتا ہے۔ لیکن اس یکسانی
کے باوجود قریب قریب ہر شاعر کے ہاں کوئی نہ کوئی ایسی خصوصیت ضرور پائی جاتی ہے۔ جو اس کو دوسروں سے
ممتاز کر کے شہرت و نمود بخشتی ہے۔ بظاہر تو حسن کے ہاں کوئی انفرادی رنگ نہیں معلوم ہوتا کیونکہ ان کا کلام
اساتذہ کی خصوصیات کا مجموعہ ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو ان کے بھی مخصوص رنگ کا پتہ چلتا ہے جو ان

ہمعصروں میں مفقود اور اُن کے کلام میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔

ان کی اکثر غزلیں مسلسل اور بیشتر میں قطعہ بند اشعار داخل ہیں۔ میرے خیال میں یہی تسلسل بیان ان کی انفرادیت ہے۔ اور اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ حسن مثنوی نگار پہلے ہیں اور غزل گو بعد کو۔ مثنوی کی سب سے اہم خوبی ربط یا سلسلۂ کلام ہے جس میں ان کو مہارت تامہ حاصل تھی، لہٰذا جب کبھی یہ غزل کی طرف رجوع ہوتے ہیں تو یہ تسلسلِ بیان غیر شعوری طور پر قطعہ بند اشعار کی شکل میں ہویدا ہو جاتا ہے۔ اور اس نے اس حد تک ترقی کی کہ انفرادیت کی شکل میں رونما ہوا۔ گو کہ غزل میں قطعہ بند اشعار سے تغزل کم ہو جاتا ہے۔ غزل کی شان ہی ہے کہ اس کا مضمون ایک ہی شعر میں پُورا ہو جائے۔ لیکن حسن کا تو آرٹ ہی یہ تھا لہٰذا وہ احسن حُسن و خوبی سے قطعات کو غزلوں میں سمو دیتے ہیں کہ شعر کا حُسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر یہاں ایک مسلسل غزل اور چند قطعہ بند اشعار پیش کیے جاتے ہیں:۔

جو منہ میں آیا اُس کے سو غصہ سے کہہ گیا   کچھ مجھکو بن نہ آئی میں رو رو کے رہ گیا
آگے زباں درازی تو اتنی نہ تھی کبھی   کیا جانے کس کے کہنے پہ وہ رشکِ مہ گیا
یہ سخت سُست باتیں سنائیں کہ کیا کہوں   دریا غضب کا تھا کہ مرے سر سے بہہ گیا
قابل جو کچھ نہ کہنے کے تھا اور سُننے کے   سو کہہ گیا وہ شوخ مجھے اور مَیں سہہ گیا
دل میں تو آئی تھی کہ حسن تو بھی بول اُٹھ   پر دل میں سوچ سوچ کے کچھ اپنے رہ گیا

غیروں میں دیکھ تجھکو بیٹھے ہوئے کہیں کیا   جو کچھ کہ اپنے دل پہ گزرا سو حال گزرا
پر منصفی سے اتنا فرمائیے کہ بارے   خدمت میں آپ کی بھی کچھ انفعال گزرا
کس تلخ کامیوں سے راتیں حسن نے کاٹیں   پر تو نہ اُس تک اِک دن شیریں مقال گزرا

کیا جانے حسن تھا یا کون تھا اُس آگے   احوال اپنا کوئی رو رو کے کہہ رہا تھا
تس پر جواب اس کو ملتا نہ تھا ادھر سے   بے چارہ اپنے سر کو ناحق پٹک رہا تھا

مَیں اِک روز پوچھا جو اُس شوخ سے   کہ کیوں کچھ تجھے بھی مری چاہ ہے
تو ہنس کر لگا کہنے کیا خوب کیوں   تو میرا کہاں کا ہوا خواہ ہے
یہ سُن کر جو مَیں چُپ رہا تو کہا   ابے دل کا مالک تو اللہ ہے

بھی ہیں۔ ان کے اشعار درد واثر اور سوز وگداز کے اچھے خاصے مجسّمے ہیں، اور ساتھ ہی ساتھ زبان کی سادگی، شیرینی اور گھلاوٹ بھی قابل داد ہے۔ ذیل میں انھیں خصوصیات کے ماتحت چند اشعار پیش کرکے اس مضمون کو ختم کیا جاتا ہے۔

جان و دل ہیں اُداس سے میرے　　اُٹھ گیا کون پاس سے میرے
شاید اُٹھنے کا تم نے قصد کیا　　اُڑ چلے کچھ حواس سے میرے

یار کا دھیان ہم نہ چھوڑیں گے　　اپنی یہ آن ہم نہ چھوڑیں گے

کب میں گلشن میں باغ باغ رہا　　میں تو جوں لالہ واں بھی داغ رہا
جو کہ ہستی کو نیستی سمجھا　　اس کو سب طرف سے فراغ رہا
دل حسن یا ایسے گم ہوئے کہ سدا　　ایک کو ایک کا سُراغ رہا

نہ میں شمع ساں سر بسر جل گیا　　سراپا محبت کا گھر جل گیا

زندگی نے وفا نہ کی ورنہ　　میں تماشا وفا کا دکھلاتا

روتے ہی روتے راہ میں آخر　　کام اپنا تمام کر اُٹھا

حجاب عشق گر حائل نہ ہوتا　　تو ملنا یار کا مشکل نہ ہوتا
نکرتا عشق سے گر علم تحصیل　　تو کچھ تحصیل کا حاصل نہ ہوتا

ہرگز نہ ہوش آیا اس کو کبھی عزیزاں　　بے ہوش ہو کے نکلا جو اس کی انجمن سے

دروازہ گر کھلا ہے اجابت کا پر حسن　　ہم کس کس آرزو کو خدا سے طلب کریں

یاس ہی یاس گرد ہے دل کے　　اور اب کوئی آس پاس نہیں

دل کو کھویا ہے کل جہاں جاکر　　جی میں ہے آج جی بھی کھو آئیں

کون گاڑا ہے نیم بسمل یاں　　زلزلہ جو اُٹھے ہے عالم میں

عشق کا اب مرتبہ پہونچا مقابل حسن کے　　بن گئے بت ہم آخر اس صنم کی یاد میں

گل ہے زخمی بہار کے ہاتھوں　　دل ہے صد چاک یار کے ہاتھوں
ہو رہا ہے خراب خانۂ دل　　دیدۂ اشکبار کے ہاتھوں

دل سے تیرے لگا گئے ہم　　کس آگ سے گھر جلا گئے ہم

بھولے سے تو نے پیار کی اک دن کی جو بات　　روتا ہوں دل ہی دل میں اُسے یاد کر ہنوز

جذباتِ فراق

(تازہ کلام پروفیسر رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری)

کوئی رگِ دلِ افسردہ آج پھر اُکساؤ
پھر آج غم کے شبستاں میں اک چراغ جلاؤ

یہ امتزاج تو دیکھو سکون و لرزش کا
نظر فریب ہے کیا حسن کے خطوں کا کھنچاؤ

ارے خود اپنا فریبِ نگاہ کیا کم ہے
یہ کیا ضرور کہ اُس کی نظر کے دھوکے کھاؤ

نظامِ دہر میں پہلا سا اب کہاں کس بل
کہ حسن و عشق میں اب کوئی لاگ ہے نہ لگاؤ

نہ عشق ہی کو خبر ہو نہ حسن ہی جانے
کسی سے عالمِ مستی میں اس طرح کھل جاؤ

جہاں میں ہے بڑی چیز خود فریبیٔ عشق
کسی کا عہدِ وفا جھوٹ ہی ہو، مان بھی جاؤ

اب اُن سے روز کی غمخواریاں نہیں اُٹھتیں
ارے تم اس سے تو اہلِ وفا کو بھول ہی جاؤ

اُداس اُس نے ہم اہلِ رضا کو دیکھ لیا
نگاہِ یار سے اب جلد کوئی بات بناؤ

حیات و مرگ کا وہ امتیاز اُٹھاتا ہے
اب اور جو ہو، محبت کو نام تو نہ دھراؤ

اگر مصائبِ دنیا کو دُور کرنا ہے
کچھ اپنی اپنی مصیبت سے بے خبر ہو جاؤ

فلک پہ گوش بر آواز ہیں ستارے بھی
ہے رات کتنی سہانی، کوئی فسانہ سناؤ

پھر اُس کی اُٹھتی جوانی کی کھینچ دو تصویر
شرابِ ناب کی پھر وہ گلابیاں چھلکاؤ

ابھی تو بلبلیں آسودۂ نشیمن ہیں
گلو کچھ اور ابھی رنگ و بو کے جال بچھاؤ

ملے گی جنسِ گراں حسن کی نہ دولت سے
جو مول لینا ہو تو ہو معلوم [illegible] کا بھاؤ

کہو دیارِ محبت کے رونے والوں سے
ہزار فتنے اُٹھاؤ، اُس آنکھ کو نہ جگاؤ

ترا نظارہ ہے یا کوئی نغمۂ دلکش
کہ آج تک تو نہ دیکھا تھا یہ بدن کا رچاؤ

نہ پوچھ اُلجھی ہوئی گتھیاں محبت کی
نہ پوچھ حسن کی باتوں میں کتنا ہے سُلجھاؤ

کہاں پھر اس کی نظر کی یہ کیف سامانی
چھڑا ہے نغمۂ سازِ حیات، جھوم جھو
بساطِ ناز پہ تو ہے کہ کوئی دیوی ہے
بھوؤں کی نرم لچک انکھڑیوں کا نرم جھ
جو دیکھنا ہو خرامِ سکوں نما اُس کا
مرے کلام کا دیکھو بہاؤ اور ٹھہرا
لہو کی بوند ہے دل، شانِ مدّ و جزر تو دیکھ
کسی ندی کا ہو جیسے اتار اور چڑھا
نسیمِ گیسوئے مشکیں سے تابہ کے اُلجھے
اب اس ہوا کو سوئے گم شدانِ غم سن
کرو نہ گریۂ معصومِ عشق کو رسوا
چمکتے جھوٹ سے پانی میں تو نہ آگ لگا
اگرچہ سادہ تھا کتنا گناہ آدم کا
وہ رنگ لائے گا کیا کیا ابھی تو دیکھتے جا
بجا یہ ترکِ محبت، بجا یہ عزمِ محال
کسی کو خیر نہ اب چاہنا، قسم تو نہ کھا
مجھے پیامِ عمل دے کے تم جو بھول گئے
تو ہو کے صرفِ عمل بھی میں کیا کروں گا بتا
نہاں تھی نظمِ جہاں میں یہ جنگِ عالمگیر
کسے پڑی ہے کرے ایسے میں جو بیچ بچاؤ
بجا ہے ایسے ہی نازک سمے میں اُٹھنا تھا
جو بیقرار ہوں اتنا، سنبھل بھی جاؤں گا، جاؤ
تڑپ کو ہم نے بنایا سکونِ بے پایاں
ہماری دُکھ بھری لے میں ہے کس قدر ٹھہرا
فراقؔ اس کی محبت سے باز کیوں آؤں
اب اس میں ایک جہاں سے بگاڑ ہو کہ بناؤ

اشعارِ فانی

اک معمّہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو اک خواب دیوانے کا
مر کے ٹوٹا ہے کہیں سلسلۂ قیدِ حیات
مگر اتنا ہے کہ زنجیر بدل جاتی ہے
پھولوں سے تعلق تو اب ہے، مگر اتنا
جب ذکرِ بہار آیا سمجھے کہ بہار آئی
کیا غم میں اب آہ بھی بخشی نہیں جاتی
اک سانس بھی کیا آپ کے ناکام نہ لیتے
میں نے فانیؔ ڈوبتے دیکھا ہے نبضِ کائنات
جب مزاجِ حسن خود برہم نظر آیا مجھے
محشر میں جبرِ دوست سے طالب ہوں داد کا
آیا ہوں اختیار کی تہمت لئے ہوئے

ماسکو سے نپولین کی پسپائی

آج جبکہ جرمنوں کی حالت ماسکو کے محاذ پر زبوں ہو رہی ہے اور وہ روسی فوجوں کے سامنے پسپا ہوتے چلے جا رہے ہیں
وہ واقعات یاد آتے ہیں جو ۱۸۱۲ء میں اسی ماسکو محاذ پر فرانس کے مشہور جنرل نپولین بوناپارٹ کو پیش آئے تھے
وہی مصیبتیں آجکل نازیوں پر بھی نازل ہو رہی ہیں۔ نپولین ماسکو میں داخل ہو گیا تھا لیکن چند ہفتے بعد اسے جاڑے
کی وجہ سے واپس ہونا پڑا اور اس کی اسی پسپائی نے ایک بھیانک منظر پیش کیا تھا۔ روسیوں نے پسپا ہونے
کا سامان رسد کاٹ دیا تھا، جس کی وجہ سے نپولین کے سپاہی پیٹ کی روٹیوں کو بھی محتاج ہو گئے تھے،
نے ان کا صفایا کر دیا تھا۔ نپولین نے یہ واقعات خود اپنے خطوط میں بیان کئے ہیں جو ماریہ لیوسیہ کے نام
گئے تھے۔ ذیل میں ناظرین کی دلچسپی کے لئے ان خطوط کے بعض اقتباسات درج کئے جاتے ہیں:۔

اسمولنسک ۱۸۔ اگست ۱۸۱۲ء

"آج صبح سے میں اسمولنسک میں ہوں، میں نے یہ شہر روسیوں سے اس وقت فتح کیا، جب تین ہزار روسیوں کو تہ تیغ کر چکا، زخمیوں اور قیدیوں کی تعداد اس سے تگنی تھی، میری صحت عمدہ ہے، مگر سخت گرمی پڑ رہی ہے میرے جنرل سواز نبرگ نے یہاں سے چھ سو میل کے فاصلہ پر روسیوں کو شکست دی ہے۔"

گاٹ ۔۳۔ ستمبر ۱۸۱۲ء

"میں آج رات کو یہاں سے روانہ ہو کر ماسکو کی طرف پیش قدمی کر رہا ہوں۔ آج کل یہاں خزاں کا موسم ہے، یعنی بالکل ویسا ہی موسم ہے جیسا اُس وقت تھا جب ہم فانٹین بلو کو گئے تھے۔ غلہ کی کھیتیاں بھرپور ہیں، زمین نباتات اور ترکاریوں سے سبز ہو رہی ہے، اسی لئے ہمارے سپاہی خوش ہیں اور یہی بہت بڑی بات ہے۔ بہر حال اس وقت معاملات خوش اسلوبی کے ساتھ چل رہے ہیں، اور میری صحت بھی اچھی ہے۔"

" بوروڈینو۔ ۸۔ ستمبر۔ حکمنامہ

میرے بہادر سپاہیو! جس لڑائی کے لئے تم اس قدر بیتاب تھے اب وہ شروع ہونے والی ہے، اور تمہاری بجا کوششوں پر فتح کا انحصار ہے اور فتح حاصل ہونے پر سامانِ زندگی کی کوئی کمی نہیں رہے گی۔ رہنے کو اچھے مکانات ملیں گے، اور گھر کی طرف بھی جلد ہی واپسی ہو گی، اس لئے جو کارنمایاں تم نے آسٹرلٹز، فریڈلینڈ وائٹسک اور اسمولنسک میں انجام دیئے تھے، وہی یہاں بھی انجام دو، تاکہ تمہارے پوتے پڑوتے کہا کریں کہ

"میرے دادا اباّ یا نانا نے ماسکو کے قریب بڑی زبردست جنگ لڑی تھی"۔
(بورڈونو کی لڑائی بڑے گھمسان کی لڑائی ہوئی تھی جس میں نپولین کی سپاہ کو شدید نقصان پہونچا تھا۔ اس کے آٹھ جنرل ہلاک اور نو زخمی ہوئے تھے۔)

بورڈونو ۔ ۸۔ ستمبر

"میں بورڈونو کے میدان جنگ سے تمھیں یہ خط لکھ رہا ہوں، روسیوں کی ایک لاکھ بیس ہزار فوج میدان میں تھی جسے کل میں نے شکست دی۔ لڑائی بڑے گھمسان کی ہوئی، مگر دو بجے بعد دوپہر ہم کو فتح حاصل ہوئی۔ کئی ہزار روسی اور تیس توپیں گرفتار کی گئیں۔ روسیوں کے نقصان کا اندازہ تیس ہزار کیا جاتا ہے۔ ہمارے بھی بہت سے آدمی ہلاک اور زخمی ہوئے۔ جنرل کالنکورٹ مارے گئے۔ میں خود لڑائی کی زد سے باہر تھا۔ بہرحال اس کو میری خوش نصیبی سمجھو۔ موسم کسی قدر سرد ہے"۔
اس وقت نپولین ماسکو روڈ پر تھا۔

نارجی ۔ ۱۳۔ ستمبر

"آج کل پیرس کا موسم تو بہت عمدہ ہو گا۔ یہاں چند روز سردی پڑکر اب پھر سردی ہلکی ہو گئی ہے، میرا زکام بھی اچھا ہو رہا ہے۔ اب میں ماسکو سے اٹھارہ میل کے فاصلہ پر ہوں۔"

۱۶۔ ستمبر

"اس سے پیشتر میں تمھیں ماسکو سے ایک خط لکھ چکا ہوں، جہاں میں ۱۴ ستمبر کو پہونچ گیا تھا۔ یہ شہر پیرس جیسا عظیم الشان ہے۔ یہاں صرف تین ہزار تو گرجا گھر ہیں اور ہزاروں عمدہ عمدہ محلات ہیں، کسی چیز کی یہاں کمی نہیں ہے۔ شرفا اور اُمرا تو پہلے ہی فرار ہو گئے اور تجارت پیشہ لوگ بھگا دیئے گئے تھے۔ اب شہر میں صرف عوام باقی رہ گئے ہیں۔ میرا زکام رفع ہو گیا ہے اور میں اب تندرست ہوں۔ خیال ہے کہ دشمن پیچھے ہٹتا ہٹتا قازان جا کر دم لے گا۔ یہ دل خوش کن فتح ماسکو کی لڑائی کا نتیجہ ہے۔"
جب نپولین کی فوج ماسکو میں داخل ہوئی تو ماسکو کے گورنر نے شہر میں آگ لگا دی جس سے ہزارہا روسی یا زخمی جل کر مر گئے، اور کروڑوں کا مالی نقصان بھی ہوا۔ غرض نپولین کو شہر نہیں بلکہ کھنڈر دیکھنے کو ملا۔ نپولین دھڑک رہا تھا، اور اس کی آتش بھڑک رہی تھی۔ چنانچہ ماسکو کی حالت دیکھکر اُس نے لکھا کہ:۔
"توبہ توبہ! یہ جنگ تو استیصال کی جنگ ہے۔ اس قسم کی ظالمانہ کارروائیاں تہذیب و تمدن کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتیں۔ خدا کرے جن لوگوں نے اس قسم کی تباہکارانہ تدابیر سوچی ہیں، ان پر صدیوں لعنت برستی رہے"
" ماسکو ۔ ۱۸۔ ستمبر ۔ میں اس سے قبل بھی تم کو ماسکو سے لکھ چکا ہوں۔ میں نے اپنے ذہن میں اس شہر کا

نقشہ قائم نہیں کیا تھا۔ سنتا تھا کہ ماسکو میں پانسو محلات ایسے شاندار ہیں جیسا کہ پیرس میں میرا محل ہے۔ ان محلوں میں بعض کے اندر فرانسیسی طرز کا سامان آرایش ٹھیا پڑا تھا۔ متعدد قصر شاہی، فوجی بارکیں اور شاندار اسپتال بتائے جاتے تھے، لیکن ان میں سے ہر چیز تباہ و برباد کردی گئی ہے۔ سب چیزوں کو چار دن سے لگی ہوئی آگ کھا گئی ہے۔ چونکہ معمولی لوگوں کے مکانات لکڑی کے ہیں اس لئے وہ ماچس کی طرح جل گئے۔ خود ماسکو کے گورنر اور روسیوں نے اپنی شکست پر جل کر اس خوبصورت شہر کو نذر آتش کر دیا ہے جس سے دو لاکھ باشندے خانہ برباد ہوگئے۔ پھر بھی بہت کچھ بچ رہا ہے اور ہماری فوجوں کو ہر قسم کا مال غنیمت ملا ہے۔ کیونکہ ایسی حالت میں لوٹ معاف ہے۔ شہر کے جلنے سے روسیوں کا بہت نقصان ہوا ہے اور ان کی تجارت کو سخت زوال پہونچے گا۔ ان کمبختوں نے پانی کے پمپ تک تباہ کر دیئے ہیں۔ میرا زکام اچھا ہوگیا ہے اور میں اب اچھا ہوں۔"

ماسکو۔ ۱۸ ستمبر

آج میں نے ہر جگہ جا کر شہر کو دیکھا، کیسا خوبصورت شہر ہے، جس کو تباہ کرکے روس نے سخت نقصان اٹھایا ہے، شہر میں صرف ایک ہزار مکان باقی رہ گئے ہیں، میری فوج کو رسد اور سامان مل گیا ہے۔ ان کے پاس سامان خورو نوش اور فرانس کی برانڈی کثیر مقدار میں موجود ہے۔"

(دو دن کے بعد آگ کی شدت نے نپولین کو قصر کریملین چھوڑنے پر مجبور کر دیا اور وہاں سے ڈلیسنہ کے قصر پیٹرووسکی میں چلا گیا۔)

ڈلیسنہ۔ ۲۰ ستمبر

"میں اب اپنے سرمائی قیام گاہ کی طرف جا رہا ہوں، بڑا پیارا موسم ہے، لیکن جلد ہی ختم ہو جائیگا، ماسکو کو جلا کر خاک میں ملا دیا گیا ہے اور اب وہ میرے جنگی منصوبوں کی رو سے قیام کے قابل نہیں رہا، اس لئے اب میں اس کو چھوڑتا ہوں اور اپنی فوجیں بھی یہاں سے ہٹا لوں گا۔ میری صحت اچھی ہے، اور تمام معاملات خاطر خواہ چل رہے ہیں۔"

لیکن جب ماسکو کی آگ بجھ گئی تو نپولین اسی روز قصر کریملین میں واپس آگیا۔

ماسکو۔ ۲۳ ستمبر

"ہم نے اتنے آگ لگانے والوں کو گولی کا نشانہ بنا دیا ہے کہ اب آگ بند ہوگئی ہے۔ صرف ایک چوتھائی شہر آگ سے باقی بچ گیا ہے۔ تین چوتھائی جل گیا ہے۔"

دوسرے دن نپولین نے صلح کی پیشکش کے ساتھ اپنا ایک ایلچی سینٹ پیٹرزبرگ بھیجا، اب وہ فرانس واپس جانے کو بے قرار ہو رہا تھا۔ لیکن زار روس نے اس کی تجویز کا کوئی جواب نہ دیا۔ ۵ اکتوبر کو نپولین نے دوسرا خط بھیجا اور اپنے وزیر مختار کو لکھا کہ "میں صلح چاہتا ہوں، لہذا صلح ہو جانا چاہیئے، میرا یہی اصرار ہے اور بس لیکن صلح باعزت ہونا چاہیئے۔"

لیکن روسیوں نے اِن تجاویزِ صلح پر کوئی توجہ نہ کی۔ ادھر روسی جنرل مارشل کوٹوسوف نے نقل وحرکت کی اور فرانسیسی سپاہ کے عقب میں پہونچ گیا۔ یہاں اُسے جنوبی صوبوں سے رنگروٹ اور سامان رسد کافی مقدار میں مل گیا اور اس سے فرانسیسی خطوط رسل ورسائل کو خطرہ پیدا ہو گیا۔ نپولین ششش و پنج میں مبتلا ہو گیا کہ کیا کرے۔ کیونکہ ایسی حالت میں سینٹ پٹیرزبرگ پر حملہ کرنے کا کوئی سوال ہی نہ پیدا ہو سکتا تھا چنانچہ نپولین نے اسمولنسک کی طرف ہٹ جانے کا فیصلہ کیا۔ اور ۱۵۔ اکتوبر کو اسمولنسک کی طرف زخمیوں اور بیماروں کا منتقل ہونا شروع ہو گیا۔ اور نپولین کی ڈیڑھ لاکھ فوج اور پچاس ہزار سواروں کا تانتا اسمولنسک کی طرف لگ گیا۔

"فلام کوٹیا۔ ۲۳۔ اکتوبر

قصر کریملین کو بارود سے اُڑا کر میں نے ماسکو کو چھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ شہر پر قبضہ رکھنے کے لئے بیس ہزار سپاہیوں کی ضرورت پڑتی اور اس سے میری کارروائیوں میں خلل پڑتا۔ موسم نہایت اچھا ہے۔ صبح سے دو بجے تک کُہرا چھایا رہتا ہے، پھر مطلع صاف ہو جاتا ہے اور آفتاب کی تمازت محسوس ہونے لگتی ہے۔ رات کو چاندنی رہتی ہے۔ ایسا موسم میرے دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔"

"بوروسک۔ ۲۴۔ اکتوبر

میری فوج کوچ کر رہی ہے۔ میں قصر کریملین کو اُڑا کر ماسکو سے چل رہا ہوں۔ موسم سرما میں یہاں کا قیام میرے نقشہ کے خلاف تھا۔ میری صحت اچھی ہے، کام عمدگی سے چل رہا ہے اور موسم اچھا ہے۔"

اس کے بعد فرانسیسی فوجوں کی پسپائی جاری رہی۔ راستہ بورڈینو کے میدان جنگ سے گذرتا تھا جہاں ٹوٹی توپیں، خون آلود وردیاں اور ہزاروں لاشیں پڑی سڑتی تھیں جنھیں بھیڑئیے کھا رہے تھے اور یہیں سے پسپائی نے تباہی کی صورت اختیار کرلی۔

"دیوزمہ۔ یکم۔ نومبر

اس خط کی تاریخ سے تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ میں پولینڈ کے قریب پہونچ رہا ہوں، جہاں میں اپنا سرائی ہیڈکوارٹر قائم کرنا چاہتا ہوں، اس طرح مجھ میں اور تم میں تین سو میل کا فاصلہ کم ہو جائیگا۔ یہاں سردی کافی ہے ٹمپریچر صفر کے درجہ سے تین چار درجے کم ہے، دھوپ خوب نکلتی ہے۔ میری صحت عمدہ ہے اور کام مزے سے چل رہا ہے۔"

گرانڈ آرمی کے بچے کھچے دستے خستہ و ماندہ چلے جاتے تھے۔ ابتری پھیل گئی تھی اور انھیں سپاہیوں میں چھڑی ہاتھ میں لئے شہنشاہ نپولین بھی چل رہا تھا۔ استراخانی ٹوپی سر پر اور سمور کی کوٹ جسم پر تھا۔

"۷۔ نومبر۔ گیارہ بجے

اب میں تم سے قریب تر ہوتا جا رہا ہوں۔ کل میں اسمولنسک میں ہونگا، یعنی پیرس سے بارہ سو میل قریب تر ہونگا

موسم سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اب جلد ہی برفباری شروع ہونے والی ہے۔"

نپولین ۹۔ نومبر کو اسمولنسک پہونچ گیا، ہر طرف تباہی و بربادی کے مناظر دکھائی دیتے تھے۔ شہر میں ہزاروں زخمیوں اور بیمار سپاہیوں سے پٹا پڑا تھا، رسد کم ہوتی جاتی تھی اور روسی فوجیں یلغاریں کرتی ہوئیں سلسلۂ تعلقات منقطع کرنے کو بڑھتی چلی آرہی تھیں، اس لئے سلسلہ منقطع ہونے سے پیشتر نکل جانا ضروری تھا۔ ۱۴۔ نومبر کو نپولین اسمولنسک سے روانہ ہوگیا، صورتِ حالات نازک ہوتی جاتی تھی، لیکن اپنے خطوط میں اُس نے اس کا کوئی ذکر نہیں کیا

اورچھا۔ ۱۹۔ نومبر۔　فوج کے نام اعلان

تم میں سے بہت سوں نے فوج کا ساتھ چھوڑ کر الگ الگ چلنا شروع کر دیا ہے۔ اس طرح گویا تم نے اپنی ڈیوٹی سے دغا کی ہے جس سے سپاہ کی عزت و آبرو اور سلامتی خطرہ میں پڑ گئی ہے۔ اس قسم کی بے قاعدگیوں کا خاتمہ ہونا چاہیئے۔ جو سپاہی حکم کی خلاف ورزی کرے گا اُس کو گرفتار کرکے سرسری سزا دی جائیگی۔"

اورچھا۔ ۲۰۔ نومبر

روس کی کاسک فوجوں نے ہمارے سلسلۂ آمدورفت پر چھاپہ مارا ہے، چند روز میں سلسلہ بدستور قائم ہو جائے گا۔ یہ خبر ملکہ نیپلز اور والسٹرائن کو بھی پہونچا دینا، اور میرا خط چانسلر اعظم کو بھی دکھا دینا۔"

فرانسیسی سپاہ کو بیریسینہ کے کنارے کی دلدلوں میں گھیر لیا گیا، دوسرے کنارے پر روسی جنرل ششاگوف کا قبضہ تھا، اور بائیں کنارے پر دوسری روسی فوج شمال کی طرف سے بڑھتی آرہی تھی، اور فرانسیسی سپاہ کے عقب میں ایک تیسری روسی فوج تھی، دریا پر بمقام بورلساف صرف ایک پُل تھا اور اُسی کے ذریعہ سے جان بچ سکتی تھی، لیکن روسی برقندازوں نے اس پل کو بھی جلا دیا، اس لئے نپولین کی بچی کھچی سپاہ نے دریائے بیریسینہ کو چھ میل نیچے ایک گھاٹ سے عبور کیا۔ ۲۷۔ نومبر کی رات کو نپولین بمقام ڈانوسکی ایک جھونپڑی میں رہا اور دوسرے روز صبح کو روسی فوجوں نے دو طرف سے حملہ کر دیا۔ نپولین کی فوج چلی جارہی تھی جس پر روسی کاسک چھاپہ مار مار کر نقصان پہونچاتے تھے۔ چار کمپنیوں پر مشتمل ایک اسپشل اسکواڈرن بنا لیا گیا تھا جس کے کپتان جنرل اور جس کے ماتحت افسران کرنیل تھے اور یہ نپولین کا باڈی گارڈ تھا۔

سمور گونی۔ ۵۔ دسمبر

تمھاری پریشانیوں کا حال پڑھکر میں خود پریشان ہوا جارہا ہوں۔ واقعات کی رفتار خاطرخواہ نہیں رہی لیکن ابھی تک معاملات خراب نہیں ہوئے ہیں۔ سردی البتہ بہت شدید پڑ رہی ہے۔

اسی روز نپولین نے اپنی فوج کے سرداروں کو طلب کیا اور فوج کی اعلیٰ کمان شاہ نیپلز کے حوالہ کردی اور خود بھیس بدل کر براہ ولنا روانہ ہوگیا اور وارسا، ڈریسڈن، لائپزگ ہوتا ہوا پیرس پہونچ گیا۔

روس کی مہم سے سات ماہ بعد ۱۸۔ دسمبر کو واپس ہوا۔

سینٹ ہلینا ۔ ۱۸۱۵ء

میں نے مسلح سپاہیوں سے جنگ کی، لیکن قدرت کی طاقتوں سے نہ لڑ سکا، میں نے انسانوں کی فوجوں کو شکست دی، لیکن میں آگ، پالا، اور موت پر فتح نہ پا سکا۔ قسمت مجھ سے زیادہ طاقتور تھی"۔

افسانۂ ابر

(حضرت ابر احسنی گنوری)

تکمیلِ تمنا کی بھی کوئی صورت کر دے انسانوں میں
یہ سادہ ورق کیوں رہ جائے اے حسن ترے افسانوں میں
قبروں کی ویرانی پہ نہ جا، اے دار العیش کے متوالے
آرام کی نیندیں آتی ہیں انساں کو انھیں ایوانوں میں
آغاز تھا میرا صبح ازل، انجام مرا شامِ محشر
میں ہوں اللہ کی قدرت کے اُن طولانی افسانوں میں
غم ہو یا دردِ محبت ہو، میں دل سے کس کو دور کروں
یہ بھی میرے مہمانوں میں، وہ بھی میرے مہمانوں میں
روداد مری ساری دنیا سنتی ہے اور سو جاتی ہے
نیندیں بھی پنہاں ہوتی ہیں شاید دلکش افسانوں میں
رودادِ محبت ہے میری با معنی بھی بے معنی بھی
سن لو تو حقیقت ہے لیکن سو جاؤ تو ہے افسانوں میں
آخر دل کے رنگیں آنسو آنکھوں میں اُمنڈ کر آ ہی گئے
جو میخانہ میں پنہاں تھی وہ آ پہونچی پیمانوں میں
دنیا کی سماعت پر نظریں کرتا ہوں اور رہ جاتا ہوں
سمجھا نہ جسے اب تک کوئی، ہوں ابر انھیں افسانوں میں

مدّ و جزر

(از جناب اقبال نراین جگر دہلوی)

جگر شباب محبت کی وہ ملاقاتیں — وہ انتہائے محبت میں شوق کی باتیں
مئے نشاط سے لبریز جام کیف آور — وہ دن سرور کے وہ لطفِ وصل کی راتیں
مجھے خوشی کے بھرا ایام یاد آتے ہیں
جنونِ عشق کے سب کام یاد آتے ہیں

جو سر میں جوششِ سودا تو پاؤں میں چکّر — تلاشِ یار میں پھرنا مرا وہ دن دن بھر
وہ کُو بکُو مرا دیوانوں کی طرح جانا — کسی کی دید کی حسرت میں مضطرب ہو کر
جو دن کو رہتی تھی محویت اُن کی اُلفت میں
خیال دل سے نہ جاتا تھا خوابِ راحت میں

وصالِ یار سے میں شاد کام رہتا تھا — مئے نشاط سے لبریز جام رہتا تھا
نہ انتظار کی گھڑیاں نہ انتظار کے دن — عجب سرور مجھے صبح و شام رہتا تھا
مزے وہ دردِ محبت کے یاد آتے ہیں
وہ رنگ خوبیِ قسمت کے یاد آتے ہیں

غرض یہ زیست مری وقفِ شادمانی تھی — مزے سے دن مرے کٹتے تھے کامرانی تھی
مرا وہ ذوقِ تماشا، وہ شوقِ نظارہ — وہ خوب وقت تھا کیا خوب زندگانی تھی
خوشی سے روح تھی بالیدہ غم کا نام نہ تھا
سوائے حُسن پہ مرنے کے کوئی کام نہ تھا

وہ درد جو کبھی دردِ فراقِ یار نہ تھا — جنونِ عشق جو منّت کشِ بہار نہ تھا
وہ حُسن جو مرے پیشِ نظر رہا ہر دم — وہ عشق جو مری نظروں میں خارزار نہ تھا
وہ اب نگاہوں سے افسوس ہو گیا روپوش
نہ لطفِ صحبتِ ساقی نہ اب وہ جوش و خروش

خزاں رسیدہ چمن ہے خزاں کا دَور ہے اب　　بساطِ عشق کا نقشہ ہی آہ اور ہے اب
بدل دیا ہے زمانے کو دَورِ گردوں نے　　ادا شناسِ محبت یہ ظلم و جور ہے اب

فراقِ یار نے برباد کر دیا مجھ کو
جنونِ عشق سے آزاد کر دیا مجھ کو

وہ اضطرابِ محبت ہے اب وہ شیون ہے　　نہ اب وہ جوشِ جنوں زندگی کا رہزن ہے
نہ کوچہ گردیاں اب ہیں نہ جوششِ سودا　　نہ ہے وہ چاکِ گریباں نہ تارِ دامن ہے

خدا کا شکر گئی بے قراریِ شبِ غم
بجائے رنج مسرت ہے اب مری ہمدم

سکوت ہے مرے دل کو قرار ہے مجھکو　　نہ اُن کے آنے کا اب انتظار ہے مجھکو
وہی نشاط ہے اگلا سا عیش و عشرت ہے　　نہ اب وہ کرب نہ وہ انتشار ہے مجھکو

نہ دردِ عشق وہ باقی رہا نہ رنج و الم
جگر کسی کے لئے نالہ ہے نہ وہ ماتم

یہ نہ کرے تو آدمی آخر کار کیا کرے

از جناب ابو الاثر حفیظ جالندھری

اب وہ نوید ہی نہیں صوتِ ہزار کیا کرے　　نخلِ اُمید ہی نہیں ابرِ بہار کیا کرے
دن ہو تو مہر جلوہ گر، شب ہو تو انجم و قمر　　پردے ہی جب ہوں پردہ در روئے نگار کیا کرے
عشق نہ ہو تو دل لگی، موت نہ ہو تو خودکشی　　یہ نہ کرے تو آدمی آخر کار کیا کرے
اہلِ ہوس بھی ہیں بہت خیر نظر نہ آئیے　　یہ تو مگر بتائیے، عاشقِ زار کیا کرے
موت نے کس اُمید پر سونپ دئیے ہیں بحر و بر　　منتِ غیار ہے بشر، منتِ غبار کیا کرے
شمع بھی ہے رہینِ یاس پھول بھی ہیں اداس اداس　　کوئی نہیں ہے آس پاس کنجِ مزار کیا کرے
گریۂ شرم واہ واہ فردِ عمل ہوئی تباہ　　دیکھئے اک یہی گناہ، روزِ شمار کیا کرے
اپنے کئے پہ بار بار کون ہو روز شرمسار　　مل گیا عذرِ پائیدار قول و قرار کیا کرے

حدِ ہنر نہیں حفیظ تیرے خیال میں کوئی
اہلِ کمال میں کوئی تجھ کو شمار کیا کرے

(از کتاب)

بنارس ہندو یونیورسٹی کی سلور جوبلی

اس امر سے کوئی مورخ انکار نہیں کرسکتا کہ ہندوستان قدیم زمانہ یا قرون وسطیٰ میں مہذب اور متمدن نہ تھا۔ یہ صحیح ہے کہ تمدن کا معیار زمانہ کے ہر دور میں انسان کی ذہنی اور اخلاقی ارتقاء کے ساتھ بدلتا رہتا ہے جس زمانہ سے مغربی اقوام نے ہندوستان کو اپنے حملوں کا نشانہ بنایا اور انیسویں صدی میں سلطنت انگلشیہ نے اپنا تسلط جمایا تو سیاسی داروگیر کے ساتھ مغربی تعلیم کا بھی آغاز ہوا۔ اس طرزِ تعلیم کی ابتدا اور مقاصد میں ایک خاص قسم کی ذہنی بیداری پیدا کردی اور مغربی طرز کی ابتدائی ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے مدرسے اسکول اور کالج قائم کئے گئے جن کے اجرا میں ایک زمانہ تک گورنمنٹ سے زیادہ عیسائی مشنریوں نے حصہ لیا اور انھیں اپنے مذہب اور عیسائی روایات کی اشاعت کا ذریعہ بنایا ہندوؤں اور مسلمانوں پر اس زمانہ تک ایک خاص قسم کی بےحسی طاری تھی۔ انگریزی تعلیم حاصل کرنیکے شوق میں ہم لوگ قومی اور مذہبی خصوصیات کو اس قدر فراموش کرچکے تھے کہ ان عیسائی درس گاہوں میں اپنی اولاد کو بخوشی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے بھیجتے تھے۔

سر سید احمد خاں وہ پہلے دور اندیش اور بیدار مغز بزرگ تھے جنھوں نے مسلمانوں کو ترقی کے راستہ پر گامزن کرنے کی غرض سے مغربی تعلیم کو ایک لازمی اور ضروری ذریعہ سمجھا اور اسکی ترویج و اشاعت کے لئے ۱۸۷۵ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قائم کیا جس میں تاریخ اسلام اور مذہبی تعلیم کا جزو بھی شامل کیا گیا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان نوجوان مغربی تعلیم کے ساتھ مذہبی اور قومی خصائص سے بھی بے بہرہ نہ رہیں۔ چنانچہ سرسید اپنی اس کوشش میں کامیاب رہے اور انکی وفات کے بعد علی گڑھ کالج نے یونیورسٹی کی صورت اختیار کرلی۔ اس زمانہ میں کسی ہندو لیڈر کو یہ خیال پیدا نہیں ہوا کہ اسی طرز کا ہندو کالج بھی قائم کرکے ہندوؤں کی مذہبی روایات کو زندہ رکھے۔

۱۸۹۹ء میں اینی بسنٹ صاحبہ نے اپنے چند ہندو رفقا کی مدد اور مشورہ سے ہندو کالج کی بنیاد ڈالی جس میں مغربی نصاب تعلیم کے علاوہ ہندو مذہب کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی تھی۔ اور جس کے تعلیم یافتہ طلبا نے ہندوستان کے مختلف حصوں میں جاکر اپنے قدیم مذہب کی عظمت اور حرمت کو ذہن نشین کرانے میں نمایاں حصہ لیا۔ مگر کچھ ایسے اسباب پیدا ہوئے جنکی بنا پر ۱۹۱۳ء میں اینی بسنٹ صاحبہ نے مع اپنے رفیقوں کے ہندو کالج سے علحدگی اختیار کرلی اور اس مشہور و معروف کالج کو مجوزہ ہندو یونیورسٹی کے سپرد کرنیکا تہیہ کرلیا۔ ۱۹۱۱ء میں پنڈت مدن موہن مالویہ، مہاراجہ صاحب دربھنگا اور ڈاکٹر اینی بسنٹ صاحبہ نے ہندو یونیورسٹی قائم کرنے کا مستقل ارادہ کرلیا تھا اور چندہ کی فراہمی کیلئے ہندوستان کے مختلف حصوں میں انھوں نے دورہ بھی کیا۔ چنانچہ ۴ فروری ۱۹۱۶ء بسنت پنچمی کے دن لارڈ ہارڈنگ والسرائے ہند نے اس شہرۂ آفاق یونیورسٹی کا سنگ بنیاد رکھا اور مہاراجہ صاحب بنارس نے نگوا میں ایک وسیع رقبہ زمین جو دریائے گنگا کے متصل واقع ہے یونیورسٹی کو ہدیتاً نذر کردیا۔ پنڈت مدن موہن مالویہ نے اپنی ان تھک کوششوں اور اس اثر کی بدولت جو انکو ہندوستان کے مختلف

حصّوں میں حاصل ہے کئی کروڑ روپیے جمع کئے اور اس یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کی توسیع کی۔ چنانچہ اس وقت اس یونیورسٹی میں اتنے علوم و فنون کے شعبے جاری ہیں جو ہندوستان کی دیگر یونیورسٹیوں میں نہیں پائے جاتے۔ بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندو قوم کے جو تمام ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہے قدیم روایات کی اگر کوئی یونیورسٹی پورے طور سے نمایندگی کرتی ہے تو وہ ہندو یونیورسٹی ہے جس کے استقلال اور ترقی پر ہندو قوم جس قدر فخر کرے کم ہے۔

اس پچیس سال کے عرصہ میں جب سے یہ یونیورسٹی قائم کی گئی ہے سائنس اور آرٹ، انجینئرنگ اور آیورویدک فیکلٹی کی ضروریات کے مطابق بڑی بڑی عالی شان عمارتیں اور ہوسٹل قائم کئے گئے، اُستادوں اور پروفیسروں کے قیام کیلئے بنگلے بنوائے اور پچھلے پچیس سال کے اندر ہندو یونیورسٹی نے جو ترقی کی ہے وہ بہت قابل تعریف اور صحیح معنوں میں حیرت انگیز ہے۔

یہ سچ ہے کہ اس یونیورسٹی کے روح رواں شریمان پنڈت مدن موہن مالویہ ہیں اور انھوں نے اسے جس قدر ترقی دی ہے وہ بھی ہر شخص کے علم میں ہے۔ مگر سخت ناانصافی ہوگی اگر اس موقع پر اُن بے نفس بزرگوں کے ایثار کا ذکر نہ کیا جائے جنھوں نے اسکی نشو و نما میں بیدریغ حصہ لیا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر بھگوان داس، پنڈت اقبال نرائن گرٹو، جو آجکل اس یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر ہیں۔ پنڈت چھیدا لال مرحوم، جنھوں نے بیس سال تک بلا معاوضہ اس کی خدمت کی، اور اپنا تمام سرمایہ اس کی نذر کر دیا۔ پروفیسر شیاما چرن ڈے جواب بھی بغیر کسی معاوضہ کے مصروف خدمت ہیں۔ یہ وہ شاندار کارنامے ہیں جو ابدالآباد تک ہندوستان کی تاریخ میں زندہ رہیں گے۔

اس یونیورسٹی کی خوش قسمتی کی اس سے بہتر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ اس کے صدر اعلیٰ یعنی وائس چانسلر سر رادھا کرشنن جیسے زبردست فاضل ہیں، جن کے علم و فضل کا سکّہ نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دنیا پر جما ہوا ہے، جو اپنے علم و فضل حکمت اور فلسفہ دانی۔ سحرالبیانی اور فصاحت کی بدولت تمام عالم میں مشہور ہیں۔ جن کو آکسفورڈ یونیورسٹی نے اپنے یہاں مشرقی مذہب اور فلسفہ کا پروفیسر مقرر کر کے اپنی علمی قدر دانی کا ثبوت دیا۔ سر رادھا کرشنن نے تھوڑے ہی عرصہ میں ہندوستان کے دور دراز حصّوں کا سفر کر کے اس جوبلی کی یادگار میں چندہ کی ایک معتدبہ رقم فراہم کر لی۔ بہرحال آپ کی بدولت ہندو یونیورسٹی کے اعزاز میں جس قدر اضافہ ہوا ہے اُس کے اعادہ کی چنداں ضرورت نہیں، کیونکہ آپ کے کارنامے انگریزی اخباروں کے ذریعہ سے ہم کو روزانہ معلوم ہوتے رہتے ہیں۔

۲۱۔ جنوری ۱۹۴۲ء کو سلور جوبلی کے موقع پر مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، اور ملک کے دیگر سربرآوردہ لیڈر جمع تھے، مہاتما گاندھی نے کانووکیشن کے موقع پر تقریر کرتے وقت ہندوستانی زبان کو تعلیم کا ذریعہ قرار دینے پر زور دیا۔ انھوں نے قوم کو شرم دلائی کہ ہماری تعلیم کا ذریعہ ایک غیر ملکی زبان ہے اور اس حقیقت پر اظہار افسوس کیا کہ ہم اپنی مادری زبان سے بے اعتنائی برتتے ہیں، اُمید ہے کہ کارکنان یونیورسٹی اس مسئلہ کی طرف جلد توجہ فرمائیں گے۔ اور ہندوستانی زبان کو وہ درجہ بخشیں گے جس کی کہ وہ مستحق ہے۔

تنقید کتب

تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں

از پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق

اُردو شاعری پر ایک نظر[1]

اِس کتاب کے لکھنے والے پروفیسر کلیم الدین احمد پروفیسر انگریزی پٹنہ یونیورسٹی ہیں، اس کا مقدمہ جناب فضل الرحمٰن صاحب نے لکھا ہے۔ یہ بھی پٹنہ یونیورسٹی میں انگریزی ادب کے پروفیسر ہیں۔ آپ نے اس مقدمہ میں جو بہت لمبا نہیں ہے نہایت جامعیت کے ساتھ اصل کتاب کے مضامین اور دلائل کو رونما کیا ہے۔ اصل کتاب چار سو صفحوں کی ہے۔ یہ اُردو شاعری کی تاریخ نہیں ہے۔ بلکہ اس میں میرا ور سودا کے زمانے سے آج تک کے اُردو شاعروں نے جن جن اصناف سخن میں شاعری کی ہے اُن سب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ہر صنفِ سخن کے فنی نکات اور اُس کے امکانات پر بحث کی گئی ہے

اس کتاب میں ایسی اور اتنی نئی باتیں کہی گئی ہیں کہ یہاں ہم ان میں سے صرف چند باتوں کی جھلکیاں ہی آپ کو دکھا سکتے ہیں۔ یہ کہنا بالکل مبالغہ نہیں کہ اس کتاب کی ایک ایک بات اُردو شاعری کے لئے ادبی انقلاب کا حکم رکھتی ہے۔ فاضل مصنف نے اُردو شاعری پر فارسی شاعری کے اثر کو مہلک بتایا ہے، جس کا سب سے خطرناک نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو شاعری پر غزل چھا گئی۔ فاضل مصنف نے نہایت تفصیل کے ساتھ غزل کی ٹکنیک[2] پر بحث کرتے ہوئے بتایا ہے، کہ غزل صرف انحطاط اور انتشار کی فضا میں پیدا ہو سکتی ہے اور پل سکتی ہے۔ اِسی لئے غزل کا ہر شعر ایک دوسرے سے گویا منہ پھیرے ہوئے رہتا ہے۔ اِس میں مطلع، اشعار اور مقطع ہوتے ہیں لیکن حقیقی فنّی کارنامے کا آغاز، ترقی اور انتہا پیدا ہونا ممکن ہے۔ غزل کے اشعار کی بے ربطی سے طبیعت منغّص ہو جاتی ہے۔ یہ تمام باتیں میر سودا اور درد سے لے کر آج تک کے مشہور غزل گو شعرا کی پوری پوری غزلوں کا حوالہ دے کر بتائی اور سمجھائی گئی ہیں۔ بقولِ مصنف اگر یہ شعرا مغربی ادب سے واقف ہوتے تو غزل نہ کہتے۔ لیکن یہ پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ اگر یہی بات ہے تو رامائن، مہابھارت، کالیداس کی نظمیں اور ڈرامے، کبیرداس اور دوسرے ہندی شعرا کے کلام کے مطالعہ سے ایسا کیوں نہیں ہوتا۔ خود میر، سودا، میر حسن اور نظیر اکبرآبادی نے افسانوں اور دوسرے مسائل کو مفصل مسلسل اور مربوط اور منضبط طور پر منظوم کر کے مستقل نظموں کا ضخیم مجموعہ مرتب کرنے کے باوجود غزلیں کیوں کہیں۔ کیا خود فارسی

---

[1] یہ تنقید اُردو کی نئی کتابوں کے ریویو کے سلسلے میں لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے براڈکاسٹ ہو چکی ہے، اب ڈائرکٹر صاحب اسٹیشن مذکور کی عنایت سے زمانہ میں شائع ہو رہی ہے

[2] Technique

میں مثنویاں نہیں تھیں۔ پھر غزل ہی کیوں ہمارے شاعروں اور ہماری قوم کے دل کو لگتی رہی۔ کیا ایسا تو نہیں ہے کہ جس زمانے میں اُردو شاعری کا آغاز ہوا تب سے قریب قریب سو برس تک غزل سے زیادہ فطری شاعری ہماری قوم کے لئے ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ صرف اعلیٰ قسم کی ایسی داخلی شاعری امن و اماں سے محروم قوم کو تشفی دے سکتی ہے جس کے ایک ایک مصرع اور ایک ایک شعر میں زندگی کی رام کہانی ہو۔ ہم اور فاضل مصنف تو اسی زمانہ کے ہیں لیکن کیا آج بھی ملک میں ایسے سیکڑوں ہزاروں آدمی نہیں ہیں جو دنیا بھر کے ادب سے بخوبی واقف اور متاثر ہوتے ہوئے بھی اس کے معترف ہیں کہ غزل کے ایک شعر میں جو دو عالم گیر وسعت اور جامعیت ہوتی، اور انسانیت کی جو رام کہانی ہوتی ہے وہ اچھی سے اچھی نظموں کے اشعار میں مشکل سے نظر آتی ہے۔ غزل کے اشعار کا ایک دوسرے سے منھ پھیرے رہنا بھی ایسی بات ہے جو بے ڈھنگی اور بے کیف غزل گو شعرا کی غزلوں میں تو ضرور نظر آتی ہے یا اچھے غزل گو شعرا کی اُن غزلوں میں جہاں ان کا تخیل اور وجدان تھک گیا ہو۔ ورنہ اچھی غزل کے بظاہر ایک دوسرے سے الگ اشعار دشنہ و خنجر، بادہ و ساغر کے پردوں میں زندگی کے مستقل اور مرکزی کشاکشوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ہر غزل کی ایک بنیادی کیفیت ہوتی ہے۔ اس تہ نشین دھارے[1] کی اُوپری سطح پر مختلف اشعار موجوں کی طرح اُٹھتے ہیں۔ بہر حال اس امر میں فاضل مصنف کے دلائل جو نہایت سنجیدگی سے دیئے گئے ہیں نہ تو دلچسپی سے خالی ہیں اور نہ غور و فکر سے۔

فاضل مصنف کا آخری فیصلہ غزل کے باب میں اس کتاب کے حصہ دوم کے صفحہ ۱۹۲ پر درج ہے اور وہ یہ ہے کہ "اُردو شاعری ترقی کر ہی نہیں سکتی جب تک غزل سے ایک مدت کے لئے کنارہ کشی نہ کی جائے"۔ اس فیصلے کے بعد بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ غزل کو ایک دم پھانسی کیوں نہ دے دی جائے۔ ایک مدت کے لئے یعنی دس بیس پچاس برس کی پھانسی کا کیا مفہوم ہے۔ بُری چیز ایک مدت کے بعد اچھی چیز کیونکر بن سکتی ہے۔ لیکن غزل کے سمجھدار اور ذمہ دار معاون بھی یہ ضرور چاہیں گے کہ کچھ دنوں تک غزل کو آرام لینے دیا جائے۔ اور اس کے بعد بھی صرف سجل دل و دماغ اور رچا ہوا مذاق رکھنے والے لوگ ہی غزلیں کہیں تاکہ اس دورِ خزاں کے بعد نئی بہار آئے۔ نیا خون اور نئی روح غزل کی رگوں میں دوڑے اور نغمہ و شعر کی وہ وحدت (Lyrical Unity) غزل میں آ جائے جس کے فقدان یا عدم تکمیل کے فاضل مصنف شاکی ہیں۔

غزل کے علاوہ قصائد، مثنویوں، قطعات، مسدس، مخمس، اور ترجیع بند پر بھی اس کتاب میں نہایت سنجیدگی سے بہت سی کارآمد باتیں کہی گئی ہیں، اور یہاں فاضل مصنف کا مغربی ادب سے مانوس ہونا تنقید کیلئے بہت مفید ثابت ہوا ہے۔ مرثیہ پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ انیس و دبیر کے الگ الگ محاسن و معائب بتاتے ہوئے اردو کے اُن تمام مرثیوں کی جو واقعۂ کربلا سے متعلق ہیں عام خرابیاں بتائی گئی ہیں، مثلاً ناقص اور کمزور کردار نگاری

---

[1] Under Current.

منظر نگاری میں جذبات کی کمی اور اچھی تصویر کشی کے باوجود پورے منظر کا آنکھوں کے سامنے نہ آنا۔ عربی زندگی و فضا کا ہندی زندگی و فضا کے ساتھ انمل اور بے جوڑ اتحاد جو طبیعتوں کو بدمزہ کردے۔ گھوڑے، تلوار اور دیگر ضمنی چیزوں کا ذکر اسی تفصیل اور اسی زور کے ساتھ کرنا جس طرح اس واقعہ کے عمل (Action) اور اس کے المیہ عناصر کا ذکر ہے۔ مرثیوں میں واقعات کے تناسب کا احساس نہ ہونا اور ان میں مرکز ثقل نہ ہونا۔ تمہیدی اور فروعاتی بندوں کی بہتات سے مرثیوں کا اتنا طویل ہو جانا کہ طبیعت بدمزہ ہو جائے۔ اور سب سے بڑھکر یہ عیب کہ واقعۂ کربلا کے اسباب کا کوئی مسلسل بیان اور تاریخی اثرات وغیرہ کچھ بھی نہیں ملتے۔

اس کے بعد دَور جدید کی اُردو شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ آزاد اور حالی کو نئی شاعری کے محرکوں، نقادوں اور شاعروں کی حیثیت سے سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں آپ کو یہ چونکا دینے والے جملے بھی کتاب زیر نظر میں ملیں گے:۔

"آزاد، حالی، شبلی، کسی میں مجذ شاعر ہونے کی صلاحیت نہ تھی" اقبال ایسے شاعر تھے جس کی اُردو شاعری منتظر تھی..... زبردست شخصیت، تبحر علمی کے بھی حامل تھے..... اُردو شاعری کو ابتذال سے نکال کر اعلیٰ مرتبہ پر جگہ دینا اُن کے لئے مشکل نہ تھا، لیکن اس طرف انھوں نے توجہ نہ کی..... اپنے لئے بہترین قومی اور ملی شاعری کا مرتبہ بھی حاصل کر لیا لیکن اُردو شاعری تشنہ کام ہی رہی۔"

مصنف صاحب جوش اور سیماب کا نام ایک ساتھ لیتے ہوئے فرماتے ہیں" جوش کی بیشتر نظمیں حقیقت میں نظمیں نہیں غزلیں ہیں جو نظم کا بھیس بدل کر نکلی ہیں۔" ترقی پسند ادیب پر بحث کرتے ہوئے جہاں اور بہت سے حکم لگائے گئے ہیں وہاں یہ بھی کہا گیا ہے۔" شاعر اشتراکی ہو یا سرمایہ دار امر ضروری یہ ہے کہ وہ صحیح معنوں میں شاعر ہو۔ سرمایہ دار شاعر اپنے جذبات و تصورات کو جوش کے ساتھ محسوس کرے اور ان کو حسن و صداقت کے ساتھ بیان کرے تو وہ کامیاب شاعر ہو سکتا ہے"۔ سوال یہ ہے کہ کیا وقت کی ضرورت، سماج کی ضرورت اور زندگی کی پکار سے شاعر کے جذبات و تصورات کو کوئی تعلق ہونا چاہیئے یا نہیں۔ کیا بے وقت کی شہنائی محض اس لئے خوشگوار معلوم ہوگی کہ کوئی اپنی دُھن میں مست ہو کر اُسے بجا رہا ہے۔ میں تو عالم خیال میں فاضل مصنف کو یہ کہتے ہوئے سنتا ہوں کہ" زمانے کی ضرورتوں، سماج کے مسائل و مصائب، دنیا کی کشمکش اور زندگی کی پکار سے شاعر کو کوئی غرض نہیں"۔ عالم خیال ہی میں میں یہ کہکر چُپ ہو جاتا ہوں" ہاں ایسا ہی ہے ؟"

بہرحال یہ کتاب سیکڑوں لحاظ سے اس قابل ہے کہ سنجیدگی سے ملک کے ادیب اور طلباء ادب اس کا بغور مطالعہ کریں۔ یہ کتاب قدم قدم پر ہمیں چونکا دیتی ہے۔ اُصولی بحثوں کے ساتھ ساتھ قدماء سے لے کر اب تک کے تیس چالیس مشہور شعراء کے کلام پر انفرادی حیثیت سے بحث کی گئی ہے۔ فاضل مصنف نے اپنے الدمحترم

حضرت علامہ ڈاکٹر عظیم الدین احمد کے کلام پر بھی تبصرہ کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ ان کی نظمیں اِن تمام معائب سے پاک ہیں جو حالی۔ چکبست۔ اقبال۔ جوش اور اُردو کے تمام شاعروں کے کلام میں ملتے ہیں۔ مگر موصوف نے ہمیں یہ نہیں بتایا کہ وہ اجتہاد و انقلاب جو حالی و اقبال اور جوش کی کوششوں سے اور ترقی پسند شعرا کے کارناموں سے بقول مصنف رونما نہ ہوسکا کیا وہ علامہ ڈاکٹر عظیم الدین احمد کے مجموعۂ کلام کی اشاعت سے رونما ہوگا۔ فاضل مصنف نے ہمیں یہ اُمید نہیں دلائی۔

کتاب اس جملہ سے شروع ہوتی ہے "شاعری کی ہندوستان میں قدر و منزلت نہیں"۔ اور اخیر میں ایک مایوسانہ جنبشِ سر کے بعد اس جملے پر ختم ہوتی ہے۔ "اُردو شاعری کا مستقبل اُمید افزا نظر نہیں آتا"۔

شرحِ درد

خواجہ میر دردؔ نے سب سے پہلے تصوّف کو اُردو شاعری میں داخل کیا۔ چونکہ مسائل تصوف ہر کس و ناکس کی سمجھ سے باہر ہیں اس لئے خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی نے جو اُردو نثر کے ایک صاحب طرز مصنف ہیں خواجہ صاحب کے دیوان کی شرح لکھکر ایک اہم ادبی خدمت انجام دی ہے۔ اس کتاب میں خواجہ دردؔ کے خاص خاص اشعار کی جن میں تصوّف کی چاشنی ہے یا جو تلمیح طلب اور عام فہم سے کسی قدر بالا تھے نہایت عمدگی کے ساتھ شرح کردی گئی ہے سہل اشعار جن میں کوئی بات قابلِ شرح نہیں تھی نظرانداز کر دیئے گئے ہیں۔ شرح کے بارے میں ہم سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ "نظر اپنی اپنی سمجھ اپنی اپنی" ہماری رائے میں بعض شرح طلب اشعار چھوٹ گئے ہیں، اور بعض شعروں کی جو شرح کی گئی ہے اُس پر دو رائیں ہوسکتی ہیں، مگر خواجہ محمد شفیع صاحب کا دیباچہ ہر حیثیت سے قابلِ قدر ہے۔ لکھائی چھپائی، کاغذ بھی اچھا۔ ضخامت چھوٹی تقطیع کے ۲۱۶ صفحات۔ قیمت سوا روپیہ۔ شائقین خواجہ محمد شفیع صاحب ٹیا محل دہلی سے طلب کریں۔

یادِ رفتگاں

خواجہ عبدالمجید صاحب دہلوی نے اس چھوٹی سی کتاب میں چھبیس بزرگوں کی زندگی کے بعض چشم دید واقعات بیان کرکے اُن کے سوانح حیات اور عادات و خصائل پر قابل قدر روشنی ڈالی ہے۔ جن بزرگوں کے حالات قلمبند کئے گئے ہیں اُن میں میر محبوب علی خاں مرحوم نظام دکن، نواب سالار جنگ، نواب وقار الملک، سر سید احمد خاں، ڈپٹی نذیر احمد مولانا شبلی، حضرت داغ دہلوی، پنڈت رتن ناتھ سرشار، مولوی عزیز مرزا، حکیم محمود خاں، حکیم واصل خاں، نواب محسن الملک، سر شاہ سلیمان، وغیرہ بزرگ شامل ہیں۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہوچکا ہے اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ اس میں صرف چشمدید واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ سماعی باتیں بالکل نظرانداز کردی گئی ہیں۔ یہ حالات قدرتاً مختصر مگر نہایت دلچسپ ہیں۔ اسلوب بیان دلکش اور اس کی زبان بھی بہت پیاری ہے چھوٹا سائز حجم ۱۱۲ صفحات قیمت بارہ آنہ ملنے کا پتہ: مکتبۂ جامعہ ملیہ دہلی۔

رفتارِ زمانہ

آجکل روس کے سوائے اور کسی محاذ سے کوئی اطمینان بخش خبر نہیں آرہی ہے۔ مشرق بعید میں تو جاپان کو چند ہی ہفتوں میں خلاف توقع اور غیر معمولی کامیابیاں حاصل ہوگئی ہیں۔ سارا ملایا اس کے قابو میں آگیا اور دو ہفتوں کی جد و جہد کے بعد سنگاپور کی اہم بندرگاہ پر بھی اس کا قبضہ ہوگیا ہے۔ اس بندرگاہ کے استحکامات پر برطانیہ نے چھ کروڑ پاؤنڈ صرف کئے تھے۔ لیکن اس کا حشر وہی ہوا جو ۱۹۴۰ء میں فرانس کی میجنو لائن کا ہوا تھا۔ برطانوی فوج نے جس میں انگریزی، آسٹریلین اور ہندوستانی سپاہی سبھی شامل تھے دشمن کے مسلسل حملوں کا انتہائی بہادری سے مقابلہ کیا لیکن دشمن نے ساز و سامان اور آب و دانہ سب کچھ اپنے قبضہ میں لیکر مزید مقابلہ کی گنجائش ہی باقی نہ رکھی۔ چنانچہ برطانوی سپہ سالار کو مجبور و معذور ہوکر جاپانیوں کے سامنے بلا شرط ہتھیار ڈالنے پڑے۔ سنگاپور کی تمام قلعہ بندیوں کے علاوہ ساٹھ ہزار سپاہی بھی دشمن کے ہاتھوں قید ہوگئے۔ انمیں ۳۲ ہزار ہندوستانی سپاہی بتلائے جاتے ہیں۔ ان کا کل فوجی سامان بھی جاپان کے ہاتھ لگا۔ اس شکست سے مشرق بعید میں برطانیہ کے فوجی انتظامات کو بہت بڑا دھکا لگا ہے۔ اب جاپانی ایک طرف سماٹرا اور دوسری طرف برما پر اپنا قبضہ جمانے کی سر توڑ کوشش کر رہے ہیں۔ سماٹرا پر قبضہ کرکے وہ جزیرۂ جاوا پر حملہ آور ہوکر وہاں سے تیل وغیرہ حاصل کرنے کی فکر میں ہیں۔ برما میں رنگون پہونچکر وہ برما روڈ کا راستہ بند کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ اس وقت اس راستے سے چین کو جو جنگی سامان بھیجا جارہا ہے وہ نہ جاسکے[1]۔ برما کے بعد جزیرۂ لنکا، مدراس و کلکتہ کی بندرگاہوں کے لئے جاپان کے جنگی جہازوں کی گولہ باری کا خطرہ پیدا ہوگیا ہے۔ بات یہ ہے کہ جاپان نے ایک طرف ہنالولو اور پرل ہاربر میں امریکی بحری طاقت کو سخت نقصان پہونچا کر اسے فی الحال مفلوج کر دیا۔ دوسری طرف ملایا کے قریب "پرنس آف ویلز اور ریپلس" نامی برطانیہ کے دو زبردست جنگی جہاز ڈبوکر غرق کرکے برطانوی حفاظت کی ساری اسکیم برباد کردی۔ اس طرح بحر الکاہل میں اتحادیوں کا بحری اقتدار ختم ہوکر فی الحال جاپان کے ہاتھ آگیا ہے اب جبتک یہ حالت ہے اور امریکہ و برطانیہ پھر نئے سر سے بحر الکاہل میں اپنا اقتدار قائم کرکے جاپان کو یہاں سے بیدخل نہیں کر دیتے ہیں اس وقت تک مشرقی ملکوں کی حالت بہت ہی نازک اور خطرناک رہیگی۔ یہی وجہ ہے کہ مسٹر چرچل نے سنگاپور کی شکست کی پوری اہمیت قبول کرتے ہوئے اسے ساری حکومت برطانیہ کیلئے ایک انتہائی افسوسناک واقعہ قرار دیا ہے۔ برطانیہ کو موجودہ جنگ کا سب سے بڑا نقصان سنگاپور ہی میں برداشت کرنا پڑا ہے۔ اس نقصان کی تہ میں بھی ہوائی طاقت کی کمزوری ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جاپان نے پچھلے چند سال کے اندر چپکے ہی چپکے اپنی ہوائی اور بحری طاقت میں بہت بڑا اضافہ کرلیا ہے۔ برطانیہ پچھلی جنگ کے بعد بالکل غافل رہا بلکہ برطانیہ کے مقتدر مدبر کمی اسلحہ کا خواب دیکھتے رہے اور محوری طاقتیں آئے دن کمزور ملکوں کے ساتھ جو زیادتیاں کرتی رہیں انھیں چپ چاپ خاموشی سے برداشت کرتے رہے۔ جاپان بھی کئی سال سے محوری طاقتوں

[1] اس مضمون کے لکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ گورنمنٹ برطانیہ نے اب یہ راستہ ترک کرنے کا ارادہ کرلیا ہے اور آسام سے خشکی کا ایک نیا راستہ کھول دیا ہے جس سے چین کو سامان جنگ بھیجا جائیگا۔

کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔ برطانوی مدبرین افسوسناک غفلت برتتے رہے اور کسی جگہ انھوں نے ظلم و تشدد کا ڈٹ کر تدارک کرنا مناسب نہ سمجھا اسی کا نتیجہ آج یہ دیکھنے میں آرہا ہے۔ جاپان بحرالکاہل پر قبضہ کرنیکے بعد ایک طرف آسٹریلیا اور دوسری طرف ایشیا کے تمام بڑے بڑے ملکوں پر اپنا تسلط جمانیکی سر توڑ کوشش کر رہا ہے۔ فلپائن میں البتہ مزاحمت کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے اور چین کے وطن پرست سپاہی بڑے استقلال اور دلیری سے اسکا مقابلہ کر رہے ہیں چنانچہ وسطی اور شمالی چین میں انھیں مقامی کامیابیاں حاصل ہو رہی ہیں۔ چینیوں نے کئی اہم مقامات جاپان کے قبضے سے چھڑا لئے ہیں اس وقت چینی فوجیں برما کی حفاظت میں بھی حصہ لے رہی ہیں اور سیام میں بھی داخل ہو گئی ہیں وہ جاپانیوں سے مسلسل ساڑھے چار سال سے لڑ رہے ہیں انھیں اُن کے سب ہتھکنڈے معلوم ہو گئے ہیں اسلئے اگر ساز و سامان کی مدد ملتی رہے تو پوری امید ہے کہ وہ جاپان کو دم لینے کا موقع نہ دینگے۔ اسی وجہ سے وزیر اعظم جاپان نے اہل چین پر ڈورے ڈالنا شروع کر دیا ہے لیکن ہمکو بھروسہ ہے کہ اہل چین جو اپنی ملکی آزادی قائم رکھنے کیلئے اتنی زبردست قربانیاں کر چکے ہیں اُسکے مکر و فریب میں نہ آئینگے اور اتحادیوں کے ساتھ ملکر جاپان کو شکست دیکر ہی دم لینگے۔ جاپان اسوقت ڈچ انڈیز کے مقبوضات اور کولمبو وغیرہ سب پر اپنا اقتدار قائم کرنیکی فکر میں ہے اور آسٹریلیا کے مشہور بندرگاہ پورٹ ڈارون پر پے در پے حملے کر رہا ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جاوا اور برما کے علاوہ جاپان جنوبی چین پر بھی حملہ کرنیکی تیاری کر رہا ہے لیکن اسمیں اہم مشکلات حائل ہیں جنکی وجہ سے جاپان ابتک اس طرف رُخ نہیں کر سکا ہے۔

لیبیا میں جرمن جنرل رومیل کو کمین گاہ سے مزید کمک پہونچ گئی ہے اور اُس نے ایک مرتبہ پھر اپنے خالی کردہ علاقے کو انگریزی فوج سے واپس لینے کی کوشش کی۔ چنانچہ بنغازی ایک مرتبہ پھر اُسکے قبضہ میں ہو گیا۔ لیکن ادھر چند دن سے فریقین ایکدوسرے کی تاک میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس وقت اس علاقہ میں کسی طرف سے کوئی اہم کارروائی نہیں ہو رہی ہے لیکن رائل ایر فورس بنغازی وغیرہ پر بڑے زور شور سے بمباری کر رہی ہے۔ ۱۶ و ۱۷ فروری کو بڑے پیمانے پر حملے کئے گئے۔ شاید اسی مسلسل سرگرمی کی بدولت جنرل رومیل غرا ہو کر سست پڑ گئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فریقین ایکدوسرے پر زور و شور سے حملہ کرنیکی تیاریاں کر رہے ہیں۔

دوسرے جنگی محاذوں سے قطع نظر روس کی طرف دیکھئے تو اُسکے دلیر دلاور سپاہی اس کڑاکے کے جاڑے میں جرمن فوجوں کا ناک میں دم کئے ہوئے ہیں حالانکہ ہٹلر نے اپنے سپاہیوں کی مسلسل پسپائی سے پریشان ہو کر تازہ دم فوجیں بھیجنا شروع کر دی ہیں اور انھیں پیچھے ہٹنے کی ممانعت کر دی ہے۔ یہ بات اس وجہ سے اطمینان بخش ہے کہ اس تازہ کمک سے آنیوالے موسم بہار کے جرمن حملہ کا انتظام کسی نہ کسی حد تک ضرور درہم برہم ہو گا۔ پچھلے سال جاڑے کے موسم ہی میں ہٹلر نے روسی حملے کی تمام تیاریاں مکمل کی تھیں۔ امسال روسیوں نے اُسے جاڑے میں بھی چین سے بیٹھنے نہ دیا اور جان و مال کے کثیر نقصانات کے باوجود روسیوں کے دم خم میں کوئی کمی نہیں ہوئی ہے بلکہ انھوں نے تہیہ کر لیا ہے کہ جبتک سرزمین روس کو وہ دشمن سے پاک و صاف نہیں کر لیتے وہ نہ خود چین سے بیٹھیں گے اور نہ جرمنوں کو چین سے بیٹھنے دینگے چنانچہ جرمنوں کی تازہ مزاحمت کے باوجود انھیں لینن گراڈ، سمولنسک اور یوکرائن کے علاقوں میں مقامی فتوحات حاصل ہو رہی ہیں۔ اس وقت تک روسیوں نے چار ہزار آٹھ سو گاؤں اور اسّی شہر جرمنوں سے واپس لے لئے ہیں جرمن قدم قدم پر مزاحمت کر رہے ہیں لیکن روسی فوجیں آگے بڑھتی چلی جا رہی ہیں خدا کرے آئندہ دو ماہ میں وہ لینن گراڈ مشرقی یوکرائن اور کریمیا کے رقبوں کو جرمنوں سے آزاد کرا لینے میں کامیاب ہوں کیونکہ اسمیں انھیں کامیابی حاصل ہو گئی تو پھر ہٹلر کو موسم بہار کے حملے میں نئی مشکلات درپیش آئینگی۔

اس ماہ میں ایک اور ناگوار واقعہ یہ ہوا کہ جرمنی کے دو بڑے جنگی جہاز اور ایک کروزر جو پچھلے دس ماہ سے برسٹ میں مقید پڑے ہوئے تھے ایک روز

تنگنائے ڈوور کے راستے سے بھاگ نکلے۔ رائل ایر فورس نے خبر پاتے ہی ان پر گولہ باری کی کوشش کی لیکن جرمن جہازوں نے دھوئیں کے دل بادل چھوڑ کر اپنی جان بچا لی اور صحیح سلامت ہیلی گولینڈ پہنچ گئے۔ اس سلسلے میں انگریزی ہوائی جہازوں کو بھی کچھ نقصان اٹھانا پڑا۔ انگلستان میں اس واقعہ سے بڑی ہلچل پھیل گئی۔ سنگاپور کی شکست کے بعد جرمن جہازوں کا انگلستان کی ساحلی فوج کے حملوں سے اس طرح بچکر نکل جانا انگریز خاص و عام سب کو بہت ہی ناگوار ہوا ہے۔ اور پارلیمنٹ میں بھی اس عام ناراضی کی صدائے بازگشت سنائی دی اخبارات نے بھی وزارت پر خوب لے دے کی۔ مسٹر چرچل نے حال ہی میں پارلیمنٹ میں جنگ کی مجبوریوں کے متعلق ایک صاف اور واضح بیان دیکر یہ کہہ دیا تھا کہ اس وقت لڑائی کا پالنہ کچھ ایسا پڑگیا ہے کہ اہل برطانیہ کو کچھ اور بری خبریں سننے کیلئے تیار رہنا چاہیئے۔ انھوں نے صاف بتلا دیا تھا کہ یہ سال انگلستان کیلئے سخت آزمایش کا سال ہے۔ مگر اس تنبیہ کے باوجود اہل برطانیہ مسٹر چرچل کے بعض ساتھی وزیروں کے طریق عمل سے خوش نہیں ہیں اور وزارت میں اہم تبدیلیوں پر زور دے رہے ہیں۔ اس وقت تو پارلیمنٹ میں مسٹر چرچل پر اعتمادی ووٹ پاس کر دیا گیا لیکن اندر ہی اندر لوگوں میں بے اطمینانی باقی رہی۔ چنانچہ سنگاپور کی شکست اور ڈوور کے واقعہ کے بعد ہی پھر وزیر اعظم پر زور ڈالا گیا۔ بحر اطلانتک میں جرمن ڈبکینیاں جہازوں کو جو نقصان پہونچا رہی ہیں اُس سے بھی عوام کو بے چینی ہے۔ چنانچہ اس کے متعلق پارلیمنٹ کا ایک خفیہ اجلاس ہو چکا ہے۔ جنگ کی عام حالت کے متعلق وزیر اعظم عنقریب ہی ایک بیان دینے والے ہیں جسکے بعد پارلیمنٹ میں مباحثہ عام ہوگا۔ اس اثنا میں مسٹر چرچل نے عام مطالبہ کے مطابق اپنی جنگی کونسل میں ترمیم و تخفیف کر دی ہے لارڈ بیور بروک وزارت سے مستعفی ہوکر امریکہ میں جنگی سامان کی فراہمی کی خدمت انجام دینگے۔ جنگی کیبنٹ کے ۲ دو اور ممبر بھی تخفیف میں آگئے ہیں۔ مسٹر چرچل نے سر اسٹافورڈ کرپس کو جو روس کے سب سے بڑے ہمدرد اور انگلستان کے ہر دلعزیز اور انتہائی آزاد خیال مدبر ہیں اور ڈیڑھ سال تک ماسکو میں برطانوی سفیر کی حیثیت سے ملک اور سلطنت کی اہم خدمت انجام دے چکے ہیں اپنی وزارت میں شامل کر کے جنگی کونسل کا ممبر بنا دیا ہے۔ یہ اہم تبدیلیاں عام طور پر پسند کی گئی ہیں لیکن ابھی وزارت میں مزید رد و بدل کی گنجایش ہے اور ہمارا خیال ہے کہ جلد ہی مزید تبدیلیاں ہونیوالی ہیں۔ خدا کرے وزیر ہند کے عہدہ پر بھی کوئی روشن خیال، ہمدرد اور ہر دلعزیز مدبر مقرر ہو۔ کیونکہ مسٹر ایمری کے زمانہ میں ہندوستان کا مسئلہ حل ہوتا نظر نہیں آتا ہے جب کبھی پارلیمنٹ میں یا اسکے باہر انھیں اظہار خیالات کا موقعہ ملا ہے ہندوستانیوں کی دلشکنی ہی ہوئی ہے۔ ایسی صورت میں ضروری ہے کہ اب اس عہدہ پر کوئی اور مدبر ممتاز ہو ورنہ ہندوستانی مسئلہ پیچیدہ ہی ہوتا جائیگا اور اسکے حل کی کوئی صورت نکلنا مشکل ہوگا۔

ہندوستانی نقطۂ نظر سے چین کے لیڈر جنرل چیانگ کائی شیک اور انکی اہلیہ محترمہ کی ہندوستان میں تشریف آوری اس ماہ کا اہم ترین واقعہ ہے۔ جنرل موصوف نے جنگی اور ملکی معاملات پر فوجی اور دوسرے سرکاری افسروں سے تبادلۂ خیالات کرنے اور درۂ خیبر کے استحکامات معائنہ کرنیکے علاوہ یہاں کے قومی لیڈروں سے بھی طولانی ملاقاتیں کیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو سے آپنے چار مرتبہ ملاقات کی۔ مہاتما گاندھی سے کلکتہ میں ۴½ گھنٹے تک بات چیت ہوئی۔ مسٹر جناح سے سوا گھنٹہ گفتگو ہوئی۔ جنرل ممدوح شانتی نکیتن بھی تشریف لیگئے۔ اسطرح چند ہی دنوں کے قیام میں آپ رنگون، کلکتہ، دہلی، لاہور، خیبر وغیرہ ہو آئے اور ہندوستان کی قدیم تہذیب و جدید تحریکات سے آپنے ایسی واقفیت حاصل کر لی جو آیندہ کیلئے ہمارے واسطے ایک فال نیک ہے۔ ہندوستان اور چین زمانۂ قدیم میں بھی ایکدوسرے کے معین و مددگار تھے۔ کوئی وجہ نہیں کہ آیندہ زمانہ میں پھر چینیوں اور ہندوستانیوں کے درمیان نہ صرف دوستانہ بلکہ برادرانہ تعلقات قائم ہوں۔ موجودہ جنگ میں چینی ہمارے ملک کی حفاظت میں سرگرم حصہ لے رہے ہیں آیندہ بھی یہ دونوں عظیم الشان قومیں شانہ بشانہ کھڑی ہوکر ایکساتھ دنیوی ترقی کے منازل طے کر سکتی ہیں۔ ۹ مارچ کو حضور والسرائے کی تحریک پر تمام ملک میں "یوم چین" منایا جانیوالا ہے اسیطرح ۱۲ مارچ کو تمام چین میں "یوم ہندوستان" منایا جائیگا۔ اس وقت ایشیا کی آزادی اور خودمختاری چین کی آزادی کے ساتھ وابستہ ہے۔ ہندوستان بھی آزادی کا طلبگار ہے۔ اگر یہ دونوں قومیں متفق اور متحد ہو کر آزادی کی جد و جہد میں یکسوئی اور پوری سرگرمی سے حصہ لیں تو ایشیا کے پورے عروج میں شک و شبہ کی کیا گنجایش ہو سکتی ہے۔

جنرل چیانگ کائی شک کو ان باتوں کا پورا احساس ہے کیونکہ انھوں نے اپنے رخصتی پیغام میں دونوں ملکوں سے امداد باہمی کی اپیل کی ہے انکی رائے میں انسانی تہذیب کے اس انتہائی تاریک زمانہ میں اہل ہند اور اہل چین دونوں کو دنیا کی آزادی کی جدوجہد میں اپنے مقدور بھر حصہ لینا چاہیئے کیونکہ جبتک دنیا آزاد نہ ہوگی چینیوں اور ہندوستانیوں کو آزادی نصیب نہ ہوگی۔ اسکے ساتھ ہی ان کی یہ بھی رائے ہے کہ جبتک چین اور ہندوستان کو آزادی حاصل نہ ہوگی دنیا امن و صلح سے محروم رہیگی۔ آپنے برطانیہ عظمیٰ سے بھی اپیل کی ہے کہ مزید انتظار کے بغیر جس قدر جلد ممکن ہو ہندوستانیوں کو حقیقی پولیٹیکل اختیارات دیدیئے جائیں تاکہ وہ اپنی روحانی اور مادی قوتوں کو ترقی دے سکیں اور یہ محسوس کر سکیں کہ وہ نہ صرف جبر و ظلم کی مخالف قوموں کو فتحمند لانے کیلئے لڑ رہی ہیں بلکہ یہ جنگ خود ہندوستان کی آزادی کی جنگ ہے"۔ دیکھئے مدبران برطانیہ اس پرزور اپیل کا کیا جواب دیتے ہیں مسٹر چرچل نے حال میں اتنی رعایت تو کی ہے کہ دوسری نوآبادیوں کی طرح اب ہندوستان کو بھی برطانیہ کی جنگی کونسل اور بحر الکاہل کی جنگی کمیٹی میں اپنے نمائندے بھیجنے کی دعوت دی ہے۔ ڈاکٹر سپرو صاحب کے مراسلہ کے جواب میں انھوں نے اس بات کو بھی واضح کر دیا ہے کہ ہندوستان سے جو شخص بھی ان کونسلوں کیلئے نامزد کیا جائیگا اسکا وہ کھلے دل سے سواگت کرینگے۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ گورنمنٹ کسی غیر سرکاری لیڈر کو ان کونسلوں کیلئے نامزد کر سکتی ہے لیکن ہندوستانی مسئلہ محض اکا دکا مراعات سے طے نہیں ہو سکتا ہے اسکے لئے برطانیہ کو زیادہ ہمت اور اولو العزمی سے کام لینا ہوگا۔

امریکہ اور انگلستان کے تعلقات بہت قریبی ہوتے جارہے ہیں۔ اس وقت دونوں ملکوں نے تیاری اسلحہ اور تمام جنگی انتظامات کیلئے واشنگٹن اور لندن دونوں جگہ میں مشترکہ بورڈ قائم کر دیئے ہیں جنکی بدولت چھوٹی بڑی ہدایت باہمی مشورے سے طے ہوا کریگی۔ دو اور واقعات بھی قابل ذکر ہیں۔ پچھلے کئی مہینوں سے روس، انگلستان اور ایران کے درمیان معاہدہ ہونیکی خبریں آرہی تھیں اس ماہ اس معاہدہ پر فریقین کے دستخط ہو گئے ہیں۔ شاہنشاہ حبش کے ساتھ بھی انگلستان کا معاہدہ طے ہو گیا ہے۔ دونوں معاہدے ایک وقت مقررہ کیلئے جنگی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے کئے گئے ہیں۔ اصولی حیثیت سے ایران کی آزادی برقرار رکھی گئی ہے اور اُسے جنگ کی ذمہ داریوں سے بری کر دیا گیا ہے لیکن روس اور برطانیہ دونوں مل کر ایرانی سرزمین کو محوری طاقتوں کی زد سے بچائے رکھیں گی۔ ابی سینیا کی درستی اور بحالی کیلئے برطانیہ اسے دو سال تک مالی امداد دیگا اور اسکی فوجی تنظیم کیلئے اپنے افسران بھیجے گا۔ حبش کی عدالتوں میں بھی برطانوی جج رہیں گے۔ شاہ حبش نے انسداد غلامی کا وعدہ کر لیا ہے جو بطور خود ایک خوشکن بات ہے۔

شاہ فاروق اور وزرائے مصر میں اختلاف رائے کا یہ نتیجہ نکلا کہ سابق وزارت مستعفی ہو گئی اور مصر کی حکومت اب نحاس پاشا کے سپرد کیگئی ہے جو مصر کی سب سے بڑی قوم پرست جماعت وفد پارٹی کے لیڈر ہیں۔ نحاس پاشا نے شاہ فاروق کو اس بات پر رضامند کر لیا ہے کہ موجودہ مصری پارلیمنٹ برخاست کر دیجائے اور ۲۶۔ فروری کو نیا انتخاب ہو۔ انھوں نے برٹش سفیر کو بھی یہ لکھدیا ہے کہ وہ صرف اس شرط پر وزیر اعظم ہونا قبول کر رہے ہیں کہ برٹش گورنمنٹ مصر کے اندرونی معاملات میں کوئی دخل نہ دے۔ وہ خود برطانیہ کے ساتھ مصر کے معاہدہ کی پوری تعمیل کرنیکو تیار ہیں۔ برطانوی سفیر نے اسکے جواب میں اس بات کا اطمینان دلایا ہے کہ وہ مصر کے داخلی امور میں مخل نہ ہونگے اور وزارت سے دوستانہ تعلقات رکھیں گے۔

پچھلے مہینہ سر اکبر حیدری کی افسوسناک وفات ہوئی ۸۔ فروری کو مشہور کانگریسی لیڈر اور نامور محب وطن سیٹھ جمنا لال بجاج یکایک قلب کی حرکت بند ہو جانے سے صرف ۵۴ سال کی عمر میں ملک کو ہمیشہ کیلئے داغ مفارقت دے گئے۔ سیٹھ جمنا لال اپنی وضع کے ایک خاص دلیش بھگت تھے نمود و نمائش سے انھیں طبعی نفرت تھی۔ انھوں نے تن من دھن سب کچھ اہل وطن کے ارپن کر دیا تھا۔ انھوں نے پچھلے بیس سال کے اندر اپنی ساری دولت دلیش بھگتی میں لٹادی۔ وردھا اور سیواگرام انکی فیاضی کے جیتے جاگتے نمونے ہیں جو رہتی دنیا تک انکا نام روشن رکھیں گے۔ پچیس لاکھ روپیے کے قریب انھوں نے قومی و ملکی تحریکوں میں صرف کیا ہوگا۔ انکا گھر خاص و عام سب کیلئے ایک کھلا ہوا مہمان خانہ تھا۔ ملکی خدمت میں انھیں بارہا قید و بند کی سختیاں بھی جھیلنا پڑیں لیکن انکی ہمت مردانہ میں کبھی فرق نہ آیا۔ وہ ایک ہوشمند تاجر، مخیر رئیس، اولو العزم قومی کارکن اور مہاتما گاندھی کے رفیق خاص تھے۔ دیسی ریاستوں کی اصلاح و ترقی سے انھیں بڑی دلچسپی تھی جے پور کی ایجی ٹیشن کی رہنمائی کا فرض انھیں نے اپنے ذمہ لیا تھا۔ چرخہ اور دیسی کرگھوں کی صنعت کی حمایت انکی زندگی کا خاص مشن تھا۔ انکی ذات والا صفات ملک کیلئے ہر طرح سے خیر و برکت کا باعث تھی۔ افسوس آج وہ نہیں۔ ملک کی تمام امیدوں کا خاتمہ ہو گیا۔ انکی بلند حوصلہ دھرم پتنی نے اپنے مقدور بھر انکی ملکی خدمات جاری رکھنے کا تہیہ کیا ہے اور انکی وفات کے بعد ہی ڈھائی لاکھ کے قریب اپنی تمام ذاتی جائداد قوم کے نذر کر دی ہے۔ فراخدلی اور اولو العزمی ایثار اور نیک نفسی وفا شعاری اور پتی بھگتی کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔

معذرت: یہ پرچہ اس سے بہت پہلے شائع ہو جاتا۔ آخری صفحات کے علاوہ، تقریباً سب کاپیاں یکم فروری ہی کو مطبع میں بھیجی جا چکی تھیں لیکن کاغذ دستیاب نہ ہونے سے اسکی چھپائی رکی رہی دو ہفتہ سے زائد دوڑ دھوپ کے بعد بڑی مشکل سے یہ کاغذ دستیاب ہوا۔ سفید چکنا کاغذ کسی طرح نہیں مل سکا چنانچہ اسی کم کے کاغذ پر کاپیاں چھپوا کر یہ نمبر ختم کیا گیا۔ آئندہ کیا ہوگا ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کیونکہ کاغذ کا تھوڑا بہت اسٹاک بھی موجود نہیں اور کاغذ والوں کے دماغ عرش پر ہیں جو منہ مانگی قیمت پر بھی کاغذ وقت پر نہیں دیتے۔

زمانہ

جلد ۷۷ — مارچ ۱۹۴۲ء — نمبر ۳

ٹیگور کے تعلیمی نظریے

از ڈاکٹر م حفیظ سید ۔ ایم ۔ اے ۔ پی ۔ ایچ ڈی ۔ ڈی لٹ (الہ آباد)

ہندوستان کوئی ایسا خطہ نہیں جو کرۂ ارض میں کسی اچانک تبدیلی کے سبب دفعتاً سمندر سے نکل پڑا ہو، اور جس کی سطح موم کی طرح تمام بیرونی اثرات اپنے اندر جذب کرلے۔ ہندوستان ایک قدیم ملک ہے جس کی مخصوص روایات ہیں جس کی روحانی ثقافت، روحانی احترام اور پاکیزگی، جس کی جرأت اور بہادری جس کا مصلحانہ رویہ اور مہمان نوازی، جس کی محبت اور امن پسندی تاریخ کے صفحوں میں ابتک محفوظ ہیں۔ یہ تمام خصوصیتیں اب ہماری فطرت کا جزو بن چکی ہیں، ہمارے خون اور ہڈیوں میں رچ گئی ہیں جن سے دست بردار ہوجانا غیر ممکن ہے۔ ہاں یہ البتہ ہوسکتا ہے کہ ہم ہر قسم کے خارجی اثرات کو اپنے اندر سمولیں اور اپنی اندرونی خصوصیات کو کھو بیٹھیں۔ دراصل غیر ملکی تہذیب کی خوبیوں کی بہ نسبت اس کے عیوب کو اختیار کرلینا زیادہ آسان ہے۔ مغرب کے ساتھ تعلقات نے ہمارے سیدھے سادے مذہب اور ہماری زندگی میں ایک ہیجان پیدا کردیا ہے۔ خدا پر ایمان، با اخلاق زندگی اور ایثار یہ تمام چیزیں رفتہ رفتہ مادیت اور زرپرستی کے آگے ٹھکرا رہی ہیں۔ دولت اور ایک مسرور ازدواجی زندگی۔ اب یہ ہمارے بلند ترین مقاصد رہ گئے ہیں۔ وہ ملک جس نے غریبی کو کبھی ٹھکرایا نہیں، وہاں کے باشندے فقر اور مفلسی سے خوفزدہ ہیں، وہ لوگ جو کسی نصب العین کی راہ میں خوشی خوشی جانیں قربان کردینا اپنا فرض سمجھتے تھے آج موت کے خوف سے پریشان ہیں۔ یہاں تک کہ موت پر بھی زندگی کو ترجیح دیتے ہیں۔ زندگی اب زندگی نہیں بلکہ وجود محض کی حیثیت اختیار کرچکی ہے۔ زندگی

انسانیت سے دامن چھڑا کر حیوانیت کی طرف قدم بڑھا رہی ہے۔ انسان اب صرف کیف اور حصولِ لذت کے لئے جینا چاہتا ہے۔ ذہن انسانی، دماغی غذا کی کمی کے سبب اب اپنی بے بضاعتی محسوس کر رہا ہے، مادّی اثرات بہت تیزی سے ترقی کر رہے ہیں، جس سے ہندوستان کی اندرونی روح میں گھُن لگ گیا ہے۔ ٹیگور نے کسی خود غرضانہ مقصد کی بنیاد پر ہندوستان کی سیاسی غلامی کی مخالفت نہیں کی بلکہ وہ اِن مغربی اثرات سے خوفزدہ تھے جو آہستہ آہستہ ہندوستان کی روح کو محکوم اور اس کی زندگی اور اسپرٹ کو ضعیف کر رہے ہیں۔ ہندوستانیوں کا موجودہ مطمحِ نظر کس حد تک مغرب زدہ ہو چکا ہے اس کا اندازہ بقول ٹیگور اس سے ہو سکتا ہے کہ موجودہ ہندوستان کا باشندہ ہر بات میں حکومت سے امداد کا طالب ہے۔

ٹیگور کی رائے میں مادّیت کے اس سیلاب کو روکنے کے لئے ہندوستان میں تعلیمی نظریوں کو بدلنے کی اشد ضرورت ہے۔ جدید تعلیم یافتہ ہندوستانی دراصل اپنے مغربی ہمعصر کی ایک بھدّی نقل ہے۔ اس کی آواز دوسروں کی صدائے بازگشت اور اس کی زندگی دوسروں کی زندگی سے ماخوذ ہے۔ اس کی روح روح نہیں رہی بلکہ محض دماغ ہو کر رہ گئی ہے، اس کی آزاد فطرت اشیاء کی غلام ہو گئی ہے۔ ٹیگور کو اس جدید مخلوق سے اتنی نفرت ہے کہ وہ گھبرا کر چیخ اُٹھتا ہے :-

"ہمارا ملک صحیح معنوں میں خدا کا راندہ ہوا ملک ہے، یہاں کام کرنے کی خواہش اور طاقت کو برقرار رکھنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ ہمیں صحیح معنوں میں مدد نہیں ملتی، کوسوں تک تلاش کیجئے کوئی ایسا انسان نہیں ملتا ہے جس سے گفتگو کر کے آدمی کو زندگی کا احساس پیدا ہو۔ کوئی مفکر، حساس اور کام کرنے والا آدمی نہیں ملتا، کوئی فرد ایسا نہیں جسے عظیم الشان چیزوں کا تجربہ اور احساس ہو یا جو حقیقی اور سچی زندگی بسر کر رہا ہو۔ بس کھایا پیا، دفتر گئے، مہمل باتوں پر گفتگو کرتے رہے اور اس کے بعد سو گئے۔ جب یہ لوگ جذبات کی دنیا میں آتے ہیں تو آپے سے باہر ہو جاتے ہیں، اور جب کسی مسئلہ پر سوچتے ہیں تو بالکل طفلانہ انداز میں، قابل، مکمّل اور ٹھوس آدمیوں کی سخت کمی ہے اور جدید تعلیم یافتہ انسان دراصل چلتے پھرتے سائے ہیں جن کا اردگرد کی دنیا سے کوئی گہرا تعلق نہیں ہے۔"

یہ مغربی تعلیم کی پیداوار، ہندوستانی انسان نہیں بلکہ سائے ہیں، ان کی زندگی حُسن سے اور روحانی نغموں سے خالی ہے۔ جدید تعلیم نے غلامانہ تہذیب کو فروغ دیا ہے۔ بقول ڈاکٹر کمارسوامی، جدید تعلیم آرٹ کو عجائب خانوں، اور نگار خانوں، تعلیم کو کتب خانوں، مذہب کو تہواروں اور مذہبی کتابوں، اور موسیقی کو گراموفون اور رقص گاہوں تک محدود کر دینے میں کامیاب ہوئی ہے۔ ہندوستان کی علمی ترقی روحانیت نہیں بلکہ محض کتابی لیاقت کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ دراصل تعلیم یافتہ ہندوستانی اپنے تعلیم دینے والوں کی معمولی اور سطحی اور "تکلیف دہ"

نقل کرکے اس سے انتقام لے رہا ہے۔ وہ گلشن ہستی کا ایک ایسا پودا ہے جس کی جڑیں زمین سے قطعی علحدہ کردی گئی ہیں۔ صحیح تعلیم ہمیشہ انسانی فطرت کے عمیق پہلوؤں سے شروع ہوتی ہے۔ تعلیم یافتہ ہندوستانی اپنے ماضی اور دُور دراز زمانوں کے روایات، تعلقات اور احکامات سے علحدہ کردیا گیا ہے۔ وہ روایات اور تعلقات جو اُسے اپنے ملک سے وابستہ اور متحد کرتے ہیں۔ جو تعلیم آج دی جارہی ہے وہ مکمل انسان نہیں پیدا کرے گی۔ آج کل کا اسکول ایک فیکٹری ہے جو یکساں نتائج برآمد کرنے کے لئے خاص طور پر تعمیر کی گئی ہے۔ انفرادی خصوصیات کی قطعی پرواہ نہیں کی جاتی، ہزاروں مختلف دماغی ضروریات کے ساتھ ایک ہی رویہ برتا جاتا ہے، روحانی ترقی یا حریت پرور خیالات کی کوئی آزادی نہیں۔ مذہبی اور فنّی، اخلاقی اور روحانی پہلوؤں کو سائنٹیفک اصولوں اور سماجی قوانین کے مطالعہ میں غرق کردیا گیا ہے۔ دماغ کو میکانی بنا دینا اور ذہنی اُپج کو بیکار کردینا ہماری تعلیمی پالیسی کا بے رحمانہ نتیجہ ہے۔ علمی نقطۂ نظر سے بھی اس تعلیم کے نتائج کچھ قابل احترام نہیں ہیں۔ یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دل میں حصول علم کی خواہش، اپنی تہذیب کے لئے احترام کا جذبہ یا آزادانہ غور و خوض کا کوئی رُجحان ہوتا ہے۔ امتحانات کا سلسلہ اس کے دماغ کو ناکارہ بنا دیتا ہے۔ اسے اس بات کی بھی کوئی پروا نہیں ہوتی کہ کون سی بات صحیح ہے اور کون غلط، وہ انھیں باتوں کو سیکھنا چاہتا ہے جن کا تعلق امتحان میں کامیابی سے ہے۔ علم برائے علم نہیں بلکہ علم برائے حصول زر ہے۔ غرض محض دنیاوی کامیابی اس کا مطمحِ نظر ہے۔ وہ قبل از وقت مستقبل کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہوتا ہے اور اس طرح اُس کے ارادے اس کے مطالعہ میں ہارج ہونے لگتے ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ ہندوستان میں صرف کلرکوں اور کاریگروں کی گنجائش ہے۔ یہاں ذاتی جوہر کے چمکنے کا کوئی موقع نہیں، پھر کیا تعجب کی بات ہے کہ وہ اپنے کو ان حالات کے موافق بنا لیتا ہے۔ اسے روح انسانی کی عمیق تفسیر اور تشریح اس طرح بتائی جاتی ہے گویا کہ اس کا وجود ہمارے لٹریچر میں نہیں، جو در اصل اُس کے ادبِ عالیہ میں موجود ہے۔ وہ تمام باتیں جو ہندوستانی نسل کی روحانی زندگی سے متعلق ہیں شروع ہی سے نظر انداز کردی جاتی ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ ہماری پوشیدہ طاقتوں کو اُبھارنے روحانیت کو بیدار کرنے اور دل و دماغ کو روشن کرنے میں ترقی یافتہ ادب سے زیادہ کوئی شئے کارآمد نہیں ثابت ہوسکتی۔ خصوصًا ایسا ترقی یافتہ ادب جو روحِ انسانی کی حقیقتوں سے بحث کرتا اور اس پر روشنی ڈالتا ہو۔

ہندوستانی دل و دماغ کے لئے اس کی قدیم ادبیات سے زیادہ حیات بخش کوئی چیز نہیں ہوسکتی، لیکن جدید تعلیم یافتہ ہندوستانی ان سے بیگانہ محض ہیں۔ ہندوستان کے بچے اپنے ماضی کو فراموش کررہے ہیں اور خود اپنی فطرت نہیں پہچان سکتے۔ ہندوستان کی قدیم تاریخ کے بطن سے جو چشمے جاری ہیں اُن کی آزاد رو لہریں اب اس نئی پَود کے ہاتھوں رُکاوٹیں محسوس کررہی ہیں۔"

ہندوستان کا مستقبل زندگی کی اس آبیاری سے محروم ہوجائے گا جس نے اس کی قدیم تہذیب کو اس قدر

خوبیوں سے معمور کردیا ہے۔" ضرورت ہے کہ ہندوستان کے قدیم نصب العین کو پھر شمع راہ بنائیں۔ اس کی تمام خصوصیات نہیں تو کم سے کم اس کی صحیح اسپرٹ کو دوبارہ زندہ کرنا بہرحال ضروری ہے تعلیم کا مقصد روح کی تربیت ہے نہ کہ صرف دماغ کو خوراک مہیا کرنا یا قوت حافظہ کو ترقی دینا۔ اعلیٰ ترین تعلیم سے ہمیں نہ صرف معلومات حاصل ہوتی ہیں بلکہ اس کی بدولت ہماری زندگی "حیاتِ کل" سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ ہم حقیقت کی "وحدت" سے آگاہ ہو جائیں۔

ماضی میں جب زندگی سادگی سے معمور تھی، انسان کے مختلف عناصر ترکیبی میں ایک دوسرے سے مکمل ربط تھا۔ لیکن جب سے دماغ اور روح و جسم کے درمیان تفریق پیدا ہو گئی ہے ہماری تعلیم دماغ اور جسمانی ضروریات ہی کو تمام تر اہمیت دینے لگی ہے۔ ہم اپنی پوری توجہ بچوں کی معلومات بڑھانے میں صرف کرتے ہیں اور اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ اس طرح دماغی، جسمانی اور روحانی زندگی کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہوتی جاتی ہے۔

روحانی تربیت کیونکر حاصل کی جا سکتی ہے؟ کیا خدا اور اس کے وجود پر بحث و تمحیص کے ذریعہ؟ نہیں بلکہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنی روح کو آزاد چھوڑ دیں، کیونکہ وہ شخص جسے روحانی آزادی نصیب ہے کبھی احمقوں کی طرح یہ نہیں کہہ سکتا کہ خدا کا وجود نہیں۔

روحانی زندگی کو فروغ دینے اور روحانی جذبات کو بیدار کرنے کے لئے ٹیگور آشرم کی فضا اور معلم کے وجدان پر بھروسہ کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم کو ہر سانس میں اس حقیقت کو محسوس کرنا چاہیئے کہ ہم خدا سے قریب ہیں۔ قدیم ہندوستان میں یہ ممکن تھا، کیونکہ آشرم ہی گھر، اسکول، عبادت گاہ اور صحرا سب کچھ تھا۔ اُستاد کے دل میں بھی ہر وقت خدا کی قربت کا احساس تھا۔ وہ اپنے سینہ کی دھڑکن ہی میں خدا کے وجود کو پاتا تھا۔ اُن کے شاگرد بھی خدا کے وجود کو اسی طرح محسوس کرتے تھے جیسے آسمان و زمین کے وجود کو۔ قدیم ہندوستان میں تعلیم کا مقصد یہ تھا کہ ہماری روح میں ابدیت کے نغمے بیدار ہو جائیں تاکہ روح تکمیل اور آزادی حاصل کرے۔ اس قسم کی تعلیم جس کا مقصد انسانی روح کو تمام قید و بند سے آزاد کرنا ہو ہماری آنکھیں کھول دے گی، اور ہم ان تباہ کاریوں کی ایک جھلک دیکھ لیں گے جو ہماری زندگی، صحت اور روحانیت پر ڈھائی جا رہی ہیں۔ ہمیں اپنی زندگی اور ترقی کے مواقع کے محدود ہونے کا پورا پورا احساس ہو جائے گا۔ اس قسم کی تعلیم ہماری روحانی اور دماغی صلاحیتوں کو ابھار کر ہمیں اس قابل بنا دے گی کہ ہم ہر قسم کی بے انصافی کا مردانہ وار مقابلہ کر سکیں۔ اس طرح کا دار العلوم نہ صرف تہذیب و تمدن کے اعتبار سے اہم ہے بلکہ فنون لطیفہ اور روحانیت کا مرکز ہے۔

ٹیگور نے جدید طریقۂ تعلیم کو قدیم روحانیت کے نصب العین سے ملا دیا ہے۔ اس کے نزدیک اعلیٰ ترین تعلیم گاہ صرف آشرم ہو سکتا ہے۔ جہاں طلبا زندگی کے بلند ترین مقصد کے حصول کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ جہاں قدرت کا سکون خوابیدہ ہوتا ہے، جہاں زندگی نہ صرف عمیق تفکر سے لبریز ہوتی ہے بلکہ اس کے تمام پہلو پورے پورے

طور پر بیدار رہتے ہیں، جہاں طلبا کے دماغوں پر قوم پرستی کے نظریوں کو زبردستی مسلط نہیں کیا جاتا، بلکہ اس بات کی تعلیم دی جاتی ہے کہ یہ دنیا خدا کی وسیع بادشاہت ہے جس کے شہری بننے کی ہمیں آرزو کرنی چاہیئے جہاں طلوع و غروب کے مناظر اور ستاروں کا خوابیدہ حسن کبھی ہماری آنکھوں سے پوشیدہ نہیں ہوتے، جہاں پھول اور پھل اور قدرت کی نیرنگیاں ہمارے دلوں میں اپنی قدر و قیمت کا احساس پیدا کرتی ہیں اور جہاں بڑھے اور جوان، اُستاد اور طالب علم ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں اور ایک ساتھ ابدی زندگی کے کیف و مسرت سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

ہندوستانی زبانوں کو تعلیم کا ذریعہ بنانا چاہیئے۔ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ انگریزی پورے ہندوستان کی مشترکہ زبان بن سکتی ہے، اگر ایسا ممکن بھی ہو تو کم سے کم یہ کوئی پسندیدہ بات نہ ہوگی۔ ہم انگریزی زبان میں اعلیٰ ادب پیدا نہیں کر سکتے، سوچنے اور سمجھنے کی اعلیٰ صلاحیت رکھتے ہوئے بھی تعلیم یافتہ طبقہ کی سطحیت اور اُپج کی کمی کا اصلی سبب یہی ہے کہ ہمیں دو زبانوں میں سوچنا پڑتا ہے، ہمارے یہاں غیر ملکی علوم اسکولوں اور کالجوں کی چیز ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہ دُور سے ہمیں اپنے جلوے دکھاتے ہیں لیکن ہماری زندگی کا جزو نہیں بنتے۔ غیر ملکی علوم زیادہ سے زیادہ ہماری نوٹ بک یا کتابوں میں بند پڑے رہتے ہیں، اور ہمارے خیالات اور عمل کا جزو نہیں ہو سکتے۔

ٹیگور کا خیال ہے کہ ابتدا میں انگریزی زبان پر زور دینا تمام تعلیمی نظریوں کے خلاف ہے۔ یہ چیز روزمرہ کی روش میں دلچسپی کے بجائے خشکی اور تھکاوٹ کا احساس پیدا کرتی ہے، علم حاصل کرنے کا عمل جہاں تک ہو سکے کھانے کے عمل کے مطابق ہو۔ جب پہلے ہی لقمہ میں ذائقہ پسند آجاتا ہے تو بھوک اچھی طرح بیدار ہو جاتی ہے اور ہاضمہ بھی اپنا فرض ادا کرنے لگتا ہے۔"

ٹیگور انگریزی کو ثانوی زبان کی حیثیت دیتے ہیں، لیکن ہمارے اسکولوں میں ملکی زبانیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں، چونکہ تعلیم ملکی زبانوں کے ذریعہ نہیں دی جاتی اس لئے عوام اور تعلیم یافتہ طبقہ کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہو گئی ہے۔ انگریزی تعلیم نے ملک میں ایک ایسا تعلیم یافتہ اونچا طبقہ پیدا کر دیا ہے جس کا عوام کے نظریۂ زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان کے سامنے ایک ایسا نصب العین پیش ہو گیا ہے جسے وہ عملی جامہ نہیں پہنا سکے، اس لئے کہ وہ اسے عملی شکل دینا جانتے ہی نہیں، ان پر یہ الزام کہ وہ عوام کی نمایندگی نہیں کرتے بے بنیاد نہیں ہے۔ تعلیم یافتہ جماعت میں ایک قسم کا جماعتی احساس برتری پیدا ہو چلا ہے، ان کے روایتی نظریے غیر مستقل اور مذہبی اعتقاد کمزور ہیں، ان کی ذہنیت مشرق و مغرب کے ایک نامکمل امتزاج کا نتیجہ ہے۔ حالانکہ عوام کی ایک بڑی تعداد ابھی تک خالص ہندوستانی ذہنیت رکھتی ہے مگر ہمارے

جلسوں اور کانفرنسوں میں انگریزی زبان ذریعۂ اظہار ہوتی ہے۔

انگریزی داں حضرات کی قدر افزائی ہوتی ہے، وہ حکومت سے مطالبات کرنے میں تو بہت سرگرمی دکھاتے ہیں لیکن اپنے ہموطنوں کے درمیان خیال و عمل کا اتحاد پیدا کرنے کا کوئی جذبہ نہیں رکھتے، حالانکہ یہ سیاسی سرگرمیوں کا اہم ترین مقصد ہے۔ عوام کے دلوں سے رشتہ جوڑنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ مادری زبانوں کو تعلیم کا ذریعہ بنا دیا جائے۔ ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں اپنے پیغام کو پھیلانے کا یہی واحد طریقہ ہے۔ اگر ہم سنسکرت اور دوسری مادری زبانوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک کی بہتر اور بلند تر زندگی کے تمام ذرائع فنا ہو جائیں گے۔ ٹیگور کا قول ہے:۔

"بچّہ کو پڑھاتے ہوئے بالکل بچّہ بن جانا، یہ فراموش کر جانا چاہیئے کہ تم بچّوں سے زیادہ قابل ہو اور علوم کے تمام منازل طے کر چکے ہو، بچّوں کی صحیح رہنمائی کے لئے اپنی عمر کا احساس بالکل مٹا دینا چاہیئے۔ تم کو ان کا بڑا بھائی بن جانا پڑے گا تاکہ تم خود بچوں کی خواہشات اور دماغی سطح پر آکر ان سے تعلقات قائم کر سکو اس وقت میں اس سے زیادہ آپ سے کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ اگر آپ بچوں کو تعلیم و تربیت سے آراستہ کرنا چاہتے ہیں تو دائمی طور پر بچّہ بنے رہنے کی اسپرٹ پیدا کیجئے۔۔۔۔"

"رابندرانات تاگور"

یہ نظم ایران کے مشہور شاعر رشید یاسمی نے ۱۹۳۱ء میں ٹیگور کی سترویں سالگرہ کے موقع پر لکھکر اپنے وطن کی طرف سے مشرق کے شاعر اعظم کو بھیجی تھی

درود باد بر آں شاعرِ بلند مقام   کہ زو ببالد فخر و ببند و بنازد نام

گزیدۂ شعرا فخرِ ادب تاگور   کہ کشور سخن از وے گرفت نظم و قوام

یگانہ مہرِ درخشانِ شرق کز نورش   زدودہ گشت جہانِ سخن ز تارِ ظلام

چو آفتاب ز آفاقِ شرق تاباں شد   وز او گرفت ہمہ غرب روشنائی دوام

نماند گوشۂ اندر ہمہ بسیط زمیں   کہ نیست فیضش نہاد اندر آنجا گام

ز گفتہ ہائے دلآویز و نکتہ ہائے لطیف   ہمی رساند جان را ز آسماں پیغام

کند پدید ز لفظِ بدیع و معنیِ نغز   بخاطر اندر آثار روح در اجسام

معانی اندر لفظش چو عالمِ ملکوت   کہ نیست آنجا اندیشہ را ز فشار و ز کام

ترانہ ہائے دل انگیز او بہر روزے   ہزار خاطرِ آشفتہ را کند آرام

ہنرورے کہ ز سحرِ کلام چیرہ شدہ است   بشرق و غرب زمیں بر قلوب بر انعام

ز رائے روشن او بہرہ می برد یکساں   زدودہ فکرِ خواص و خمودہ طبعِ عوام

ایا خلاصۂ ذوق و کمال و دانشِ شرق   کہ چوں تو پور نزاید ز مادرِ ایام

بہ ہیچ جائے جہاں قدر تو نہ بشناسد   کہ در قلمروِ سعدی و کشورِ خیام

نہ چوں دگر شعرا شعرہائے دلکش تو   شکایتِ شبِ ہجر است و وصفِ جامِ مدام

کہ ہرچہ گوئی پند است و حکمت و اخلاق   ز بہرِ صلح و صفا و ز بہرِ امن و سلام

ز داروے سخنت جانِ دردمندِ بشر   نجات یابد از آسیب و محنت و آلام

ترا ز جایزہ ہائے نوبل کہ بگرفتی   اگرچہ ارزش گیری ہنوز نیست تمام

نثارِ شعرِ ترا شاید از سپہرِ بلند   بیفگنند مہ و خورشید و زہرہ و بہرام

بجشنِ ہفتاد از عمرِ تو بایستی   کہ سوئے ہند از ایراں بہ بستمی احرام

چو راہِ دور مرا زیں طواف دارد باز   بدیں قصیدہ فرستم ترا درود و سلام

بہ پیری اندر طبیعت جوان و نیرومند   دلِ تو خرم و جاں باد مہبطِ الہام

دلِ رشید ز آثارِ فکرِ روشنِ تو   بسانِ طبعِ تو شاداں و خرم و پدرام

(الموسوی)

قطعات

(محمد ضیاء الاسلام صاحب ایم۔اے (ڈپٹی کلکٹر مراد آباد)

نورافشانیِ الفت

تیری اُلفت شراب بن کے رہی ایک رنگیں سا خواب بن کے رہی
اوّل اوّل تو کچھ خلش سی ہوئی بعدہٗ ماہتاب بن کے رہی

اعجازِ نگاہ

زندگی اِک گناہ ہے ہمدم اِک بھٹکتی سی آہ ہے ہمدم
جس سے ذرّاتِ دل چمک اُٹھے ایک سادہ نگاہ ہے ہمدم

ہم اور آپ

زندگی اِک بلائے مبرم ہے موت آتی نہیں تو جیتے ہیں
ہم لہو پی کے زندہ ہیں، اور آپ یہ سُنا ہے شراب پیتے ہیں

بے بسی

مانگے ہوئے لفظوں میں روانی کیسی مسکیں دلوں میں شادمانی کیسی
یاں شدتِ غم سے سانس لینا ہے محال یخ بستہ فضاؤں میں جوانی کیسی

میرے آنسو

(از جناب نیساں اکبر آبادی)

(۱)

مجھ کو محسوس ایسا ہوتا ہے — آنسوؤں میں مرے ترنّم ہے
یہ زباں کا بھی کام دیتے ہیں — آنسوؤں میں مرے تکلّم ہے
اُن کے دامن پہ کھل رہے ہیں گُل — آنسوؤں میں مرے تبسّم ہے

(۲)

یہ ڈبو دیں گے کشتیٔ غم کو — آنسوؤں میں مرے ہے طغیانی
چاند شرمندہ ہے خجل تارے — آنسوؤں کی مرے یہ تابانی
اِک نہ اِک روز رنگ لائے گی — آنسوؤں کی مرے فراوانی

(۳)

اِن میں کچھ کچھ ضیائے انجم ہے — میرے آنسو فلک کے تارے ہیں
غم کی تلوار نے کیا ٹکڑے — میرے آنسو جگر کے پارے ہیں
کام آتے ہیں رنج و غم میں یہ — میرے آنسو بہت ہی پیارے ہیں

(۴)

میرے اشکوں کی قدر گھٹتی ہے — کوئی کہتا ہے جب گہر ہیں یہ
میری آنکھوں سے خوں برستا ہے — کوئی کہتا ہے جب شرر ہیں یہ
دل مسرّت کے گیت گاتا ہے — جب وہ کہتے ہیں "پُر اثر ہیں یہ"

نیرنگِ حسن

یا

نایکا بھید

(۲)

(از مسٹر سلیم جعفر)

باب دوم - پرکیّا نایکا

پرکیّا (परकीया) در پردہ نامحرم پر مٹی ہوئی وصل یار کے لئے دانائی و فرزانگی سے کام لیتی ہے

पुरजन परम परोसिनी परोस सबै जानत हैं सील सदा सुदु सुचिता की खान। परमानन्द जेते गुरु गोकुल बसैया तेते बसत न जाने कहूं ऐसो समै सुखदान॥ घूंघट के घेर चहुंफेर तें तिरीछा हेर नजर धरा पैं अधरा पै मन्द मुस्कान। जानत हैं केल खेल केदल कदम्ब पुञ्ज कीर धीर केकी औ कपोत कोकिलान॥

یار و اغیار میں دانائی و فرزانگی و حسن سلوک کا چرچا ہے سب کہتے ہیں کہ دنیا میں ایسا کوئی نہیں۔ روئے تاباں پر گھونگھٹ کا نقاب۔ نظر زمین پر گڑی ہوئی اور ہونٹوں پر تبسم ہے۔ مرغان چمن اور نوسنالان گلستاں یعنی عیش کی نشیلوں کے رازدار اس ادائے شرمگیں کی حقیقت خوب جانتے ہیں۔

اَنُوڑھا (अनूढ़ा) آغوشِ پیتم تک پہونچنے سے پہلے دامنِ عصمت پر داغہائے عصیاں ہیں

प्रीति पतिब्रत सो बल बैर कहो केहि भांति भटू अभ भाग। काज सरे तौ लजाति हों लाजन काज सरे तो बिदा हित भागे॥ ह्वै रही सांप छछुन्दर की गति काम अकाम हिये अनुरागे। ऐसी उपाय बताय सखी हरि अंक लगे पै कलङ्क न लागे॥

ہائے کیا ستم ہے پیتم کے نام سے جی گھبراتا ہے۔ دل کا کہا مانا جائے تو منہ دکھانے کو جگہ نہیں رہتی نہ مانا جائے تو محبوب سے نباہ ممکن نہیں۔ سانپ اور چھچھوندر والی مثل ہے۔ وفاداری اور بے وفائی میں کشمکش ہے۔ اے سکھی کوئی صورت بتا کہ مطلب حاصل ہو اور کلنک کا ٹیکا بھی نہ لگے۔

اُوڑھا (ऊढ़ा) طبیعت ہرجائی ہے۔ التفاتِ پیتم باعثِ تسکین نہیں، مائلِ اغیار ہے

एही छिद्रद्वार के कदीम दरबान दोई इनको छपाय काहू ऊपरी लयो है री। मैं तो इन द्रोहिन के गहरे रही थी खोइ बारी रेतन खायो बड़ो

उलट भयो है री ॥ ठाकुर बूझे आंसू भर भर देत तनिक न सोच देत कौन को दयो है री । मेरो मन मेरी आली मोहि यह जान परी दृग बटपारन के भेद में गयो है री ॥

در دل کے یہی دو دربان قدیم پاسبان سے بھی کوئی آنکھ بچا کر نکل گیا۔ انھیں کم بختوں کے بھروسے نیند آ گئی تھی۔ گھر لوٹ کر بات سیتا ناس کر گیا (سکھی پوچھتی ہے کیا ہوا تو) آنسو امڈے چلے آتے ہیں جواب نہیں دیتی۔ اتنا کہتی ہے سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ آنکھوں نے لیٹیروں سے ملکر دل لٹوا دیا۔

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد۔

داناؤں نے نائکہ کی مدعا بازی میں طرح طرح کے رنگ اختیار اور ان میں بھی نیرنگیاں پیدا کی ہیں۔

گپتا (गुप्ता) ودگدھا (विदग्धा) لکشتا (लक्षिता) کُلٹا (कुलटा)

مُدِتا (मुदिता) اور انوشیانا (अनुशयना)

(۱) گپتا (गुप्ता) وصل یار پر پردہ ڈالا جاتا ہے۔

(۱) بھوت سُرت گوپنا (भूत सुरति गोपना) گزشتہ عشرت اندوزیوں کی کیفیت کی یاد ستاتی ہے۔

मोहि लखि सोवत बिथोरिगो सुबेनी बनी तोरिगो हिये को हार छोरिगो सुगैया को। कहै पदमाकर त्यों घोरिगो घनेरो दुख बोरिगो बिसासी आज लाजही की नैया को॥ अहित अनैसो ऐसो कौन उपहास यहै सोचन खरी मैं परी जोवति जुन्हैया को। बूझेंगी चबैया तब कैहों कहा दैया इत पारिगो को मैया मेरी सेज पै कन्हैया को ॥

مجھے سوتا دیکھ کر بنی بنائی چوٹی کا بال بال کھول گیا۔ ہار توڑ، سینہ بند کھول گیا۔ کیا ستم ڈھا گیا ہے۔ ظالم نے شرم کی کشتی ڈبو دی۔ فکر یہ ہے کہ وہ کون ایسا ستم پیشہ ہے۔ کوئی پوچھے گا تو کیا جواب دوں گی۔ ... پر کیا ... کہاں سے ...

(ب) بھوشیہ گپتا (भविष्य गुप्ता) وصال آئندہ کے چھپانے کی فکر ہے۔

आज तें न जैहौं दधि बेचन दुहाई खाऊं मैया की कन्हैया उतै ठाढ़ोई रहत है । कहै पदमाकर त्यों सांकरी गली है अति इत उत भाजिबे को दांव न लहत है ॥ दौरि दधि दान काज ऐसो अमनैक तहां आली बनमाली आय बहियां गहत है । भादों सुदी चौथ को लख्यो री मृग अंक यातें झूठहूं कलंक मोहि लागिबो चहत है ॥

بھائی کی قسم آج سے دہی بیچنے نہ جاؤں گی، وہاں کنھیا کھڑا ہی رہتا ہے، گلی تنگ ہے کہیں بھاگنے کو بھی جگہ نہیں۔ اور وہ آ کر ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔ بھادوں سُدی چوتھ کو "مرگ" کا "انک" دیکھا ہے اس لئے کلنک کا ٹیکا لگنے والا ہے۔

ہ نقش ہزار رہ

(ج) وَرتمان گُپتا (वर्तमान गुप्ता) جو کچھ ابھی ابھی کیا ہے اُسے کس خوش اسلوبی سے چھپایا جاتا ہے:۔

छूट जाय गैया के बिलैया चाट चाट जाय कौन दुखदैया दैपा सोच उर धार्यो मैं। हौंही जगवैया औ धरैया निज सैया तरे कहां जो कहैया हास होयगो बिचार्यो मैं॥ ग्वाल कवि हौले की अवैया निरदैया यही आज या समैया ओट पैया गहि पार्यो मैं। मैया को बुलाओ या कन्हैया को करेगो हाल दधि को चोरैया मैया पकरि पछार्यो मैं॥

اس نظر میں یہ رمز تھی کہ یار نے کا کے چھوٹ جاتی ہے یا بلی دہی چاٹ جایا کرتی ہے۔ میں تو اسے جا کر اپنی چارپائی کے نیچے رکھتی ہوں، اسے مجھے سے لوگ لوگ ہنسیں گے۔ یہ چپکے چپکے آنے والا آج ہی اور ابھی ابھی میں نے پکڑا ہے۔ میرے بھائی کو بلا تا وہ اس کی خوب خبر لے گا۔ میں نے اس دہی کے چور کو پکڑ کر پچھاڑا ہے۔

(۳) وِدگدھا (विदग्धा) اپنی طرف لوگوں کو مائل کرنے کو بڑی چترائیاں دکھاتی ہیں۔

(ا) بچن وِدگدھا (बचन विदग्धा) سخن آرائی سے پردہ پوشی کا کام لیا جاتا ہے۔

तोरत फूल कलीन नवीन गिरो मुंदरी को कहूं नग मेरो।
संग की हारी हेराय गोपाल गई अरसाय डराय अंधेरो॥
सासति सासु की जाय सकों न अहो छिन एक न गैयन फेरो।
कुंज बिहारी तिहारी थली यह जात उजारी दया कर हेरो॥

پھول اور کلیاں توڑتے انگوٹھی کا نگ گر گیا۔ سہیلیاں ڈھونڈھ کر تھک گئیں نہیں ملا۔ ساس کے کوچوں کے ڈر سے گھر نہیں جا سکتی۔ ذرا سی دیر۔ گایوں کو واپس کرو۔ اے کنج بہاری تمہارے واری اندھیرا گھر کا پڑتا ہے۔ ذرا ڈھونڈ دو۔

(ب) کریا وِدگدھا (क्रिया विदग्धा) جو کس سے لوگوں کو اڑایا جاتا ہے:۔

मंदिर मंद अनंद है सुन्दरि जात हुती अपने कहूं नातें। आगे सबै गुरु नारि रहीं हंस के हरि बात कही इक घातें॥ हाथ उठाय हनी छतियां मुसकाय कै जीभ गही दांतें। बैनन

में कह्यो ए जगदीस कि सैनन में कह्यो जाहु यहां तें॥

مندر ہو کر خوش خوش کسی رشتہ دار کے ہاں جا رہی تھی، آگے چل کر راہ میں بڑی بوڑھیوں سے مٹ بھیڑ ہو گئی، ہلدس کر ہاتھ سینہ پر مارا۔ زبان دانتوں میں دبائی۔ اے جگدیش کہہ کر چلّا اٹھی اور اشاروں اشاروں میں کہا یہاں سے چل دو۔

(۳) لکشتا (लक्षिता) ان کی حرکتوں سے سکھیاں ان کی کارستانیاں تاڑ جاتی ہیں

सीस सारी सफुरति अलकैं सुकर रही झलक कपोलन अनूप छबि छाई है। बदन बदलि गयो खौर सिर चंदन की अंजन की रेख देख बिथुर सोहाई है॥ देव जो सोहाग भाग अनुराग उमगत कंचुकी दुहर कैसे दुरत दुराई है॥ करि रतिरंग मनमोहन सों साथे राधे आज मधुबन तें बिहान होत आई है॥

سر کی ساری سرک گئی، زلفیں پریشان ہو گئیں۔ بے مثل حجیب سے رخسار دمک اٹھے، چہرہ کا رنگ بدل گیا، پیشانی پر کا چندن کی آڑی لکیر اور دُنبالہ چشم بگڑ گیا۔ فرط محبت سے سینہ کا ابھار محرم کے چھپائے نہیں چھپتا۔ من موہن کی بزم سے بادہ عشرت سے سرشار آج رادھے سویرے ہی مدھوبن سے آئی ہے۔

(۴) کلٹا (कुलटा) یہ عشرت پرست ایک ساغر میں مست ہونے والا نہیں۔ اس گدائے میکدہ کے پیالے میں ہر رنگ کی ہونی چاہیئے۔ غضب کی ہرجائی طبیعت پائی ہے۔

गलै में छैलन आवत जानि के झांकि झरोखन रीझ रिझावै। चंचल मचंल डारे रहे अंगिराय अनूप सरूप दिखावै॥ मोहति है मुरि के मुसकान म कोयल ज्यों कल बैन सुनावै। लाड़ टिकी ललचाय चितै अटकी नट की गति नैन नचावै॥

یہ سمجھ کر کہ راستہ سے بانکے ترچھے نوجوان گزر رہے ہیں دل میں گدگدی اٹھی۔ جھٹ سے جھروکے پہنچ نظربازی شروع کر دی۔ منھ پر آنچل ڈال انگڑائی لے حسن بے مثال دکھایا۔ بے قرار ہو مسکرا کر کوئل کی سی دل آویز آواز سنائی۔ ٹکٹکی باندھ للچائی نظروں سے دیکھا۔ آنکھیں اس طرح سے چلتی تھیں جیسے رسّی پر نٹ اُدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر جھٹ آتا جاتا ہے۔

(۵) مدتا (मुदिता) حسن و عشق کا فسانہ ہے سُن کر اُن کا دل ہاتھ سے نکلا جاتا ہے:۔

माईके के बिरह मयंकमुखी दुखी देखि भेद वाको सासुरे के मालिन बतायो है। मो पै ठकुराइन हुकुम करिबाई करो खिजमत करिबो हमारे बाट आयो है॥ भौन में तिहारे

बाग ताकी हौंहीं सेवती हों तामें तहखानो सुनो अति ही सोहायो है। ताकी कोठरीन की अंध्यारी भारी सुन के सुदुलही दुलारी को महा री मोद छायो है॥

سسرال کی مالن نے اس بھید کو پا لیا کہ میکے کا خیال آکر کیوں دل افسردہ رہتی ہے۔ بولی میں تو آپ ہی کی نوکر ہوں، آپ کی خدمت میرا فرض ہے۔ پائیں باغ میں ایک نہایت عمدہ تہ خانہ ہے، خالی ہی پڑا رہتا ہے، اُس میں اندھیرا بھی بہت رہتا ہے۔ یہ سن کر دل باغ باغ ہو گیا۔

(۷) اَنُسَیَنَا (अनुसयना) یہ میکش اُس جگہ کے ویران و تباہ ہو جانے سے دل گیر ہوتا ہے جہاں بادہ خواری طے پائی تھی۔ نیرنگیاں ملاحظہ ہوں۔

(ا) وَرتمان سَنکیت وِگھٹّنَا (वर्तमान संकेत विघट्टना) عیش پرستی کی موجودہ جگہ تباہ و برباد ہو گئی۔ میکش نے سن کر کلیجہ تھام لیا۔

आई रितु पावस अकास आठो दिसन मे सोहत सरूप जलधरन की भीर को। मतिराम सुकवि कदंबन की बासजुत सरस बढावे रस परस समीर को॥ भौन तें निकरि वृषभान की कुंवरि देखो ता समै संकेट की निकुंज गिरयो तीर को। नागरि के नैनन तें नीर को प्रबाह बढ़यो निरखि प्रबाह बढ़यो जमुना के नीर को॥

برسات کا موسم آگیا، ہر طرف سے بادل اُمڈے چلے آتے ہیں، قدرت کا دل فریب منظر تڑپائے دیتا ہے کدمب کی خوشبو ہوا سے مل کر مشامِ جاں کو تازہ کر رہی ہے۔ گھر سے نکل کر نظر دوڑاتی ہے تو کیا دیکھتی ہے کہ مقررہ مقامِ عیش جو جمنا کے کنارے تھا طوفان نے مٹا دیا۔ آنسوؤں کی ایسی جھڑی لگی کہ جمنا کا پانی اور بھی چڑھ گیا۔

(ب) بھاوِی سَنکیت نَشٹا (भावी संकेत नष्टा) انھیں فکر آئندہ ستا رہا ہے

सासुरे तें चलि बाहिर बाग विलोकतही अखियां भरि आई। जानति ही जु सखी जिय की तिन कान में आन नहीं समुझाई॥ देखे बिना पहिले ही भली रतिकेल को ठौर पिया पहिलाई। जाति जहां हो तहां पुनि सुन्दर मन्दिर सूने घनी अमराई॥

سسرال سے نکلتے ہی باغ پر نظر پڑی آنسو ڈبڈبا آئے سکھیاں واقف راز تھیں مصروف چارہ سازی ہوئیں۔ کان میں کہنے لگیں کیوں دل بیٹھا جاتا ہے۔ جہاں چلی ہو وہاں ایسے ایسے بہت سے خوبصورت اور گھنے باغ ہیں۔

(ج) رَمَن گَمنَا (रमणा गमना) یہ میکش عشرت کدہ کے خیال ہی سے بے چین ہو جاتے

बैठी बनि बानिक सों मानिक महल मध्य अंग अलबेली को अचानक थरकि परयो। कहै पदमाकर तहांई तन तापन तें हारन तें मुकुना हजारन दरकि परयौ॥ बाल छतियां तें धकधक ना कढ़त मुख बक ना कढ़त कर ककना सरिक परयौ॥ पांसुरी पकरि रही सांसु री संभारे कौन बांसुरी बजत आंख आंसुरी ढरीक परयौ॥

البیلی بن سنور کر بیٹھی تھی کہ جسم کے بیچ کا حصہ اچانک تھرک اُٹھا، تجا پڑھ، یا اُس کی گرمی سے ہار کے موتی چٹخ کر گر پڑے سینہ کی دھڑکن کم ہونے ہی نہیں آتی منھ سے بات نہیں نکلتی۔ کنگن اپنی جگہ سے سرک گیا سانس اُکھڑ گئی، سنبھالے نہیں سنبھلتی۔ بانسری بجتے ہی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

باب سوم ۔ سامانیا یا گنکا نایکا

سامانیا نایکا۔ تعریف شروع ہی میں آچکی ہے۔ یہ بھی تین رنگوں میں جلوہ افروز ہوتی ہیں۔

(ا) سُوتَنْتَرا (स्वतन्त्रा) یہ آزاد ہیں۔ مثال شروع ہی میں ملاحظہ ہو۔

(ب) جَنَنی آدھینَا (जननी अधीना) یہ اپنی نایکہ کے پنجہ میں پھنسی ہیں۔

आठहू जाम खड़ी रहै धाम करै व्यभिचार कथा लरजै ना। ठाढ़ी भई है बसीठहू काहू की मानति दीठ कछू अरजै ना॥ सूरत आन के मेरे लिये करनेस जू ल्यावति मो गरजै ना॥ या ब्रज गांव बसे सुभ ठांव सु कोऊ चितेरिन को बरजै ना॥

ہر گھڑی دریچہ میں کھڑی ہے۔ عیاشی کی باتیں کرتے نہیں شرماتی۔ کسی کے پیام و سلام، عرض و معروض کی پروا نہیں۔ لوگ تصویریں کھینچتے ہیں، منع کرنے پر بھی نہیں مانتے (کہتی ہے) یہ برج تو اچھا شہر کہلاتا ہے پھر ان مصوّروں کو کوئی کیوں نہیں سمجھاتا۔

(ج) نِیَمَا (नियमा) یہ دولت کے لالچ میں محبوب کے گھر پر قبضہ کر لیتی ہیں۔

रूप अनूप सोहात नयो परभात सों जोबन रूप उजेरो। कंचन से तन भूषन भूषित गति कला गुन ज्ञान घनेरो॥ सील सुभाय सयानप एक सिरै सब तें तुहि में हिय हेरो। हीकर मोद सुखी पीय को मंत्र बसीकर सीकर तेरो॥

حسن بے نظیر بڑا ہی دل فریب ہے، گھر بھر میں اُجالا ہو رہا ہے سارا جسم سونے سے پیلا پڑا ہے۔ موسیقی کی ماہر، بہت ہی فرزانہ، سب سے حسن سلوک ہے۔ خوش ہو کر محبوب کو فریفتہ کیا۔ کیسا موہنی منتر تیرے پاس ہے۔

نومیدیِ جاوید

(از جناب راجہ مہدی علی خاں)

تو بھی اب چھوڑ دے مجھے ہمدم!

کہ میں وہ سازِ بے نوا ہوں اب
ٹوٹ کر جو خموش ہو جائے
جس کے تاروں میں اب بھی لرزاں ہو
ایک جاں سوز آخری آواز
جو فضا میں نہ کر سکے پرواز
ساز کے پیچ و خم میں کھو جائے

تو بھی اب چھوڑ دے مجھے ہمدم!

کہ وہ سوکھا ہوا شجر ہوں میں
جو ہو تنہا کسی بیاباں میں
آندھیاں جس کو توڑنا چاہیں
نظر آتا ہو جو نحیف و نزار
جس میں باقی رہے نہ حسنِ بہار
جل کے رہ جائے سوزِ پنہاں میں

تو بھی اب چھوڑ دے مجھے ہمدم!

کہ وہ بجھتا ہوا دیا ہوں میں
جو ہواؤں کے رہگذار میں ہو
جو ہو مہمان چند لمحوں کا
خوف و اُمید و یاس سے لرزے
زندگی جس سے دُور دُور رہے

موت ہر لمحہ انتظار میں ہو
تو بھی اب چھوڑ دے مجھے ہمدم!
چھوڑ دے تو بھی اب مجھے تنہا
چین کی نیند مجھ کو سونے دے
اور مری روح کو دے آزادی
اذنِ پرواز دے فضاؤں میں
وقت کے بیکراں خلاؤں میں
سالہا سال اس کو رونے دے
تو بھی اب چھوڑ دے مجھے ہمدم!

پریتم ایسا گیت سُنا!

(از جناب عزیز احمد ارکوی)

پریتم کوئی ایسا گیت سُنا　　ساون کی بھری برساتوں میں!
آجائے نئی جوانی پر　　وہ رس ہو پریتم کی باتوں میں!!
درد اٹھے میٹھا میٹھا سا　　دل کسکے کالی راتوں میں!!!
پریتم کوئی ایسا گیت سُنا!

جس گیت کی میٹھی تانوں سے　　اک پریم کی گگری پھوٹ پڑے!
آنکھوں سے لہو ہو جائے رواں　　اشکوں کا دریا پھوٹ پڑے!!
اُجڑی ہوئی دل کی محفل میں　　اک نور کی دُنیا پھوٹ پڑے!!!
پریتم کوئی ایسا گیت سُنا!

پھر موڑ وہی اور ساز وہی　　پریت کے دن پھر آجائیں!
پھر ساتھ ہو، پیار کی باتیں ہوں　　اس ریت کے دن پھر آجائیں!!
پھر دکھیاروں کی ہار نہ ہو　　اور جیت کے دن پھر آجائیں!!!
پریتم کوئی ایسا گیت سُنا!

دَورِ مغلیہ کے ہندو ادیب و شاعر

مسٹر اقبال انصاری - ایم - اے ریسرچ اسکالر لکھنؤ یونیورسٹی۔

فارسی زبان کی سرپرستی میں جو امتیاز آلِ تیمور کو حاصل ہے وہ اُن سے پہلے یا بعد کسی کو میسّر نہیں۔ ان کے زمانہ میں بیشمار کتابیں لکھی گئیں، چمن زار شاعری میں تازہ بہار آئی، فارسی سرکاری زبان مقرر ہوئی اور یہی نہیں بلکہ ہندوؤں کے ساتھ اختلاط و ارتباط اور دانست نے چھ، سات سو سال کی سرکاری زبان (ہندی) کو پیچھے ہٹا دیا اور فارسی ہی دفتری زبان مقرر ہوئی۔ بادشاہ خود بھی باوجودیکہ مختلف زبانوں مثلاً ہندی ترکی وغیرہ سے واقفیت رکھتے تھے لیکن زیادہ تر فارسی ہی میں گفتگو اور تصنیف و تالیف کیا کرتے تھے۔ اور سارا اسلامی و ہندو ماحول عجمی رنگ میں رنگا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ فارسی کی تعلیم ایک ایسا تجربہ تھا جس نے ہندوؤں کی علیحدگی اور تفرد کے توہمات کا ازالہ کر دیا اور اسلامی تمدن نے ہندو سوسائٹی پر نہایت گہرے اور خوشگوار اثرات ڈالے اور سیکڑوں برس تک فارسی ہندو اور مسلمانوں میں میل جول کا ایک زبردست ذریعہ بنی رہی۔ ہندوؤں پر فارسی تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ اُن کا تمدن اسلامی اور ہندو تمدن کے امتزاج کا آئینہ دار ہو گیا۔ ان کے ادبیات نے مسلمانوں کے اسٹائل کے علاوہ مذہبی اثرات اور رسمیات کو بھی قبول کر لیا۔ اور ہندوؤں کے ہاں بسم اللہ الرحمن الرحیم، الحمد للہ، صلی اللہ علیہ وسلم۔ رمضان المبارک وغیرہ قسم کے الفاظ کثرت سے ملتے ہیں جو مغل مسلمانوں سے مخصوص و محبوب تھے۔ ہندوؤں کے ناموں کے ساتھ مرزا، خواجہ، میاں وغیرہ القاب ملتے ہیں اور اُنکے ناموں میں عربی و فارسی جزو مثلاً مشتاق رائے۔ رائے حکیم چند، دولت رائے وغیرہ بھی اکثر پائے جاتے ہیں۔

ان چیزوں کے دکھانیسے محض یہ مطلب ہو کہ ہندوؤں کی علمی سرگرمیاں معلوم ہو سکیں اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی واضح ہو جائے کہ انہوں نے مسلمانوں سے علوم و فنون سیکھے اور بعض اصناف میں ان سے بھی سبقت لیگئے۔ انہوں نے کس کثرت کیساتھ مختلف علوم و فنون پر کتابیں لکھیں اور یہ کہ ہندو مصنفین ہندوستان کے عام مسلمان مصنفین سے کسیطرح کم نہیں اسلیئے کہ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہندوؤں میں برہمن مخلص، شفیق، سالم، بہار، وارستہ، منوہر و تفتہ جیسے ادیب مورخ و انشاپرداز موجود ہیں تو ہمیں ہندوؤں کی فارسی دانی کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ بات ظاہر ہو جاتی ہو کہ ہندو اعلیٰ انشا پردازوں، محققین، مورخین، لغت نویس اور شیریں زبان شاعروں اور نغز گویوں کو نظرانداز کر کے ہم فارسی ادب کی کوئی مکمل تاریخ نہیں لکھ سکتے کیونکہ ہندو فارسی ادب کا جزو لاینفک ہیں۔

عام ہندو عموماً اور کایستھ اور کشمیری برہمن خصوصاً نہایت صاحبِ ذوق ہوتے تھے۔ کایستھوں کا کام ازمنہ

قدیمہ سے محض نوشت و خواند ہی تھا اور وہی راجاؤں کے یہاں منشی گری پر فائز ہوا کرتے تھے مسلمان جب ہندوستان میں آئے تو انہوں نے اسی جماعت سے فائدہ اُٹھایا ہوگا۔ سکندر لودی کے زمانہ میں جب فارسی کے تعمیم کی منظم کوشش کی گئی تو ہندوؤں میں ہیجان نہ پیدا ہونا اسبات کی ایک دلیل ہو سکتی ہے کہ ہندوؤں کی کوئی فارسی داں جماعت ضرور موجود تھی اور اغلب یہ ہے کہ وہ جماعت کائستھوں کی تھی۔ اٹھارھویں صدی تک تو ان لوگوں نے وہ ترقی کی کہ ان کی عورتیں بھی فارسی جاننے لگیں ترقی کی انتہا ہے کہ محمد شاہ کے ہاں بقول خان آرزو[۵] کائستھ سرکاری دفتروں پر چھائے ہوئے تھے۔ جب سلطنت مغلیہ کا زوال ہوا تو علمی سرگرمیاں دوسرے مراکز کی طرف منتقل ہو گئیں۔ لیکن اس سے اُن کے اعزاز میں فرق نہ آیا۔

کائستھوں کی طرح کشمیری برہمنوں میں بھی فارسی کا آغاز سلطان زین العابدین کے وقت سے ہو چکا تھا۔ اور اکبر و شاہجہاں کے زمانہ میں انکا شاہی دربار میں موجود ہونا مسلم ہے۔ سکھوں اور انگریزوں کے ابتدائی عہد میں بھی کشمیری برہمن مقتدر و موقر رہے اور فارسی کی خدمت اپنا شیوا سمجھتے تھے۔

بہرحال ہندوؤں میں مجموعی حیثیت سے اکبر کے زمانہ سے فارسی کا شوق پیدا ہوا۔ اور تصنیفوں کی ابتدا ہوئی جہانگیر اور شاہجہانی دور کے وسط تک یہ اپنی مذہبی کتابیں فارسی میں منتقل کرتے رہے اور اورنگ زیب سے لیکر مغلوں کے انحطاط تک ان کی ادبی پختگی اور تکمیل کا زمانہ رہا ہے۔ درحقیقت یہی ہندوؤں کی ادبی خدمت کا زرین زمانہ کہا جا سکتا ہے اسلئے کہ اس زمانہ میں تاریخ، انشا، شاعری اور دیگر علوم پر بیشمار اور بیش بہا کتابیں لکھی گئیں۔ انحطاط سلطنت سے اب تک اُنکی علمی سرگرمیاں باقی ہیں۔

ہندو مصنفین نے تقریباً ہر اُس مضمون پر لکھا جس پر مسلمانوں نے لکھا تھا۔ تاریخ، شاعری، انشا، ریاضیات لغت، موسیقی، عروض، پر بے انتہا لٹریچر بہم کر دیا ہے۔ وقائع نویسی، ترسیل، اور دستور العمل وغیرہ کی ترتیب میں انہیں خاص مہارت تھی۔ تاریخی کتابوں میں سبحان رائے بٹالوی کی خلاصۃ التواریخ، بندرابن داس کی لب التواریخ زخمی کی سلطان التواریخ، بہادر سنگھ کی یادگار بہادری، سوہن لال کی عمدۃ التواریخ خاصکر قابل ذکر ہیں۔ تذکروں میں سوہن لال انیس کی انیس الاحبا، بندرابن داس خوشگو کی سفینہ شفیق اورنگ آبادی کی گل رعنا، اخلاص کی ہمیشہ بہار اور زخمی کی انیس العاشقین وہ تصنیفات ہیں جن کا پایہ مسلمانوں کے بہترین کارناموں سے کسی طرح کمتر نہیں فن انشا سے تو ہندوؤں کو فطری لگاؤ تھا وہ ابتدا ہی سے اس کام پر مامور ہوتے چلے آئے تھے۔ جنانچہ بعض ان میں سے بہت ہی مشہور بھی گزرے ہیں مثلاً چندر بھان برہمن مخلص۔ مادھو رام لچھمی نرائن۔ جوالا پرشاد وقار اور رتن سنگھ زخمی۔

---

۵ مجمع النفائس بانکی پور لائبریری

لغات کی کتابیں اگرچہ ہندوؤں نے کم لکھیں لیکن جو لکھی ہیں وہ بہت ہی بلند پایہ ہیں اور اُن کے لٹریچر کا یہ روشن ترین پہلو کہا جاسکتا ہے۔ بہارعجم مصنفہ ٹیک چند بہار، مصطلحات وارستہ اور مراۃ الاصطلاح انندرام مصنفہ مخلص کی قدر و قیمت انصاف کی نظروں میں غیرمعمولی ہے۔

اِن علوم و فنون کے علاوہ ہندوؤں نے فن سیاق و ریاضی پر بھی بہت کچھ لکھا ہے لیکن انشا، و لغت کی ہمسری نہیں کرسکتیں۔ ہندوؤں میں اچھے شاعر تھوڑے سے ہی ہوئے ہیں۔ اِس کا سبب یہ ہوسکتا ہے کہ ہندو شاعر عہد اکبری میں نہیں پیدا ہوئے کہ شہنشاہی علم نوازی اُن پر زر و سیم کی بارش کرتی وہ زمانہ انحطاط میں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئے تاہم تین چار شاعر ایسے پیش کئے جاسکتے ہیں جن کا طرۂ امتیاز بلند پایہ تخیل اور جدت اسلوب تھا۔ مثلاً برہمن، مخلص اور شفیق۔

ہندوؤں کی فارسی خدمات اور میلان کا یہ نتیجہ ہوا کہ اُنہیں اور مسلمانوں میں روابط پیدا ہوگئے اور اُن کے اختلاط سے ایک نئے تمدن کی تشکیل ہوئی لیکن اکتساب انتفاع ہندو سماج ہی تک محدود نہ رہا۔ اسلامی ادبیات بھی ہندی اثرات سے متاثر ہوئی چنانچہ ابوالفضل سے لیکر معمولی لکھنے والوں تک کی تحریروں میں بکثرت ہندی الفاظ ملتے ہیں پروفیسر محمود شیرانی نے سینکڑوں محاورے اور الفاظ مسلمانوں کی تحریروں سے نکال کر جمع کر دیئے ہیں[1] جنسے اس حقیقت کو بے نقاب کیا ہے۔ کہ "استعمال ہند" پرانے زمانہ سے جائز رہا ہے۔ خان آرزو[2] تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر ہندی شعراء زبان فارسی میں ہندی الفاظ استعمال کرنے کے علاوہ الفاظ فارسیہ میں تصرف بھی کریں تو بجا نیست۔ اگر فارسی شاعر فارسی میں بیسیوں ہندی الفاظ استعمال کرنے اور اکثر غلط استعمال کرنے کے مجاز ہیں اور کہیں کہیں انکی جسارت تصرفات کی حد تک پہونچ گئی ہے تو "پھر تصرف صاحب قدرتان ہندو فارسی چرا جائز نباشد"۔

بہرحال ہندو شعراء کی زباندانی ہر طرح قابل ستایش ہے۔ میدان ادبیات فارسی میں ان کے سمند فکر نے جو جولانیاں دکھائی ہیں اسنے انہیں زمرۂ اساتذہ میں شامل کردیا ہے۔ چندربھان برہمن، انندرام مخلص ٹیک چند بہار، وارستہ سیالکوٹی مل اسی قسم کے فلک پیمایان ادب ہیں۔ جن کے حالات اور تصنیفات سے مفصل بحث مدنظر ہے۔

(۱) چندربھان برہمن | تذکروں میں اس فاضل کے حالات سے سیر حاصل بحث نہیں ملتی۔ اسلئے ہمارے ماخذ کی تنگ وسعتیں چند تذکروں اور خود اسکے مصنفات کی حدود سے آگے نہیں بڑھتیں۔ نشتر عشق، مراۃ الخیال، مجمع النفائس اور مصنف کے کچھ خود نوشت حالات ہی سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

[1] اورنٹیل کالج میگزین نومبر ۱۹۲۹ء [2] ملاحظہ ہو راقم کا مضمون "خان آرزو ایک نقاد کی حیثیت سے" نگار نومبر ۱۹۴۰ء اور "مجمع النفائس" معارف، اگست و ستمبر ۱۹۴۱ء

چندر بھان کے والد دھرم داس لاہور کے رہنے والے تھے۔ دہرم داس کے تین لڑکے اور بھی تھے ان میں اُودے بھان عاقل خاں کے ہاں متصدی ... ائے بھان اور اندر بھان تعلقات دنیاوی سے کنارہ کش ہو کر ریاضت و عبادت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ تعلقات باہمی عمدہ تھے چنانچہ چندر بھان اپنے خطوط میں اُن کا ذکر نہایت اَدب احترام سے کرتے ہیں۔

چندر بھان نے ابتداً مُلا عبد الحکیم سیالکوٹی کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ طالب علمی سے لیکر ملازمت تک کا حال معلومات کے دسترس سے باہر ہے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ اراکین دورِ شاہجہانی کے ایک نہایت سربرآوردہ رکن تھے اور طرزِ نگارش اسقدر بلند تھا کہ خود داراشکوہ کی نظر انتخاب ان پر پڑی اور وہ عرصہ تک بعہدۂ میر منشی ممتاز ہے۔ چندر بھان نہایت معزز۔ باوقار، سلیم، اور صُلح کل ہندو تھے۔ اپنی تحریروں میں ہندوانہ مراسم کا نہایت لطف سے ذکر کرتے ہیں۔ اسکے متعلق ایک لطیفہ بھی تذکروں میں ملتا ہے۔ ایکدفعہ برہمن نے شاہجہاں کے سامنے یہ شعر پڑھا ؎

مرا دلیست بکفر آشنا کہ چندیں بار ۔۔۔ بکعبہ بُردم و بازش برہمن آوردم

بادشاہ اسوقت متقّش تھے یہ کفر آمیز شعر سُنکر اور برہم ہوئے اور قتل کا حکم دیا۔ افضل خاں وزیر اعظم نے کہا کہ حضور سعدی کا شعر اسکے مناسب حال ہے ؎

خرِ عیسےٰ گرش بمکہ برند ۔۔۔ چوں بیاید ہنوز خر باشد

برہمن کی اولاد میں ایک لڑکے تیج بھان کا پتہ چلتا ہے۔ اسکے علاوہ کسی اور اولاد کا پتہ نہیں۔ چندر بھان نے ۱۰۷۳ھ میں بنارس میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

تصانیف (۱) چہار چمن (۲) گلدستہ (۳) تحفۃ الانوار (۴) نگارنامہ (۵) تحفۃ الفصحا (۶) مجموعۃ الفقرا (۷) منشآت (۸) دیوان۔ ان تمام تصانیف میں چہار چمن۔ منشآت اور دیوان بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ دیوان کا ایک نسخہ پنجاب پبلک لائبریری میں موجود ہے۔ (اورنٹیل کالج میگزین اگست ۱۹۲۵ء)

ہندوؤں میں برہمن سب سے پہلا باکمال شاعر ہے جس نے دیوان چھوڑا ہے۔ تذکروں میں انتخاب کلام بہت کم ملتا ہے مثلاً صاحب مراۃ الخیال کی نگاہ نکتہ رس تین شعر سے زیادہ سارے دیوان سے انتخاب نہ کر سکی۔ بہرحال اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ کلام صفائی و سادگی سے متصف ہے۔ اسکے علاوہ تصوّف، وحدت الوجود، فلسفہ اور بے ثباتی دُنیا وغیرہ سب کچھ موجود ہے۔ چند مثالیں ملاحظ ہوں:۔

راستی نیست اینکہ دار سرد ۔۔۔ راست گویم کہ راستی دگر است (راستی)

آں نکتہ کہ خال نام دارد ۔۔۔ از روئے تو انتخاب کردیم (تخیل)

بنائے قصر جہاں را ثبات ممکن نیست ۔۔۔ بجز اساس محبت کہ دیر بنیاد است (بے ثباتی دنیا)

بانیِ خانہ دبت خانہ دے خانہ کیست
خانہ بسیار دلے صاحب ہر خانہ یکیست (وحدت الوجود)

مادرو دلِ خویش نہفتیم و نگفتیم
شب تا سحر از درد نخفتیم و نہ گفتیم (محبت و عشق)

بارشتۂ مژگاں ہمہ شب دانۂ اشکے
از غیر نہاں داشتہ سفتیم و نگفتیم (")

درجہاں باش ولیکن زجہاں فارغ باش
ہر کہ فارغ زجہانست جہانے با اوست (ترک دنیا)

مرد را سود و زیاں در نظر آید یکساں
ہر کہ شد در گرد سود و زیانے با اوست (")

(۲) انند رام مخلص | مخلص کا ذکر تقریباً تمام تذکرہ نویسوں نے کیا ہے۔ مولف تذکرہ مخزن الغرائب ہندو شاعروں کا ذکر کم کرتا ہے لیکن وہ بھی مخلص کو شعراء کی فہرست میں داخل کرنے سے گریز نہیں کرتا۔ فی الحقیقت ہندو شاعروں میں مخلص ہر لحاظ سے بڑے سے بڑے درجہ کا مستحق ہے۔ قادر الکلام شاعر تو تھا ہی لیکن مدعی زبان دانی بھی تھا۔ ایرانیوں سے ہم چشمی سے نہیں جھجکتا اور سرپرستی شعراء میں بدل و جاں کمربستہ رہتا تھا۔

مخلص ذات کا کھتری۔ فارسی و عربی کا زبردست عالم۔ اور محمد شاہ کے زمانہ میں وزیر اعتماد الدولہ کا وکیل تھا۔ اپنے حسن خدمات کے صلہ میں رائے رایاں کا خطاب حاصل کیا۔

مخلص نے شعر و شاعری میں پہلے بیدل سے اصلاح لی لیکن بعد کو خان آرزو کیطرف رجوع کیا اور انکی ایسی قدردانی کی کہ ۱۱۳۲ھ میں جب خان آرزو دہلی پہونچے تو محمد شاہ سے ایک جاگیر اور استعداد خاں کا خطاب دلوا دیا۔ مخلص کے تعلقات اپنے دوستوں و معاصرین کیساتھ نہایت عمدہ تھے چنانچہ خان آرزو مجمع النفائس میں لکھتے ہیں کہ "انند رام بے حد خوش اخلاق آدمی ہے۔ تیس سال سے میرا قیام دلی میں ہے اسکا سبب صرف مخلص کی عنایات ہیں"۔ مخلص کے معاصرین کے حالات نہایت تفصیل کیساتھ رقعات، مراۃ الاصلاح اور چمنستان سے معلوم ہوتے ہیں۔ مخلص ۱۱۶۴ھ میں نفس الدم میں مبتلا ہو کر راہی ملک بقا ہوا۔

مخلص کی غیر معمولی قابلیت واستعداد پر خود اسکے مصنفات شاہد ہیں پھر بھی شاعری، وانشا، وزباندانی کے متعلق مشاہیر کی رائے سنئے۔ سید غلام علی نسیم امروہوی کہتے ہیں ۔

آں سپہر سخنوری مخلص
فخر عرفی وانوری مخلص (نشتر عشق بانکی پور)

خان آرزو اسکے متعلق لکھتے ہیں۔ کہ

"از منتخبان روزگار است۔ در انشا و فن شعر کتب متعدد دارد۔ اشعارش نہایت مرغوب" (مجمع النفائس)

الہ داغستانی لکھتا ہے۔

"در ابرو فکر او کسے در ہنود نیست" (ریاض الشعراء)

صاحب نشتر عشق اقول ہے۔ کہ

در فارسی روشِ مخصوص بدست آوردہ ...... نظم را بحدِ اعتدال رسانیدہ"

غلام علی آزاد کہتے ہیں۔ کہ

"سخن آن در رام قشقۂ قبول بر جبیں دارد"

افسوس ہے کہ مخلص کا دیوان نہیں ملتا۔ صرف ایک کاپی انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہے۔ مجمع النفائس میں کئی جزو میں اسکے اشعار کا انتخاب موجود ہے۔ مصحفی نے بھی عقد ثریا میں رباعیات و قطعات نقل کئے ہیں جسکی ایک قلمی کاپی بانکی پور میں موجود ہے۔ غلام علی آزاد نے بھی مخلص کا دیوان اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا اور کلام کا جو نمونہ انہوں نے پیش کیا ہے وہ مجمع النفائس ہی سے لیا ہے بہر حال مخلص کے چند شعر بطور نمونہ نیز متذکرہ بالا اقوال کی تائید میں پیش کیے جاتے ہیں۔

گذشتی از نظر بے تو زندہ ایم ہنوز　　ز شرم آب نگشتیم، خاک بر سر ما
قصۂ کوہکن بود گویا　　بوئے خوں آید از فسانۂ ما
ماجرائے بلبل و گل شاہد احوال ماست　　از تو مخلص نالہ و از یار شنیدن بس است
از قد کش بر من قیامت در جہاں　　گر نشد امروز، فردا می شود
بلبل شوریدۂ چوں من ندارد ایں چمن　　صد بہار آخر شد و من ہمچناں دیوانہ ام
عکس چشم خوشت در آئینہ است　　یا شنا می کند در آب آہو
حقوق صحبت گل بر تو بسیار است اے بلبل　　مبادا از چمن غافل در ایام خزاں باشی
از آں ہر لحظہ در بر میکشم سرو گلستاں را　　کہ ایں رعنا جواں بسیار می ماند بیار من

تصنیفات | (۱) مراۃ الاصلاح (۲) چمنستان (۳) رقعات (۴) ہنگامۂ عشق (۵) کارنامۂ عشق (۶) تذکرہ یعنی محمد شاہ اور نادر شاہ کے جنگ کی تاریخ (۷) دیوان (تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو اورنٹیل کالج میگزین فروری ۱۹۲۹ء)

(۳) ٹیک چند بہار | ٹیک چند کے لغات بہار عجم کو جتنی مقبولیت ہندوستان میں ہوئی اتنا ہی خود مؤلف گمنام میں رہا۔ صرف مجموعۂ نغز ایک تذکرہ ایسا ہے جسمیں آٹھ دس سطریں ملتی ہیں۔ لکھنے کے لئے تو میر و میر حسن و علی ابراہیم منشی کریم الدین سبھی نے کچھ نہ کچھ لکھا ہے لیکن وہ نہ لکھنے کے برابر ہے۔
رائے ٹیک چند بہار دہلی کے رہنے والے تھے۔ سراج الدین علیخاں آرزو اور شیخ ابو الخیر خیر اللہ وفائی سے شرف تلمذ تھا۔ چنانچہ وہ بہار عجم میں اول الذکر کو سراج المحققین اور ثانی الذکر کو خیر المدققین کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ خان آرزو بہار کو "ستم کیدست" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔
ٹیک چند کھتریوں کی قوم ستارہ سے تعلق رکھتے تھے اور اسی لفظ ستارہ سے بعضوں کو یہ غلط فہمی ہوگئی

کہ وہ سُنار بچہ تھے اسلئے کہ ہندی میں زرگر کو سُنار ہی کہتے ہیں۔
جہانتک معلوم ہوتا ہے بہار کی طبیعت میں یار باشی و خوش مزاجی تھی۔ میر فتح علی حسینی گردیزی، میر تقی میر، اور خود خان آرزو سے تعلقات دوستانہ و مخلصانہ تھے۔
علی ابراہیم مصنف گلزار ابراہیم کا بیان ہے کہ بہار نے ایران کی سیاحت بھی کی تھی۔ بہار کو شہنشاہ دہلی نے رائے یا راجہ کے خطاب سے بھی سرفراز فرمایا تھا۔
بہار عجم شاہد ہے کہ ٹیکچند فارسی میں غیر معمولی استعداد رکھتے تھے۔ وہ شاعر بھی تھے لیکن میر حسن اور قاسم کے تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ بدقسمتی سے کوئی اشعار کا مجموعہ یا انتخاب دستیاب نہیں ہوا۔ بہر حال میر حسن اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں
"از مستعدان روزگار۔ شاعر فارسی بود۔ از اصطلاحات فارسی بسیار خبر داشت۔ از یاران سراج الدین علیخاں صاحب بود۔ تصانیف بسیارے داشت۔"
کسی تذکرہ نگار نے بہار کی تصنیفوں کی کوئی فہرست نہیں لکھی منشی کریم الدین بھی اپنے تذکرہ میں یہی لکھتے ہیں کہ "بہار ہندی، اُردو اور خصوصاً فارسی میں بہت سی کتابیں چھوڑ کر مرا"۔ بہر حال اسکی کچھ تصنیفیں جنکا پتہ چل سکا ہے لکھی جاتی ہیں
(۱) بہار عجم (۲) جواہر الحروف (۳) نوادر المصادر (۴) ابطال ضرورت (۵) جواہر الترکیب۔
ان تمام تصنیفوں میں بس بہار عجم ہی تک ہماری رسائی ہو سکی۔
بہار عجم متواتر بیس سال کی کوششوں اور سو سے زیادہ کتابوں کے مطالعہ کے بعد تیار ہوئی۔ اور بقول بلوخمن (کنٹری بیوشنز Contribution صفحہ ۲۸) انسان کے قلم سے نکلا ہوا سب سے بڑا لغات ہے" خان آرزو بھی اسکی جامعیت کے معترف اور لکھتے ہیں کہ "صاحب بہار عجم جو میرا دوست ہے اور اسکا ثانی فی زمانہ موجود نہیں ......" (شمر)
بہار عجم کی شہرت اور جامعیت مسلم الثبوت اور اقران و اماثل کے علاوہ بعد کو آنیوالوں کی نظروں میں بھی نہایت ممتاز ہے اسکی شہرت کو اسناد دوام نصیب ہو چکا ہے کہ اگر کسی اور ہندو کی کوئی دوسری کتاب اصطلاح و لغت میں ہمارے پاس نہ ہوتی تو ہم اسے بلاشبہ ہندوؤں کی تصانیف میں بہترین تصنیف قرار دیتے۔ ہندو اور مسلمان دونوں کے لغات کو سامنے رکھکر انصافاً کو ماننا پڑیگا کہ بہار عجم بہترین کتاب ہائے لغات میں ضرور شمار کی جانی چاہیئے۔
(۴) وارستہ سیالکوٹی مل | وارستہ سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔ انکی تصانیف مصطلحات اور مطلع السعدین سے پتہ چلتا ہے کہ وہ میر محمد علی رائج سیالکوٹی کے خوان تدریس کے زلّہ ربا تھے۔ بقول سرخوش رائج کا اپنے وقت کے اچھے شاعروں میں شمار تھا۔ اور ممکن ہے کہ وارستہ نے شعر و شاعری کا ذوق انہیں سے پایا ہو اسلئے کہ باقی اصناف علم میں محمد علی کو کوئی خاص شہرت حاصل نہ تھی۔ عمر کا آخری حصہ ڈیرہ غازی خان میں بسر ہوا اور وہیں ۱۱۸۰ھ میں انتقال کیا۔

اسپر تعجب نہ ہونا چاہیئے کہ وارستہ کے حالاتِ زندگی بہت کم ملتے ہیں کیونکہ تذکرہ نویسوں نے ہندو شعراء کے حالات لکھنے میں جس کوتاہ قلمی سے کام لیا ہے اسمیں استثناء کو دخل نہیں ہے صرف سفینۂ خوشگو اور گلِ رعنا میں تھوڑا سا ذکر ہے اور باقی تذکروں کے صفحات اسکے ذکر سے خالی ہیں۔ مگر کسی سوء ظن کے امکاناتِ تردید کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ وارستہ علمی مرکزوں سے دور مدت العمر پنجاب میں رہے اسلیئے ممکن ہے کہ اُن کے تبحر کی دسترس دامانِ شہرت تک نہ ہوئی ہو اور اُن کا غلغلۂ کمال تذکرہ نویسوں کے گوشِ ہوش تک نہ پہونچا ہو۔ یہ بھی بعید از قیاس نہیں کہ وہ شاعری میں مرتبہ بلند نہ رکھتے ہوں اور چونکہ تذکرے عموماً شاعروں ہی کا ذکر کرتے ہیں اسلیئے وہ انسان کے ذکر سے تو تہی دامن ہیں۔ ان دو سببوں کے سوا اور کوئی سبب نہیں معلوم ہوتا۔ تذکروں میں معمولی لوگوں کے حالات کے ملنے اور وارستہ جیسے محقق اور انشاء پرداز کے ذکر کے نہ ملنے کی یہی تاویل کی جاسکتی ہے بایں ہمہ وہ آج ہمارے سامنے محض اپنے مصطلحات کی بناء پر معزز و موقر ہے۔

وارستہ کی طبیعت میں سطحیت کے بجائے عمق اور تنگ خیالی کے بجائے وسیع النظری موجود ہے۔ وہ اپنے زمانہ کا بہترین محقق ضرور تھا اور متاخرین آسے اپنا اُستاد مانتے ہیں۔ وہ "تصرف" کو شعر میں جائز نہ سمجھتا تھا۔ یہ ایرانیت "نہیں" تو کیا ہے ورنہ جس چیز کو خود ایرانیوں نے جائز رکھا ہوا سے ایک ہندی کا ناجائز سمجھنا کیا معنی؟ اور اپنی اسی ایرانیت پسندی کے زعم میں وارستہ خان آرزو اور ٹیک چند و نعمت خاں عالی وغیرہ پر برابر اعتراض بھی کرتا ہے۔ وارستہ کی تحقیق یقیناً اس پایہ کی ہے کہ وہ بڑے سے بڑے محقق کے دوش بدوش نظر آتا ہے۔ بہترین لغتوں میں غلطیاں نکالتا ہے نقد و جرح کرتا ہے اور پھر کتاب میں شامل کرتا ہے۔ وارستہ کا مصطلحات معاصرین و متاخرین کے لئے مستقل ماخذ رہا ہے۔ ٹیک چند نے تو بقول بوخمن "اسکو کاملاً بہارِ عجم میں شامل کرلیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وارستہ کا رسالہ زیادہ مشہور نہ ہوسکا"۔ قتیل نے اپنی تصنیفات میں وارستہ سے برابر استفادہ کیا ہے۔ آغا احمد علی موید برہان لکھتے ہیں کہ "مصطلحات متاخرین کے لغات اور محاورات پر مشتمل ہے۔ یہ سیالکوٹی مل کی تصنیف ہے اور یہ فاضل پہلے پندرہ برس تک ایرانی زباندانوں سے محاورات اخذ کرتا رہا ہے....."۔ صاحب آصف اللغات لکھتے ہیں کہ مصطلحات ایک مختصر و مفید کتاب ہے۔ یہ فارسی اصطلاحوں سے متعلق ہے۔ کہیں کہیں مفردات کا بھی ذکر ہے۔ لفظوں کی ترتیب مسلسل نہیں ہے۔ کم پیشرو اسکی طرف متوجہ نہیں ہوتے ہیں۔ وارستہ کو تحقیق الفاظ کا خاص مذاق ہے۔ اسکی تالیف (مصطلحات) اگرچہ مختصر ہے لیکن بعید معتبر" ان کتابوں کے علاوہ فرہنگ انندراج ہفت قلزم اور بہار عجم کی ترتیب میں مصطلحات سے بہت مدد لیگئی ہے۔

تصنیفات | (۱) مصطلحات (۲) مطلع السعدین (۳) صفات کائنات یا عجائب و غرائب (۴) جواب شافی یا محاکمات وارستہ (۵) جنگ رنگا رنگ یا تذکرہ وارستہ۔

افسوس ہے کہ وارستہ کی شاعری کے متعلق کچھ نہ معلوم ہوسکا اور وہ محض اپنی محاورہ دانی اور انشاء پردازی کیوجہ سے مشہور ہوا میں نے ان چاروں علماء و محققین کا نہایت مختصر ذکر کیا ہے ورنہ ان سبھوں کی شخصیت اور قابلیت کا تقاضا ہے کہ مستقل طور پر انکے مفصل حالات کو تاریکی سے روشنی میں لانیکی کوشش کرے اور یہ واضح ہوجائے کہ استعداد علمی اور ادبیت میں ہندو بھی عام مسلمانوں کے دوش

"سونے والا"

(از سید مقبول حسین احمد پوری بی۔اے۔ ایل۔ایل۔بی)

بچھائے جہاں گھاس مخمل کا بستر
ندی گائے میٹھی سی لوری جہاں پر
جہاں دھوپ پربت کے پہلو سے جھانکے
ہوا جس جگہ ایک پنکھا سا ہانکے
وہیں اک سپاہی پڑا سو رہا تھا!

پڑا سو رہا تھا کھلے منہ کھلے سر
نہ تکیہ، نہ کمل، نہ چادر، نہ بستر
زمیں فرش تھی آسماں سائباں تھا
خدا جانے اس نیند میں وہ کہاں تھا
غرض وہ سپاہی پڑا سو رہا تھا!

لیٹے تھی اسے گود میں اپنے نیچر
اڑھائے تھا سورج سنہری سی چادر
چھوؤں کی چہک نے نہ ٹوکا تھا اسکو
گلوں کی مہک نے نہ روکا تھا اس کو
سپاہی وہاں بیخبر سو رہا تھا!

(دکھی نیند بیمار بچے سے ملتی
وہ بیمار مسکان ہونٹوں پہ کھلتی)
رکھے اپنے دو ہاتھ چھاتی کے اوپر
جہاں اس میں دو چھید تھے خون سے تر
سپاہی پڑا بے خبر سو رہا تھا

(از فرانسیسی سے ترجمہ بتوسط انگریزی)

لہ یہ پرندے جھنڈ بنا کر آتے ہیں اور ایک دم سے بولنے لگتے ہیں

گل چاندنی

(از منشی لکشمی نرائن جوہر بدایونی)

آہ! اے رشکِ قمر حسن شرارِ دلنشیں — آہ! اے چشم و چراغِ دامنِ چرخ بریں
تیرے دم سے باغ ہے فردوس بر روئے زمیں — تیرے جلووں میں نہاں ہے صنعتِ حسنِ آفریں
ظلمتِ شامِ غریباں تیرے دل میں بند ہے
تو ضیائے صبحِ خنداں کا کوئی پیوند ہے

کہکشاں کا یا کوئی تو گوہرِ نایاب ہے — شمع کافوری ہے تو، یا پارۂ سیماب ہے
تیرے آگے بزمِ دنیائے فلک بے آب ہے — چاندنی کا پھول ہے، یا ماہِ عالم تاب ہے
تو بظاہر ایک پرتو ہے ضیائے نور کا
دیدۂ سرخاب سے لیکن ہے رشتہ دور کا

ڈھونڈتی پھرتی ہے تجھکو خاطرِ حسرت نواز — حسن کی دنیا ہے تو، اے جلوۂ نظارہ ساز
پردۂ حسنِ مجازی میں ہے شانِ بے نیاز — لوٹ لے حسنِ رخِ گل اے نگاہِ امتیاز
روشنی تیری پہونچتی ہے مری منزل کے پاس
میں تصور میں تجھے رکھتا ہوں اپنے دل کے پاس

آہ! اے سیماب پیکر، ہستیِ نقشِ بر آب — آہ! اے شمعِ گلستاں، اے حبابِ جوئے ناب
شوقِ خود آرائی نے جب تیری الٹی تھی نقاب — یاد آتا ہے ترے بچپن کا وہ عہدِ شباب
فصلِ گل صدقے اترتی تھی فضا خاموش تھی
رونمائی کی ادا تیری چمن بر دوش تھی

آنسوؤں سے دل کے شبنم تیرا دھوتی تھی شباب — جب نسیمِ صبح کر دیتی تھی تجھکو بے حجاب
گود میں پہروں کھلاتی تھی ضیائے ماہتاب — چھیڑ دیتی تھی ذرا تجھکو شعاعِ آفتاب
حسن کی تکمیل میں قدرت سے تجھ پر کیا نہیں
بدنصیبی سے مگر ہاں! چاہنے والا نہیں

"ہمہ اوست"

(از غلام ابرار صدیقی آثر بی۔اے علیگ)

"خدا پرستی" اور "ہمہ اوست" کے عقیدہ کو ایک تمثیل کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ دو آدمی ایک مکالمہ شہر میلان کی ایک تماشا گاہ میں ادا کر رہے ہیں، ان میں سے ایک جس کو یہ خیال ہے کہ وہ گریلیمو کی تماشا گاہ میں کھڑا ہے اس فن کی تعریف کرتا ہے جس سے وہاں کا ناظم گڑیوں کو تیار کر کے اُن کے حرکات و سکنات کو درست کرتا ہے، لیکن دوسرا کہتا ہے "ارے! تم تو بالکل مغالطہ میں ہو، ہم توڑو ڈیلا کی تماشا گاہ میں ہیں اور یہ منیجر اور اس کے ساتھی اسٹیج پر ہیں اور واقعی یہ لوگ انسان ہیں جو تمہارے سامنے کھڑے ہیں، اس تمثیل میں تو ایک شاعر اداکاری کا فرض انجام دے رہا ہے۔"

"ہمہ اوست" کے عقیدہ پر میرا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ نہ تو کچھ بتاتا ہے اور نہ کسی بات کو واضح کرتا ہے۔ ساری دنیا کو "خدا" کہنے سے تو کوئی بات واضح نہیں ہوتی، اس سے ہماری زبان میں صرف لفظ "دنیا" کا ایک مرادف، مگر فضول مرادف پیدا ہو گیا ہے۔ یہ کہنا کہ "ہمہ اوست" یا یہ کہ "او ہمہ است" یعنی یہ کہنا کہ "دنیا خدا ہے" یا یہ کہ "خدا دنیا ہے" ہر حال میں ایک ہی معنی پر دلالت کرتا ہے۔ لیکن اگر خدا کو ایک شے تصور کیا جائے تو یہ تصور کرنا بھی لازم آتا ہے کہ وہ ایک ایسی شے ہے جو باوجود بارہا تجربہ میں آنے کے ابھی تک محتاج وضاحت ہے، اور اگر دعویٰ یہ ہے کہ "او ہمہ است" یعنی "خدا دنیا ہے" تو اس سے صرف اتنا ہی مستنبط ہوتا ہے کہ اس عقدہ کے حل کرنے کی کچھ نہ کچھ کوشش تو ضرور کی گئی لیکن صرف اسی قدر کہ ایک بالائے ادراک شے حیطۂ ادراک میں آ جائے اور یہ تصویر خیالی سے زیادہ معتبر نہیں۔ برخلاف اس کے اگر شئے معلومہ سے ابتدا کی جائے یعنی دنیا کو پیش نظر رکھ کر یہ کہا جائے کہ "ہمہ اوست" یعنی "دنیا خدا ہے" یہ صاف ظاہر ہے کہ یہ محض بیہودہ گوئی ہے، اور ہم اس سے کسی مفید نتیجہ پر نہیں پہنچتے یعنی ایک قریب الفہم شئے کو بعید الفہم شئے سے سمجھانے کی سعی بے سود ہے، اس طرح "ہمہ اوست" کے لئے "خدا پرستی" لازم ہے۔ ہاں اگر خدا کا تصور اس طرح کیا جائے کہ وہ ایک ایسی شئے ہے جس سے بخوبی واقفیت ہے تو کسی نہ کسی طرح اس کو دنیا سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ اس سے وہ نہایت سلیقہ کے ساتھ سب سے الگ ہو جاتا ہے، بالفاظ دیگر دنیا ایک ایسی شئے خیال نہیں کی جاتی جس کا واضح کرنا ضروری ہے بلکہ خدا کا تصور پہلے اس لئے کیا گیا کہ گویا اس سے بہتر ہی سے واقفیت ہے اور یہ تو سمجھ میں

نہیں آتا کہ اب کرنا کیا ہے۔ اس لئے اسکی جگہ دنیا کو مان لیا گیا ہے۔ "ہمہ اوست" کے عقیدہ کی ابتدا چونکہ دنیا کو پیشتر ہی سے کوئی بہتر و اعلیٰ نہیں سمجھتا اور یہ درست ہے اس لئے کوئی اسے "خدا" کا مرتبہ دینے کیلئے تیار نہ ہوگا۔ وہ خدا بھی بڑا خود رائے اور ناعاقبت اندیش ہے جسکو اسکے سوا اور کوئی کام ہی نہ تھا کہ ہماری گندی اور بیہودہ دنیا کی شکل میں جلوہ آرا ہو۔ معاذ اللہ۔ اُف اُنہیں خدا بیشمار انسانوں اور دوسری جاندار مخلوق کے قالب میں نمودار ہوا! اور تماشا دیکھئے کہ اس مادی حالت میں اسکو دق اور پریشان کیا اور بُری طرح ستایا بھی جاتا ہے۔ بوالعجبی! کہ چار دن کی جلوہ فروشی کی خاطر اپنے ہی ہم جنس کی پرستش بھی کرنے پر مجبور ہو جاتا اور مصیبتیں جھیلنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ محتاجی اور موت پر بھی رضامند ہے اور لب پر شکوہ و شکایت نہیں، روک تھام کی کوشش نہیں، سب ہنسی خوشی گوارا!!! مثلاً اُن لاکھوں حبشی غلاموں کی، جن پر ہر وقت جبر و تشدد کا آبدار خنجر چلا کرتا ہے شکل میں بھی موجود ہے۔ اور اُف نہیں کرتا۔ ان تیس لاکھ جولاہوں کے روپ میں حاضر ہے جو یورپ میں بھوک اور تکلیف میں تنگ و مطوب یا کسی کارخانہ کے بڑے کمروں میں بدمزہ اور تکلیف دہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور کوئی عذر نہیں!

اِسی طرح اگر مندرجہ بالا انکار سے چشم پوشی کرکے اس اہم تبدیلی اور ترقی پر غور کیا جائے جو "خدا پرستی" نے "ہمہ اوست" کے عقیدہ کے باب میں کی ہے، اور مندرجہ بالا انکار سے چشم پوشی کی جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہم ایک بالکل غیر ثابت شدہ اور تقریباً قطعی بعید الفہم شئے کو سب سے زیادہ بیہودہ اور لچر چیز کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ بہرکیف جب ہم لفظ "خدا" استعمال کرتے ہیں تو وہ چاہے کیسے ہی معمولی اور دھندلے طریقہ سے کیوں نہ ہو لیکن ہم دو باتوں کا اقرار ضرور کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ سب سے بڑی قوت ہے، دوسرے یہ کہ سب سے زیادہ عقلمند ہستی ہے اور یہ دونوں باتیں اس سے کسی طرح جدا نہیں ہو سکتیں گویا اس کا جزو لاینفک ہیں۔ اس بات کا خیال کرنا بھی حماقت اور نادانی سے ہرگز کم نہیں کہ ایسی خوبیوں اور اوصاف والی ہستی اپنے کو اس حالت و شکل میں پیش کرے جس کا ابھی اُوپر ذکر ہو چکا ہے، رہی "خدا پرستی" وہ ایک ایسی شئے ہے جس کو ثابت ہی نہیں کیا گیا۔ اگرچہ یہ ایک دشوار سی بات ہے کہ ہم بہائم و سباع کو دیکھکر اسے خواہ مخواہ مان لیں کہ اس دنیا کو کسی ایک ہی ذات نے منظم و مرتب کیا ہے۔ پھر بھی یہ خیال کچھ زیادہ بُرا نہیں ہے۔ ہاں یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ بزرگ ترین اور بہترین ذات رنج و غم اور مصائب و آلام کی ایک لامحدود دنیا پیدا کر سکتی ہے حالانکہ یہ ہم بالکل نہیں سمجھ سکتے کہ وہ ایسا کرتی ہی کیوں ہے۔ اسی لئے جب ہم اس بزرگ و برتر ذات سے اعلیٰ ترین اوصاف وابستہ کرتے ہیں، تو وہ اس کی عقل و دانش کو اس قدر لامحدود کر دیتے ہیں کہ جس سے پھر اس پر کسی سہو اور غلطی کا الزام عاید ہی نہیں ہو سکتا۔ "ہمہ اوست" کے عقیدہ کے مطابق خدا خود لامحدود رنج و غم اور مصائب و آلام کی دنیا ہے اور اس چھوٹی سی دنیا میں لمحہ بہ لمحہ اپنی ہی مرضی سے ہلاک ہوتا رہتا ہے کتنا مضحکہ خیز خیال ہے۔ اجتماع ضدین نہیں تو جیسا کہ جرمن دینیات کے ایک قابل احترام مصنف نے کہا ہے کہ نفس اور شیطان ایک ہی چیز کے دو مختلف نام ہیں۔ اگر نفس پر قابو حاصل نہیں کیا جا سکتا تو سمجھ لو کہ شیطان پر بھی قابو

حاصل نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح "خدا" اور "دنیا" ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔

یہ صاف ظاہر ہے کہ "ہمہ اوست" کے عقیدہ کے رو سے اس "سنسار" کا دوسرا نام "ایشور" ہے "زروان" کے متعلق بدھ مذہب والوں کا یہی اعتقاد ہے، وہ اسے اپنی سمجھ سے باہر بیان کرتے ہیں اور اس کو ہاتھ نہیں لگاتے، مگر نسبتاً اسے کوئی اہمیت و وقعت بھی نہیں دیتے۔ یہ صرف یہودی، عیسائی اور مسلمان ہی ہیں جنھوں نے "خدا" کے لفظ کو صحیح معنوں میں استعمال کیا ہے۔

اکثر یہ جملہ سننے میں آتا ہے کہ "دنیا بذاتِ خود ایک انجام ہے" اس حالت میں یہ اور بھی دشوار ہو جاتا ہے کہ اب اس کو "ہمہ اوست" کے عقیدہ سے واضح کیا جائے یا "تقدیر پرستی" کے ذریعہ سے۔ لیکن چاہے جو کچھ ہو پھر بھی یہ جملہ اتنا تو صاف بتاتا ہے کہ اس حالت میں دنیا کا صرف طبعی پہلو مدنظر ہے اور اس کو اخلاقی پہلو سے کوئی سروکار نہیں۔ کیونکہ ہم اخلاقیات کی اس سے کسی طرح امید نہیں رکھ سکتے جب تک کہ ہم اس کو کسی اہم اور بلند مقصد کے حاصل کرنے کا ذریعہ تصور نہ کریں۔ یہ اور بھی بڑی غلطی ہے جو لوگوں کی تلون مزاجی کا نتیجہ ہے کہ دنیا صرف طبعی پہلو رکھتی ہے اور اس کو اخلاقیات سے کوئی سروکار نہیں ہے۔

(شوپنہار)

شمیم کے سو شعر

یہ چھوٹی سی کتاب ہمارے عنایت فرما سید مظفر حسین صاحب شمیم کے سو شعروں کا ایک دلنواز مجموعہ ہے جو سید جمیل الدین صاحب جمیل کی نظرِ انتخاب کا رہینِ منت ہے۔ شروع میں پروفیسر نجیب اشرف صاحب ایم۔ اے صدر شعبۂ اردو بمبئی یونیورسٹی کا لکھا ہوا ایک مختصر سا پیش لفظ ہے جس میں شمیم کے کلام کی خوبیوں پر تنقیدی نگاہ ڈالی گئی ہے۔ شمیم صاحب ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔ بندش کی چستی اور لفظوں کی سلاست و روانی کا کافی خیال رکھتے ہیں۔ ان کے اشعار میں ترنم بھی ہوتا ہے اور ان کے بعض اشعار پڑھ کر حضرت امیر مینائی کا زمانہ یاد آ جاتا ہے۔ دو چار شعر نمونتہً ذیل میں درج کیے جاتے ہیں جن کے مطالعہ سے ناظرین خود رائے قائم کر سکیں گے۔

تو بہارِ سرو سمن میں رہ، تو بہارِ سرو سمن میں آ — تو نسیمِ گلشنِ خلد بن، مرے دل کے اجڑے چمن میں آ
تو نسیم بن کے چمن میں چل، تو نسیم بن کے چمن میں آ — تو شمیم بن کے گلوں میں پھر، تو سحر کی پہلی کرن میں آ
نصیبِ دشمن ہوئیں جو اکثر وہی مری بد نصیب راتیں — گنہ سے بڑھ کر سیاہ راتیں، عدو کے گھر کی رقیب راتیں
مرا چھپ چھپ کے ان سے ملنا وہ اسکا رک رک کے مجھ سے ملنا — کہاں گئیں وہ عجیب راتیں، کدھر گئیں وہ حبیب راتیں
آ کہ حسنِ بے وفا کو عشق کا شیدا کریں — اور رسوائی کا اس کی کو بکو چرچا کریں
مدتیں گذریں چراغِ آرزو خاموش ہے — آ کہ پھر اک بار یادِ کوہکن تازہ کریں

پیامِ آزادی

(از حضرت فراق گورکھپوری، ایم اے)

مری صدا ہے گلِ شمعِ شامِ آزادی
سُنا رہا ہوں دلوں کو پیامِ آزادی

لہو ہے تیرے شہیدوں کا یا بھڑکتے شرار
اُچھل رہا ہے زمانے میں نامِ آزادی

مجھے بقا کی ضرورت نہیں کہ فانی ہوں
مری فنا سے ہے پیدا دوامِ آزادی

اب انقلاب کی ٹھانو کہ کوششِ اصلاح
خیالِ خام و غمِ ناتمامِ آزادی

معاہدے، سندا اور این و آں تو باتیں ہیں
یہ جنگ کیا ہے؟ غلامی بنامِ آزادی

جو راج کرتے ہیں جمہوریت کے پردے میں
انھیں بھی ہے کود سودائے خامِ آزادی

تمھیں کرو گے منظّم جہاں کو، مزدورو!
تمھیں سجاؤ گے دیوانِ عامِ آزادی

فضا میں جلتے دلوں سے دھواں سا اٹھتا ہے
ارے یہ صبحِ غلامی! یہ شامِ آزادی

یہ مہر و ماہ یہ تارے یہ بامِ ہفت افلاک
بہت بلند ہے ان سے مقامِ آزادی

فضائے شام و سحر میں شفق جھلکتی ہے
کہ جام میں ہے مئے لالہ فامِ آزادی

سیاہ خانۂ دنیا کی ظلمتیں ہیں دو رنگ
یہ شامِ عہدِ کہن ہے کہ شامِ آزادی

سکوں کا نام نہ لے ہے وہ قیدِ بے میعاد
ہے پے بہ پے حرکت میں قیامِ آزادی

قدم یہ اٹھتے ہیں پس ماندگانِ منزل کے
کہ رہروؤں میں یہی ہیں امامِ آزادی

دلوں میں اہلِ زمیں کے ہے نیو اس کی مگر
قصورِ خلد سے اونچا ہے بامِ آزادی

جبر وہاں کی اگر لا سکے تو ہم مجبور
مشیّتوں نے نہ پایا مقامِ آزادی

ترے خیال سے زنجیرِ تیرگی ٹوٹی
ترا جمال ہے ماہِ تمامِ آزادی

ترنّمِ سحری دے رہا ہے تو چھپ کر
حریفِ صبحِ وطن ہے یہ شامِ آزادی

ہمارے سینے میں شعلے بھڑک رہے ہیں فراقؔ
ہماری سانس سے روشن ہے نامِ آزادی

لہ اٹلانٹک چارٹر، اینٹی کامنٹرن پیکٹ، جاپان، جرمنی اور انگلستان و امریکہ کے نئے نظام (New Order) وغیرہ کی طرف اشارہ ہے (ادارہ)

اندھی لڑائی

(از پنڈت آنند نراین ملّا ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی)

لڑائی کے مختلف نظریے ہیں۔ مہاتما گاندھی اہنسا کو پرم دھرم سمجھتے ہیں اور شاید کسی حالت میں تلوار اٹھانے کو جائز نہیں سمجھتے، حضرت عیسیٰ بھی اسی اصول پر کاربند ہوئے، اسلام نے حق کو برقرار رکھنے اور ظلم و تشدد کو مٹانے کے لئے جنگ کو ضروری سمجھا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جبتک دنیا میں حق و باطل جبر و انصاف کا تصادم باقی اور زبردست و زیردست کے وجود قائم ہیں جنگ کا سلسلہ بھی جاری رہیگا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی روز بروز روشن ہوتی جاتی ہے کہ ذہنی طاقت بطور خود انسانی مصیبتوں کا خاتمہ نہیں کر سکتی اسکے علاوہ انسانی تہذیب کی ترقی کے ساتھ اب لڑائی بھی آنکھ بند کر کے لڑی نہیں جا سکتی اور نہ بہادر سے بہادر لڑنیوالے محض دوسروں کے اشارے پر آخر تک اپنا جوش و خروش قائم رکھ سکتے ہیں۔ لڑائی کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ اسکا مقصد، مفہوم لڑنیوالوں کے ذہن نشین ہو اور اس پر دلاور و فرض شناس لوگ جان قربان کرنا اپنا فرض سمجھ سکیں۔ پھر بھی لڑائی اسی وقت مفید ثابت ہو سکتی ہے جب اسکا نتیجہ ایک منصفانہ صلح ہو تاکہ پھر مزید لڑائی کی ضرورت باقی نہ رہے۔ امن بھی سب سے بہتر وہی ہے جس کے سایہ میں سب کے مفاد یکساں محفوظ ہوں اور سب کو سکھ اور چین، عزت اور ترقی کے برابر موقعے ملیں۔ یقیناً اسی قسم کے جذبات سے متاثر ہو کر ہمارے دوست پنڈت آنند نراین ملّا نے لڑائی کے متعلق یہ بے نظیر نظم لکھی ہے۔ (ا۔ ز)

کٹے جا رہے ہیں، مرے جا رہے ہیں
یہ نادان انساں لڑے جا رہے ہیں

کوئی ان سے پوچھے، لڑائی یہ کیوں ہے؟
مذاقِ نبرد آزمائی یہ کیوں ہے؟
بشر کی بشر پر چڑھائی یہ کیوں ہے؟
نہیں جانتے، پر لڑے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں، مرے جا رہے ہیں

عدو کون ہے؟ اور حمایت ہے کس کی؟
خصومت ہے کس سے؟ رفاقت ہے کس کی؟
مٹانا ہے کس کو؟ حفاظت ہے کس کی؟

نہیں جانتے، پر لڑے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں، مرے جا رہے ہیں

حقیقت میں سب اختلافات کیا ہیں؟
جہاں کے اصولی نزاعات کیا ہیں؟
جو کرتے ہیں حل، وہ سوالات کیا ہیں؟

نہیں جانتے، پر لڑے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں، مرے جا رہے ہیں

یہ پیکار جو ہیں وہ اغراض کیا ہیں؟
مریضِ تمدن کے امراض کیا ہیں؟
بشر کے حقوق اور فرائض کیا ہیں؟

نہیں جانتے، پر لڑے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں، مرے جا رہے ہیں

صداقت پہ اٹھی ہے تلوار کس کی؟
ہے اک دامِ تزویر گفتار کس کی؟
جو جیتے تو اس میں ہوئی ہار کس کی؟

نہیں جانتے، پر لڑے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں، مرے جا رہے ہیں

غلامِ حکومت، بندھے لڑ رہے ہیں
تمدن کے جکڑے ہوئے لڑ رہے ہیں
نہیں جانتے، کس لئے لڑ رہے ہیں
مگر لڑنے والے لڑے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں، مرے جا رہے ہیں

جو دیکھیں ذرا، غور سے اک نظر بھر
تو کھل جائے، ہے کون پردہ کے اندر
وہی اہلِ دولت خود اپنی غرض پر

غریبوں کو قرباں کئے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں، مرے جا رہے ہیں

فریبِ دلائل سے بہکا کے اُن کو
سرابات کی سمت لے جا کے اُن کو
نزاعاتِ باطل میں اُلجھا کے اُن کو

حقیقت چھپائے چلے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں، مرے جا رہے ہیں

کہیں بن کے اک دورِ نَو کے پیمبر
کہیں تازہ کر کے، مذاقِ سکندر
کہیں حبِّ قومی کا بہروپ بھر کر

زمانہ کو دھوکے دیئے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں، مرے جا رہے ہیں

کسی طور رائج، نہ یکسانیت ہو
نہ بیدار، تقدیرِ انسانیت ہو
جو ہو اس میں تجدیدِ حیوانیت ہو

یہ اپنی سی لیکن کئے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں، مرے جا رہے ہیں

کمی ہے نہ کھیتوں میں غلّہ کی کوئی
ترقی یہ ہے علم اور آگہی بھی
جہاں کی ضرورت کو ہر شئے ہے کافی

بشر پھر بھی بھوکے مرے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں، مرے جا رہے ہیں

جو دل تھے کبھی بے قرارِ محبّت
جو تھے مایۂ صد بہارِ محبّت
جو بن سکتے تھے نغمہ زارِ محبّت

وہ نفرت کدے اب ہوئے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں، مرے جا رہے ہیں

جسے خوابِ راحت بنانا تھا ممکن
جسے نازِ قدرت بنانا تھا ممکن
جہاں حس کو جنت بنانا تھا ممکن
اُسے اِک جہنم کئے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں، مرے جا رہے ہیں

تشدد کی کب تک یہ فرماں روائی؟
لُٹیروں کے قبضہ میں کب تک خدائی؟
ارے آہِ بیکس کی یہ نارسائی!
دلوں کے عقیدے ملے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں، مرے جا رہے ہیں

کبھی امن کا دَور آ لے گا آخر!
نظامِ تشدد یہ ٹوٹے گا آخر!
کبھی خونِ انساں بھی کھولیگا آخر!
اِسی آس پر ہم جیئے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں، مرے جا رہے ہیں

مگر ان سوالوں پہ کس کی نظر ہے؟
کہن میں ابھی آفتابِ بشر ہے!
مقابل ہے کوئی، بس اتنی خبر ہے؟
اِک اندھی لڑائی لڑی جا رہی ہے
کٹے جا رہے ہیں، مرے جا رہے ہیں
یہ نادان انساں لڑے جا رہے ہیں



سیٹھ جمنالال بجاج

(از مسٹر سری رام جلوٹے)

سیٹھ جمنالال جی بجاج سنہ ۱۸۸۹ء میں جے پور میں پیدا ہوئے تھے۔ وردھا کے متمول سیٹھ شری جمنالال جی نے آپ کو سنہ ۱۸۹۵ء میں گود لے لیا اور اُسی وقت سے آپ وردھا میں رہنے لگے اور آپ کا نام بھی جمنالال ہو گیا۔ اُس وقت جمنالال جی کی حیثیت تقریباً تین لاکھ روپیہ کی سمجھی جاتی تھی، لیکن آپ نے اسی پونجی سے تقریباً ایک کروڑ روپیہ پیدا کیا جس میں اپنی زندگی میں تقریباً پچیس لاکھ روپیہ نقد مختلف ملکی قومی تحریکوں کو دان دیدیا۔ عمر کے ساتھ ساتھ آپ کی لیاقت و پبلک اسپرٹ کی شہرت بھی روز افزوں بڑھتی گئی اور عام ہر دلعزیزی کے ساتھ ساتھ حکام نے بھی آپ کی پبلک خدمات کی قدر دانی کی، چنانچہ گورنمنٹ نے آپ کو آنریری مجسٹریٹ مقرر کیا اور رائے بہادر کا خطاب بھی دیا۔ لیکن جب آپ نے کانگریس کی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کیا تو آپ نے دونوں اعزازات سے سبکدوشی حاصل کر لی۔

آپ شروع ہی سے بڑے دیش بھگت تھے مگر سنہ ۱۹۱۹ء سے آپ کانگریس کے کاموں میں سرگرمی سے عملی حصہ لینے لگے۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں آپ انڈین نیشنل کانگریس ناگپور کی استقبالیہ کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے۔ اسی سال آپ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبر بھی انتخاب کئے گئے اور آخر دم تک اس عہدہ پر ممتاز رہے۔ پندرہ سال تک آپ کانگریس کے خزانچی رہے۔ سنہ ۱۹۳۴ء میں آپ کانگریس کے پریسیڈنٹ بھی منتخب ہوئے۔ ان سب عہدوں پر آپ نے ہمیشہ بڑی محنت و جانفشانی اور ذمہ داری کے ساتھ اپنے فرائض منصبی انجام دیئے۔

اپنی سیاسی سرگرمیوں کے سلسلہ میں سیٹھ جی چار مرتبہ جیل گئے۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں جب آپ کو جھنڈا ستیاگرہ کے سلسلے میں جیل جانا پڑا تو آپ کو جرمانہ کی بھی سزا دی گئی تھی، چنانچہ اس کی وصولیابی کے لئے آپ کا کچھ سامان قرق کر لیا گیا۔ مگر جب اس کے نیلام کی نوبت آئی تو عوام میں آپ کی ہر دلعزیزی اور ہمدردی کا یہ تماشا دیکھنے میں آیا کہ کسی شخص کو آپ کا سامان خریدنے کی جرأت نہ ہوئی اور حکومت کو مجبوراً آپ کا جرمانہ معاف کر دینا پڑا۔

سنہ ۱۹۴۰ء میں جب سیٹھ جمنالال بجاج انفرادی ستیاگرہ کے سلسلے میں جیل گئے تو اُنکی تندرستی بہت خراب ہو گئی اور اُن کا وزن تقریباً سولہ پونڈ کم ہو گیا۔ اسی وجہ سے وہ جلد ہی رہا کر دیئے گئے، جس پر اُنھوں نے مہاتما گاندھی سے دوبارہ جیل جانے کی اجازت مانگی، لیکن مہاتما جی نے اس کی اجازت نہ دی۔ سیٹھ جی

مہاتماجی کے سچے پیرو تھے۔ ملکی معاملات میں ہمیشہ اُن کی رائے اور ہدایت پر عمل کرنا ہی اپنا فرض سمجھتے رہے۔ سیٹھ جمنا لال جی اُن ملکی لیڈروں اور سیاسی کارکنوں میں نہ تھے جو اخبارات میں لمبے چوڑے بیانات دیکر یا عوام کے سامنے دھواں دھار تقریریں کرکے شہرت حاصل کر لیتے ہیں۔ وہ سچے محبِ وطن وخادمِ قوم اور ٹھوس کام کرنے والے شخص تھے۔ شروع ہی سے وہ مہاتما گاندھی کے گرویدہ اور اُن کے سچے پیرو تھے۔ گاندھی جی ہی کی مرضی پر انھوں نے وردھا سے تین میل دُور اپنے گاؤں سیگاؤن میں مہاتماجی کے قیام کا انتظام کردیا تھا۔ سیگاؤن آج دنیا میں سیوا اگرام کے نام سے مشہور ہے اور بیشمار حامیانِ کانگریس کا تیرتھ بن گیا ہے، اور سچ بات یہ ہے کہ سیوا اگرام جمنا لال بجاج کی اُولوالعزمی اور فیاضی ہی کا نمونہ ہے۔ جس وقت جمنا لال نے کانگریس میں قدم رکھا وہ دولت مند لوگوں کے لئے بڑا نازک وقت تھا۔ سیٹھ جمنا لال جی تجارتی حلقوں میں بہت ممتاز حیثیت رکھتے تھے بلکہ اُنھیں سیٹھوں ساہوکاروں کا راجہ سمجھا جاتا تھا۔ اُنھوں نے دولت بھی بہت کافی پیدا کی، لیکن فیاضی کا اُن کے مزاج میں اتنا دخل تھا کہ انھوں نے اپنی زندگی میں لکھوکھا روپیہ خیرات کے کاموں میں بیدریغ صرف کیا جس سے امیر طبقے کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ بھی اُن کی دل سے عزت کرنے لگے۔ سیٹھ جمنا لال نے کتنے ہی اسکولوں کالجوں کو بیش قرار مالی امداد دی۔ درحقیقت اُن کے قرب وجوار میں شاید ہی کوئی ایسا کام ہوگا جس میں اُنھوں نے امداد نہ دی ہو۔ دیہاتی صنعت وحرفت اور گھریلو کاریگری کو ترقی دینے کی تحریکوں کے تو آپ روحِ رواں تھے۔ آل انڈیا ویلیج انڈسٹریز اور چرخا سنگھ کے آپ سرگرم حامی تھے۔ آپ اور آپ کے تمام اہلِ خاندان کو کھادی سے بڑا پریم تھا۔ آپ نے گاندھی سیوا سنگھ بھی قائم کیا اور مارواڑیوں کو تعلیم دینے کے لئے ایک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی۔ اگروال صاحبوں کے سُدھار و ترقی کے لئے اگروال مہاسبھا قائم کی۔ بنستھالی میں لڑکیوں کا ایک اسکول کھولا جہاں کے بچے آپ کو کاکاجی کے لقب سے یاد کرتے تھے۔

شہر کی نسبت آپ کو دیہات کی زندگی بہت مرغوب تھی، جہاں آپ تکلف وتصنع سے قطعی مبرا ہوکر زندگی بسر کرنا پسند کرتے تھے۔ چنانچہ آپ اکثر اپنی بیل گاڑی خود ہی چلا کر وردھا سے سیوا اگرام جایا کرتے تھے اور دیہاتی بھائیوں کے دُکھ سُکھ میں شریک حال رہتے تھے۔ ہندی سے بھی آپ کو ایک خاص محبت تھی۔ مدراس میں جب ہندی ساہتیہ سمیلن کا اجلاس ہوا تو آپ ہی اُس کے صدر چُنے گئے۔ اُس وقت آپ نے پچاس ہزار روپیہ ہندی زبان کی توسیع وترقی کے لئے عطا کیا۔ اِس کے علاوہ آپ نے پانچ ہزار روپیہ ہندی ساہتیہ سمیلن کو بھی دیا۔ گوروکل کانگڑی میں گاندھی جی کے اقتصادی اصولوں کی ترویج واشاعت کے لئے آپ نے ایک اُستادِ خاص کی تقرری کے لئے تیس ہزار روپیہ عطا کئے۔ آپ کو گوروکل کے طریقۂ تعلیم سے بھی خاص دلچسپی تھی۔ چنانچہ آپ اکثر گوروکل کانگڑی جایا کرتے

تھے اور کارکنانِ گوروکل کو مفید مشورے دیتے رہتے تھے۔

اچھوت ادھار کے کاموں سے بھی آپ کو گہری دلچسپی تھی۔ سب سے پہلے آپ ہی نے صرف کثیر سے وردھا میں "لکشمی نراین جی" کا ایک خوبصورت مندر بنوایا جس میں ہریجنوں کو آنے جانے کی پوری آزادی اور پوجا پاٹ کی تمام سہولتیں حاصل ہیں۔ اس کے بعد اس قسم کے کئی مندر ملک کے مختلف مقامات میں بنائے گئے لیکن شروع شروع میں اس بارے میں آپ ہی نے اہل ملک کی رہنمائی کی۔ آخر زندگی میں انھیں گئو سیوا کی دھن ہوئی اور انھوں نے گاندھی جی کے مشورہ سے گئو سیوا سنگھ کی بنیاد ڈالی۔ آپ کی رائے میں ہندوستان میں گائے کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے اور اُس کی حفاظت کرنا ہر ہندوستانی کا فرض ہے۔ آپ کے انتقال کے بعد آپ کی دھرم پتنی شریمتی جانکی دیوی گئو سیوا سنگھ کی صدر منتخب ہوئی ہیں اور اب انھوں نے اس مشن کو کامیاب بنانے کا بیڑا اُٹھایا ہے، اور اپنی تمام جائداد اس کارِ خیر میں وقف کر دی ہے اس جائداد کا تقریباً بارہ لاکھ روپیہ اندازہ کیا گیا ہے جو اب رفاہِ عام میں لگا دیا جائے گا۔

سیٹھ جی نے صرف ترپن سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ ۱۱ فروری ۱۹۴۲ء کو چار بجے شام کے وقت اُن کے قلب کی حرکت بند ہو گئی۔ دوپہر تک اُن کی طبیعت بالکل ٹھیک تھی یکایک اُن کی حالت خراب ہو گئی ڈاکٹروں نے علاج معالجہ کیا لیکن کوئی تدبیر پیش نہ گئی، مہاتما گاندھی جی کو ٹیلیفون کیا گیا لیکن اُن کے پہونچنے سے پہلے ہی سیٹھ جمنا لال اس دنیا سے چل بسے۔ افسوس اُس وقت آپ کے بڑے لڑکے کمل نین جی بھی وردھا میں موجود نہ تھے

آپ کی ارتھی کے جلوس میں لاکھوں آدمی شامل تھے، اور مہاتما گاندھی جی سری مہا دیو دیسائی۔ سیٹھ گھنشیام داس برلا بھی موجود تھے۔ شری ونوبھاوے نے ویدک طریقے پر آخری سنسکار ادا کرائے۔ تمام ملک کو آپ کی ناوقت وفات کا افسوس ہوا ہے۔ ہندوستان کے کونے کونے میں صدہا ماتمی جلسے ہوئے اور آپ کے خاندان کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا گیا۔

درحقیقت سیٹھ جمنا لال کی وفات سے مارواڑی قوم کا ایک ہیرا اور ملک کا سچا اور بے لوث خدمتگزار کھو گیا۔ سیٹھ جی کی زندگی سادگی کا نمونہ تھی۔ اتنی دولت پیدا کرنے کے باوجود غرور انھیں نام کو بھی نہ چھو گیا تھا۔ اُن کے مزاج میں تمکنت کو مطلقاً دخل نہ تھا۔ اُن کی ہمیشہ یہی کوشش رہتی تھی کہ ادنیٰ سے ادنیٰ شخص کو اُن سے ناراض ہونے کا موقعہ نہ ملے۔ فیاضی کا یہ عالم تھا کہ اگر ہم سیٹھ جمنا لال بجاج کو اس صدی کا دانِ ویر کرن کہیں تو بیجا نہ ہوگا آپ کی مہمان نوازی سارے ملک میں مشہور تھی، آپ کا گھر مرجع خلائق تھا۔ اس میں خاص و عام سب کے لئے ہر وقت گنجائش تھی۔ مہاتما گاندھی نے اُن کے بارے میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ شاید ہی انھوں

تے کوئی ایسا مکان بنوایا ہو جو دھرم شالا نہ ہو گیا ہو۔ جو لوگ ایک بار بھی وردھا ہو آئے ہیں وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں۔ مہاتما جی کے کل مہمان انھیں کے یہاں ٹھہرا کرتے تھے۔ کانگریس کے مہمانوں کی میزبانی کا حق بھی وہی ادا کرتے تھے۔ غرض سیٹھ جمنالال جی اپنے وقت کے حاتم تھے۔ اُنکے دسترخوان پر ہر شخص کی آؤ بھگت ہوتی تھی آپ کی بے وقت وفات سے ہندوستان کی سیاسی تحریک میں ایک بہت بڑی کمی ہو گئی ہے جس کا پر ہونا بہت مشکل ہے۔ ملک کو ایسے ہی بے لوث، بے غرض، اور ایثار مجسم محبان وطن کی ضرورت ہے جو ملکی ضروریات کو اپنی ضروریات سمجھیں اور نام و نمود کی خواہش کے بغیر سچے دل سے اہل ملک کی ہر ممکن خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیں

مہاتما گاندھی سیٹھ جمنالال بجاج کے متعلق لکھتے ہیں:- "آپ جس کام کو ہاتھ میں لیتے تھے اس میں جی جان سے جٹ جاتے تھے، یہ اُن کا شعار تھا۔ جب روپیہ کمانے لگے تو ڈھیروں روپیہ کمایا، لیکن میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ناجائز طریقوں سے اُنھوں نے ایک پائی بھی نہیں کمائی، اور جو کچھ کمایا اُسے رفاہ عام کے کاموں میں صرف کر دیا۔ اُن کی ناوقت وفات پر تو جانکی دیوی پاگل ہی ہو گئی تھیں، وہ کہنے لگیں "بس مجھے تو اُن کے ساتھ ستی ہونا ہے، اُن کے بغیر میں جی ہی نہیں سکتی"۔ اس پر میں نے کہا "یہ نہ سمجھو کہ اس طرح ستی ہونے سے لوگ تمھاری پوجا کریں گے، اس سے تو الٹے بدنامی ہوگی۔ اگر ہو سکے تو لوگ اگنی پیدا کرو اور اس میں بھسم ہو کر ستی ہو جاؤ نہ میں تم کو روکونگا اور نہ کوئی دوسرا ہی روک سکیگا۔ لیکن اگر اتنی ہمت نہیں تو پھر انکے بعد جوگن بنکر تم سچی ستی بن سکتی ہو" گھنشیام داس جی برلا بھی پاس ہی تھے، اُنھوں نے کہا "ہمارے یہاں تو ایسے موقعوں پر کوئی شبھ سنکلپ کرنے کا رواج ہے، جانکی دیوی سے کوئی شبھ سنکلپ کرائیے"۔ اس پر جانکی بائی نے خود ہی کہا "میرا سنکلپ یہی ہے کہ آنجہانی میرے لئے جو کچھ چھوڑ گئے ہیں وہ سب میں اُن کے جاری کئے ہوئے رفاہ عام کے کاموں کے ارپن کر دوں۔ اُنھوں نے اُسی وقت مجھے اپنا حساب بھی بتایا، دو ڈھائی لاکھ کی رقم تھی۔ وہ سب اُنھوں نے گئو سیوا کیلئے ارپن کر دی اس کے بعد جب وہ چتا کی اگنی کے پرکاش میں کھڑی تھیں تو میں نے اُن سے یہ بات بھی کہی کہ "صرف اس سے کام نہ چلے گا۔ اپنا سارا دھن کرشن ارپن کر کے تم بھکارن بن گئی ہو، اب لڑکے تمھیں کھلائیں گے اور تم کھاؤ گی اور نہیں کھلائیں گے تو میرے پاس آ جاؤ گی اور میرے بھکشا میں شریک ہو جاؤ گی لیکن اس کے ساتھ ہی تمھیں اس چتا کی ساکھشی میں اپنے آپ کو بھی اس کام کے لئے سمرپت کر دینا چاہیئے اور اپنے لئے نہیں بلکہ جمنالال جی کے لئے ہی جینا چاہیئے، تمھیں اُن کی گئو پوری میں رہنا چاہیئے یا میرے پاس سیوا گرام میں، تیسری جگہ تمھارے لئے نہیں ہے۔ اور چونکہ تم اپنا سب کچھ اس کام کے لئے دے چکی ہو اس لئے افسوس کرنے کا بھی تمھیں حق نہیں رہ گیا ہے" جانکی دیوی نے اسے بھی منظور کر لیا اور جمنالال جی کی گئو پوری میں گڑھ جانے کا نشچے کر لیا۔ اس طرح وہ سچی ستی بن گئیں

تنقیدِ کتب

"داستانِ تاریخ اُردو"

یہ کتاب جناب حامد حسن قادری صاحب پروفیسر سینٹ جانس کالج آگرہ کی تصنیف ہے جسے اگروال پبلشرز آگرہ نے ۳۰x۲۰/۱۶ تقطیع پر ۵۲۰ صفحات میں مجلد شائع کیا ہے۔ کاغذ لکھائی چھپائی گٹ اپ سب نفیس ہے۔

موضوع کے اعتبار سے یہ کتاب کوئی نئی چیز نہیں ہے، کیونکہ شاعرانِ اردو کے حالات اور اردو زبان کی تاریخی ترقی کے متعلق اب تک کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں مثلاً مولوی سید محمد یحییٰ صاحب تنہائی مشہور کتاب سیر المصنفین اس باب میں سب سے پہلی کوشش ہے جو سنہ ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی تھی، اس کے بعد مسٹر رام بابو سکسینہ کی انگریزی ہسٹری آف اردو لٹریچر اور اس کا اردو ترجمہ تاریخ ادب اردو "دکن میں اردو" (مؤلفہ مولوی نصیر الدین ہاشمی) "پنجاب میں اردو" (مؤلفہ محمود خاں صاحب شیرانی) "اربابِ نثر اردو" (مؤلفہ جناب سید محمد صاحب ایم۔اے) "نمونۂ منثورات" (مؤلفہ جناب احسن مارہروی مرحوم) "مختصر تاریخ ادب اردو" (مؤلفہ پروفیسر اعجاز حسین صاحب) وغیرہ وغیرہ کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ "داستانِ تاریخ اردو" بھی اسی سلسلہ کی ایک قابلِ قدر کڑی ہے۔

اس کے متعلق خود لائق مصنف اپنے دیباچے میں لکھتے ہیں:-

"میں نے تصنیفوں اور مصنفوں پر اعتراضات کئے ہیں، دوسروں کے اعتراضات نقل کر کے حسبِ موقع اُن کی تائید یا تردید کی ہے۔ میری تنقیدیں شاید تلخ و بے باک نظر آئیں لیکن بے لاگ اور بے لوث بھی ثابت ہونگی۔"

ہم کو بڑی خوشی سے اعتراف ہے کہ لائق مصنف نے شروع سے آخر تک اس دعوے پر عمل کرنے کی سچی کوشش کی ہے اور وہ اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔

قادری صاحب نے شروع سے لے کر حالی و شبلی کے عہد تک نثر نگاری کا تجزیہ کیا ہے اور کل کتاب چھ دور میں تقسیم کی ہے۔ کیا اچھا ہوتا اگر وہ موجودہ دور کے مصنفین کو بھی اپنی کتاب میں جگہ دیدیتے کیونکہ اب تک جتنی کتابیں اس مضمون پر لکھی گئی ہیں سب کی سب اس عہد کے مصنفوں کو نظر انداز کرتی ہیں، یا اگر کسی بزرگ نے ذکر بھی کیا ہے تو محض چند سطور ہیں جو لائقِ اعتنا نہیں۔

پروفیسر قادری نے اصل کتاب شروع کرنے سے پہلے وہ تمام تاریخی واقعات بھی بیان کر دیئے ہیں جو عرب و ہندوستان کے درمیان سلسلۂ تجارت کے متعلق ہیں۔ اس سلسلہ میں اُنھوں نے مفصل طور پر یہ بھی دکھایا ہے کہ کس طرح ضرورت نے عربوں کی زبان میں ہندی الفاظ اور ہندوستانیوں کی زبان میں عربی الفاظ داخل کر دیئے،

۱؎ قیمت للعہ ملنے کا پتہ:- مسرس رام نراین لال اگروال، پبلشرز آگرہ

اُن کے تلفظ میں کیا کیا فرق واقع ہوگیا، پنجاب میں اُردو کا کیونکر آغاز ہوا، ہندو مسلمانوں کے ارتباط سے فارسی شاعری میں ہندی الفاظ اور ہندی شاعری میں فارسی عربی الفاظ کھپنے لگے۔ محمد غوری کے عہد میں اُردو زبان کی کیسے ترقی ہوئی اور اولیائے کرام کا اُردو پر کیا احسان ہے۔ دکن میں اُردو کا کب آغاز ہوا اور شمالی ہند میں اُردو کس طرح پھیلی؟

قادری صاحب نے بعض دوسرے لوگوں کے خیال کے مطابق اُردو نثر کی سب سے پہلی تصنیف سید اشرف جہانگیر سمنانی کے رسالہ تصوف کو قرار دیا ہے۔ حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ اس کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔

بہرحال کتاب کا پہلا دَور دکن میں اُردو خدمات کے تذکرہ کے لئے وقف کیا گیا ہے۔ دوسرا دَور ۱۷۳۲ء سے لے کر ۱۷۹۹ء تک قائم کیا گیا ہے اور اس میں شمالی ہند میں اُردو نے جو ترقی کی ہے اُس کا بیان ہے۔ اسی کے ساتھ یورپین مصنفین اُردو کی خدمات کا ذکر ایک علحدہ باب میں کیا گیا ہے۔ تیسرا دور سنہ ۱۸۰۰ء سے لے کر سنہ ۱۸۳۰ء پر ختم کیا گیا ہے۔ اس دَور میں بیشتر اُن بزرگوں کا ذکر ہے جو فورٹ ولیم کالج سے متعلق ہیں۔ چوتھے دَور کا آغاز سنہ ۱۸۳۱ء ۱۲۴۶ھ سے ہوتا ہے جو سنہ ۱۸۵۷ء ۱۲۸۶ھ پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ اس دَور میں مرزا غالب اور ماسٹر رامچندر وغیرہ کا ذکر خیر ہے۔ پانچواں دور سنہ ۱۸۷۱ء سے سنہ ۱۹۰۰ء تک قائم کیا گیا ہے جس میں سرسید امیر مینائی، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک وغیرہ کو جگہ دی گئی ہے۔ چھٹا دور غدر کے بعد سے بیسویں صدی کے شروع تک قائم کیا گیا ہے جس میں آزاد۔ حالی، شبلی، نذیر احمد، ذکاء اللہ وغیرہ کا تذکرہ ہے۔

اِس تقسیم ادوار میں یہ بات سب سے زیادہ کھٹکتی ہے کہ یہ دَور کسی معینہ مدت میں ختم نہیں ہوتے۔ مثلاً دوسرا دَور ۶۷ سال میں ختم ہوتا ہے، تیسرا ستر برس میں، چوتھا ۳۹ انتالیس سال میں، پانچواں ۲۹ اُنتیس سال میں اور چھٹا تقریباً ۴۳ تینتالیس سال میں۔

اس کے علاوہ لائق مؤلف نے پہلے دَور کا آغاز دکنی تصنیفات سے کیا ہے اور دکن کا اولین مصنف شیخ معین الدین گنج العلم کو بتایا ہے لیکن اس عہد کی تصنیفات مشکل سے اُردو تصانیف کہلائی جاسکتی ہیں۔ کسی زبان کے بننے اور اُس کے مکمل نشو و نما ہونے میں کافی مدت صرف ہوتی ہے، تب کہیں جاکر وہ اپنا ایک جداگانہ رنگ قائم کرتی ہے۔ نظم اُردو میں اولیت کا سہرا ولی کے سر سمجھا گیا ہے، حالانکہ ولی سے پیشتر بھی بہت سے شعراء دکنی اُردو میں اشعار کہا کرتے تھے۔ لیکن چونکہ ولی کی اور اُن کی زبان میں نمایاں فرق ہے اور اُن کی زبان ولی کے مقابلہ میں کم صاف اور دکنی محاورات سے بھری پڑی ہے۔ اس کے برخلاف ولی کی زبان ہماری زبان سے بہت کچھ مشابہت رکھتی ہے اس لئے انھیں اُردو شاعری کا باوا آدم مانا گیا ہے

حالانکہ ان سے بعض دوسرے شعراء دکن سے زیادہ قدیم تھے۔ اسی طرح ہم کو اردو نثر کا دور شیخ عین الدین گنج العلم کی تصانیف سے شروع کرنے میں بہت پس و پیش ہے۔ کیونکہ اس زمانہ کی کتابیں ہماری زبان سے بہت کم ملتی جلتی ہیں۔ تاہم ایسا اردو کے مؤرخ کے لئے اردو کی تدریجی ترقی کے ذیل میں اُن کا ذکر ناگزیر ہے۔ زیادہ سے زیادہ فضلی کی کتاب "دہ مجلس" کو اردو زبان کی پہلی تصنیف کہا جا سکتا ہے۔ اگرچہ اس کی زبان بھی میر عطا حسین تحسین کی تحریر کے مقابلہ میں کم عام فہم اور شستہ ہے لیکن اس سے قبل کی کتابوں کو تو ہم کسی طرح اردو تصنیف نہیں کہہ سکتے بلکہ محض دکنی اردو تصانیف سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

"یورپین مصنفین اردو" کے باب میں لائق مؤلف نے اس زمانہ کے کل تاریخی واقعات مفصل طور پر درج کئے ہیں۔ جب اہل یورپ نے تجارت کی غرض سے ہندوستان آنا جانا شروع کیا پرتگیزوں، ڈچ، فرانسیسیوں اور انگریزوں نے کیسے اپنی نوآبادیات قائم کیں اور انگریزی اور فرانسیسی تجارتی رقابت کا تذکرہ کافی شرح و بسط کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اسی سلسلے میں لائق مصنف نے یہی بتایا ہے کہ جب انگریزوں کا تسلط بنگال پر قائم ہو گیا تو انھیں ملک میں اپنی مستقل حکومت قائم کرنے کا خیال ہوا اس لئے انھوں نے انگریزوں کو اردو فارسی تعلیم دینے کی غرض سے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا جس کے شعبۂ تصنیف و ترجمہ میں ڈاکٹر گلکرائسٹ کے زیر نگرانی بعض مشہور مصنفین نے انگریزوں کے لئے فارسی وغیرہ سے اردو میں کتابوں کا ترجمہ کیا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ڈاکٹر گلکرائسٹ کے علاوہ اور دوسرے انگریزوں نے اردو کی قواعد وغیرہ کے متعلق انگریزی یا دوسری یورپی زبانوں میں کیا کیا کتابیں لکھیں۔

لائق مؤلف نے اپنے تذکرے میں چند ایسے مصنفین کو بھی شامل کر لیا ہے جن کا ذکر چنداں ضروری نہ تھا مثلاً تیسرے دور میں محمد حسین کلیم کو جگہ دی گئی ہے حالانکہ اُن کا کارنامہ نثر میں محض اتنا ہے کہ انھوں نے فصوص الحکم کا ترجمہ اردو میں کیا تھا، لیکن اس کا نمونہ بجز ایک فقرہ کے جو آب حیات اور دوسری کتابوں میں برابر نقل ہوتا چلا آیا ہے اور کچھ نہیں ملتا۔ اول تو اس ایک فقرہ سے طرز تحریر کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا اور اگر کچھ اندازہ بھی ہوتا ہے تو اتنا کہ کلیم محض قافیہ پیمائی کرنا جانتے تھے تیسرے دور میں میر امن اور دوسرے سلیس اردو لکھنے والے موجود تھے۔ اس لئے ان بزرگوں کے درمیان کلیم کا ذکر نامناسب ہے۔

اسی طرح حکیم شریف خاں کا ذکر بھی غیر ضروری ہے کیونکہ اُن کے ترجمۂ قرآن مجید کے شائع ہونے کی آج تک نوبت ہی نہیں آئی۔ اور ایک آدھ سطر سے اُن کے طرز تحریر کے متعلق کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ مرزا قتیل، سید اعظم علی اکبرآبادی، مولوی قطب الدین دہلوی، مفتی صدر الدین آزردہ، منشی سعد اللہ رامپوری، امام بخش صہبائی اور مولوی مسیح الزماں کو بھی آسانی سے نظر انداز کیا جا سکتا تھا کیونکہ قتیل کا کارنامہ محض دریائے لطافت کی ترتیب میں شرکت کرنا ہے۔ سید اعظم علی کے فسانۂ سرور افزا پر ترجمہ کا دھوکا ہوتا ہے حالانکہ یہ اُن کی ذاتی تصنیف ہے۔ مفتی صدر الدین

بجز چند خطوط اُردو کے کسی مستقل تصنیف کے مالک نہیں ہیں۔ مفتی سعد اللہ رامپوری کی طرز تحریر قدیم ہے اور مولوی مسیح الزماں کی یادگار محض علم الحساب ہے جس میں انشائے رقعات، چند حکایات اور قواعد حساب درج ہیں۔

داستان تاریخ اُردو کے فاضل مؤلف نے بعض ادوار میں مصنفوں کے لئے غلط جگہ تجویز کی ہے مثلاً یوسف خاں کمبل پوش کا ذکر سرسید کے دور کے بجائے غدر سے قبل کے دور میں ہونا چاہیے تھا کیونکہ اُن کی تصنیف عجائبات فرنگ ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی اور بقول قابل مؤلف کے اس کتاب کی زبان سوا سو برس پیشتر کی ہے۔ اسی طرح شاہ محمد قاسم نانوتوی کا ذکر خیر بھی غدر سے پہلے ہونا چاہیے، کیونکہ وہ اپنی عبارت میں اکثر جگہ کسو، کدھی لکھ جاتے ہیں اور جونکہ کی جگہ جوکہ تحریر کرتے ہیں حالانکہ نجات قاسم ۱۸۷۵ء کی تصنیف ہے قطب الدین باطن کی تصنیف گلستانِ بے خزاں کی عبارت بھی انھیں غدر سے قبل کے دور میں جگہ دینے کی سفارش کرتی ہے۔ یوں بھی یہ کتاب ۱۸۵۱ء میں لکھی گئی ہے۔

مؤلف نے پانچواں دور ۱۸۷۱ء سے لیکر ۱۹۰۰ء پر ختم کر کے چھٹا دور غدر سے لیکر بیسویں صدی کے آغاز تک قائم کیا ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ پانچویں دور کے ختم ہونے سے پہلے چھٹا دور کیسے شروع کر دیا گیا ہے اور چھٹا دور جو پانچویں دور سے بعد میں آتا ہے اس کا عہد غدر کے بعد سے کیسے قائم کر دیا گیا ہے۔ جبکہ خود پانچواں دور ۱۸۷۱ء سے آغاز ہوتا ہے۔

یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ پانچویں دور کو چھٹے دور سے کیوں علٰحدہ رکھا گیا ہے جبکہ لائق مؤلف کو خود اعتراف ہے کہ "زمانہ کے لحاظ سے یہ دور الگ الگ نہیں ہیں۔ دونوں کی ابتدا و انتہا تقریباً ساتھ ساتھ ہے" یہ استدلال بھی کمزور ہے کہ چونکہ بعض مصنفین کی تصانیف باعتبار موضوع و مضمون اولیت کا درجہ رکھتی ہیں اس لئے پانچواں دور چھٹے دور سے علٰحدہ ہونا چاہیے۔ دور کے قائم کرنے میں صرف یہ بات ملحوظ خاطر ہونا چاہیے کہ دونوں ادوار کی طرز تحریر میں نمایاں فرق ہے یا نہیں، لیکن اگر اس نقطۂ نگاہ سے پانچویں اور چھٹے دور کی تحریرات کا مقابلہ کیجئے تو ان میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔

اس دور میں مصلح اور ادیب دونوں حیثیتوں سے سرسید کا اثر ہمہ گیر رہا ہے، اُن کی وجہ سے نہ صرف عام خیالات ہی میں زبردست انقلاب ہوا بلکہ تحریر بھی اُن کے اثر سے محفوظ نہ رہ سکی۔ حالی۔ شبلی، نذیر احمد، ذکاء اللہ، سید علی بلگرامی، چراغ علی سب انھیں کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اس زمانہ کا کوئی انشا پرداز سرسید کے اثر سے بچ سکا تو وہ پروفیسر آزاد کی تنہا شخصیت ہے ورنہ تقریباً تمام بزرگوں کے طرز تحریر میں سرسید کا اثر سرایت کر گیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں مضامین میں سادہ اور بے تکلف عبارت لکھنے کی روش قائم ہوئی وہیں انگریزی الفاظ کا غیر ضروری استعمال بھی شروع ہو گیا۔ مولانا شبلی کا دامن البتہ کسی قدر محفوظ رہا۔ بہرحال ایسی صورت میں ان بزرگوں کو سرسید سے علٰحدہ رکھکر ایک جداگانہ دور قائم نہیں کیا جا سکتا۔

پانچویں دور میں سرسید کے ساتھ امیرمینائی کو رکھنا بھی موزوں نہیں ہے ہماری رائے میں تو اُن کو سرسید کے دور کے بجائے غالب اور غلام غوث بیخبر کے ہمراہ رکھنا چاہیئے۔

اس قسم کی کتابوں میں اکثر مصنفین کے اقتباسات جو اُن کے طرز تحریر کے نمونے کی حیثیت سے درج کئے گئے ہیں۔ دوسری کتابوں سے بلاحوالہ نقل کر دیے جاتے ہیں۔ اس نقص سے یہ کتاب بھی بالکل پاک نہیں ہے لیکن لایق مصنف نے اکثر اس کتاب کا حوالہ دیدیا ہے جس سے اقتباس نقل کیا گیا ہے۔

ہم کو یہ بھی افسوس ہے کہ کتاب کو حالی اور آزاد کے دور پر ختم کر کے شرر اور سرشار جیسی جلیل القدر ہستیوں کو نظرانداز کر دیا گیا ہے جنھوں نے اُردو ادب پر احسان عظیم کیا ہے۔ اُن کی رائے میں "شرر اور رسوا اور سرشار وسجاد حسین ناول اور ظرافت کے پیش رو ہیں جو عصر حاضر میں کمال کو پہونچی...... اور اس کے لئے علیحدہ تالیف کی ضرورت ہے۔"

ان جزوی باتوں کے متعلق اختلاف رائے کے باوجود ہر انصاف پسند نقاد کو ماننا پڑے گا کہ پروفیسر حامد حسن قادری نے اس کتاب میں بڑی محنت و جانفشانی سے کام لیا ہے۔ انھوں نے ہر معاملے میں اپنی رائے صاف صاف اور بیباکانہ ظاہر کردی ہے۔ بیجا اعتراضات اور غلط تعریف و توصیف سے بھی ان کا قلم پاک رہا ہے۔ اُنھوں نے کس آزادی سے اظہار رائے کیا ہے اسکے معلوم کرنیکے لئے اُنکی چند رائیں ملاحظہ فرمایئے۔ مولانا حالی کے متعلق لکھتے ہیں

"اُن کی عبارت پڑھنے سے ادبی مسرت حاصل نہیں ہوتی، انشاپردازی کا نشاط و اہتزاز پیدا نہیں ہوتا تاہم اُن کی پختگی تلی تحریر کا اثر ہوتا ہے۔ اس لئے حالی کوئی خاص صاحب طرز منشی نہیں لیکن صحیح و با اصول ادیب ہیں۔"

یا مولوی ذکاءاللہ کے متعلق اُن کی رائے یہ ہے:۔

"اُن کی اکثر تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی دوسری زبان سے ترجمہ کر رہے ہیں حالانکہ وہ مضامین اُنکی ذاتی فکر اور آزادانہ تحریر کا نتیجہ ہوتے ہیں، کہیں کہیں محاورہ اُردو کے خلاف فارسی محاوروں کا لفظی ترجمہ کر دیتے ہیں۔"

اور آزاد کے متعلق اُن کا خیال ہے کہ:۔

"علامہ آزاد کو پنجاب میں رہتے اور پنجابیوں سے گفتگو کرتے رہنے کے سبب سے پنجابی بول چال کی عادت ہو گئی تھی کبھی کبھی اپنی تحریر میں لکھ دیتے تھے۔ خطوط میں ایک جگہ لکھتے ہیں 'کیا میں نے پنجاب سے نکالا کیا ہوا ہے'۔ دربار اکبری میں بھی یہ بات نظر آتی ہے، آب حیات میں نہیں۔"

بہرحال قادری صاحب نے اردو نثر کی یہ ضخیم تاریخ لکھکر ملک کی ایک زبردست ادبی خدمت کی ہے۔ ساری کتاب کی عبارت شگفتہ اور دلکش ہے اور اس کی تیاری میں بڑی محنت و کاوش سے کام لیا گیا ہے۔ جس کا احسان اُردو زبان پر ہمیشہ رہیگا۔

رفتارِ زمانہ

مشرق جاپان کی پیش دستیوں کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ ملایا اور سنگاپور پر قبضہ کرنے کے بعد اس نے جاوا پر بھی قبضہ جما لیا ہے
جو مشرق میں ڈچ طاقت کا آخری گڑھ اور تمام جزائر شرق الہند میں سب سے زیادہ زرخیز جزیرہ ہے۔ فلپائن کا مقابلہ بھی ختم ہو چکا ہے۔
بہادر جنرل میک آرتھر اپنے خاص خاص فوجی افسران اور فلپائن کے سول حکام کیساتھ اسٹریلیا پہونچ گئے ہیں۔ اب جنوب مغربی بحرالکاہل میں
اتحادیوں کے پاس صرف ایک جزیرہ نیوگنی باقی رہ گیا ہے۔ اس پر بھی جاپانی فوجیں بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ اس کے دارالحکومت پورٹ مورسبی پر
شدت کے ساتھ ہوائی حملے ہو رہے ہیں۔ آسٹریلیا کے مشہور بندرگاہ ڈارون، بروم اور ونڈھیم پر بھی جاپانی ہوائی جہازوں کے حملے ہوتے رہتے
ہیں۔ اس وقت جنرل میک آرتھر صدر امریکہ کی اجازت سے اتحادی فوجوں کے کمانڈر انچیف کی حیثیت سے اسٹریلیا کے مدافعتی انتظامات کر رہے ہیں
امریکہ کی فوجیں اور ہوائی جہاز بھی آسٹریلیا کی مدد کو پہونچ گئی ہیں لیکن ابھی تک آسٹریلیا کی تشویش و تردد میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ ملک کے شمالی حصے
فوجی انتظام میں دیدیا گیا ہے۔ آسٹریلیا کی جو فوجیں اس وقت تک دوسرے محاذوں میں مصروف جنگ تھیں وہ اب آسٹریلیا کی حفاظت میں حصہ لینے
کے لئے واپس بھیجی جا رہی ہیں۔ آسٹریلیا کی فوجی طاقت دو ڈھائی لاکھ سے کم نہیں اور امریکہ سے کمک پہونچنے پر ان کو غیر معمولی تقویت مل جائیگی
اس لئے امید کرنا چاہیئے کہ آسٹریلیا جاپان کی زیادتیوں کا منھ توڑ جواب دے گا۔ برہما کے حملے میں بھی جاپان نے اُسی تیز رفتاری سے کام
لیا ہے جس کا ثبوت وہ ملایا و سنگاپور میں دے چکا ہے۔ اس ماہ اس محاذ جنگ کا سب سے اہم واقعہ رنگون کی شکست ہے۔ تیسین، پیگو، تھارواڈی
اور دریائے ایراوتی کے دہانہ کا علاقہ بھی اس وقت جاپانیوں کے ہاتھ میں آگیا ہے۔ برطانوی فوج کی مدد کے لئے جو جنگ آزمودہ اور بہادر چینی سپاہ
برہما آئی ہیں وہ اس وقت امریکن جنرل اسٹلویل کی کمان میں قدم قدم پر جاپانیوں کا سخت مقابلہ کر رہی ہیں۔ جنرل ویول بحرالکاہل کے علاقہ سے واپس
آکر پھر سے ہندوستان کے کمانڈر انچیف ہو گئے ہیں۔ برہما کا کمان بھی آپ ہی کی ماتحتی میں ہے، اور انگریزی ہندوستانی اور چینی فوجیں اپنی متحدہ اور
متفقہ قوت سے برہما کی حفاظت کا حق ادا کر رہی ہیں۔ جاپانی فوج اُدھر ہفتہ عشرہ کیلئے ذرا سست رہی مگر اس طرف اس نے ٹونگو کے علاقے کو تین طرف
سے گھیر لیا ہے چینی فوجیں گو اس وقت ہر طرف سے گھر گئی ہیں لیکن بڑی بہادری سے لڑ رہی ہیں۔ چینی فوج کا ایک خاص حصہ ریاست شان میں
تعینات ہے اور ایک دوسرے حصے نے سیام (تھائی لینڈ) پر حملہ کر دیا ہے۔ چینی سپاہی دو جگہ سرحدی علاقے کو عبور کر کے سیام میں داخل ہو گئی ہیں
ہم کو امید ہے کہ یہ حملہ جنگ برہما کے لئے بھی مفید ثابت ہو گا۔ حالانکہ اس وقت جاپانی فوجیں ایک طرف ٹونگو اور دوسری جانب پروم کے سمت بڑھ رہی ہیں
جاپانی دریائے ایراودی کو پار کر کے شمالی برما کی طرف نقل و حرکت کر رہے ہیں۔ اُنھوں نے پروم و مانڈلے کے درمیان دو جگہ ریلوے لائن کاٹ دی ہے
اور ٹونگو کے شمال میں ایک اہم ہوائی اڈہ پر قبضہ کر لیا ہے[1]۔ اس وقت اُن کی چال یہ معلوم ہوتی ہے کو انگریزی فوج سے چینی فوج کا تعلق منقطع کر دیں
اس میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہو رہے ہیں، اسوقت [illegible] برما کی حالت اگر نازک نہیں تو تشویش انگیز
ضرور ہو گئی ہے۔ ۱۲ مارچ کو انگریزی فوج کو جزیرۂ انڈمان بھی خالی کرنا پڑا اب وہاں بھی جاپانی قبضہ ہے۔ جزیرۂ انڈمان کا تعلق ہندوستان
سے تھا اس لئے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ہندوستان پر جاپانی حملے کی شروعات ہو گئی ہے۔ انڈمان کے برطانوی قبضہ سے نکل جانے سے کلکتہ، پوری
مچھلی پٹم، چاٹگام، وزیگاپٹم اور مدراس وغیرہ کو ہوا اور سمندر دونوں طرف سے خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جاپان جزیرہ لنکا کی
طرف پیش قدمی کرتا ہے یا پہلے مداغاسکر جو بحر ہند میں افریقہ کے جنوب مشرق کی طرف واقع اور گرین لینڈ، نیوگنی اور بورنیو کے بعد سب سے بڑا اور
جنگی لحاظ سے خاص طور پر اہم جزیرہ ہے۔ ڈھائی لاکھ مربع میل اس کا رقبہ ہے اور اس میں کئی وسیع قدرتی بندرگاہیں ہیں جن میں بڑے بڑے
جنگی جہاز لنگر انداز ہو سکتے ہیں۔ اس وقت یہ فرانس کی وشی گورنمنٹ کے ماتحت ہے لیکن اگر اس پر جاپان کا قبضہ ہو جائے تو اُن برطانوی اور امریکی
جہازوں کے لئے بہت بڑا خطرہ پیدا ہو جائیگا جو راس اُمید کے گرد ہو کر بحر ہند میں آتے اور شمال میں خلیج فارس یا بحر احمر کی طرف جاتے ہیں بعض اوقات

[1] اس مضمون کے لکھے گئے بعد [illegible] ٹونگو اور پروم پر جاپان کا قبضہ ہو گیا ہے بلکہ پروم کے آگے اور جاپانی [illegible] بڑھ گئے ہیں
[illegible]

کا خیال ہے کہ جاپان اسٹریلیا اور ہندوستان دونوں طرف بیک وقت بڑھنا چاہتا ہے لیکن اس کے لئے بہت بڑے انتظامات کی ضرورت ہے جن کا فراہم کرنا جاپان کے لئے بھی شاید مشکل ہوگا۔

روس روس حیرت انگیز جوانمردی کے ساتھ جرمن حملہ آوروں کو اپنے ملک سے نکالنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہے۔ ستاریہ روسہ کے علاقہ میں روسی فوج نے نمبر ۱۶ جرمن لشکر کو جس کی تعداد ایک لاکھ کے قریب ہے ہر طرف سے گھیر رکھا ہے۔ ہٹلر اس لشکر کو بچانے کے لئے جرمن فوج کے تازہ دم ڈویژن پر ڈویژن بھیج رہا ہے لیکن ابھی تک روسی محاصرہ قائم ہے اور دشمن کا سخت نقصان ہو چکا ہے۔ دوسرے تمام محاذوں پر سخت لڑائیاں ہو رہی ہیں۔ اسمولنسک کے علاقہ میں بہت سے مقامات جرمنوں سے لے لئے گئے ہیں۔ یوکرین کے محاذ پر خارکوف پر تین طرف سے روسی دباؤ پڑ رہا ہے اور جرمن اس شہر کو بچانے کیلئے ہر ممکن تدبیر کر رہے ہیں۔ کریمیا اور کرچ کے محاذ پر بھی جنگ جاری ہے۔ جرمن فوجیں سباسٹوپول کا محاصرہ کئے ہوئے ہیں لیکن ابھی تک وہاں کی روسی فوج برابر مقابلہ کر رہی ہے۔ فنلینڈ میں مورمانسک کے محاذ پر بھی روسیوں نے ایک عرصہ کی خاموشی کے بعد پھر وسیع پیمانہ پر حملہ کر دیا ہے اور بحر قطب شمالی کے ساحل پر جرمن فوج کے پیچھے کئی جگہ روسی سپاہ اور توپیں اتار دیئے گئے ہیں چنانچہ یہاں بھی جرمنوں کو بہت نقصان اٹھانا پڑا اور ان کی صفوں میں بھی گڑبڑ پیدا ہو گئی ہے۔ غرض روسی دسمبر سے ابتک بڑی جوانمردی سے جنگ جاری رکھے ہوئے ہیں اسی وجہ سے جرمنوں نے جنگ روس کا جو نقشہ بنایا تھا وہ پورا نہیں ہو سکا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس جنگ میں پہلی مرتبہ روس میں بری طرح پھنس کر رہ گئے ہیں مگر وہ پہلے پانچ مہینے کے اندر تقریباً ساڑھے پانچسو میل تک روس میں داخل ہو گئے تھے وہاں کی شدت کی وجہ سے روسی انھیں ایک ثلث سے زیادہ بیدخل نہیں کر سکے ہیں۔ اب گرمی کا موسم شروع ہونے والا ہے اسلئے دونوں طرف سے زبردست مقابلے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ ہٹلر نے اپنے پچھلے فوجی سرداروں کو پھر بلا لیا ہے۔ ادھر امریکہ اور برطانیہ روس کو ہر ممکن امداد پہونچا رہے ہیں۔ ہٹلر جاپان کو سائبیریا سے روس پر حملہ کرنے کی ترغیب دے رہا ہے کیونکہ اسکے لئے از حد ضروری ہے کہ آئندہ چند ماہ کے اندر روس کا قصہ ختم کر دے لیکن روس بھی مر مٹنے کو آمادہ ہے اور کسی حالت میں اپنی آزادی کھونے کو تیار نہیں ہے۔ چنانچہ سائبیریا کے محاذ پر بھی اُس نے اپنی فوج کی تعداد دگنی کر دی ہے اور جزیرہ نمائے کامچٹکا میں بڑی تیزی سے نئے ہوائی اڈے بن رہے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ قابل لحاظ بات جاپان کا ابھی تک کوئی ایسی کارروائی نہ کرنا ہے جس سے روس کو اس کے حملہ آور ہونے کا اندیشہ پیدا ہو سکے بلکہ اس کے برعکس بحرالکاہل میں ماہیگیری کے متعلق روس و جاپان میں معاہدہ کی گفتگو ہو رہی ہے۔ اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہٹلر کو اس سلسلے میں جلد کامیابی نہ ہوگی۔ اس صورت میں خیال غالب یہ ہے کہ وہ ایران و عراق سے تیل حاصل کرنے کی ایک مرتبہ پھر کوشش کرے۔ مگر اس کے لئے اُسے ٹرکی پر حملہ کرنا ہوگا۔ حال کے بعض واقعات اس امکان کا اشارہ کر رہے ہیں مثلاً ترکی کے جرمن سفیر کا طبی مشورہ کے خلاف جرمنی جانا اور بورس شاہ بلغاریہ کا ہٹلر سے ملاقات کرنا۔ ٹرکی خود اس وقت تک احتیاط اور ایمانداری کے ساتھ اپنے غیر جانبدارانہ پالیسی پر قائم ہے۔ حال میں سمرنا سے نوے میل کے فاصلے پر سپاہ برطانوی ہوائی جہازوں نے غلطی سے چند بم گرا دیے تھے جس سے کچھ نقصان جان و مال ہوا لیکن برطانوی سفیر نے اس واقعہ پر اظہار افسوس نقصان کا معاوضہ ادا کرنیکا وعدہ کر لیا ہے غرض برطانیہ سے ترکی کے تعلقات بدستور اچھے ہیں اور کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ وہ آسانی سے ہٹلر کے پنجے میں پھنس جائے لیکن ہٹلر اپنے مقاصد کے سامنے کس کی پرواہ کرتا ہے! ممکن ہے ترکی کو ہٹلر کی دھمکیوں کے آگے دبنا پڑے۔

لیبیا لیبیا میں اس طرف معمولی جھڑپوں اور ہوائی حملوں کے سوائے اور کوئی بڑا واقعہ نہیں ہوا۔ مالٹا پر البتہ دو سو ہوائی حملے ہو چکے ہیں مگر یہ چھوٹا سا جزیرہ ابتک بہادری سے مقابلہ کئے جا رہا ہے۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ جرمن جنرل رومیل کو تازہ کمک پہونچ رہی اور کیا عجب ہے کہ وہ مصر کی طرف پیش قدمی کرے لیکن دو ہی ہفتہ بعد گرمی کی وجہ سے جنگ جاری رکھنے میں مزید دشواریاں پیدا ہو جائیں گی۔ اس طرف مصر میں نحاس پاشا کی وزارت قائم ہونے سے قوم پرست پارٹی کو ملکی حفاظت کا انتظام کرنے کا موقعہ مل گیا ہے مصری پارلیمنٹ کے تازہ انتخابات ختم ہو گئے ہیں جن میں ۲۶۴ نشستوں میں سے ۲۱۶ جگہیں نحاس پاشا کی وفد پارٹی کو حاصل ہوئیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نئی وزارت کو ملک میں کتنی ہردلعزیزی حاصل ہے۔ ایسے نازک موقع پر ہردلعزیز حکومت کا برسر حکومت ہونا ملکی حفاظت کیلئے فال نیک ہے۔

بحری معرکے پچھلے دو ڈھائی ماہ سے بحر اٹلانٹک میں جرمن ڈبکنی کشتیوں کی سرگرمیاں بہت بڑھ گئی ہیں۔ بقول مسٹر چرچل اٹلانٹک کی لڑائی چھ ماہ تک برطانیہ کے موافق رہی مگر اس طرف اس نے ناگوار صورت اختیار کر لی ہے۔ روم ساگر کے بحری معرکوں میں اتحادیوں کا پلہ بھاری ہے کیونکہ اس سمندر میں برطانوی ڈبکنیوں نے اٹلی کے بہت سے باربردار جہاز غرق کر دیئے ہیں برطانیہ خود اور امریکہ کی مدد سے اپنے جہازی نقصانات کی بہت کچھ تلافی کر لیتا ہے لیکن اٹلی کے جتنے جہاز ڈوبتے ہیں اتنے اُس کے کارخانے تیار نہیں کر سکتے ہیں۔ حال میں اٹلی کا ایک اور بڑا کروزر ڈبو دیا گیا لیکن بحر ہند اور خلیج بنگال میں جاپانی بیڑے کا ظہور دیا ہے۔

امریکہ امریکہ اپنی پوری طاقت سے اتحادی ملکوں کیلئے جنگی سامان بنا رہا ہے اور آسٹریلیا کو بھی اس نے اپنی فوج اور ہوائی جہاز بہ تعداد کثیر بھیجدیئے ہیں۔ روس اور چین کو بھی وہ برابر مدد دے رہا ہے۔ چنانچہ روس نے حال میں اس کا خاص طور پر شکریہ ادا کیا ہے امریکہ چین کو پانچ کروڑ ڈالر بطور قرض دے چکا ہے اور اس وقت برما میں جو چینی فوجیں لڑ رہی ہیں اُن کی کمان بھی امریکن جنرل اسٹوِل کے ہاتھ میں ہے۔ برما روڈ کے بند ہوتے ہوتے بہت سا جنگی سامان وہاں کے جنگلوں میں چھپا کر رکھ دیا گیا تھا جس سے اس وقت چین کو بہت بڑی مدد مل رہی ہے۔ آسام سے نیا راستہ بھی بڑی تیزی کے ساتھ بنایا جا رہا ہے اسطرح جہاں تک عزم اور انتظام کا تعلق ہے اتحادی محوری طاقتوں کو بالآخر شکست دینے کے لئے ہر ممکن ایثار اور جانفشانی سے کام لے رہے ہیں۔

ہندوستان ہندوستان کی سیاسی گتھی سلجھانے کی نئی کوشش ہوئی ہے یعنی وسط مارچ میں مسٹر چرچل نے یہ اعلان کیا کہ برطانیہ کی جنگی وزارت نے ہندوستانی مسئلہ کا اتفاق رائے سے فیصلہ کر لیا ہے اور اس کے متعلق ہندوستانی لیڈروں سے مشورہ کرنے کے لئے سر اسٹیفورڈ کرپس لارڈ پریوی سیل ہندوستان بھیجے جا رہے ہیں۔ چنانچہ ۲۲ مارچ کو سر ممدوح ہندوستان پہونچ گئے۔ دہلی پہونچتے ہی اُنھوں نے حضور وائسرائے، کمانڈر انچیف گورنران صوبہ سے تبادلۂ خیالات کرنے کے بعد لیڈروں سے ملاقاتیں شروع کر دیں۔ وہ سب پارٹیوں کے رہنماؤں سے تبادلۂ خیالات کرنیکے بعد انھوں نے یہ تجاویز اطلاع عام کے لئے شائع بھی کر دی ہیں، اُن کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔

چونکہ برطانیہ اور ہندوستان میں تشویش کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں برطانیہ نے جو وعدے کئے تھے انھیں ابھی تک پورا نہیں کیا گیا اس لئے برطانوی گورنمنٹ نے ٹھیک اور واضح لفظوں میں وہ تدابیر تیار کر لی ہیں جن پر عملدرآمد کرنے سے ہندوستان کو حتی الامکان بہت جلد حکومت خود اختیاری حاصل ہو جائیگی۔ ان تجویزوں کا مقصد یہ ہے کہ:۔

دیگر نوآبادیوں کے طرز پر ہندوستان میں ایک نئی یونین قائم کی جائے جو دوسری ڈومینیوں کی طرح تاج برطانیہ سے وابستہ ہو لیکن سیاسی حیثیت اور درجہ کے لحاظ سے دوسری ڈومینیوں بلکہ خود برطانیہ کے برابر ہو اور داخلی و خارجی جملہ معاملات میں برطانیہ کی ماتحت نہ ہو۔ اور اس انڈین یونین کے وجود میں لانے کی صورت یہ تجویز کی گئی ہے کہ "لڑائی بند ہونے کے بعد فوراً ہی ہندوستان میں ایک منتخب جماعت بنا دی جائے اور ہندوستان کا نیا آئین مرتب کرنے کا کام اس کے سپرد کیا جائے۔ اس آئین ساز جماعت میں ریاستی نمایندوں کی شرکت کی بھی گنجایش رکھی گئی ہے۔ یہ جماعت جو آئین مرتب کریگی اُسے برٹش گورنمنٹ منظور کر لیگی برطانیہ نے اس پر عملدرآمد کا وعدہ کیا ہے، البتہ:۔

(الف) اگر برطانوی ہند کا کوئی صوبہ مجوزہ حکومت ہند کو منظور نہ کرے تو وہ اپنی موجودہ حیثیت قائم رکھنے کا حقدار ہوگا لیکن بعد میں اگر کسی وقت وہ اس آئین میں شریک ہونیکی خواہش ظاہر کریگا تو اُسے نئے انڈین یونین میں شامل کر لیا جائیگا۔ جو صوبے انڈین یونین میں شامل ہونا منظور نہ کرینگے ان کے لئے برٹش گورنمنٹ جدید آئین منظور کریگی جس کی وہی حیثیت ہوگی جو انڈین یونین کی ہوگی۔

(ب) مجلس آئین ساز اور برٹش گورنمنٹ کے درمیان ایک نیا معاہدہ ہو جائیگا جس میں وہ تمام باتیں آ جائیں گی جو برطانیہ کی تمام ذمہ داریاں ہندوستان منتقل کرنے میں پیدا ہونگی۔ اس معاہدہ میں نسلی و مذہبی اعتبار سے تمام قلیل تعداد والی جماعتوں کے حقوق کی حفاظت بھی شامل ہوگی لیکن سلطنت برطانیہ کے دوسرے ممبروں کے ساتھ کوئی نیا معاملہ کرنے کے متعلق کوئی قید نہ ہوگی۔ دیسی ریاستوں کو خواہ وہ انڈین یونین میں شامل ہونا منظور کریں یا

یا نہ کریں جدید آئین کے مطابق اپنے اپنے معاہدوں میں ترمیم و نظرثانی کرنا پڑیگی۔ مجلس آئین ساز کی شکل یہ ہوگی تاوقتیکہ ہندوستانی لیڈر جنگ ختم ہونے سے پہلے متفقہ طور پر کوئی دوسری صورت پیش نہ کریں۔ جنگ کے بعد فوراً صوبجاتی اسمبلیوں کا نیا انتخاب ہوگا اور ہر صوبہ کی اسمبلی کے ممبر دس فیصدی کے تناسب سے ایک جدید آئین ساز جماعت کے ممبر انتخاب کریں گے۔ ہندوستانی ریاستیں بھی اپنی آبادی کے تناسب سے اپنے نمائندے بھیجیں گی اور اُن کو بھی برطانوی ہند کے نمایندوں کے برابر اختیارات حاصل ہونگے۔ موجودہ نازک وقت میں جب تک نیا دستور مرتب ہو ہندوستان کی حفاظت کا انتظام برطانیہ کے ہاتھ میں رہیگا لیکن ہندوستانیوں سے ملکر جنگ کے لئے کوشش کرنا حکومت ہند کا کام ہوگا۔ یہ تجویزیں مجموعی حیثیت سے منظور یا نامنظور کیجائیں۔ سر اسٹیفورڈ کرپس نے ریڈیو پر تقریر کرکے ان تجویزوں کی وضاحت کردی ہے نیز پریس کانفرنس میں ہر قسم کے سوالوں کے جوابات دیئے ہیں جن سے مزید صراحت ہوگئی ہے۔

اس وقت تک تمام دنیا میں ان تجاویز کی اشاعت ہوچکی ہے۔ سب جگہ اہل الرائے اصحاب نے ان کی اہمیت تسلیم کی ہے اور یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ برطانیہ نے لڑائی کے بعد ہندوستان کا حق آزادی منظور کرلیا ہے۔ سیاسی حیثیت سے اس سے زیادہ رعایت برطانیہ کے بس کی بات نہیں ہے کہ وہ ہندوستان کو اندرونی اور بیرونی تمام معاملات میں خود اپنے (یعنی برطانیہ) اور دوسری اجزائے سلطنت کے برابر سیاسی حقوق اور ملکی آزادی کا حقدار تسلیم کرے۔ اس میں سلطنت برطانیہ کے ساتھ رہنے اور اُس سے علیحدہ ہونے کی آزادی بھی شامل ہے۔ اور مجوزہ اعلان کی عبارت اس بارے میں اطمینان بخش ہے۔ برطانیہ نے یہ بھی منظور کرلیا ہے کہ آئندہ آئین کی نوعیت اور اُس کی تفصیلات ہندوستانی قائم مقاموں کی رائے پر منحصر ہونگی اور برطانیہ اہل ملک کے بنائے ہوئے آئین حکومت کو منظور کرلیگا۔ اس ضمن میں دو تین باتیں اور بھی قابل ذکر ہیں۔ اوّل یہ کہ انگریزی سلطنت کی تاریخ میں پہلی دفعہ اصولی حیثیت سے ہندوستان کے سیاسی مطالبات کو صریح اور واضح الفاظ میں تسلیم کیا گیا ہے۔ دوسرے ہندوستان پر انگریزی تجارتوں اور انگریز ملازمین گورنمنٹ کے متعلق کسی قسم کی کوئی نامناسب پابندی عائد نہیں کیگئی ہے تیسرے دیسی ریاستوں کو آئینی ترقی روکنے کا بہانہ نہیں بنایا گیا ہے بلکہ ان کے معاہدوں کی ترمیم کا ارادہ ظاہر کرکے ہندوستان کے ساتھ اپنی نیک نیتی کا مزید ثبوت دکھایا ہے۔ یہ سب باتیں اطمینان بخش اور دل خوش کن ہیں لیکن اس اسکیم میں صوبوں اور ریاستوں کو اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ بنانے کا جو موقعہ دیا گیا ہے اور دیسی ریاستوں کے قائم مقاموں کے انتخاب کا جو طریقہ تجویز کیا گیا ہے وہ بہت دل شکن ہے۔ مجوزہ انڈین یونین سے علیحدگی کے متعلق صوبہ کی قانونی اسمبلی کے فیصلہ کی صورت غنیمت تھی مگر عام رائے شماری کا جو طریقہ تجویز کیا گیا ہے وہ علیحدگی چاہنے والوں کو ترغیب بیجا دینے کے بمنزلہ ہے۔ ان اصولی نقائص کے علاوہ جنگی انتظامات اور فوری تبدیلیوں کے متعلق بھی بلند نظری اور فراخ دلی سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملے میں صاحب وزیر ہند مسٹر ایمری اور اُن کے ہم خیال ممبران جنگی وزارت کا اثر غالب رہا اور اُنھوں نے وہی اگست ۱۹۴۰ء کی پیشکش کا بالفاظ دیگر اعادہ کردیا ہے۔ ہندوستان مجموعی حیثیت سے اس پیشکش کو نامنظور کرچکا ہے ایسی حالت میں اس نازک موقع پر اس کا ذکر ہندوستانی محبان وطن کے لئے بہت ہی حوصلہ شکن ہے۔ گورنمنٹ برطانیہ فوجی محکمہ کو اور انتظام جنگ اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتی ہے، البتہ جنگ کے لئے آدمی روپیہ اور سامان مہیا کرنے کا فرض ہندوستانیوں کے کندھوں پر ڈالنے کو تیار ہے۔ مگر ملک میں چاہے جس طرح کی قومی حکومت قائم ہو وہ اس وقت تک اہل ملک کے جذبات کو اُبھار نہیں سکتی ہے جب تک فوجی نظم و نسق پر اُسے پورا قابو نہ ہو۔ اس وقت "زمین سوز پالیسی" "تخلیہ مقامات" کے انتظامات اور دیگر فوجی کارروائیوں کے متعلق ملک بھر میں ملایا، سنگاپور اور برما کی آئی ہوئی سچ یا جھوٹ خبروں سے ایک عام بدگمانی پھیل گئی ہے جس کے دفع ہوئے بغیر عوام میں کوئی جنگی جوش پیدا نہیں ہوسکتا ہو اور یہ بدگمانی اسی وقت رفع ہوسکتی ہے جب عوام کو یہ یقین ہوجائے کہ ملکی مدافعت کا کام محض غیر ملکی افسروں کے ہاتھ میں نہیں بلکہ مسلّمہ ملکی خادموں کے ہاتھ میں ہے۔ اس وقت تک ہم کو نہ کانگریس کا فیصلہ معلوم ہوا ہے نہ مسلم لیگ کا لیکن ہم کو یقین ہے کہ حالات اس نوبت پر آپہنچے ہیں کہ جبتک برطانیہ کے مدبر اپنے فیصلوں کی نظرثانی کرکے تمام باتوں میں ہندوستانیوں کو اچھی سے مختار کل نہ سمجھ لیں گے اس وقت تک

ہندوستان کی سیاسی گتھی سُلجھ نہ سکے گی۔ مسٹر سٹیفورڈ کرپس کا اس گتھی کو سلجھائے بغیر انگلستان واپس جانا ہندوستان اور برطانیہ دونوں کے لئے ایک سانحۂ عظیم ہوگا۔

جہاں تک سر اسٹیفورڈ کرپس کا تعلق ہے انھوں نے اپنے مشن کو کامیاب بنانے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ اُنھوں نے پریس اور ملکی لیڈروں دونوں سے انتہائی اخلاق، صفائی اور کشادہ دلی سے تبادلۂ خیالات کیا ہے۔ اب بھی وہ اسی پر مستعد ہیں کہ خواہ چند دنوں انھیں اور زیادہ قیام کرنا پڑے لیکن وہ اس مسئلہ کو حل ہی کر کے واپس جائیں۔ سنا جاتا ہے کہ اُنھوں نے جنگی وزارت پر زور ڈالا ہے کہ دوران جنگ ملکی اور فوجی انتظام کے متعلق وہ ہندوستانیوں کے مطالبوں کو منظور کر لیں۔ ڈاکٹر سر سپرو اور مسٹر جیکار نے بھی فریقین سے باہمی سمجھوتہ کی پُرزور اپیل کی ہے، اور ایک اہم یادداشت سر اسٹیفورڈ کرپس کے پاس بھیجی ہے۔

بہرحال جنگی وزارت کو اپنے فیصلوں میں ملکی مطالبات اور وقتی ضروریات کے مطابق ترمیم کر دینا چاہیئے تاکہ ہندوستانیوں کے دلوں میں یہ خیال قطعی مٹ جائے کہ برطانیہ ہندوستان کی یگانگت و یک جہتی قائم رکھنا نہیں چاہتا اور جنگی انتظامات کے متعلق ہندوستانیوں پر پُورا بھروسہ نہیں رکھتا ہے۔

علمی نوٹ

اُردو زبان کے قدیم محسن ڈاکٹر عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اُردو دہلی اپنی تمام زندگی اُردو کی خدمت کے لئے وقف کر چکے ہیں بقول اُن کے جس وقت اُنھوں نے انجمن ترقی اُردو کا چارج لیا تھا اُس وقت انجمن کے دفتر کی کُل کائنات ایک ٹوٹا صندوق اور ایک پھٹا پُرانا رجسٹر تھا۔ مگر تھوڑے ہی دنوں میں آپکی کوشش سے اعلحضرت حضور نظام نے پہلے بارہ سو اور پھر پانچ ہزار روپیہ سالانہ کی امداد منظور فرمائی اور انجمن کے کام میں روز افزوں ترقی ہونے لگی۔ چنانچہ جب سے انجمن کا صدر دفتر دہلی آگیا ہے ڈاکٹر عبدالحق کی کوشش سے ایک وسیع اراضی انجمن کی عمارت کیلئے مل گئی ہے اور اب وہ انجمن کی عمارت کیلئے چندہ جمع کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب یہ عمارت دو ڈھائی لاکھ روپیہ کے صرفہ سے بنوانا چاہتے ہیں۔ انھوں نے حال میں خود بھی چھیالیس ہزار چھ سو اکسٹھ روپیہ جو غالباً اُنکے زندگی بھر کا اندوختہ تھا انجمن کے مستقل سرمایہ میں اس شرط سے دیدیا ہے کہ اگر مجوزہ عمارت کیلئے کافی رقم اکٹھا نہ ہو تو یہ روپیہ عمارت میں صرف کر دیا جائے۔ اس ایثار کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے لیکن اُردو ادب کے توسیع و ترقی میں ڈاکٹر صاحب نے تمام عمر جس خلوص اور یکسوئی تندہی اور جانفشانی سے کام کیا ہے وہ اس مالی ایثار سے بھی بدرجہا قابل تعریف ہے۔

حکومت افغانستان نے حال میں از راہ قدردانی ڈاکٹر سر اقبال مرحوم کی قبر کے لئے ایک گراں بہا تعویذ بنوا کر افغانستان سے بھیجا ہے۔ مشہور چینی لیڈر جنرل چیانگ کائی شیک نے ڈاکٹر ٹیگور کی یادگار کے سلسلے میں شانتی نکیتن کیلئے پچاس ہزار روپیہ اور ان کے قائم کردہ چینی بھون کی تکمیل کیلئے تیس ہزار روپیہ عطا کئے ہیں۔ ہمسایہ ملکوں کی اس ادبی قدر افزائی کی جتنی قدر کی جائے کم ہے۔

زمانہ فروری ۱۹۴۲ء میں "مدوجزر" کے عنوان سے جو نظم جناب اقبال نرائن جگر دہلوی کے نام سے شائع ہوئی اُس کے متعلق ہم کو نہ صرف افسوس بلکہ تعجب سے معلوم ہوا کہ یہ نظم جناب اثر مچھلی شہری کی ہے اور انہیں کے نام سے کئی سال ہوئے اخبار سوراجیہ دہلی میں شائع ہو چکی ہے۔ ہمارے پاس کئی ماہ ہوئے یہ نظم ایک اور صاحب کے ذریعہ آئی تھی اور ہمیں نہ اسکی اشاعت کا علم تھا اور نہ یہی سان و گمان تھا کہ یہ نظم کسی دوسرے شاعر کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ زمانہ کی پُرانی جلدوں کے اکثر مضامین نظم و نثر بعض اوقات بجنسہٖ اور کبھی کبھی خفیف و برائے نام رد و بدل کے ساتھ شائع ہوتے رہتے ہیں بلا حوالہ مضامین کی اشاعت بھی بکثرت ہوا کرتی تھی مگر قلمی اعانت کے سلسلہ میں اس قسم کا دھوکا شاید زمانہ کی تاریخ میں پہلا یا دوسرا واقعہ ہے۔ چند ماہ کا ذکر ہے کہ لاہور ریڈیو اسٹیشن سے کسی صاحب نے کسی پُرانے شاعر کی غزل خفیف رد و بدل کے بعد اپنے یا اپنے کسی خاص عزیز کے نام سے پڑھکر سنائی تھی اس قسم کی بے عنوانیوں کی جس قدر ملامت و سرزنش کیجائے کم ہے

تصحیح زمانہ بابتہ فروری ۱۹۴۲ء صفحہ ۹۰ و ۹۱ میں جذبات فراق کے نام سے حضرت فراق کی جو غزل شائع ہوئی اس کا یہ شعر (صفحہ ۹۰ سطر ۵ پر) غلط چھپ گیا ہے۔

نسیم گیسوئے مشکیں سے تاب کے اُلجھے ۔۔۔ اب اس ہوا کو سوئے گم شدگان غم سنکاؤ

صحیح شعر یوں ہے:- نسیم گیسوئے مشکیں میں بس چکی کب کی ۔۔۔ اسے بھی اب سوئے گم گشتگان غم سنکاؤ

زمانہ

جلد ۷۷ — اپریل سنہ ۱۹۴۲ء — نمبر ۴

نذرِ ٹیگور

از پنڈت آنند نراین ملّا، ایم۔ اے۔ ایل ایل بی

خوشا وہ یاد جو لائی زباں پہ نام ترا
وطن کے شاعرِ اعظم تجھے سلام مرا

(۱)

تجھے چمن کی فضائیں سلام کہتی ہیں
سحر کی مست ہوائیں سلام کہتی ہیں
یہ اودی اودی گھٹائیں سلام کہتی ہیں
کہ ذرہ ذرہ پہ برسا ہے ابرِ جام ترا
خوشا وہ یاد جو لائی زباں پہ نام ترا

(۲)

تجھے فروغِ بصیرت سے دیکھنا چاہا
ابھر کے عقل کی ظلمت سے دیکھنا چاہا
تجھے حیات کی رفعت سے دیکھنا چاہا
نظر کو مل نہ سکا پھر بھی اوجِ بام ترا
خوشا وہ یاد جو لائی زباں پہ نام ترا

(۳)

بلند طائرِ سدرہ سے آشیاں تیرا
نظامِ شمس و قمر پیشِ آستاں تیرا
ستارے روندتا چلتا ہے کارواں تیرا
کہ روحِ قدس کے پہلو میں ہے مقام ترا
خوشا وہ یاد جو لائی زباں پہ نام ترا

(۴)

جہاں کے دشتِ تخیّل کا جوئے آب ہے تو
ابھی جو تشنۂ تعبیر ہے وہ خواب ہے تو
اُفق پہ ہے جو دلوں کے وہ آفتاب ہے تو
ابھی دیارِ شفق میں ہے دورِ جام ترا
خوشا وہ یاد جو لائی زباں پہ نام ترا

(۵)

شبیہِ حُسن ہے تیرے نگار خانوں میں
سرودِ عشق جواں ہے ترے ترانوں میں
حیات رقص کناں ہے ترے فسانوں میں
کہ اِک بہشتِ ترنّم ہے یا کلام ترا
خوشا وہ یاد جو لائی زباں پہ نام ترا

(۶)

ہے گونج لے میں تری سرمدی ربابوں کی
ترے نفس میں مہک جنتی گلابوں کی
تری نظر میں ہے دنیا بشر کے خوابوں کی
ہر اک طلوعِ سحر میں ہے عکسِ شام ترا
خوشا وہ یاد جو لائی زباں پہ نام ترا

(۷)

کدورتوں پہ سدا خاک ڈالنے والا
خصومتوں کو محبّت میں ڈھالنے والا
دلوں سے درد کا کانٹا نکالنے والا
سکون و اَمن کا حامل ہے ہر پیام ترا
خوشا وہ یاد جو لائی زباں پہ نام ترا

(۸)

حیاتِ فانیِ انساں کی اِنتہا ہے جہاں
مسرتِ ابدی دِل سے آشنا ہے جہاں
بشر کی روح کی تکمیلِ ارتقا ہے جہاں
وہاں سے نور فشاں ہے سہیلِ جام ترا
خوشا وہ یاد جو لائی زباں پہ نام ترا

(۹)

وطن میں دھوم ہے ہر سمت اوستادوں کی
بساطِ شعر پہ اِک فوج ہے پیادوں کی
تجھی پہ ختم ہوئی نسل دیوزادوں کی
ادب کی کوہِ ہمالہ پہ ہے مقام ترا
خوشا وہ یاد جو لائی زباں پہ نام ترا

(۱۰)

وہ زیست تیری کہ اِک کائنات رشک کرے
وہ خوبیاں تھیں کہ ہر ذی صفات رشک کرے
مِلی وہ موت کہ جس پر حیات رشک کرے
یہ بزمِ سوگ ہے تیری کہ جشنِ عام ترا
خوشا وہ یاد جو لائی زباں پہ نام ترا

طاقت کے عالمگیر ذریعے

(از مسٹر صدر الدین عظیم)

قدیم زمانوں میں انسان کا سارا اعتماد محض اپنی طاقت پر تھا، اگر اُسے کوئی چیز ایک مقام سے دوسری جگہ لے جانی ہوتی تو خود ڈھونا پڑتا، اگر کہیں سفر کرنا ہوتا تب بھی سارا دار و مدار خود اپنے قدموں پر تھا. غرض دنیا کے ہر کام میں اسے اپنی طاقت کے سوا اور کوئی چیز میسر نہ تھی، مگر اس کے بعد دوسرا زمانہ وہ آیا جب وہ معمولی آلات اور پرزوں کو استعمال کرنے لگا، اور پھر رفتہ رفتہ اُس کے آلات اور کلوں میں ترقی ہوتی گئی. لیکن آجکل کی دنیا پچھلی دنیا سے قطعی مختلف ہے، اگر آج سے تین صدی پہلے کا کوئی انسان پھر اس دنیا میں بھیجدیا جائے تو وہ یقیناً اس کو باور نہ کرے گا کہ وہ اس وقت اس زمین پر ہے جس پر آج سے کچھ پہلے وہ اپنی زندگی بسر کر چکا ہے. جدید ترقی کی اصل یہ ہے کہ انسان نے فطرت کی خارجی طاقت پر تصرف حاصل کر لیا ہے اور اپنی طاقت کے بجائے طبعی طاقتوں کو استعمال کرنے لگا ہے.

براہ راست طاقتوں کے اصل ماخذ تین ہیں، (۱) ہوا (۲) پانی اور (۳) حرارت. انسان نے سب سے پہلے ہوا کو جہاز رانی میں استعمال کیا. اس کے بعد اس نے اس سے بعض کلیں بھی چلائیں. اسے آسانی کے ساتھ یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ اگر ہم ہوا کے موافق سمت میں ایک ستون کھڑا کر کے اس میں زاویہ متقابلہ بناتی ہوئی ایک لکڑی آویزاں کر دیں تو وہ ہوا کی طاقت سے حرکت کرے گی. اور اس طرح کل کے تمام پرزے جو اس سے متعلق ہونگے حرکت میں آجائیں گے. لیکن بڑی مصیبت یہ ہے کہ انسان کلیں تو ایجاد کر سکتا ہے مگر ہوا کے بہاؤ کو مخالف سمت سے موافق سمت میں تبدیل کرنا اس کے بس کی بات نہیں، اس لئے انسان نے اس طاقت کو بھی غیر آرام دہ خیال کیا، اب اُسے فکر ہوئی اور اس نے اس عملیت سے پانی پر اقتدار حاصل کیا. یعنی اُس نے دیکھا کہ اگر پانی کے بہاؤ کے رُخ ایک پہیہ رکھا جائے تو پانی کی روانی اُسے حرکت میں لے آئیگی، اور اس طرح پورا کارخانہ متحرک ہو جائے گا. لیکن اس سے بھی انسانی آرام طلبی اور اشتہا کی سیری نہیں ہوئی اور یہ بھی ناقص ثابت ہوئی. اب اس نے حرارت سے خدمت لی. حرارت سے ہماری کلیں کس طرح متحرک ہوتی ہیں اور کس ترکیب سے ہم اس سے اپنی خدمت لیتے ہیں. یہ ہمارا موضوع نہیں. چونکہ یہ تفصیل تشریح کی محتاج نہیں. ہم اس سے تعرض نہیں کریں گے. تولید حرارت کے لئے اس وقت متعدد چیزیں استعمال ہوتی ہیں، لیکن ہم زیادہ تر

جن ذرائع سے یہ خدمت لیتے ہیں وہ کوئلہ، مٹی کا تیل، گیس اور پانی ہیں۔

ہماری جاریہ ترقی کا سارا دارومدار انھیں پر ہے۔ مگر بعض محققین کا خیال ہے کہ ان میں سے بعض ذریعے مثلاً تیل وغیرہ ایک زمانہ کے بعد ختم ہو جائیں گے اور ہم تیل کی ایک بوند بھی نہ پا سکیں گے۔ تیل کی جو حقیقت ہے وہ مخفی نہیں، تمدنی اشیاء کے علاوہ معمولی روزمرہ ضروریات کے لئے بھی یہ لازم ہو گیا ہے اور اگر تیل نہ دستیاب ہو تو نہ معلوم ہماری کتنی مشینیں اور کلیں یک لخت بند ہو جائیں۔ اسی لئے یہ تصور کر کے ہمارے مفکرین کانپ جاتے ہیں اور اس کے نعم البدل کی تلاش میں ہر لمحہ سرگرداں ہیں۔ چونکہ یہ مسئلہ نہایت اہم ہے اس لئے ذیل میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی جاتی ہے:۔

کوئلہ

جب پتھر کے کوئلہ کا استعمال اتنا عام نہیں تھا اس وقت لکڑی کے ٹکڑوں کو جلا کر کوئلہ بناتے تھے[1] جسے بھٹی وغیرہ میں استعمال کرتے تھے اور اس سے لوہا وغیرہ سخت دھاتیں پگھلاتے تھے۔ پتھر کے کوئلہ کے استعمال کی ابتدائی تاریخ زیادہ واضح طور پر معلوم نہیں ہے۔ مگر یونانیوں اور رومیوں کی کتابوں میں ایک کوئلہ کا ذکر ہے جو جلایا جاتا تھا۔ محققین نے برطانیہ میں رومیوں کے آثار باقیہ میں ایسی آگ کے نشانات پائے ہیں جن میں غالباً پتھر کا کوئلہ استعمال ہوا تھا۔ پتھر کے کوئلہ کے استعمال کا زمانہ جو تاریخ کے ذریعہ معلوم ہو سکا ہے بارھویں اور تیرھویں صدی ہے۔ اس وقت ایک ایسے کوئلہ کا پتہ چلتا ہے جو کھود کر نکالا جاتا تھا۔ ابتداءً جب اس کا استعمال شروع ہوا تو انگلینڈ میں قانونی طور پر اس کا استعمال ناجائز قرار دیا گیا اور اس علت میں کتنے ہی انگریزوں نے قید کی سخت سزا بھگتی۔

پتھر کے کوئلہ کی چار قسمیں ہیں (۱) مقیّر (Bituminous) (۲) نیم مقیّر Semi Bituminous (۳) لکڑی کا کوئلہ[2] - اور (۴) انتھراسیٹ

زمین کے اندر پتھر کے کوئلہ کا جو خزانہ موجود ہے اس کا اندازہ تقریباً ۷۰ پدم ٹن کیا گیا ہے۔ اور ہر سال یہ اکتیس نیل دس کھرب ٹن کے قریب خرچ ہوتا ہے۔ اگر آئندہ بھی اس کے خرچ کا یہی اوسط رہا تب بھی اس کی مقدار چھ ہزار برس کے لئے کافی ہے۔ اس وقت اس سے جو کام لیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ یا تو اس کی حرارت سے کہربائی طاقت پیدا کرتے ہیں یا اسے جہازوں اور بخاری انجنوں میں استعمال کرتے ہیں، یا خاص حالات میں اس کو جلا کر اس سے گیس، بنزین، یا القطرہ اور دوسرے کیمیاوی مصنوعات تیار کی جاتی ہیں۔

کہربائی طاقت پیدا کرنے کے لئے ۱۹۲۰ء میں جو کوئلہ جلایا گیا تھا اس کا اوسط ایک گھوڑے کی طاقت

---

[1] اس کو Charcoal کہتے ہیں

[2] Lignite اس کی اصل لاطینی لفظ Lignum ہے بمعنی لکڑی ہے۔

کے برابر کے لئے چار رطل پڑا تھا، لیکن علم برابر ترقی کرتا رہتا ہے، چنانچہ ۱۹۲۵ء میں اسّی گھوڑے کے برابر کہربائی طاقت کے لئے کوئلہ کا اوسط محض ایک رطل پڑا، مگر یاد رہے کہ یہ ہمارے علم کی آخری حد نہیں، اور ممکن ہے کہ ہم مستقبل میں اس کے مقابلے میں بہت کم کوئلہ خرچ کر سکیں۔

کوئلہ سے گیس بھی نکالتے ہیں۔ ممالک متحدہ امریکہ میں کوئلہ سے گیس بنانے والے کارخانے تقریباً سالانہ پانچسو ارب فٹ مکعب گیس پیدا کرتے ہیں۔ آجکل عام طور پر کوئلہ کو کان سے نکالکر کارخانوں تک لیجاتے ہیں جو شہروں سے متصل تعمیر کئے جاتے ہیں۔ لیکن معقول طریقہ یہ ہے کہ گیس خود کانوں کے قریب ہی پیدا کی جائے اور پھر شہروں تک زمیں دوز نلکیوں (پایپ) کے ذریعہ لے جائی جائے۔ اس سے اولاً یہاں سے وہاں لے جانے کی زحمت سے نجات ملے گی، دوسرے بہت سی گیس کی لہریں جو کارخانوں میں بنتے ہی ضائع ہوکر شہر کی فضا میں منتشر ہوجاتی ہیں، برباد نہ ہونگی۔ چنانچہ جرمنی کے علاقہ رور میں اسی ترکیب سے کام ہو رہا ہے۔

کوئلہ کے استعمال کی بہترین ترکیب جس کا جدید رجحان جرمنی اور انگلینڈ میں ترقی پارہا ہے وہ یہ ہے کہ اسے نفت (مٹی کے تیل کی ایک قسم ہے) وغیرہ اقسام کی شکل میں تحویل کرلیا جائے۔ ان دونوں ملکوں میں اس کے کارخانے ہیں جہاں تقریباً ایک ٹن کوئلہ سے پانچ پیپے (Barrel) تیل (پٹرول) نکلتا ہے۔ جرمن علماء اور سائینس دانوں نے ایک اور ترکیب یہ نکالی ہے کہ وہ پہلے کوئلہ کی گیس سے مختلف قسم کے تیل پیدا کرلیتے ہیں اور اس کے بعد ان تیلوں کو بنزین (پٹرول کی قسم) کی شکل میں تبدیل کرکے اس کو موٹر وغیرہ میں استعمال کرتے ہیں۔ یہ دونوں طریقے بہت گراں ہیں، اور اگر حکومت ان کی امداد نہ کرتی تو یہ طریقے کبھی عملی صورت نہ اختیار کرسکتے۔

اگر ان میں سے ایک طریقہ بھی (یا دونوں) آسان ہوکر رواج پاجائیں اور تمام کوئلہ سے تیل تیار ہونے لگے اور ہر سال تیل کا خرچ دس یا پندرہ کھرب پیپے ہو تو بھی یہ ذخیرہ کا کوئلہ چھ بیس ہزار برس کے لئے کافی ہوگا۔

تیل[1]

تمام علماء اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہیڈرو کاربن مادے، خواہ وہ کوئلہ، نفت یا خلقی گیس کی صورت میں ہوں، زمین کے طبقات میں بہت کافی مقداروں میں موجود ہیں، اس لئے اس خیال کی غلطی ثابت ہوسکتی ہے کہ نفت (تیل) کی مقدار بہت ہی محدود اور جلد ختم ہوجانے والی ہے، بلکہ مذکورہ نقطۂ نظر سے نفت ہی کی مقدار زیادہ ہونی چاہیئے۔ جب ہم جغرافیائی لحاظ سے تیل پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ زمین کے

---

[1] ہم نے لفظ تیل انگریزی لفظ (Oil) کی مناسبت سے رکھا ہے کیونکہ یہ ایک عام لفظ ہے اور نفت وغیرہ تمام اقسام پر حاوی ہے۔

اکثر حصوں سے اسے حاصل کیا جاتا ہے۔ قطب شمالی کے قریب بھی یہ پایا گیا ہے، منطقۂ خطۂ استوا میں کولمبیا اور بورنیو کے جنگلوں میں اس کی پیداوار ہے، اور منطقۂ معتدلہ میں ممالک متحدہ امریکہ کے اندر اس کا عظیم الشان مخزن ہے۔ اس کے علاوہ جنوبی امریکہ میں پیرو کے اندر، اینڈیز پہاڑ کے ڈھالو مقامات میں بھی یہ پایا جاتا ہے جن کی بلندی تقریباً تیرہ ہزار فٹ ہے۔ بحرالکاہل کے سواحل میں کالیفورنیا سے کچھ ہٹ کر بھی اس کی کانیں ہیں۔ اسی طرح صحراؤں میں بھی یہ پیدا ہوتا ہے۔ وادیٔ سان یاکم میں اچھی خاصی مقدار میں نکلتا ہے۔ ان تمام پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تیل کی کافی مقدار زمین میں موجود ہے اس دعوے کا ثبوت اس واقعہ سے بھی ملتا ہے کہ یورانتنگا کو شہر ڈالومیٹ قسم کے پتھر کی زمین پر آباد ہے اس پتھر میں ہر میل مربع میں ساڑھے سات کروڑ پیپے تیل موجود رہتے ہیں۔ اس لحاظ سے پورے شہر کا رقبہ دو سو میل مربع ہے جس میں پندرہ کھرب پیپا تیل موجود ہونا چاہیئے۔ ۱۹۳۵ء میں یہاں چالیس حوض کھودے گئے تھے جن میں سے ساڑھے بارہ کروڑ پیپا تیل برآمد ہوا تھا، اس کے علاوہ دس ہزار کنوئیں بھی کھودے گئے تھے جن میں سے ستر سے تیل نکلا، چھ سے محض گیس اور بقیہ سے کچھ نہیں۔

تیل مصدر قوت کے لحاظ سے محض کوئلہ سے پیچھے ہے۔ اس کے برآمد کی سالانہ مقدار تقریباً پندرہ کھرب پیپا ہے۔ جس وقت یہ نکلتا ہے اُس وقت اپنی شکل و صورت میں صاف تیل سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ اس وقت یہ کچھ گاڑھا اور سیاہی مائل سفید اور قوس و قزح کی طرح مختلف رنگوں سے مرکب ہوتا ہے، اس کی بُو بھی مکروہ ہوتی ہے جس میں صندل، کافور اور مختلف قسم کی بُو شامل ہوتی ہے۔

جب سے تیل کی صنعت شروع ہوئی ہے اُس وقت سے اب تک صرف دو نیل بیس کھرب پیپے تیل نکالا گیا ہے۔ اگر اس مقدار کو کسی خاص مقام میں کھود کر رکھا جائے تو اس کا عمق ایک میل اور رقبہ ایک میل مربع ہوگا۔ علماء طبقات ارض (جیالوجی) کا خیال ہے کہ اگر ممالک متحدہ امریکہ میں انھیں وسائل سے جو ان دنوں مستعمل ہیں تیل نکالا جائے تو تقریباً ۱۳ کھرب پیپے تیل حاصل کیا جاسکتا ہے۔ جو ممالک متحدہ امریکہ کے لئے پندرہ برس کے واسطے کافی ہوگا۔ اس کے علاوہ وہاں کی سرزمین میں تین نیل اسّی کھرب سے لیکر گیارہ نیل تین کھرب پیپا تک تیل اور ہے، مگر اسے موجودہ مروّجہ ذرائع سے حاصل کرنا مشکل ہے۔ اگر یہ بھی مل جائے تو یہ ساری دنیا کے لئے اسّی سال کے واسطے کافی ہوگا۔

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ ہر سال زمین سے پندرہ کھرب پیپے تیل نکالا جاتا ہے جس میں سے اکثر بنزین (موٹروں) میں کام آتا ہے جن کی کل تعداد (مختلف ممالک ملا کر) ساڑھے تین کروڑ ہے۔ اس کے

علاوہ بنزین طیاروں میں استعمال ہوتی ہے۔ یہ تو محض بنزین کی کیفیت ہے، بہت ممکن ہے کہ ہم مستقبل میں اس کے اور دوسرے اقسام کو بھی کام کے لائق بنالیں۔

اس کے علاوہ علما و محققین ہر ممکن طریقہ سے تیل کی صنعت کے لئے اس امر کے کوشاں ہیں کہ تیل حاصل کرنے کے لئے کنوؤں کی کھدائی اس کی صفائی وغیرہ کے نئے طریقے ایجاد کریں یا پرانے طریقوں میں آسانیاں پیدا کریں تاکہ بحالتِ موجودہ جو تیل بیکار ضائع ہوتا ہے وہ محفوظ رہ سکے اب تک بہترین طریقہ وہ ہے جسے طریقۂ تجزیہ (Cracking) کہہ سکتے ہیں جس میں خام تیل کو جس میں بنزین نہیں ہوتا بنزین میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ اور اس کا دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ تیل جو بنزین نہیں بن سکتا بہت کافی مقدار میں صحیح و سالم بچ جاتا ہے۔ اگر یہ ترکیب آج رائج نہ ہوتی تو بنزین جس کی دنیا کو موٹروں اور ہوائی جہازوں کے لئے سخت ضرورت ہے۔ خام تیل سے بھی کم مقدار میں حاصل ہو سکتی جب سے تیل ایجاد ہوا ہے اس وقت سے ذریعۂ قوت کی حیثیت سے برابر کوئلہ کا مقابلہ کر رہا ہے جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں ممالک متحدہ امریکہ میں ۴۸ فیصدی مستعمل طاقت کوئلہ سے حاصل کی جاتی ہے اور ۲۲ فیصدی طاقت تیل کے ذریعہ۔

ابھی حال میں ایک اور طریقہ ایجاد ہوا ہے کہ تیل کے تجزیہ (Cracking) کے وقت جبکہ اسے بنزین میں تبدیل کرتے ہیں، ایک گیس خارج ہو کر فضا میں ضائع ہو جاتی ہے جس کا اندازہ تقریباً بیس کھرب فٹ مکعب ہے اگر اس گیس سے تیل بنایا جائے تو ایک خاص قسم کی بنزین تیار ہو گی جس کو ہیڈروجن سے درست کیا جائے تو اوکٹین (Octane) تیار ہو گی جس کے ذریعہ ہوائی جہاز فی گھنٹہ پانچ سو میل مسافت طے کر سکتے ہیں۔

پیدائشی گیس

پیدائشی گیس زمین سے خواہ کسی چیز کی ملاوٹ کے بغیر نکلتی ہے یا تیل وغیرہ کے ہمراہ۔ یہ طاقت پیدا کرنے کے لئے بڑی کارآمد چیز ہے کیونکہ یہ میتھین اور ایتھین مادّوں سے مرکب ہے جو خود ہائیڈروجن اجزا سے مرکب ہیں جو اپنی حرارت کی تیزی کی وجہ سے تولید حرارت کے لئے خاص طور پر استعمال ہوتے ہیں امریکہ میں آٹھ فیصدی طاقت گیس سے حاصل کی جاتی ہے۔ اس کے استعمال کی آسان ترکیب یہ ہے کہ اسے اپنے مخزن سے مطلوبہ مقامات تک نلکیوں کے ذریعہ لے جاتے ہیں۔ یہ نلکیاں زمین میں پھیلا دی جاتی ہیں۔ اس ترکیب سے اس کے ضائع ہونے کا خوف باقی نہیں رہتا۔ محققین کا خیال ہے کہ اگر گیس کے استعمال کی مناسب صورتیں نکل آئیں تو موجودہ لوگوں کے لئے جو اسے استعمال کرتے ہیں

خود امریکہ کی ٹکسس نامی ریاست میں وہتانڈل ہی کے اندر اتنی گیس ہے جو ایک سدی تک کافی ہوگی لیکن گیس کا استعمال ابھی بہت ہی نادر ہے۔ محض امریکہ میں کچھ استعمال ہوتی ہے۔ حالانکہ یہ اور دوسرے منطقوں کے اندر بہت مقدار میں موجود ہے۔ مثلاً ایرانی تیل کے منطقوں میں یہ گیس روزانہ لاکھوں کھا مکعب فٹ کے اندازہ سے ضائع ہوتی ہے اور یہ صرف اس لئے کہ ابھی وہاں اس کے استعمال و صنعت کے وسائل مہیا نہیں ہیں۔

پانی کی قوت

آبشار بھی طاقت حاصل کرنے کا قدیم ذریعہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ قدیم مصر میں بھی کسی نے پانی کے سمت میں ایک پہیہ لگاکر اس کی حرکت سے کام لیا تھا۔ یہ ترکیب برابر ترقی کرتی رہی اور حرارت سے تیل کے عہد میں اس کا بہت رواج ہوا۔ ہم اس مضمون کے شروع میں بتلا چکے ہیں کہ جب انسان نے حرارت کو اپنی خدمت کے لئے منتخب کیا تو پانی اور بخارات اور بھاپ کی اہمیت کم ہوگئی۔ لیکن پھر جب انسان نے آگے بڑھکر کہربا یعنی بجلی ایجاد کی اور اس نے اُسے دقتوں سے نجات دلائی تو پانی کو دوبارہ قدر و منزلت حاصل ہوئی۔ کہربا متعدد چیزوں کوئلہ، تیل اور پانی وغیرہ سے جن کا ذکر پہلے ہوچکا ہے پیدا کی جا سکتی ہے۔ ان تمام ذرائع میں پانی اگر موزوں اور مناسب جگہوں پر ہو تو اس کی طاقت سب سے افضل اور کم خرچ ہے۔

اس وقت امریکہ میں آٹھ فی صدی طاقت پانی سے حاصل کی جاتی ہے۔ وہاں چشموں سے ۱۲۷ ملین سنکھ گھوڑوں کی طاقت پیدا کی جاسکتی ہے۔ لیکن اس وقت صرف ۲۲ ملین سنکھ گھوڑوں کی طاقت حاصل کی جاتی ہے۔ اگر مفکرین کا یہ خیال کہ آئندہ طاقت کے تمام ذرائع و وسائل ختم ہوجائیں گے درست بھی مان لیا جائے تب بھی پانی کی طاقت ایک ایسی قوت ہے جو تا ابد ہمارے کام انجام دیتی رہے گی لیکن اس میں شک نہیں کہ اس میں مشکلیں بھی ہیں۔ عموماً آبشار اور چشمے صنعتی رقبوں سے بہت دور ہوتے ہیں عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ پانی سے کہربا محض ایک پہیہ یا اس کے بجائے کوئی دوسری چیز لگاکر پیدا کی جاسکتی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ پہلے تو چشموں کے پاس ہی خود بجلی پیدا کرنے کے لئے کارخانے تیار کرنا پڑتے ہیں جن میں کافی خرچ آتا ہے۔ پھر بجلی کو وہاں سے اس مقام تک لیجانا پڑتا ہے جہاں اس سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس ترکیب سے تار (سلک Wire) کا سلسلہ جتنا دور ہوگا اتنی ہی بجلی لیجانے میں ضائع ہوگی۔ اسی لئے گو پانی کی قوت سب سے سستی اور بہترین طاقت ہے

مثلاً بمبئی کے روئی کے کارخانے کہربا سے چلتے ہیں، جہاں بجلی ایک سلگی سلسلے کے ذریعہ پونا سے لائی جاتی ہے۔

مگر چشموں کے مقامات کے قریب میسر نہ ہونے کی وجہ سے یہ دوسری طاقتوں سے گراں اور قیمتی پڑتی ہے۔
پانی کی طاقت مد و جزر کے ذریعہ سے بھی پیدا کی جا سکتی ہے چنانچہ اس کی جانب انیسویں صدی
سے آج تک محققین مصروف تحقیق ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اگر مدّوجزر کے ذریعہ طاقت پیدا کرنے
کی کوئی سہل اور کم خرچ ترکیب معلوم ہو جائے تو اس سے بڑی کثیر مقدار میں طاقت حاصل کی جا سکتی ہے
اس زمانے میں اس کے لئے بہت سے نئے طریقے ایجاد ہوئے ہیں لیکن ان کے فوائد صرف فرانس، انگلینڈ
اور جرمنی کے بحری مقامات تک محدود ہیں، دوسرے اُن کے آلات بہت بیش قیمت ہوتے ہیں اور ان سے
اُن مقامات میں کام نہیں لیا جا سکتا ہے۔ جہاں مدّوجزر کثرت سے نہیں ہوتے۔ ممالک متحدہ امریکہ کی حکومت
نے اس کے لئے اکھتر لاکھ پونڈ کے صرف سے ریاست مَین کے ساحل پر مدوجزر سے دو سَو گھوڑوں کی
طاقت پیدا کرنے کے لئے کارخانہ قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ چلین میں نہر اسٹین ٹانگ
انگلستان میں سورن اور فرانس میں برٹیانی کے کناروں پر بھی ایسے کارخانے بنانے کی تجویزیں زیر غور ہیں
لیکن امریکہ کی کوشش کامیاب ہونے کی قوی اُمید کی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ موجودہ زمانہ کے محققین
نے ایک اور نئی ترکیب سوچ کر نکالی ہے جس کے ذریعہ سمندر کے پانی سے یہ طاقت حاصل ہو سکتی ہے
بعض ماہرین سائینس کی رائے میں اس کا مستقبل سب سے روشن ہے۔ اس کا ابتدائی خاکہ ۱۹۱۳ء
میں ایک امریکی محقق کمپل نے تیار کیا تھا۔ اس کو ترتیب اور وسعت فرانس کے کیمیادی کلاوڈ (Claude)
اور بوشروت (Bousherot) نے دی ہے۔ چونکہ یہ ترکیب پیچیدہ ہونے کے علاوہ ابھی تک دائرہ عمل
میں نہیں آئی ہے اس لئے اس کی تفصیل زیادہ دلچسپ نہ ہوگی۔

بہر حال ان حالات اور واقعات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ قدرت کے ذرائع اور دفینے کبھی ختم
نہ ہونگے۔ زمین اپنے اندر طاقت کے ایسے بہت سے ذرائع ایک کثیر مقدار میں چھپائے ہوئے ہے جن کے
استعمال کا درست طریقہ ہم کو ابھی تک معلوم نہیں ہوا۔ اگر مستقبل میں ہمارے علم نے ترقی کی اور ہم ان کے
استعمال کے لئے ترکیبیں معلوم کر لیں تو قدرت یقیناً بخل نہ کرے گی۔

جذباتِ منوّر

نیرنگ خیالات میں اُلجھائے ہوئے ہوں
میں اپنی طبیعت کو بہلائے ہوئے ہوں

دیتا ہوں نسیم سحری کو بھی طراوت
پھولوں کے دماغوں کو بھی مہکائے ہوئے ہوں

روٹھی ہوئی تقدیر نہ روٹھے اور زیادہ
میں تجھ کو منانے کی قسم کھائے ہوئے ہوں

دنیا کی ہر اک شے ہے صلہ میری طلب کا
یہ ہاتھ کہاں آج میں پھیلائے ہوئے ہوں

اِرادۂ تخلیقِ انسان

(حضرت جوشؔ ملیح آبادی)

آج کل شاعرِ اعظم جوشؔ ملیح آبادی "حرفِ آخر" نامی ایک اہم تصنیف میں مصروف ہیں۔ بلندیِ تخیل کے لحاظ سے یہ تصنیف ملٹن وغیرہ کی تصانیف کے ہم پلّہ ہوگی۔ گو اعتقادی حیثیت سے اس کے بعض مقامات میں اختلافِ رائے کو کافی گنجایش ہے لیکن شاعرانہ اعتبار اور ادبی نقطۂ خیال سے یہ تصنیف اُردو شاعری کے لئے نخرو مباہات کا باعث ہوگی۔ ذیل میں ہم تخلیقِ انسان کے متعلق حضرت جوشؔ کا تخیل پیش کرتے ہیں۔ حضرت جوشؔ نے اس معرکۃ الآرا نظم میں دنیا کی پیدایش اور انسان کی تخلیق سے لیکر نیکی بدی اور موجودہ زمانہ کے تمام مسائل کو سمیٹ لیا ہے۔ آپ کی فکرِ رسا نے اِن حقیقتوں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے جہاں انسان کے طائرِ خیال کی پہونچ مشکل ہے۔ ذیل میں اسی شاہکار کا ایک مکمل ٹکڑا ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے

کرۂ زمین وجود میں آچکا ہے مگر ابھی تک وہ غیر آباد ہے؛ اور انسان کی تخلیق نہیں ہوئی۔ ہے چنانچہ بخیالِ جوشؔ خدا اِس ویران کرہ کو دیکھکر یہ سوچ رہا ہے کہ اس دنیا کی آرایش و زیبایش کے لئے اُسے کس قسم کا مخلوق پیدا کرنا چاہیئے۔ غور و فکر کے بعد بقولِ شاعرِ اعظم خدا ارشاد فرماتا ہے:۔

ہاں مَیں بخشوں گا اِسے اِنسان سے تابندگی — کون انساں؟ نازِ مخلوقات و فخرِ زندگی

کون انساں! فاتحِ کونین، امیرِ آب و گِل — سینۂ آفاق کا لرزندہ و بیدار دل

نورِ گیتی، مشعلِ افلاک، شمعِ انجمن — اِک مجسّم کھلکھلاہٹ، اِک سراپا بانکپن

ناصرِ اوجِ نگاراں، ناظمِ ابر و چمن — ناظرِ موجِ بہاراں، ناقدِ سرو و سمن

مدعائے آسمان و مقصدِ روئے زمیں — مرکزِ آزادِ عالم، محورِ دُنیا و دیں

شارحِ آیاتِ ہستی، شارعِ دینِ حیات — قاضیِ شہرِ صفات و کاتبِ دیوانِ ذات

مکتبِ نور و حرارت، درس گاہِ خیر و شر — صاحبِ نار و برودت، راکبِ شمس و قمر

دوربینِ خشک و تر، معیارِ نقدِ حُسن و ذم — خوردبینِ آب و گِل، میزانِ جنسِ کیف و کم

شاہِ گیتی، صاحبِ آفاق، دارائے حیات — ابرِ رحمت، وارثِ فطرت، رئیسِ کائنات
اِک زمیں پرورمحقق، اِک فلک پیما حکیم — ایک مقیاسِ تحمّل، اِک رصدگاہِ عظیم
آسماں کا داور و دارا، زمیں کا دادخواہ — بَر کا آقا، بحر کا مولا، فضا کا بادشاہ
دہر کی پیدا و پنہاں طاقتوں کا شہریار — تیرگی کا کارفرما، نور کا پروردگار
طرفہ بازی گاہِ موجودات کا اسرار باز — اوج کا نبّاض، پستی کا طبیب و چارہ ساز
برق پیما ابلقِ شام و سحر کا شہسوار — جنبشوں کا میرِ لشکر، گردشوں کا تاجدار
عرصۂ تابش کی ننو، رفتار فوجوں کا نشاں — بحرِ ظلمت کی سُبک روکشتیوں کا بادباں
روشنی کا نغمہ، فطرت کا سخن، حق کا پیام — مہر و مہ کا مقتدا، سرکش عناصر کا امام
عالمِ اسباب کی محرابِ اعظم کا چراغ — پیکرِ ارض و سما کے کاسۂ سر کا دماغ
چشمِ ہستی کی بصارت، زندگی کا رازداں — خامشی کا زمزمہ، گونگے حقائق کی زباں

خونِ گل دوڑائے گا جوانِ خس و خاشاک میں
نفخ کردوں گا خود اپنی روح جس کی خاک میں

غزل

(منشی جگناتھ آزاد بی۔ اے۔ ایل۔ ٹی، خلف جناب تروم)

پست و بلند کا یہ تفاوت مٹائے جا — اے سیلِ روزگار! بہے جا بہائے جا!
بیخود ہوں لالہ زار فضائیں ہوں مست مست — اے ساقیِ بہار! پیئے جا پلائے جا!
ہاں ٹوٹنے نہ پائے طلسمِ ازل کبھی — نظروں پہ صبح و شام کے پردے گرائے جا!
صحنِ چمن میں لولوئے لالہ بکھیر دے — اے منعمِ قدیم! خزانے لٹائے جا!
پھولوں کو بھی ہو اپنی حقیقت کی کچھ خبر — اے جانِ نوبہار! ذرا مسکرائے جا!

نیرنگ حسن[1]

(یا)

نایکا بھید

(از مسٹر سلیم جعفر)

باب چہارم

اب تک جن جن مے نوشانِ عشرت کوش کا ذکر کیا ہے اُن میں سے ہر ایک کی ادھیم، مدھیم اور اُتم تین قسمیں ہیں لیکن مدارِ تقسیم واقعات و حالات ہیں مثلاً رشک و رقابت و غرور۔

(۱) اَنّیِ سُرتِ دُکھِتا (अन्य सुरति दुखिता) شکارِ رشک۔ غیر کے جسم پر علامات عشرت کوشی دیکھکر نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ پریتم کی بزم ناز میں بادۂ عشرت سے سرشار رہی ہے۔

याही को पठाई बडो काम करि आई बड़ी तेरिये बड़ाई लखये लोचन लजीले सों। साची क्यों न कहै कछु मोको किधों आप ही को पाई बकसीस ल्याई बसन छबीले सों॥ कवि मतिराम मोसों कहत सन्देसोऊ न मेरे नखसिख अंग छरख कटीले सों। तू तो है रसीली रस बातन बनाय जाने मेरे जान आई रस राखि के रसीले सों॥

"اسی سے بھیجا تھا بڑا کام کر آئیں یہ تو آپ کی شرمیلی نگاہیں ہی کہہ رہی ہیں، سچ سچ کہئیے کچھ انعام مل گیا؟ کچھ منہ سے تو بولیئے، میرے پیام کا کیا جواب ہے؟ جسم کی پور پور پھڑک کر بتا رہی ہے کہ ان میں کٹیلے کی ادائیں بھری ہیں۔ آپ تو بڑی مزہ دار ہیں مزہ مزہ کی باتیں بنا کر مزے اُڑا کر آئی ہیں۔"

(۲) مانِنی (मानिनी) بتِ طنّاز۔ رشک و حسد باعثِ ناراضگی و کشاکش سے سکھی سمجھاتی ہے۔

रूस बनमाली सो बसंत में न आली, काकपाली पुनि सुनि कोऊ धीर ना धरत है। पुन्नी लाल कहे त्यों पलासन की लाली लखि, बिलखित बियोगिन के जियरा डरत हैं॥ मौर वारे मंजुल रसालन पै धारि धारि, भौर भौर भौरन के गुंज गुंजरत हैं। मदन गुरू के मनो चेला चहुं ओरन तें, मान के उचाटन मंत्र उचरत हैं॥

بسنت میں بھی کوئی پریتم سے روٹھتا ہے؟ کون ہے جو کوئل کی کوک کی تاب لا سکے؟ ڈھاک کے لال لال پھولوں کو دیکھکر بیچاری برہنیں کلیجہ تھام تھام لیتے ہیں۔ خوبصورت آموں کے بور پر بھنورے قطاریں باندھ باندھکر گرد و گونج رہے ہیں۔

---

[1] اس سلسلے کے پہلے مضامین زمانہ فروری اور مارچ ۱۹۳۲ء میں نذر ناظرین ہو چکے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے عشق کے دیوتا کے چیلے ناز و غرور دور کرنے کیلئے منتر پڑھ رہے ہیں"۔

(۳) (ا) پریم گروتا (प्रेम गर्विता) مست محبت۔ یا پریم کے نشہ میں چور

मनरंजन अंजन के नैन में अंगराग रचे रति रगन में। ग्रह के सिगरे नित काज करें गुरु लोगन के सत संगन में॥ कहिये कहि कौन सों कौन सुने सुपरे बने प्रेम प्रसंगन में। धनि ये धन है तिन के लहने पहरे गहने नित अंगन में॥

آنکھوں میں دل فریب سرمہ لگا ہے، جسم پر خوشبوئیں ملی ہوئی ہیں، گھر کے سارے کام بڑی بوڑھیوں کے ساتھ ساتھ کر رہی اور کہتی ہے کسی سے کوئی گلہ شکوہ نہیں، سنتا ہی کون ہے، محبت میں جو کچھ پڑے جھیلنا ہی ہوتا ہے، خوشنا بخت ان کا جو ہر وقت زیور سے آراستہ و پیراستہ رہتی ہیں"۔

(ب) رُوپ گروتا (रूप गर्विता) مغرور حسن، ذرا اس حیرت کی داد دیجئے:-

नेक जो हंसों तो लाल माल होत हीरन को, नेक जो मुरों तो मेरी नील मनि झलकी। अंजुरी भरी है मुख धोयबे को झारी लैके, सखिन निहारी छवि राती होत जल की॥ जो मैं रचों चीर तो कुचील जुरे, जोबन देखिवे को आरबे गुनधर हू की ललकी। आंगन कढ़ों तो भौंरे भरिन अंधेरी होत, पाय जो धरें तो माहि होत मखमल की॥

ذرا بھی ہنستی ہوں تو ہیروں کا ہار لال ہو جاتا ہے، ذرا بھی جھکتی ہوں تو نیلم کا نگ جگمگانے لگتا ہے، میں نے منھ دھونے کو لوٹے سے ہاتھ میں پانی لیا تو سکھیاں دیکھکر بولیں کہ اس کا رنگ لال ہو گیا۔ دو پٹہ اوڑھتی ہوں تو وہ میلا کچیلا معلوم ہوتا ہے! میرے حسن کے نظارہ کیلئے گُن ھو کی آنکھیں بھی بیتاب ہیں۔ صحن میں نکلتی ہوں تو بھونرے آ آ کر جمع ہو جاتے ہیں اندھیرا ہو جاتا ہے! زمین پر قدم رکھتی ہوں تو سُرخ مخمل سی ہو جاتی ہے۔

باب پنجم

حالات و واقعات کے تنوع کی انتہا نہیں اس لئے تقسیم محض انھیں اسباب پر کیوں کر ختم ہو سکتی تھی جن کا باب چہارم میں ذکر کیا گیا ہے۔ دیگر اُمور کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری تھا اور رکھا گیا۔ یہ باب دس کیفیتوں کا آئینہ دار ہے۔

(ا) پرُوشِت پتکا (प्रोषित पतिका) بیتاب ہجر۔ پیتم پردیس میں ہیں۔ اُن کا خیال بےچین کر رہا ہے۔

(ا) مُگدّھا پرُوشِت پتکا (मुग्धा प्रोषित पतिका) نو خیز بیتاب ہجر۔

ؔ جو اصطلاحیں کہیں پہلے بیان کی جا چکی ہیں وہ دہرائی نہ جائیں گی۔ مثلاً مگدھا کی تعریف کی جا چکی ہے پروشت پتکا کی تعریف بیان کی گئی۔ اس لئے اب مگدھا پروشت پتکا کی تعریف بیان نہ کی جائیگی، ناظرین خود سمجھ سکتے ہیں۔

मांग सिख नौ दिन को ज्योते गे गुबिन्द, निय सौ दिन समान दिन मान अकुलावे है। कहै पद्माकर छपाकर छपाकर ते, बदन छपा कर मलीन मुरझावे है। बूझत जू कोऊ कै कहारी भयो तोहि तो अपरही को औरे कछु बेदन बतावे है। आंसू सके मोच ना सकोच बस आलिन में उलही बिरहबेल दुलही दुरावे है ॥

پیتم تو دن کی اجازت لے کر گئے تھے لیکن وہ تو ایک ایک گھڑی کو سو سو دن سمجھ کر بے چین ہو رہی ہے ماہ رُخ کے رُخ ماہ کی تابانی مدھم پڑ جاتی ہے۔ کوئی پوچھتا ہے کہ کیا ہوا تو باعث تکلیف کچھ کا کچھ بتا دیتی ہے۔ آنسو روکے نہیں رُکتے لیکن سکھیوں کے سامنے شرمندہ ہونے کے ڈر سے آہ و فغاں کا گلا سینہ ہی میں گھونٹ دیتی ہے:

(ب) مَدھیا پرُوشِت پتِکا (मध्या प्रोषित पतिका)

जा दिन तें पीतम विदेस को गमन कीनो, ता दिन तें ललना अनंद सों दूरी रहे। अहमद कहै मिस हेर हेर चहुं ओर, आंगुरीन ढाल पर गनत घरी रहे ॥ सोचत सकोचन तें बतियां दुरावती है, मोगन चलि प्रान औधिक परी रहे। इन्दुमुखी अंभा लागी सुरत अचंभा लागी, कंचन के खंभा लागी रंभासी खरी रहे ॥

جس دن سے پیتم پردیس گئے رنج سے افسردہ خاطر رہتی ہے کسی نہ کسی بہانہ سے چاروں طرف دیکھا کرتی ہے، گھڑیاں گنتے گنتے انگلیوں میں چھالے پڑ گئے ہیں، فکرمند رہتی ہے مگر راز چھپاتی ہے، جان نکلی جا رہی ہے بیہوش پڑی رہتی ہے، ماہ جبیں سُست پڑنے لگی، ہوش رخصت ہونے لگے سونے کے کھمبے سے اس طرح لگی کھڑی رہتی ہے گویا کیلے کا درخت ہے۔

(ج) پرَوڑھا پرُوشِت پتِکا (प्रौढ़ा प्रोषित पतिका) سکھی کہتی ہے کہ:-

पिय साखि दै चैत के चन्दहि जीत्यो, तहां मैं लगी अति नेरे रही। पुनि सेवक सों करि सेवक सारदी हारदी मोको उजेरे रही ॥ तन बूझ्यो अबे श्रम पानिप सों पुलकावलि हू को नेरे रही। बलि द्वैज के कौन ले जीतले काज, उए अथचे लगि हेरे रही ॥

تجھے معلوم ہے کہ تو نے پیت تک یہ کہہ کر دل کو تسلی دی کہ وہ آئیں گے۔ بعد کو سردیوں کا زمانہ بھی اسی خیال میں گزار دیا۔ آنے والے ہیں۔ تکلیف پھر سے پسینے آ گئے اور خیال یار نے جسم میں جھرجھریاں پیدا کیں مگر تم نے سب کو دبا یا اور چھپایا۔ لیکن میں قربان۔ یہ تو بتاؤ کہ دوج کے چاند کو جو تم طلوع سے غروب تک دیکھتی رہیں یہ کیوں؟

سکھی جتانا چاہتی ہے کہ صدمۂ ہجر کو چھپانے کی جو کوششیں تم نے کیں انھوں نے ایک حد تک پردہ داری کی۔ لیکن آخر راز چھپائے نہ چھپ سکا کیونکہ دوسری تاریخ کا چاند دیکھکر تمھیں پسینہ آگیا اس نے راز فاش کر دیا تم اس چاند کو طلوع سے غروب تک اس خیال سے دیکھتی رہیں کہ پتیم بھی اسے دیکھتے ہوں گے اور یوں دونوں کی آنکھیں مل کر شوق دید تسلی یاب ہو۔

(د) پَرکِیا پَروشِت پَتِکا (परकीया प्रोषित पतिका)

जाके लिये डार दई भार मांझ कुल कान तन मन धाम धन प्रानहू न्योछावरे की। जासु मुख देखे बिन पल हू परयो ना कल भूल गई सुध बुध भई गति बावरे की॥ छायगो दुरन्त वह कन्त, बिजयानन्द जू, हाय निबही ना दई, ओछी प्रीति पावरे की। ताप तन ताई लिखि लाखहू पठाई पाती पाखहू बिताई पैन आई सुधि सांवरे की॥

جس کے لئے خاندان کی عزت بھاڑ میں ڈال دی جس پر تن من دھن گھر بار یہاں تک کہ جان قربان کر دی جس کی صورت دیکھے بغیر ایک پل چین نہ پڑتا تھا، ہوش و حواس بجا نہ رہتے تھے پاگلوں کی سی حالت ہو جاتی تھی! ہائے! وہ دور دراز ملکوں میں جا بسا۔ واقعی اوچھے سے پریت نباہنا دشوار ہے لاکھوں خطوں میں لکھکر بھجوایا کہ تپ ہجر کام تمام کئے دیتا ہے مدت انتظار ختم ہو چکی، لیکن اس کا پتہ نہ لگا۔

(ہ) گنکا پَروشِت پَتِکا (गनिका प्रोषित पतिका)

मन मोहन मेरे गये जब तें तब तें ना कहू कल पावनी है। हम कासों कहें दिल की बतियां छतियां वही हौल पै तावनी है॥ सु दमोदर जू निसबासर ही उनहीं के सु ध्यान में ध्यावनी है। धन देवे धनी घनो आवें जबै काऊ भांति बसंत बितावनी है॥

جب سے من موہن گئے ایک گھڑی چین نصیب نہ ہوا، دل کی بات کس سے کہوں، انھیں کے ہجر میں سینہ میں آگ لگی ہے۔ رات دن انھیں کا خیال رہتا ہے۔ جب آئیں گے مجھے مالا مال کر دیں گے کسی نہ کسی طرح موسم بسنت تو پورا ہی کرنا ہے۔

(۲) کھنڈِتا (खण्डिता) پتیم کے جسم پر علامات عشرت کو شی دیکھکر افسردہ خاطر ہوتی ہے

(۱) مُگدھا کھنڈِتا (मुग्धा खण्डिता)

मरकत भाजन सलिलगत इन्दुकला के वेष।
झीन वसन में झलमले श्याम गात नखरेख॥

"جیسے نیلم کا برتن پانی میں پڑا ہو اور اس میں چاند کا عکس پڑ رہا ہو۔ اسی طرح پتلے جامہ میں سے شیام کے جسم پر جو ناخن کی خراش ہے، چمک رہی ہے۔"

(ب) مَدھیا کھنڈتا (मध्या खण्डिता)

ख्याल मन भास कहूं करि के गोपाल घरे आए अति आलस भरेई बरे तरके। कहै पद्माकर निहारि गजगामिनी के गजमुकतान के हिये पै हार दरके॥ एते पै न आनन ह्वै निकरे बधू के बैन अधर उराहने सु दीवे काज फरके। कंधन तें कंचुकी भुजान तें सु बाजूबंद पोंचनतें कंकन हरेई हरे सरके॥

پتیم صبح اندھیرے ہی محبوبہ کے خیال سے بہت ہی تھکے ماندے گھر آئے۔ سینہ پر کسی ہاتھی کی سی مستانہ چال والی کے ہار کے ٹوٹے ہوئے بڑے بڑے موتی چپکے دیکھکر منھ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا ہونٹ ہی ہل کر رہ گئے کندھوں پر سے سینہ بند، بازوؤں پر سے بازوبند اور کلائیوں پر سے کنگن آہستہ آہستہ سرک گئے۔

(ج) پَروڑھا کھنڈتا (प्रौढ़ा खण्डिता)

द्वारिका छाप लगै भुजमूल कह्यो फल बेद पुरानन तौन है। कागद ऊपर छाप सुनी जेहि को सिगरे जग जाहिर गौन है॥ आप लगाई जो कुंकुम की सो सोहाई लगै छबि सों उर यौन है। छाती की छाप को प्यारे पिया कहिये बलि या को महातम कौन है॥

دوارکاجی میں شانہ پر مہر لگائی جاتی ہے۔ اس کے ثواب کا ذکر ویدوں اور پرانوں میں آیا ہے۔ کاغذات پر مہر لگائی جاتی ہے اُس کا فائدہ ظاہر ہے اپنے آپ پیشانی پر لال رنگ کا ٹیکا لگایا جاتا ہے اُس سے دل خوش ہوتا اور گھر میں رونق بڑھتی ہے لیکن آپ کے سینہ پر جو مہر لگی ہے، پیارے پیا قربان گئی، بتائیے اسکا کیا فائدہ یا ثواب ہے؟

(د) پَرکیّا کھنڈتا (परकीया खण्डिता)

आए कहूं रति मानि के मोहन मोहिनी देख भई मनहीनी। सुन्दर दोस तुम्हें न कछू विधि मेरे लिलार में यों लिखि दीनी॥ बैर करयो सिगरे जग सों तुम सों हित सो तुमहू यह कीनी। सुन्दरि यों इतनी कहिके भरि सांस लया अँखियां भर लीनी

پتیم کہیں سے لب عشرت کوٹھی آئے ہیں، دیکھتے ہی افسردگی چھا گئی۔ کہنے لگی "پیارے تمہارا کوئی قصور نہیں، خدا نے میری قسمت ہی میں یہ لکھدیا ہے، دنیا بھر سے بیر کرکے تمہیں چاہا اور تم نے یہ کیا۔" اتنا کہہ کر ٹھنڈی سانس لی اور آنسو اُمنڈ آئے۔

(ہ) گَنِکا کھنڈتا (गनिका खण्डिता)

अंत की प्रीति करी सो करी अब आन परी तुम्हें औरन की टब।

लालन सखियें लालन हार करी जिहि प्यार भरो करदे सब ॥ को दिन काज करे बकवाद सुनी हती आज लई लखि वा छब। आज ते राज करो बलि जाउं सु काज कहा हमसों तुमसों अब ॥

گزشتہ محبت کا ذکر ہی کیا، تمھیں تو چسکا ہی کچھ اور لگ گیا ہے۔ اپنا للوں کا پیار آپ ہی رکھیے، جسے پیار کرتے ہیں لیجا کر اس کو دیجیے، خواہ مخواہ کون بک بک کرے، جو کانوں سنا تھا آنکھوں دیکھ لیا۔ قربان جائیے آج سے لطف اٹھائیے۔ اب تم کو مجھ سے اور مجھ کو تم سے کوئی واسطہ نہیں۔

(۳) کَلَہا نتریتا (कलहांतरिता) زود پشیمان پیتم کو ذلیل کرکے پشیمان ہوتی ہے۔

(۱) مُگدھا کلہانتریتا (मुग्धा कलहांतरिता) پشیمان ناز

लखि लाल लजाय रही ललना कहि सुन्दर बैठि अलीगन में। हरि हार बुलाय न बोली जबै तब वेऊ गए उठि के बन में ॥ करते इतनी तो करी पहिले पुनि कैसी तची है तिया तन में। कहि कैन सके सखिहू सों कछू पछताति महा मनहीं मन में ॥

پیتم کو دیکھ مارے شرم کے سکھیوں میں جا بیٹھی۔ وہ بُلا بُلا کر تھک گئے مگر آئی۔ انھیں بھی غصہ آ گیا بارکر چل دیئے۔ کرنے کو تو اتنا کر گئی لیکن پھر کیسی کیسی بے قرار ہوئی ہے۔ سکھیوں سے کچھ نہیں کہہ سکتی دل ہی دل میں [illegible] تی ہے۔

(ب) مَدھیا کلہانتریتا (मध्या कलहांतरिता)

झालरनदार झुकि झूमन बितान बिछे गद्दब गलीचा और गुलगुली गिलमें। जगर मगर पदमाकर सु दीपन की फैली जगा जोति केलि मंदिर अखिल में ॥ आवत तहांई मनमोहन के लाज मेरे जैसी कछु करी तैसी दिल ही की दिल में ॥ हेर हरी बिलमें न लीनो हिलमिल मैं रही हों हाय मिल मैं प्रभा की झिलमिल में ॥

جھالروں دار شامیانے جن میں گُنت عالیچے اور نرم نرم بستر بچھے ہوئے تھے جھکے پڑتے تھے۔ سارے شبستان عشرت میں عالم چراغاں تھا۔ من موہن کے وہاں آتے ہی میں دل ہی دل میں شرمائی وہ دیکھکر ٹھٹک گئے میں کیوں نہ اُن کے گلے لگ گئی۔ افسوس بیقراری میرا دل مسوسے دیتی ہے۔

(ج) پروڑھا کلہانتریتا (प्रौढ़ा कलहांतरिता)

नयना मनि रे रसना निजगुन लीन। कर नू पिया झकझोर अनगुन कीन ॥

"نینا" (آنکھ) کے تو معنی ہی ہیں "مت رہنا" اور "رسنا" (زبان۔ بے مزہ) تو اپنے وصف ذاتی میں ڈوبی ہے لیکن اے "کر" (ہاتھ۔ کرنا کا صیغۂ امر) تو نے محبوب کو دھتکار دیا، بڑا تعجب ہے۔ یعنی آنکھ اور زبان نے

اگر یتیم سے بے رخی کا برتاؤ کیا تو مضائقہ نہیں کیونکہ اس قسم کا برتاؤ اُن کی سرشت میں داخل ہے لیکن ماتھ کا کام تو نیص ہو پہنچانا یا ایسا ہی فعل کرنا ہے حیرت ہے کہ اُس نے پیا کو بلانے کے بجائے اُن کو چلے جانے کا اشارہ کیا۔ یہاں شاعر نے صنعت ادماج یا ذوالمعنیین سے کام لے کر کلام میں خوبی پیدا کی ہے۔

(د) پَرکیّا کَلَھا نترِتا (परकीया कलहांतरिता)

नित द्रान्या अद्रान जेठानिन सौं पुनि सासु की केती रिसाई सहौ। नून तुल गनी सब सौतिन को ननदी को अदीन है दाह दही॥ इतनी किया जाके लिये हमसुन्दर ताहे सौं आज हीं रूसि रही। सखि सोचति हौं तब तें चित में बिधि की गति जाति कछू न कही॥

جیٹھانی سے ہر وقت کی لڑائی رہی ساس کا غصہ کیسا کیسا سہا سب سوتوں کو تنکے کے برابر سمجھا۔ نند کی نافرمانی کرکے اُسے بیچ دیا جس کے لئے یہ کچھ کیا آج میں اُسی سے روٹھ گئی! اے سکھی اُسی وقت سے سوچ رہی ہوں کہ خدا کے بھی کیا کیا کارخانے ہیں۔

(ہ) گنکا کَلَھا نترِتا (गनिका कलहांतरिता)

कै पटुता परवीन तिया मनुहारि के बोल कहै मनमाने लै बहु रंगन अंगन में अंगराग लगाय सुगन्धन साने॥ बङ्क लखे भृकुटीन के भायन सुधे सुभायन सो रस साने। ही हठि कै दृग दै कजरा कर फूल हरा गजरा नजराने॥

اس ہوشیار کی ہوشیاری دیکھیے، منا جاتی کرتی ہے گر جو جی میں آتا ہے کہتی ہے جسم کو طرح طرح کی خوشبوؤں سے معطر کیا ہے ترچھی نظروں سے دیکھتی ہے مگر شائستہ برتاؤ سے آتش محبت تیز کرتی ہے۔ دل میں ضد کی ٹھان کر آنکھوں میں کاجل لگا کر ہاتھ میں پھولوں کے گجرے لیا پسند کرتی ہے۔

(۴) وِپْرلَبْدھا (बिप्रलबधा) مایوس وصال۔ یہ وہ معشوق ہے جو میکدہ کو خالی دیکھکر بے چین ہو جاتا ہے۔

(ا) مُگدھا وِپْرلَبْدھا (मुगधा विप्रलबधा)

केल के बागीचा तें अकेली अकुलाय आई नागर नवेली बेली देखत ठहर परी। कुंज के अवास जहां गुंजरत भौंर पुंज सीतल समीर सीरे नीर की नहर परी॥ देव तिहि काल गुंदि ल्याई माल मालिन यों देखत बिरह विष ब्याल की लहर परी। छोह भरी छरी सी छबीली छिति मांह फूल छरी सी छुवत फूलछरी सि छहर परी॥

جس باغیچہ میں رنگ رلیاں منائی جاتی تھیں نو خیز اُس میں سے تنہا بے قرار ہو کر نکلی۔ اُسے خالی دیکھکر کانپ

اُٹھی درختوں کے کنج میں جہاں ملاقاتیں ہوتی تھیں وہاں بھونرے گونج رہے ہیں، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں اور ٹھنڈے پانی کی نہر جاری ہے۔ ایسے میں مالن نے گوندھ کر ایک ہار نذر کیا۔ دیکھتے ہی افعیٔ ہجر کے زہریلی موج رگ رگ میں دوڑ گئی۔ دبلی پتلی نازنین، پھول کی چھڑی چھوتے ہی پھول کی چھڑی کی طرح بکھر گئی یعنی اپنی بیتابی نہ چھپا سکی۔

(ب) مدھیا وپرلبدھا (मध्या विप्रलब्धा)

धारा धहराति बिज्जु छटा छहराति उठि आई है हरबराति ऐसे मेघझर में। काम की चपेटें लिये लाज की लपेटें तहां हरि सों न भेंट भई कुंज केलि द्वार में॥ जकी सी रही है नकि सुन्दर सची सम है कानों ना परसि गई बूड़ि सोच सर में। आधे आधे आखिन सों देखति सहेलिन तन आधी बात आनन में आधिक अधर में॥

گھٹائیں گھر گھر آتی تھیں، بجلی چمک رہی تھی، پانی برس رہا تھا۔ ایسے سماں میں باوجود کشاکش شرم و عشق ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی مگر محبوب مقام معینہ پر نہ ملا۔ حیران، پریشان، عالم سراسیمگی میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی اور کسی خیال میں ڈوب گئی۔ نظر بچا بچا کر سکھیوں کی طرف دیکھتی ہے، آدھی بات منہ میں اور آدھی ہونٹوں میں رہ جاتی ہے۔

(ج) پروڑھا وپرلبدھا प्रौढ़ा विप्रलब्धा

उन्नत उरोज अबला की सेत कंचुकी है राखी ना कछुक चित चोप अंगरेजे में। झलमल सारी सजी मोतिन किनारीदार झिलमिली जोति होति चांदनी अमेजे में॥ बिहंस बदन बिमला सी सो अटा पै गई परसे ना अबीन अंगि पिय सुख सेजे में। जरद भई है वह दरद तनावै कौन सारद मयंक मारी करद करेजे में॥

بلند پستان نازنین کا سینہ بند سفید ہے کیونکہ رنگین کپڑے پسند نہیں ہیں۔ ململ کی ساری جس میں موتیوں کی کناری لگی ہوئی ہے زیب تن ہے۔ اس کی جگمگاہٹ چاندنی سے مل جاتی ہے۔ اس انداز سے مسکراتی ہوئی اٹاری پر پہونچی مگر وہاں سیج میں پیا کو نہ پایا، فوراً ہی رنگ زرد ہو گیا۔ اس کا باعث اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ موسم سرما کے ماہتاب نے کلیجہ میں کٹاری ماری۔

(د) پرکیّا وپرلبدھا परकीया विप्रलब्धा

चन्द दुति मन्द भई फन्द में परी हों आनि ननद करैगी मोर छाड़ गलबान दै। सासु सतैहै जेठ पतिनी रिसैहै ... नचन सुनैहै

कहों जोर जुग मान दै ॥ सौ लों बिनती है गिनाती है कै हहा लों देव करो चाहति रहन कुल कान दै । दान दै री जिय को नदान निरदई कान्ह बसी सब रैन मोहि अब घर जान दै ॥

چاند کی روشنی مدھم پڑنے لگی اور میں پھندے میں پڑی ہوں۔ نند اگر شور مچاوے گی سگے سے باہر نکالو۔ ساس بگڑے گی جٹھانی اینڈی بینڈی سنائیگی خفا ہوگی۔ ہاتھ جوڑتی ہوں جانے دو۔ خوشامد کرتی ہوں کیا کروں جانے کو جی نہیں چاہتا خاندان کی عزت پر لات مار کر بیٹھنا چاہتی ہوں۔ اے نادان ظالم میری جان مجھے خیرات میں دے ساری رات تیرے پاس رہی ہوں اب گھر جانے دے۔

(۴) گنکا وپرلبدھا (गनिका विप्रलब्धा)

निसि अंधियारी तऊ प्यारी परबीन चढ़ि मान के मनोरथ के रथ पै चली गई । कहै पदमाकर तहां न मनमोहन सों भेंट भई सटकि सहेट तें अली गई ॥ चन्दन सों चांदनी सों चन्द सों चंमेली सों और बन बेलिन के दलन दली गई । आई हुती छैल को छले को छल छन्दन सों छैल तो छल्यो न आप छैल सों छली गई

اندھیری رات تھی مگر مال کے لالچ میں چل کھڑی ہوئی۔ میکدہ میں پیا نہ ملے وہاں سے چل دی۔ چندن چاندنی چاند چمیلی اور جنگل کی بیلیں دیکھکر دل بیٹھ گیا۔ آئی تو اس لئے تھی کہ چھیل کو اپنے پھندوں سے پھنسے گی مگر تو چھیل نہ سکی آپ ہی چھیل کے چھل میں آگئی۔

(۵) اُت کنٹھتا (उत्कण्ठिता) متاسف یا متفکر مقام ملاقات پر پریتم نہیں آیا تاسف و تفکر ہے۔

(۱) مُگدھا اُتکنٹھتا (मुग्धा उत्कण्ठिता)

खरी दुपहरी भरी हरी हरी कुंज मंजु देव अलि पुंजन के गुंज हियो हरि जात । सीरे नद नीरन गंभीरन समीर छांह सोवे परे पथिक पुकारे कीर करि जात ॥ ऐसे में किसोरी भोरी गोरी कुंभिलाने मुख पंकज से पाय धरा धीरज में धरि जात । सोहै घनस्याम मग हेरति हथेरी ओट ऊंच धाम बाम चढ़ि आवति उतरि जात ॥

ٹھیک دوپہر ہے ہرے ہرے خوبصورت کنجوں میں بھونرے گونج رہے ہیں۔ دل ہاتھوں سے نکلا جاتا ہے ندی میں ٹھنڈا ٹھنڈا پانی بہہ رہا ہے۔ ہوا گھنے درختوں کی چھاؤں میں مسافروں کو تھپک تھپک کر سلا رہی ہے اور طوطے بول رہے ہیں۔ اس سماں میں وہ گوری گوری بھولی اپنے کنول سے پاؤں زمین پر آہستہ آہستہ رکھتی ہوئی آتی ہے اور پریتم کی راہ دیکھکر کوٹھے پر جا اور ہاتھوں کی اوٹ کر نظر دوڑاتی اور پھر اتر آتی ہے

مفلس کی دُنیا

(نتیجۂ فکر عزیز اللہ خاں صاحب سلیم عنایتی)

مستِ مئے جوانی اک نوجوان لڑکی
یکتائے حسن و خوبی عصمت کی جان لڑکی

پگڈنڈیوں کے رستے چپ چاپ جا رہی تھی
اِک ہاتھ میں تھی شیشی کچھ گنگنا رہی تھی

ہر ہر قدم پہ ہنستی اور بجلیاں گراتی
کچھ دُور یوں وہ چلتی پھر تھک کے بیٹھ جاتی

طے کرتی راہ کی تھی مڑ مڑ کے دیکھتی تھی
اُمید کی جھلک تھی، چہرہ پہ تھی خوشی سی

لائی تھی شہر جاکر ماں کے لئے دوا یہ
اللہ رے مقدر، ہے غم میں مبتلا یہ!

چوبیس ۲۴ کوس منزل کاٹی تھی ایک دن میں
آفت نئی پڑی تھی اُس پہ یہ اِتنے سن میں

باپ اُس کا مر چکا تھا، بیمار ماں پڑی تھی
ہمدم نہ تھا کوئی اور مشکل بھی کڑی تھی

آخر کو گاؤں پہونچی، شیشی لئے ہوئے وہ
دل میں کوئی مسرت پنہاں کئے ہوئے وہ

دروازہ پر جو پہونچی، غم کا شکار لڑکی
باہر ہی سے پکاری، امّاں دوا میں لائی

گھستے ہی گھر میں فوراً دوڑی دوا پلائے
یا معنیٔ دگر میں آبِ شفا پلائے

ماں اُس کی چپ پڑی تھی یوں کثرتِ الم سے
گویا کوئی تعلق اُس کا نہیں ہے دم سے

وہ رو کے کہہ رہی تھی، امّاں دوا تو پی لے!
طے کر چکی تھی ماں سب رستے ہی زندگی کے

ماں اُس کی مر چکی ہے، جب یہ سمجھ گئی وہ
غم سے نڈھال ہوکر، فوراً ہی گر پڑی وہ

بیمار پڑ گئی تھی، جب سے شفیق مادر
روٹی بھی اس کو اکثر آتی نہ تھی میسر

اکثر سُنے گئے ہیں قصے یہ بیکسی کے
حاصل نہیں ہیں جن کو موقعے ہنسی خوشی کے

روزی کے سلسلے ہیں مفقود اِس جہاں میں
ممکن نہیں فراغت اب دورِ آسماں میں

کٹتی ہے زندگی یوں ہندوستانیوں کی
پائیں یہ داد کس سے اِن سخت جانیوں کی

یہ غم سلیم دل کو برباد کر ہی دے گا
اور زیرِ خاک سب کو آباد کر ہی دے گا

جنگ اور ہندوستانی صنعت وحرفت

(از مسٹر پرپورنا نند ورما)

کچھ دنوں سے فلسفانہ نقطۂ خیال کے ساتھ سیاسی نظریوں کا اعلان اور حمیت انسانی کے رنگ میں ڈبو کر پولیٹیکل اصولوں کی اشاعت کا رواج عام ہو رہا ہے اخباروں میں اور ریڈیو پر اب تک جن مضامین کی اشاعت ہوئی ہے ان میں عموماً ان باتوں کا کہیں ذکر بھی نہیں ملتا ہے جن کا ہمارے ملک سے اہم تعلق ہے۔ درحقیقت اس جنگ میں ہندوستان کو سب سے زیادہ دلچسپی اپنی اقتصادی حالت سے ہونا چاہیئے۔

لڑائی چھڑنے کے اول دو برسوں میں حکومت برطانیہ بال بال قرضہ میں بندھ گئی ہے اور اگر قرضوں کا سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو سنہ ۱۹۴۳ء کے آخر تک برطانیہ کا قومی قرضہ دس ارب پونڈ تک پہونچ جائیگا۔ اس پر پونے دو یا دو فیصدی سود بھی لگایا جائے تو صرف سود کی سالانہ رقم بیس کروڑ پونڈ ہوگی جنگ سے پہلے برطانیہ کا سالانہ خرچ ایک ارب انیس کروڑ پونڈ تھا مگر اب ایک ارب چھیاسٹھ کروڑ اسی لاکھ پونڈ ہو گیا ہے لیکن اس میں بھی اضافہ ہوا ہے اور آجکل ایک کروڑ چالیس لاکھ پونڈ روزانہ خرچ ہو رہا ہے و آمدنی تقریباً ایک تہائی ہے بقیہ رقم کفایت شعاری یا قرضہ سے پوری کرنا پڑتی ہے۔ برطانیہ جیسا صاحب تدبیر ملک بھی اتنا خرچ کب تک برداشت کر سکتا ہے اس کا جواب ماہرین اقتصادیات ہی دے سکتے ہیں۔ ہاں یہ واقعہ ضرور ہے کہ جرمنی میں نوٹوں کا استعمال بیس فیصدی بڑھ گیا ہے برطانیہ میں ابھی تک نو فیصدی اضافہ ہوا تھا۔

ستمبر سنہ ۱۹۴۱ء کے پہلے ہفتہ تک ہندوستان کے قرضۂ جنگ کی رقم اندازاً اسی کروڑ تھی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہندوستان نے جنگی امداد میں چالیس کروڑ روپیہ سالانہ دیا۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں تین فیصدی سالانہ سود پر تینتالیس کروڑ چودہ لاکھ اکتیس ہزار روپیہ کا قرض سنہ ۱۹۴۶ء میں ادائیگی کے وعدہ پر لیا گیا تھا۔ پچھلے دو سال میں مدراس، پنجاب اور صوبہ متحدہ کی گورنمنٹوں نے بھی تین فیصدی سالانہ سود پر کئی کروڑ روپیہ قرض لیا تھا جو سنہ ۱۹۵۲ء تا نہایت سنہ ۱۹۶۲ء واجب الادا ہوگا۔

ریزرو بنک آف انڈیا نے مصنوعی ذرائع سے براہ راست یا بالواسطہ ملک میں سونے کی مقدار بڑھانے

بغیر بازار میں مختلف طریقوں سے ایک ارب پچیس کروڑ کی زائد کرنسی پھیلا دی۔ روپیہ والی کفالتیں جن کی قیمت یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو سینتیس کروڑ اتنالیس لاکھ تھی ۲۵۔ جولائی ۱۹۴۱ء کو اٹھاسی کروڑ سینتالیس لاکھ ہوگئیں۔ اسی طرح پونڈ والی کفالتوں کی رقم جو یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو انسٹھ کروڑ پچاس لاکھ تھی۔ ۲۵ جولائی ۱۹۴۱ء کو ایک ارب اکیس کروڑ پینسٹھ لاکھ ہوگئی۔ یعنی اس دوران میں اسمیں باسٹھ کروڑ پندرہ لاکھ کا اضافہ ہوگیا ۲۲۔ اگست ۱۹۴۱ء کو ریزرو بنک آف انڈیا میں ایک ارب اکتیس کروڑ باسٹھ لاکھ روپیہ کی پونڈ والی کفالتیں تھیں جن میں دس کروڑ کا مزید اضافہ ہوا۔ اگر ان میں سے ایک بڑا حصہ مالکان کو ادا کرنے کے لئے گورنمنٹ کے حوالے نہ کر دیا جاتا تو تعداد اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ستمبر ۱۹۴۱ء کے پہلے ہفتہ میں گورنمنٹ کو دیئے ہوئے قرضہ اور اڈیز والنس کی رقم پانچ کروڑ ایک لاکھ روپیہ تھی۔

نوٹوں کی اشاعت میں ترسیٹھ کروڑ ستاون لاکھ روپیہ کا اضافہ ہوا ہے۔ ہفتہ مختتمہ ۲۲۔ اگست ۱۹۴۱ء میں ہندوستان کے اندر پچیس ارب، چھپن کروڑ، ننانوے لاکھ، پچاس ہزار روپیہ کے نوٹ چل رہے تھے بازار میں نوٹوں کی بھرمار ہوگئی تھی اور روپیہ بیکار پڑا ہوا تھا۔ اگست ۱۹۴۱ء کے پہلے ہفتہ میں شیڈولڈ بنکوں کی امانتوں کی میزان تیئیس کروڑ بڑھ گئی تھی۔ ستمبر ۱۹۴۱ء کے پہلے ہفتہ میں ریزرو بنک میں شیڈولڈ بنک کی رقم بقایا تو اسی لاکھ باون ہزار تھی۔ اڈیز والنس کی رقم ہندوستان میں دو کروڑ گیارہ لاکھ اکتالیس ہزار اور برہما میں ستاون لاکھ ستاون ہزار کم ہوگئی تھی۔ نقد کی رقم پندرہ لاکھ اڑتالیس ہزار بڑھ گئی تھی اور یہ سب کچھ تجارتی مندہ کا نتیجہ ہے۔

پبلک نے جنگی امداد میں جو قرضہ دیا ہے اس سے ہمارے حکام مطمئن نہیں ہیں چنانچہ پچھلے اگست میں مدراس میں تقریر کرتے ہوئے ہز اکسلنسی وائسرائے نے یہ فرمایا تھا کہ وہ ہندوستان سے کم سے کم ایک ارب روپیہ چاہتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ گورنمنٹ برطانیہ ہندوستان سے دو کروڑ روپیہ فی ہفتہ چاہتی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس قدر قرضہ کا ہماری مالی حالت پر کیا اثر پڑیگا۔

پچھلی جنگ کے اول دو برس میں یعنی ستمبر ۱۹۱۶ء میں کلکتہ میں چیزوں کی قیمتیں گیارہ فیصدی بڑھ گئی تھیں۔ لیکن موجودہ جنگ کے دو سال بعد جولائی ۱۹۴۱ء میں کلکتہ میں اشیاء کی قیمتوں میں قبل از جنگ قیمتوں سے ۴۹ فیصدی کا اضافہ ہوگیا۔ اگست ۱۹۳۹ء میں جن چیزوں کی تھوک قیمت سو تھی وہ دسمبر ۱۹۳۹ء میں ۱۳۷، جولائی ۱۹۴۰ء میں ۱۱۴ اور جولائی ۱۹۴۱ء میں ۱۴۹ ہوگئی۔ اسی طرح اگست ۱۹۳۹ء میں ضروریات زندگی کی جن چیزوں کی شرح ۱۰۵ تھی وہ اگست ۱۹۴۱ء میں ۱۳۱ ہوگئی گویا ۲۵ یا ۲۶ کا اضافہ ہوگیا۔ یہ مصنوعی طریقوں سے اضافہ نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟

امریکہ کے محکمہ اعداد و شمار و ریسرچ کے ڈائرکٹر مسٹر ای۔ اے گولڈن وینر نے امریکہ کے فیڈرل ریزرو بلیٹن میں لکھا ہے کہ:-

"مصنوعی طریقوں سے اضافۂ زر کا پہلا وقت وہ ہوتا ہے جب ملکی وسائل و ذرائع سے پوری طرح کام لیا جاتا ہے اور گورنمنٹ کو اس سے زیادہ دولت خرچ کرنی پڑتی ہے جتنی وہ ٹیکس اور قرضہ کے ذریعہ سے حاصل کر سکتی ہے۔ اس وقت گورنمنٹ پرنٹنگ پریس سے کام لیکر یا کسی سنٹرل بنک سے قرض لیکر یا کسی اور طریقہ سے اضافۂ زر کر دیتی ہے۔..... جب ایسا ہوتا ہے تو یہ اضافۂ زر کی بدترین صورت ہے۔ اگر گورنمنٹ کو اس سے زیادہ دولت خرچ کرنے کی ضرورت پڑے جس قدر کہ وہ معمولی طریقوں سے حاصل کر سکتی ہے تو ملک میں ایسی مصنوعی اور زوال پذیر دولت کا سیلاب بہانے سے یہی بہتر ہے کہ گورنمنٹ لوگوں کا مال اور اُن کی خدمات حاصل کرے۔ کیونکہ پہلے طریقہ سے جن چیزوں کی گورنمنٹ کو ضرورت ہوتی ہے ان کی قیمت اتنی جلد بڑھ جاتی ہے کہ ادائگی قیمت کے ذرائع اس کا ساتھ نہیں دے سکتے اور یہ چکر بہت بُرا ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ مالی تباہی و بربادی ہوتا ہے۔"

کاروبار کی حالت

سرکاری رپورٹ سے معلوم ہوا ہے کہ خریداری کے دیگر ذرائع کو چھوڑ کر صرف کنٹرولر و ڈائرکٹر سپلائی نے سامانِ جنگ کے سلسلہ میں ہندوستان سے چھہتر کروڑ روپیہ کی چیزیں خریدی تھیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس وقت ہندوستان میں تقریباً چارسو نئی چیزیں بن رہی ہیں، لیکن ان کے لئے کوئی نئی حرفت قائم نہیں ہوئی اور نہ نئی مشینیں آئیں، کیونکہ سال قبل از جنگ کے مقابلہ میں سنہ ۱۹۴۰-۳۹ء میں ہندوستان میں ممالک غیر سے آنے والی مشینوں کی قیمت میں چار کروڑ روپیہ کی کمی ہوئی ہے اور سنہ ۱۹۴۱-۴۰ء میں تین کروڑ کی مزید کمی ہوئی۔ پھر ہم کیسے سمجھیں کہ جنگ کی وجہ سے ہندوستان کی صنعت و حرفت میں واقعی کوئی ترقی ہوئی؟
کچے مال بھی برآمد میں بھی کمی ہوئی، یعنی سنہ ۱۹۴۰-۳۹ء کے مقابلہ میں ہندوستان سے جو کچا مال باہر بھیجا گیا اس میں چوبیس کروڑ کی کمی ہوئی اور مصنوعات کی برآمد میں علی الترتیب پانچ کروڑ کا اضافہ ہوا۔ سنہ ۱۹۴۲-۴۱ء کے پہلے چار ماہ میں بھی یہی حالت رہی یعنی کچے مال اور مصنوعات کی برآمد میں علی الترتیب پانچ کروڑ اور ساڑھے چار کروڑ کی کمی ہوئی لیکن کہا یہ جاتا ہے کہ سنہ ۱۹۴۰-۳۹ء کے مقابلہ میں ایک کروڑ کی بیشی ہوئی۔

درحقیقت ہندوستان کی تجارت ایک بہت ہی برے چکر میں پھنس گئی ہے۔ جنگی سامان کی تیاری کا انتظام چند روزہ ہے جو جلد ختم ہو جائیگا کیونکہ جنگ بہت زیادہ طول پکڑنے والی نظر نہیں آتی عجب نہیں کہ یہ جلد اور دفعتاً ختم ہو جائے۔ پھر اس کے بعد ہم اپنے کاروبار کو کس طرح سدھار سکیں گے اس وقت غیر ملکی آرڈروں کا بالکل ہی خاتمہ ہو جائیگا۔ اور باہر سے آرڈر آنے میں کافی وقت لگے گا۔

تو کیا یہ موجودہ بہتات آئندہ نقصانات کا پیش خیمہ ہے؟

اس میں شک نہیں کہ سوتی کپڑے کی برآمد میں اضافہ ہوا ہے۔ سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء میں سترہ کروڑ ستر لاکھ گز کپڑا باہر گیا تھا جو سنہ ۱۹۴۰-۴۱ء میں انتالیس کروڑ ایک لاکھ گز ہو گیا لیکن اسی زمانے میں سوتی کپڑے کی درآمد بھی چونسٹھ کروڑ اٹھتر لاکھ گز سے چوالیس کروڑ ستر لاکھ گز رہ گئی۔ کپڑے کی باز برآمد ایک کروڑ ستاون لاکھ گز سے بڑھ کر چار کروڑ پینتیس لاکھ گز ہو گئی۔ ستمبر سنہ ۱۹۴۰ء میں سوتی کپڑے کی قیمت دو روپیہ پندرہ آنہ فی پونڈ تھی مگر مئی سنہ ۴۱ء میں یہ چار روپیہ پانچ آنے ہو گئی۔ جنگ کی وجہ سے سوتی کپڑے کے کاروبار میں ضرور ترقی ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستانی روئی کی برآمد میں کمی ہو گئی ہے۔ سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء میں ستائیس لاکھ دو ہزار آٹھ سو گانٹھیں (چار سو پونڈ کی ایک گانٹھ) برآمد ہوئی تھیں۔ جو سنہ ۱۹۴۰-۴۱ء میں اکیس لاکھ بہتر ہزار نو سو رہ گئی۔ اسی زمانے میں روئی کی درآمد میں بھی کمی ہوئی۔ یعنی پانچ لاکھ انتالیس ہزار سات سو گانٹھوں سے چار لاکھ ننانوے ہزار دو سو رہ گئیں۔

سن کی مصنوعات میں بھی نمایاں کمی ہوئی تھی۔ سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء میں بارہ لاکھ اکیس ہزار پانسو ٹن سن کا مال تیار ہوا تھا۔ سنہ ۱۹۴۰-۴۱ء میں دس لاکھ ننانوے ہزار دو سو ٹن تیار ہوا۔ سن کی بوریوں کی قیمت مئی سنہ ۱۹۴۰ء میں ساڑھے سینتیس روپیہ سیکڑہ تھی۔ مئی سنہ ۱۹۴۱ء میں بیالیس روپیہ ہو گئی۔ کچے سن کی برآمد کو بھی دھکا لگا ہے۔ سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء میں چھ لاکھ نوے ہزار پانسو ٹن سن برآمد ہوا تھا۔ سنہ ۱۹۴۰-۴۱ء میں اسکی مقدار دو لاکھ چوالیس ہزار ایک سو ٹن رہ گئی۔ مئی سنہ ۱۹۴۰ء میں درجہ اول کی سن کی گانٹھ (چار سو پونڈ) کی قیمت چھپن روپیہ تھی۔ مئی سنہ ۱۹۴۱ء میں ساڑھے چوالیس روپیہ رہ گئی۔

لوہے اور اسٹیل میں بھی ۱۴ سے لیکر سو ٹن تک کمی بیشی ہوئی۔ لیکن قیمتیں قریب قریب وہی ہیں۔ شکر کی قیمت بہت بڑی حد تک کم ہو گئی۔

سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء میں ۴۴ ہزار ۸۰۰ ٹن کوئلہ باہر سے آیا تھا۔ سنہ ۱۹۴۰-۴۱ء میں پانچ ہزار اسی ٹن آیا۔ مگر اسی زمانہ کی برآمد میں اضافہ ہوا۔ جھریا نمبر اول کوئلہ کے ایک ٹن کی قیمت ڈگین کے اندر مئی سنہ ۱۹۴۰ء میں تین روپیہ چھ آنہ تھی جو مئی سنہ ۱۹۴۱ء میں تین روپیہ دو آنہ رہ گئی۔

بہر حال سب ملا کر سنہ ۴۰ء کے مقابلہ میں ہماری تجارت برآمد سنہ ۱۹۴۰-۴۱ء میں بارہ کروڑ انسٹھ لاکھ روپیہ کم ہو گئی اور تجارت درآمد میں اکانوے لاکھ روپیہ کی بیشی ہوئی۔ یہ بھی ایک نقصان دہ پہلو ہے:

سنہ ۱۹۴۰ء اور سنہ ۱۹۴۱ء میں مختلف چیزوں کی قیمتوں میں اتار چڑھاؤ کا معلوم کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا:

نمبر	نام	جولائی سنہ ۱۹۴۰ء	جون سنہ ۱۹۴۱ء
۱	سوتی کپڑا	دس آنے چار پائی فی پونڈ	تیرہ آنے چار پائی فی پونڈ
۲	سوت کا تاگہ	چھ آنہ دو پائی فی پونڈ	چھ آنے گیارہ پائی فی پونڈ

نمبر	نام	جولائی سنہ ۱۹۴۰ء	جون سنہ ۱۹۴۱ء
۳	سن خام	پونے گیارہ روپیہ من	گیارہ روپیہ من
۴	جوٹ کاٹن (ہیسین)	دس روپیہ تیرہ آنے سو گز	بائیس روپیہ سو گز
۵	چاول نمبر اول	ساڑھے پانچ روپیہ من	پونے سات روپیہ من
۶	گیہوں پنجاب	چھبیس روپیہ تین آنے (۵۶۰ پونڈ)	تیس روپیہ گیارہ آنے چھ پائی
۷	اون خام	چالیس روپیہ (۸۲ پونڈ)	پچپن روپیہ من

برآورد و پیداوار کے متعلق اعداد و شمار ذیل بھی غور طلب ہیں:-

نمبر	نام	جولائی سنہ ۱۹۳۹ء	جولائی سنہ ۱۹۴۰ء
۱	سن کی مصنوعات	۹۲۷۲۹ ٹن	۱۱۱۵۲۰ ٹن
۲	کاغذ	۱۰۷۱۴۵ ٹن	۱۲۸۰۳۴ ٹن
۳	اسٹیل کی چیزیں	۶۵۶۲۳ ٹن	۷۱۵۵۸ ٹن
۴	گیہوں کا آٹا و میدہ	۱۲۸۰۵۴۲ من	۱۲۳۲۳۵۱ من

یہ اعداد و شمار اگرچہ محدود چیزوں کے متعلق ہیں لیکن ان سے برآورد و پیداوار میں ترقی معلوم ہوتی ہے مگر اس ترقی سے ہندوستان کو کوئی فائدہ نہیں پہونچا اس کے لئے قیمتوں کے اتار چڑھاؤ پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس معاملہ میں گورنمنٹ کی بالکل غلط پالیسی رہی، بعض صوبوں کی حکومتوں نے بعض چیزوں کی قیمتوں پر کنٹرول رکھا اور بعض پر نہیں۔ مثلاً یو۔ پی میں گیہوں پر سرکاری کنٹرول رہا۔ اس صوبے میں گیہوں کی سب سے بڑی منڈی ہاپوڑ ہے یہاں گورنمنٹ نے گیہوں کی قیمت چار روپیہ فی من اس وقت مقرر کی جب پنجاب میں گیہوں پر حکومت کا کوئی کنٹرول نہ تھا۔ اور وہاں سے ایران کو بڑی مقدار میں گندم بھیجا جا رہا تھا۔ پہلے پنجاب کا گیہوں یو۔ پی کے گیہوں سے ایک روپیہ یا آٹھ آنے من سستا ہوتا تھا مگر اب ایک روپیہ یا آٹھ آنے من مہنگا ہو گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یو۔ پی کے گیہوں کے لئے کوئی بازار نہ رہا جس سے اس کو فائدہ ہوتا۔

گورنمنٹ کی غیر یقینی پالیسی کی وجہ سے گذشتہ جنگ کے زمانہ سے موجودہ جنگ کے زمانہ میں اشیاء کی قیمتوں میں زیادہ غیر قابل اطمینان اختلاف ہو رہا ہے۔ گذشتہ جنگ کے پہلے سال میں یعنی ۱۹۱۴-۱۹۱۵ء سے پہلے ماہ جولائی سنہ ۱۹۱۴ء کا معیار سو قرار دیکر اگر قیمتوں پر نظر ڈالی جائے تو اگست ۱۹۱۴ء میں ۱۰۲ ہو گئی تھی اور پھر تمام سال سو اور ایک سو ۱۰۲ کے درمیان رہی۔ اب جولائی سنہ ۱۹۳۹ء کو معیاری یعنی سو قرار دے کر دیکھا جائے تو اکتوبر سنہ ۱۹۳۹ء میں تعداد ۱۱۰ اور دسمبر سنہ ۳۹ء میں ۱۳۷ ہو گئی تھی اور جولائی سنہ ۱۹۴۱ء

میں ۱۴۹ تھی۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں ضروریات زندگی کی چیزوں کا اُتار چڑھاؤ ۱۰۵ اور ۱۱۰ کے درمیان رہا۔ اگر اس حالت کا انگلستان کی حالت سے مقابلہ کیا جائے جو ہندوستان کے مقابلہ میں جنگ کی مصیبت میں کہیں زیادہ مبتلا رہا ہے تو نقصان میں ہمارا ہی پلہ بھاری رہیگا۔

نقشۂ ذیل میں اگست سنہ ۱۹۳۹ء کو معیاری یعنی ۱۰۰ قرار دیا گیا ہے۔

	ستمبر سنہ ۱۹۳۹ء	مئی سنہ ۱۹۴۰ء		جولائی سنہ ۱۹۴۱ء
۱۔ کلکتہ	۱۱۴	۱۱۷	۰۰	۱۲۶
۲۔ انگلینڈ	۱۰۶	۱۳۴		...
۳۔ امریکہ	۱۰۳	۱۰۱		...

انگلستان اور امریکہ کے متعلق تازہ اعداد دستیاب نہیں ہو سکے لیکن حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر انگلستان میں فی ماہ پانچ سے لیکر ایک فیصدی قیمت میں اضافہ ہوا تو ہندوستان میں یکایک پندرہ سے بیس فیصدی تک اضافہ ہو گیا۔ اس طرح تمام بازار میں گڑبڑ ہو گئی اور پبلک کو بہت تکلیف پہونچی۔ مثال کے طور پر اگست ۱۹۳۹ کو معیاری یعنی ۱۰۰ قرار دیکر دیکھیے کہ ستمبر سنہ ۱۹۳۹ء میں سن خام روئی اور سن کی چیزوں کی قیمت ۱۳۵ سے ۱۴۰ ہو گئی فروری سنہ ۱۹۴۰ء میں ۱۶۴ سے ۲۲۸ ہو گئی۔ پھر ستمبر سنہ ۱۹۴۰ء میں ۹۳ اور ۱۲۸ تک اُتر گئی۔ اسی زمانہ میں روئی خام اور سوتی کپڑے کی قیمتیں ۱۲۸ تا ۱۱۱ ہو گئی۔ ستمبر سنہ ۱۹۴۰ء میں ۱۴۲ و ۱۲۸ ہوئی اور پھر ۱۲۵ و ۱۲۳ ہو گئی۔ اس قسم کا اُتار چڑھاؤ سٹہ کے نقطۂ نظر سے بہت خطرناک ہے اور کسی شخص کو اطمینان نہیں ہو سکتا کہ بازار کا بھاؤ آئندہ کیا ہوگا۔

ایک بات اور بھی سن لیجئے قیمتوں کے اضافہ سے ہماری تجارت برآمد کی قیمت میں کوئی اضافہ نہیں ہوا برآمد کا کاروبار اس وقت بالکل مندا تھا البتہ درآمد کی قیمتیں بڑھ گئی ہیں۔ نقشۂ ذیل میں ملاحظہ فرمائیے۔

سنہ ۲۸-۱۹۲۷ء = ۱۰۰

	برآمد	درآمد
جولائی سنہ ۱۹۳۹ء	۶	۶۶
اپریل سنہ ۱۹۴۱ء	۷۶	۹۶
جولائی سنہ ۱۹۴۱ء	۷۲	۸۲

ان تمام باتوں سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ جنگ کے گذشتہ دو سال میں ہندوستان کے بازار کی حالت خراب ہو گئی ہے۔ قیمتوں کے غیر مستقل اتار چڑھاؤ کی وجہ سے لوگوں کا کاروباری جوش سرد پڑ گیا ہے۔

برآمد و درآمد کا کاروبار کھٹائی میں پڑ گیا ہے، آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

بقول مسٹر سُبمل بھٹاچاریہ ایم۔ اے پروفیسر اقتصادیات ڈھاکہ یونیورسٹی قیمتوں میں اضافہ خاص اسباب کی بنا پر ہوتا ہے۔ مثلاً جنگ کے زمانہ میں چیزوں کی کمی محسوس ہوتی ہے، دوسرے گورنمنٹ کے آرڈر سپلائی کے معمولی ذرائع سے بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ لڑنے والے ملکوں کے زبردست اخراجات کی وجہ سے بھی قیمتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور جہازوں کی تعداد میں کمی بھی اس کا ایک سبب ہے جس کی وجہ سے محصول اور بیمہ کی شرح بڑھ جاتی ہے۔ اپنے ملک سے دوسرے ملکوں کو مال بھیجنے میں جوکھوں ہوتی ہے اسی لئے قیمتیں بڑھ جاتی ہیں۔

جنگی اخراجات کی زیادتی کی وجہ سے گورنمنٹ کرنسی کو بڑھا کر اپنی مالی حالت درست دکھانے پر مجبور ہوتی ہے۔ اور اُسے بکثرت نوٹ چلانے پڑتے ہیں جس کو مصنوعی طریقہ سے اضافۂ زر کہا جاتا ہے۔ گورنمنٹ کی بڑھی ہوئی قوت خریداری چیزوں کی قیمتوں میں غیر معمولی اضافہ کر دیتی ہے۔ ہمارے ملک میں بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ گورنمنٹ کی بھاری اسٹرلنگ خریداری سے مصنوعی طور پر کرنسی میں بقدر ایک ارب تیس کروڑ کے (اتنے کے نوٹ چلائے گئے) اضافہ ہو گیا۔ اور چاندی کے روپئے بھی بکثرت چلا دیئے گئے جن میں چاندی کی مقدار بہت ہی کم ہے۔ اسی کو سستی دولت کہہ سکتے ہیں جو واقعی مصنوعی طریقوں سے اضافۂ دولت قرار دیا جا سکتا ہے چنانچہ قیمتوں میں اضافہ کی بھی یہی وجہ ہے۔ غرض اس وقت ہم انڈسٹریل دوشاخے میں پھنسے ہوئے ہیں بہر حال لڑائی کے پچھلے دو سال میں جو صورت حال تھی وہ یہ ہے:۔

۱۔ ہندوستان کا اسٹرلنگ بوجھ بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔

۲۔ ہندوستان کی کرنسی میں پونے دو ارب تک اضافہ ہو گیا تھا۔

۳۔ چیزوں کی قیمتیں اور زندگی کے مصارف بہت زیادہ بڑھ گئے ہیں اور ان کا اُتار چڑھاؤ بہت بے تُکا ہو رہا ہے۔

۴۔ کاروباری طبقہ کی حالت ویسی ترقی پر نہیں ہے جیسی کہ سمجھی جاتی ہے۔

۵۔ منظم طریقہ سے صنعت و حرفت کی توسیع و ترقی نہیں کی گئی۔

قطعہ

سکوت در مکمل سکوت چار طرف　　ردائے نور میں لپٹی ہوئی ہے چاندنی رات
اُبلتا ہو کسی چشمہ سے جس طرح پانی　　نکل رہے ہیں مرے دل سے اس طرح جذبات

شبِ ماہ

(از حسن یحییٰ صاحب عنبرؔ ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی)

قبائے ماتمی پھینکی شبِ ظلمت نے بالآخر
جمایا رنگ اپنا محفلِ عشرت نے بالآخر

ہوئیں تاریکیاں رخصت کہ اب نورِ قمر چمکا
شجر، میدان، دریا، کوہ، صحرا، بام و در چمکا

ہوا میں تازگی ہے اور فضا میں کیف مستی ہے
جدھر دیکھو ادھر فیاضیٔ قدرت برستی ہے

ہر اک شئے دیکھ کر ہوتا ہے خنکی کا اثر پیدا
اسی منظر سے ہوتا ہے مگر خونِ جگر پیدا

کہوں میں کیا عجب کچھ رنگِ موجودات ہے اس وقت
نگہ کو دن کا دھوکا ہے اگرچہ رات ہے اس وقت

نظر آتی ہے پھیلی ہر طرف اک نور کی چادر
کہ زیبائش پہ جس کی ہو فدا بلّور کی چادر

ضیا پاشی سے اس کی ذرہ ذرہ اب ستارہ ہے
کہ جس حسنِ خود آرا کا مہِ تاباں شرارہ ہے

شبابِ بوستاں کیوں پھر نئے سر سے پلٹ آیا
کوئی جا کر نقابِ حسنِ فطرت کیا الٹ آیا

مرقع ہے کسی بہزاد کی تصویر کا گلشن
نگاہیں بھیجتی ہیں یا کسی کشمیر کا گلشن

وہ پھولوں کی ہے کثرت فرشِ سبزہ پر کہ کیا کہیے
کسی نازک ادا کی گر نہ اس کو اک قبا کہیے

بہارِ لالہ و گل جوش زن یوں ہر طرف ہے اب
مئے رنگیں لئے ہر شاخِ گل ساغر بکف ہے اب

صبا کا دمبدم غنچوں کو دیکھے چومنا کوئی
روش پر چھوٹے پودوں کا رہ دیکھے جھومنا کوئی

کسی جانب گلاب و لالہ کی آتش دہکتی ہے
کسی جانب چمن میں رات کی رانی مہکتی ہے

وہ سرمستی بھری ہے نرگسِ شہلا کی آنکھوں میں
ادائے کیف سرشاری ہوئی پیدا درختوں میں

غرض گلزار پر چھایا ہے عالم بادہ نوشی کا
تکلم ہو فدا جس پر وہ منظر ہے خموشی کا

وہ غافل ہے کہ جو اس وقت محوِ خوابِ راحت ہے
وہی بیدار ہے جو نازدانِ اسرارِ فطرت ہے

پنگھٹ

(ایک قصّہ)

(از خواجہ شمیم بھیروی)

"رامو! ارے رامو"

رامو رسوئی میں برتن مانجھ رہا تھا، ۱۲ برس کا صحت مند بچّہ، دیہاتی آب و ہوا دن بھر کی محنت اور اچھی خوراک رنگ نکھرا ہوا چہرہ مہرہ کا اچھا، سر پیدرو مہاجن ایسے رئیس کا گھر اور بچپن کی بے فکری، ہر چند مفلسی کی گود سے نکلا لیکن امارت کی فضا میں چار برس سے سانس لے رہا تھا۔ دن بھر کی جھڑکیوں کے باوجود اُس کی اُٹھان میں کمی نہ آسکی رئیس کے رسوئی کی چاٹ نے اس کے مزاج میں اکھڑپن پیدا کر دیا تھا، الھڑ تو تھا ہی بڑے گھر کے وقتی چونچلوں نے زبان کو بے لگام اور طبیعت کو بے پروا بھی بنا دیا۔ رانی جی کی آواز سن کر ہونٹ کاٹے اور بڑبڑایا

"اُٹھی ہے نرک کی چڑیل، آنکھ کھولتے ہی رامو رامو چیخنے لگی"

رسوئی سے نکلا رانی جی کے سامنے پہونچا۔

"سرکار"

"سرکار کا بچہ، گھنٹہ بھر سے گلا پھاڑ رہی ہوں، سانپ سونگھ گیا تھا؟" رانی نے کہا۔

"دیوی جی! برتن مانجھ رہا تھا"

"کانوں میں بھی روئی ڈال رکھی تھی"

"جو آگیا ہو۔ دیوی جی!"

"اب کھڑا منھ تکے جا، چھوٹے بابو کے بوٹ میں پالش کر، وہ کہیں جانے والے ہیں۔"

رامو چھوٹے بابو کے کمرے کی طرف دوڑا، ایک قدم دہلیز میں تھا کہ دوسرا پاؤں اُلجھا اور منھ کے بل زمین پر آ رہا۔ انگوٹھے کا ناخن الگ ہو گیا۔ گرتے گرتے میز سے ٹکرایا تو فرشی لمپ گر کر چور چور ہو گیا۔ رامو کو اپنی تکلیف کا خیال تو ہوا یا نہیں لیکن لمپ کی موت نے اس کی ساری کائنات کو ماتم کدہ بنا دیا۔ اس ہنگامے میں چھوٹے بابو اُٹھے، ہر چند وہ امارت کی سرمستیوں میں زندگی کی بیس منزلیں طے کر چکے تھے لیکن حسن تعلیم اور شہر میں مختلف لوگوں کی معاشرتی بیچارگیوں کے مطالعہ نے کچھ کچھ انسانیت کے قریب کر دیا تھا کچھ کسی کی مصیبت پر آنسو بہانا اُن کی عادت نہ تھی لیکن کسی کی تکلیف کا ابتدائی احساس مضطرب ضرور کر دیتا تھا۔ بلبلاتے رامو کو اُٹھا کر انگوٹھے پر دوا لگائی اور پٹی باندھ دی۔

رانی جی اس ہوشربا منظر کو دیکھکر تھرا اُٹھیں سنتے لال بابو اور کمھار کے لونڈے کی سیوا، برس ہی تو پڑیں

"منّے! تم لونڈے کا مزاج بگاڑ رہے ہو، موئے نے ادھر پانچ روپے کا لمپ ناس کردیا اُدھر بہانہ کیا کہ بوٹ پالش سے چھوٹ جائے۔ اس پر لگے تم اُس کے چوچلے اُٹھانے"۔

"ماتا! اگر ہماری سیوا کرتے کرتے کوئی اناتھ دکھ میں پڑ جائے تو اُس کی سیوا ہمارا دھرم ہے"۔

"بڑا آیا دھرم کا پالن کرنے والا۔ ہماری جھوٹن کا پلا ہم سے ناز اُٹھوائے۔ تو تو چلا جائے گا اور یہ میری جان کو آئے گا۔"

منّے بابو چپ ہو گئے۔ رامو نے آہ بھری اور لنگڑاتا ہوا رسوئی میں جا بیٹھا۔

مہینہ بھر سے رامو ماں سے نہ ملا تھا۔ ماں نے کہلا بھیجا کہ کچھ دنوں سے بیمار ہوں صورت تو دکھا جاؤ"۔ اگر ممتا بچے کے لئے تڑپ سکتی ہے تو بچہ بھی اُس آغوش کی چاہ میں بےچین ہو سکتا ہے جہاں اُس کی انسانیت نے نشو و نما کی ابتدا کی۔ ممکن ہے جوانی طاعت و انقیاد کی ساری حدیں توڑ دے لیکن بچپن کی "تشنگی محبت" "ماں کے" پہلے پیار" کو بھلا دینے کی ہمت نہیں کر سکتی۔ ماں کی بیماری پر رامو کیسے نہ تڑپ اُٹھتا دوڑا دوڑا رانی جی کے پاس آیا اُن کے قدم لئے اور روکر اجازت چاہی۔

"بہت دن سے ماں کو دیکھا نہیں، وہ بھی نہیں آسکتی، سخت بیمار ہے"۔

"ہٹ کام چور کہیں کا، گھر میں کوئی دھندا نہیں جو تو چلا ہے ماں کا دکھ بٹانے"۔ رانی جی نے حقارت سے کہا

"دیوی جی ماں مر جائیگی" رامو نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

"مر جائے۔ کون سی انوکھی بات ہوگی، مائیں مرا ہی کرتی ہیں" رانی نے ناک بھوں سکیڑ کر کہا۔

"پر آپ مر جائیں تو کیا منّے بابو کو دکھ نہ ہوگا" رامو نے جل کر کہا۔

اس جملے کا جواب تھپڑ گھونسے اور لاتیں ہی ہو سکتا تھا۔ پٹ پٹا کر رامو رسوئی میں آ بیٹھا، رانی جی کے بڑبڑانے کی آواز برابر کانوں میں چلی آتی تھی۔

"کتا۔ نیچ، کھلانے کو سے نہیں اور ماں کے لاڈ نہیں بھولا"

آج رامو کی آشفتہ مزاجی اپنی انتہائی بلندی پر پہونچ چکی تھی۔ اس قدر سزا کے بعد اُس کا "ذوقِ گناہ" اور بڑھ گیا۔ ہر چند غلامی نے اس کی فطری ضد کو دبا رکھا تھا لیکن آج کے دباؤ نے اُس کے انقلابی دماغ میں اس بلا کی شورش پیدا کر دی کہ محکومی کے پرخچے اُسے فضا میں، اُس کے دل و دماغ سے بہت بلند پرِ کاہ کی طرح اُڑتے نظر آرہے تھے۔ اُس نے فیصلہ کر لیا۔

"نوکری ہو چکی، غلامی اور ماں سے ملنا، پاپ ہے، بھوکا اور ماں کے لاڈ! غلط ہے۔ ہاں اب ماں

سے ملوں گا مگر رامو بن کر نہیں، سیٹھ رام چندر بن کر"
وہ گھر سے بھاگ گیا۔

"رانی جی! میرا رامو کہاں ہے" ایک جوان مگر کمزور عورت نے رانی جی سے کہا۔
"دریا میں ڈوب گیا" رانی نے غصّے سے کہا۔
"مجھ رانڈ کا ایک ہی تو جینے کا سہارا ہے" اُس نے رو کر کہا۔
"نکالو نکالو اس کمہارن چڑیل کو، نیچ کہیں کی" رانی جی نے حکم دیا۔
رامو کی ماں دھکّے مار کر نکال دی گئی۔ کسی نے اُسے بتایا کہ "ہفتہ بھر ہوا رامو ندی کی طرف گیا، گاؤں کی لڑکیاں پنگھٹ پر تھیں سُنا ہے کہ ندی میں ڈوب مرا۔"

پورے پندرہ برس کے بعد۔
رامو کی ضعیف ماں ٹمٹماتے ہوئے دیئے سے کہہ رہی تھی:۔
"تیل ہو چکا، تو بجھ رہا ہے۔ میں بھی کب کی بجھ چکی ہوتی لیکن رامو کی آشا مجھے مرنے نہیں دیتی، کدا چیت وہ آ جائے۔ بھگوان تو سرو شکتی مان ہے، مجھے تیری دیا نے نراش نہیں ہونے دیا۔ میرے ہردے سے اب بھی تیرا شبد آ رہا ہے "رامو آئیگا"
رامو" آ گیا، ماتا جی"
دروازہ کھلا، اور سچ مچ رامو ماں کے قدموں پر تھا۔ دونوں مل کر خوب روئے، اور رامو نے اُسے بتایا کہ کس طرح وہ بھاگ کر کلکتہ پہونچا اور وہاں محض ماں کے شکھ اور اپنی عزتِ نفس کو زندہ کرنے کے لئے اُس نے تعلیم حاصل کی، ڈاکٹر بنا اور اب اُسے وہ لینے آیا تھا۔
"بیٹا! اتنے دنوں ماں کی خبر نہ لی!"
"ماتا جی! اب تک میں آپ کی سیوا کے یوگ نہ ہو سکا۔ اب آپ کے لاڈ دیکھنے کی یوگ ہوں، اب مجھے میری ماں سے ملنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔"
"میرے لال" ماں نے بے اختیار رامو کو سینے سے لگا کر منھ چوم لیا۔
"ماتا جی! کچھ رانی جی کی خبر ہے کس حال میں ہیں" رامو نے پوچھا۔
"بیٹا! سنتے بابو کے پتا سرگباش ہو گئے، بہت قرضہ نکلا، ریاست ہاتھ سے نکل گئی۔ سنتے بابو نہ جانے کب سے کہیں چلے گئے، تمھارے پیچھے ایک لڑکی رانی جی کے ہوئی اب وہ جوان ہے۔ لڑکی ہمسایوں کا پانی بھرتی ہے اور رانی جی دھان صاف کرتی ہیں۔"

رامو نے ایک آہ بھری اور کہا:۔

"تو پھر شاید وہی لڑکی ہے، پنگھٹ پر پانی بھر رہی تھی، ہوبہو رانی جی کی تصویر۔"

"ٹھیک ہے بیٹا، وہی شیلا ہے۔" ماں نے جواب دیا۔

صبح ہوتے ہی رامو رانی جی کے ہاں گیا، رو کر قدموں پر گر پڑا اور کہا:۔

"ماتا جی! آپ کے دُکھ سے مجھے کتنا کشٹ ہو رہا ہے"

"بیٹا! رامو ہو تم، آہ، مجھے لاجوں نہ مارو۔"

"ماتا جی! رامو اپنے گزرے ہوئے دن بھول گیا ہے، وہ آپ کی سیوا کے لئے آیا ہے"

"جیتے رہو، سُکھی رہو۔ میں بھگوان کے سہارے جی رہی ہوں، میں نے بھگوان کو دُکھی کیا اور اُس کا پھل بھوگ رہی ہوں"

"مجھے اپنی سیوا میں لے لیجئے، شیلا کو میرے گھر کی رانی......"

"کیا کہا" گویا رانی جی کے دماغ کی کوئی دبی ہوئی چنگاری بھڑک اُٹھی۔

رامو نے زیادہ کہنا مناسب نہ سمجھا وہ چلا آیا۔

شیلا اور رامو صبح و شام پنگھٹ پر ملتے۔ لیکن انسانیت ہمیشہ اُن کے درمیان رہی۔ شیلا ہمیشہ اپنے جیتے ہوئے دنوں پر روئی، بھائی کا سوگ منایا، اور رامو نے ہمیشہ اُسے تسلیاں دیں۔ وہ انسان تھے اور اُنکی بارگاہ میں شیطان کی ساری طاقتیں ہمیشہ سربسجود رہیں۔ جوانی اُنکی بھی ہمدرد ماں طلب تھی لیکن انسانیت مو النست و ہمدردی اور سلوک و رافت سے زیادہ انھیں "عشق و جوانی" کا کوئی مفہوم نہ بتلا سکی۔

تین مہینے کے بعد جب رامو کی ماں نے بہت زیادہ رانی جی کو مجبور کیا تو اُنھوں نے کہا:۔

"یہ سزا باقی تھی، سریندر مہاجن کی بیٹی للو کمہار کے بیٹے سے بیاہی جائے۔"

رامو اور شیلا کا بندھن ہو گیا، گاؤں والوں نے بہت لے دے کی، رامو سب کو لیکر کلکتہ چلا گیا، چلتے چلتے جب کشتی دریا میں روانہ ہوئی، رامو نے کہا:۔

"شیلا اب ہم سُکھی ہیں......

وہ کچھ کہنے کو تھا کہ رانی جی کشتی سے کود پڑیں، ڈوبنے سے تو بچا ہی لی گئیں۔ لیکن ایک گھنٹہ میں اسی پنگھٹ پر دم توڑ دیا جہاں رامو کی زندگی کا آغاز ہوا تھا۔ مرتے مرتے رانی جی نے کہا: "میں جینا نہیں چاہتی، اپنے ایک داس کی داستا میں سانس لینا اُف کتنا کشٹ ہے"

پنگھٹ پر رانی کی لاش جل رہی تھی اور شعلے ہوا سے کہہ رہے تھے:۔

"انسان مٹ جاتا ہے لیکن اُس کی فطرت نہیں مٹتی"

تنقیدِ کتب

حرفِ ناتمام

اُردو کے نامور شاعر منشی مہاراج بہادر برقؔ دہلوی کی نظموں اور غزلوں کا یہ تیسرا مجموعہ ہے جسے مسٹر شیلش چندر طالبؔ دہلوی نے فراہم کرکے خاص اہتمام سے شائع کیا ہے۔ کلامِ برقؔ کے دو مجموعے "مطلع انوار" اور "کرشن درپن" اس سے قبل شائع ہو کر مقبولِ عام ہو چکے ہیں۔ برقؔ صاحب کی شخصیت یا اُن کی شاعری کسی تعریف و تعارف کی محتاج نہیں۔ ان کا شمار زمانۂ حال کے نغزگو اور سحر طراز شعرائے اُردو میں ہے ذوقِ سخن اُنھیں ورثہ میں ملا تھا۔ وہ ایک کہنہ مشق سخنور اور پُرگو شاعر تھے۔ اُن کا قلم ہر صنفِ سخن پر حاوی تھا خصوصاً قومی، مُلکی اور مذہبی شاعری میں تو آپ کی شاعری درجۂ کمال کو پہونچ گئی تھی۔ آپ کی نظموں کی زبان فصیح اور ٹکسالی ہوتی ہے، الفاظ سلیس، ترکیبیں چُست اور تخیّل بلند ہے شاعرانہ حیثیت سے وہ ادراک اور احساس دونوں قوتوں سے کام لیتے ہیں جب محسوسات کی آئینہ بندی پر اُتر آتے ہیں تو مناظر کی چلتی پھرتی تصویریں کھینچ کر نظروں کے سامنے لے آتے ہیں۔ مثلاً کہکشاں کا نقشہ کھینچتے ہیں۔

کہکشاں ہے یا فلک پر جادۂ زریں ہے یہ   بحرِ اخضر میں کوئی یا موجِ نور آگیں ہے یہ
یا بساطِ آسماں پر جدولِ سیمیں ہے یہ   شکلِ بستہ یا فروغِ جلوۂ سیمیں ہے یہ

پارہ ہائے نور کا یا آتشیں گلزار ہے
جو فرازِ چرخِ گرداں سے تجلی بار ہے

دوسرے بند کی ٹیپ ملاحظہ ہو:-

بجلیاں سی کوندتی ہیں خرمنِ سیماب میں
یا چراغاں کا ہے عالم نور کے سیلاب میں

منظر نگاری کا مزید کمال دیکھنا منظور ہو تو ان کی نظمیں "سورج مکھی کا پھول" "بسنت" "دیوالی" "نورانی کلیاں یا ستارے" "جشنِ چراغاں" ملاحظہ فرمائیے جو اس کتاب میں موجود ہیں۔ اس مجموعے میں برقؔ صاحب کی کئی قومی اور مذہبی نظمیں بھی ہیں، مثلاً "کرشن اوتار" "مہارانا پرتاپ اور بادِ فاتحک" "بھارت ویر سپہدار ہیم چند" "دروپدی کا چیر پنچ وٹی کا ایک سین" "راجہ آج کا ولاپ" "اشوک بن میں" "گورو گوبند سنگھ" وغیرہ جنھیں پڑھکر زندگی کی روح رگ و ریشہ میں جاری و ساری ہو جاتی ہے۔

حضرت برق نے "شاعر" کے عنوان سے ایک نہایت پُرلطف نظم لکھی ہے جو تعریف و توصیف سے قطعی مستغنی ہے "رازِ آفرینش" کے عنوان سے جو نظم اس مجموعہ میں درج ہے وہ بھی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اِن نظموں کے علاوہ اس مجموعہ میں حضرت برق کی کچھ غزلیں اور قطعات بھی ہیں۔ شروع میں متعدد اہل قلم نے مقدمے لکھکر حضرت برق کے سوانح حیات اور اُن کے کلام پر روشنی ڈالی ہے۔ آخر میں برق مرحوم کی ناوقت وفات پر مختلف حضرات کے قطعاتِ تاریخ، نوحے اور مرثیے ہیں شروع میں حضرت برق کا فوٹو بھی دیا گیا ہے۔ غرض ہر حیثیت سے یہ مجموعہ جو چھوٹی تقطیع کے ۲۰۴ صفحات پر چھپا ہے قابل قدر ہے قیمت عہ، ملنے کا پتہ: مسٹر ستیش چندر سکسینہ طالب بی. اے، چاوڑی بازار، گلی بتاشاں دہلی۔

فردوسِ تخیل

یہ نواب بہادر فضل اللہ خاں صاحب مرحوم کی صاحبزادی زاہدہ خاتون شروانیہ آنجہانی کے سبق آموز کلام کا ایک دلپذیر مجموعہ ہے۔ آپ نے صرف اٹھائیس سال کی عمر پائی اور ۱۹۲۲ء میں انتقال ہوگیا۔ آپ کا کلام ان کی زندگی ہی میں ملک کے وقیع رسالوں میں شائع ہوتا رہا۔ مگر زندگی بھر آپ کا نام اور تخلص نزہت پردۂ راز ہی میں رہا۔ اُن کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے پہلو میں ایک دردمند دل رکھتی تھیں اور پُرانے خیالات رکھنے والے مردوں کا جو برتاؤ صنفِ نازک سے ہوتا ہے اُس سے ہمیشہ نالاں رہیں۔ عورتوں کی فریاد جو "آئینۂ حرم" کے نام سے شائع ہوئی ہے بیحد دردانگیز ہے، پردہ نشین عورتوں کا اس سے بہتر نقشہ اور کیا کھینچا جا سکتا ہے۔ کہتی ہیں:-

کیا کہوں کیسے الم دیدہ و ناشاد ہیں ہم — خستۂ جور ہیں ہم کشتۂ بیداد ہیں ہم
تختۂ مشق سناں بازیِ صیاد ہیں ہم — آدمی کاہے کو ہیں پیکرِ فولاد ہیں ہم
بے حس و بے حرکت، بے بس و سرافگندہ
"بچہ در دستِ جواں، مردہ بدستِ زندہ"

ہم کو کیا علم کہ کیا شئے ہے مزہ دنیا کا — نہ یہ معلوم خوشی نام ہے کس چڑیا کا
آہ! بے جرم ہمیں صنفِ قوی نے تاکا — تختۂ مشق بنایا ستم بے جا کا
آج انساں کے فضائل سے ہیں دونوں محروم
ایک تفسیرِ "جہول" ایک ہے تفسیرِ "ظلوم"

قرآن شریف میں "ظلوماً جہولا" آیا ہے۔ مرحومہ نے اس مصرعہ میں مرد و عورت کے لئے جہول و ظلوم کے الفاظ استعمال کرکے کیا خوب دادِ فصاحت دی ہے۔ ہندوستان میں جس قسم کا پردہ رائج ہے وہ گویا حبسِ دوام ہے۔ چنانچہ اس منحوس پردہ کی بدولت کتنی عورتیں عین عنفوانِ شباب میں نذرِ اجل ہو جاتی ہیں۔ نزہت مرحومہ نے اس پردہ کا کیا خوب نقشہ کھینچا ہے

آتشِ ظلم سے دنیا ہوئی دوزخ ہم پر — پھونک ڈالا تپِ دق بن کے غموں نے اکثر

ہیں جو تنگی میں منافق کی لحد سے بدتر
بے اجل مرتے ہیں تہ خانہ کے اندر گھٹ کر

ڈاکٹر کہتے ہیں "در کھولو، ہوا آنے دو"
سنگدل کہتے ہیں" ہرگز نہیں مرجانے دو"

ہندوستان کے مردوں کا جو برتاؤ اپنی عورتوں کے ساتھ عموماً ہے، اُس کا نقشہ ملاحظہ فرمائیے:۔

"ناقص العقل" ہمیں یہ عقلا کہتے ہیں
خود بھلے بنتے ہیں، اوروں کو بُرا کہتے ہیں

کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا کہتے ہیں
"پُردغا" کہتے ہیں، "بےمہرووفا" کہتے ہیں

کوتوالوں سے لڑیں چور، ستم ہے کہ نہیں
یہ تماشا سبب غصہ وغم ہے کہ نہیں

یہ مسدس مرحومہ کا شاہکار ہے۔ اگر ایک طرف مردوں کے لئے آئینۂ نصیحت ہے تو دوسری طرف عورتوں کے لئے بھی تازیانۂ عبرت ہے۔ اس مجموعہ میں تقریباً ڈیڑھ سو نظمیں، قطعات ورباعیات ہیں جن کے مطالعہ سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ مرحومہ کو ہر صنفِ سخن پر قدرت حاصل تھی، تاریخی مادے بھی نہایت برجستہ نکالے ہیں۔

شروع میں انیسہ ہارون بیگم شیروانیہ کا لکھا ہوا ایک مختصر دیباچہ ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرحومہ مجموعہ کو اپنے حین حیات میں خود ہی مرتب کر چکی تھیں۔ ہمارے نزدیک یہ مجموعہ نہ صرف کتب خانوں میں رکھنے بلکہ ذوق وشوق سے بار بار پڑھنے کے قابل ہے۔ لکھائی چھپائی کاغذ سب عمدہ۔ ضخامت ۳۱۲ صفحات۔ قیمت ۸؎

ملنے کا پتہ:۔ دارالاشاعت پنجاب لاہور۔

اشعارِ نظیر

حافظ شمس الدین احمد صاحب پروفیسر پٹنہ کالج پٹنہ نے نظیر اکبرآبادی کی چیدہ چیدہ نظمیں خاص طور پر طالب علموں کے لئے انتخاب کر کے اس چھوٹی سی کتاب میں یکجا کر دی ہیں۔ انتخاب میں پروفیسر صاحب نے یہ خیال رکھا ہے کہ نظموں کی زبان فارسی یا سنسکرت الفاظ سے پاک اور سلیس اُردو ہو۔ نظیر اکبرآبادی ہندوستانی زبان کے بہترین شاعر ہوئے ہیں اور اُن کے کلام پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجموعہ کے لئے پروفیسر صاحب نے جو مقدمہ لکھا ہے اس میں اُردو ہندی کی بحث میں جو ہندی کی چندی نکالی گئی ہے وہ ہمارے خیال میں بالکل فضول ہے۔ نظیر نے جو زبان استعمال کی ہے وہی اس زمانہ میں ملکی زبان تھی، نہ وہ مولویانہ اُردو ہے اور نہ پنڈتانہ ہندی بلکہ ٹھیٹھ ہندوستانی زبان ہے۔ لائق مؤلف نے نظیر کے حالاتِ زندگی اور اُن کے کلام کے محاسن ومعائب بھی درج کئے ہیں۔ لکھائی چھپائی کاغذ رسمی چھوٹی تقطیع کے پانچ جزو ضخامت۔ قیمت بارہ آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ لالہ رام نرائن لعل بک سیلر الہ آباد

شمع

یہ بڑی تقطیع کے ساڑھے چار سو صفحوں کا ایک ضخیم ناول ہے جو اے۔ آر۔ خاتون صاحبہ دہلوی کی طبع رسا کا نتیجہ ہے۔ اس کا پلاٹ بہت دلچسپ ہے اور پڑھنے والے کو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا جیتی جاگتی تصویریں آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہیں۔ ناول کی ہیروئن شمع اور منصور محمود اس کے ہیرو ہیں۔ شمع کے چچا کا بیٹا قمر الحسن رقیب روسیاہ ہے جس نے اپنی کندۂ ناتراش اور جاہل ماں کے کہنے سننے سے سب کو پریشان کر دیا۔ دوسری طرف خود شمع اور اس کے والد اختر حسن جج اور منصور شرافت و انسانیت کے مجسمے ہیں۔ اس ناول کے دو کیرکٹر خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ایک ظاہر جن کی بذلہ سنجیاں روتوں کو ہنسا دیتی ہیں، دوسرے خان بہادر غلام مصطفےٰ صاحب وکیل جنھوں نے اختر حسن کی دوستی کا حق ادا کر دیا اور شمع کو بچانے کیلئے عجیب و غریب قانونی چال کھیلی۔ شمع کی انّا بوا ہرمزی نے بھی خوب حقِ نمک ادا کیا۔ قمر الحسن کی چالاکیاں اور عیاریاں دیکھنے کے قابل ہیں۔ اس ناول کی کئی اور خصوصیتیں بھی قابل ذکر ہیں، ایک یہ کہ اس میں مغربی فنِ ناول نگاری کی تقلید نہیں کی گئی ہے اور مختلف کیرکٹروں کی خصوصیات خود ان کی باتوں سے دکھائے گئے ہیں اور فضول طوالت سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ اس ناول میں مسلم شرفا کی تہذیب اور روزمرہ معاشرت کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس میں رنج و خوشی کے دونوں پہلو خوش اسلوبی سے سمو دیئے گئے ہیں۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ رسمی ہے، قیمت عہ/ ملنے کا پتہ:۔ اے۔ آر۔ خاتون۔ جلال منزل، کوچۂ پنڈت۔ دہلی۔

گرام سدھار

مولوی عبد الشکور صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی کو ادبی اور تعلیمی دلچسپیوں کے ساتھ ساتھ گرام سدھار کی بھی لو لگی ہوئی ہے۔ چنانچہ گرام سدھار کے موضوع پر آپ کی یہ دوسری کتاب ہے جس میں دیہات کی مالی و اقتصادی حالت پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کا سب سے مفید باب وہ ہے جس میں بیماریوں کے انسداد کی آسان ترکیبیں بیان کی گئی ہیں۔ لکھائی چھپائی، کاغذ عمدہ ۱۲۰ صفحہ ضخامت۔ قیمت ۶/ ملنے کا پتہ: منیجر اسلامیہ گرلس ہائی اسکول بریلی

"مصنف"

اگست ۱۹۴۱ء میں "مجلس مصنفین" کے نام سے علی گڈھ میں ایک ادبی مجلس قائم ہوئی ہے۔ یہ رسالہ اسی مجلس کا ماہی پرچہ ہے۔ اس نمبر میں آٹھ مضامین نثر اور دو نظمیں ہیں، جو سب ارکان مجلس کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں مضامینِ نثر میں "نواب دوندے خاں" "حقیقت موت" "مصر قدیم کی پہلی شاہنشاہی" "انیسویں صدی میں اردو صحافت" "کیا موجودہ تصوف خالص اسلامی ہے؟" بڑی محنت اور تحقیق سے لکھے گئے ہیں۔ ہم کو امید ہے کہ اردو ادب کی توسیع و ترقی میں مجلس مصنفین علیگڈھ کا حصہ قابل قدر ہوگا۔ اور اس مغز رسالہ کے آئندہ نمبر اس سے بھی زیادہ دلچسپ اور سبق آموز ہونگے۔ "مصنف" کی سالانہ قیمت للعہ/ ہے۔ شائقین سید الطاف علی بریلوی سلطان جہاں منزل مسلم یونیورسٹی علیگڈھ سے طلب فرمائیں۔

آدم و حوّا کی پیدائش

از شاعرِ اعظم حضرت جوش ملیح آبادی

حضرت جوش کی زیرِ تصنیف کتاب "حرفِ آخر" کے ایک حصہ میں زمین پر آدم و حوا کے نزول کی کیفیتیں دکھائی گئی ہیں، اور اس منظر کا خاکہ پیش کیا گیا ہے کہ جب آدم اور حوّا زمین پر آتے ہی مسکراتے ہیں تو کیا کیفیت پیدا ہوتی ہے۔
(۱-ن)

(۱- آدم کی پیدائش)

ذرّہ ذرّہ سے اُٹھی اِک تازہ موجِ زندگی ... آسمانوں نے علم کھولے زمیں نے سانس لی
بھاپ بن کر چھائی میدانوں پہ روحِ بحر و بر ... دید کی خاطر پہاڑوں نے اُٹھائے اپنے سر
خفتہ میدانوں میں شہروں کا تخیّل جاگ اُٹھا ... ایک پرتو سا در و دیوار کا پڑنے لگا
لیلیٔ تعمیر کا رخسار لَو دینے لگا ... گونج اُٹھی کہسار کے سینے میں تیشہ کی صدا
کمِ قدرت کو لئے موجِ ہوا آنے لگی ... "باادب" "باہوش" کی پیہم صدا آنے لگی
دقِ ایجاداتِ صنعت کا بگل بجنے لگا ... آئی طبلِ عالمِ خاکی سے "دوں" "دوں" کی صدا
نسنائی سینۂ فولاد میں تیغِ دو دم ... پتھروں میں کسمسائے ناتراشیدہ صنم
نپے میثاقِ اطاعت کے سنانے کے لئے ... آئیں ساری قوتیں عالم کی صف باندھے ہوئے
منے آ کے اشیاء نے بتائے اپنے نام ... ہونکتے بپھرے عناصر نے کیا جھک کر سلام
راما قدِ آدم بحر کی موجیں اُٹھیں ... تند طوفانوں کی اکڑی گردنیں خم ہو گئیں
رکے گشتی میں خواصِ این و آں مثلِ خراج ... نذر کو آیا قوائے کارفرما کا مزاج
سکی ہستی سے مؤدب ہو گئے ارض و سما ... شاہدانِ دہر نے وا کر دیئے بندِ قبا
تنی کو سینۂ ظلمت میں راہیں مل گئیں ... خاک کے در کھل گئے کانوں کی باچھیں کھل گئیں

نوعروسِ دہر نے زلفوں کو برہم کر دیا
چاند تھرّے کو جھکا سورج نے سر خم کر دیا

۲- حوا کی پیدائش

لرزیں ذرّوں نے لیں غنچوں نے آنکھیں کھول دیں
آسماں جھوما رزت کرنے لگی کمسن زمیں

سر پہ پہلی بار چمکا قوس کا رنگین پُل
گلشنِ ہستی میں پہلی بار لچکی شاخِ گُل

غنچگی نے مسکرا کر پہنا پھولوں کا لباس
چہرۂ گیتی پہ پہلی مرتبہ اُتری مٹھاس

درس پہلی بار دنیا کو لطافت کا ملا
اوّلیں نغمہ چھڑا اور اوّلیں غنچہ کھلا

گل کے پیراہن سے پہلی بار نکلی بوئے گُل
تاک کے خوشے سے پہلی بار ٹپکا خونِ مُل

اِک لگاوٹ سی ہوئی پیدا ابھی جو بڑھ کے لاگ
نَے سے پہلی بار نکلی نغمۂ سوزاں کی آگ

ابتدائی شدتِ احساس میں ڈوبا ہوا
دیدۂ ارض و سما سے اوّلیں آنسو گرا

اور پھر گھر کر تمناؤں کا بادل آگیا
گھر کے گرجا اور گرج کر اک جہاں پہ چھا گیا

پھر تو برسانے لگا ذوقِ جنوں ذوقِ نگاہ
خاک پر اُٹھا جوانی کا جمالِ بے پناہ

عربدہ بیچے ہوئے برنائی اٹھلانے لگی
شوخیاں مچلیں جوانی رقص فرمانے لگی

کانپتی تپتی دہکتی حسرتیں پیدا ہوئیں
زندگی کی طبعِ کافوری میں شمعیں جل اُٹھیں

عرش نے بربط اُٹھایا فرش کی چمکی جبیں
رسمسائے ماہ و انجم گنگنائے بحر و بر

جوہروں میں دل نشیں بُندے جھمکنے لگے
سینۂ الماس میں کنگن جھلکنے سے لگے

زمزمِ ریشم کی تمنا دہر پہ چھانے لگی
اِک خیالی سرسراہٹ کی صدا آنے لگی

سینۂ دوشیزۂ گیتی کے اندر ناگہاں
کروٹیں لینے لگا ذوقِ حریر و پرنیاں

عارضِ بے آب گوہر پر صباحت چھا گئی
روئے زر پر خون یوں دوڑا کہ سُرخی آگئی

سینۂ کہسار میں بندھنے کی تمنا جاگ اُٹھی
قلبِ سیم و زر میں اک پازیب سی بجنے لگی

دفعتاً عالم کی پہنائی پہ گویا چھا گئی
پاک بچوں کے تبسم کی سہانی چاندنی

کھلکھلا اُٹھے شگوفے چہچہا اُٹھے طیور
نغمہ گونجا زیر و بالا رنگ دوڑا دُور دُور

جھوم کر گھنگھور ساون کی گھٹا آنے لگی
زمزمہ برسے، فضا چہکی، صبا گانے لگی

جدید شاعری

از مسٹر محبوب حسین، بی۔اے (عثمانیہ)

ذہنی اور فکری ارتقاء نے تنقید اور معیار کے نئے نئے اصولوں کی تشکیل کے بعد شاعری کی جامع اور مبسوط تعریف ہیگل سے نامور فلسفی کی زبان میں یوں ادا کرائی ہے کہ "شاعری کے مجسمے کا پاؤں زمین پر اور سر آسمان پر رہنا چاہیئے"۔ ہیگل کا منشا اس سے مافوق الفطرت مجسمہ نہیں ہے بلکہ وہ شاعری میں روزمرہ کی زندگی کا عکس، ماورائی عناصر کے امتزاج کے ساتھ دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ شاعری میں تخیل اور واقعیت دونوں کا میل چاہتا ہے کہ ممتاز اور زندہ جاوید ادب کی یہی خوبیاں ہیں

اُردو شاعری کی پرورش جاگیرداری اور سرمایہ داری کی آغوش میں ہوئی ہے اس لئے وہ ادب برائے ادب نہیں ہے، بلکہ ادب برائے حیات ہی ہے۔ لیکن چونکہ وہ ایک مخصوص نظامِ تمدن کی ترجمان اور سوسائٹی کی مقتدر شخصیتوں کی روزمرہ زندگی کا عکس رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اکثریت سے بیگانہ رہی اور اس کو صحیح حیات کا ترجمان نہیں کہا جا سکتا ہے۔ وہ مخصوص طبقہ کی ملکیت رہی ہے جو سماجی امتیازات کا مالک رہا ہے۔ اُن کی عشرت کوشیوں اور شادکام زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرتی رہی۔ جب کبھی شاعری پر عقلیت نے قبضہ کرنا چاہا تو وہ اپنی عیش پسند زندگی کے انجام سے سہم کر تصوف اور غیر فانیت کی پناہ میں چلی گئی، اور فراری ادب پیش کیا۔ قدیم یا رجعت پسند شاعری، ادب برائے حیات ہی کی ترجمان ہے لیکن جس حیات کی ترجمانی میں شاعری نے حصہ لیا اس کا تعلق سوسائٹی کے مقتدر طبقہ سے تھا جس نے شاعری کو اپنے مزاج کا مطیع رکھا۔ اسی وجہ سے شاعری نے اپنا اصلی مقام جو اسے مذہب اور فلسفہ کے مانند حاصل تھا کھو دیا۔ مولانا حالیؔ نے قدیم شاعری کا صحیح نقشہ اس شعر میں کھینچ دیا ہے:۔

یہ شعر اور قصائد کے ناپاک دفتر   عفونت میں سنڈاس سے ہیں جو بڑھ کر

انھیں خرابیوں کے بطن سے جدید شاعری نے جنم لیا ہے۔ حالیؔ پہلے باغی تھے جنھوں نے داخلی خارجی، فکری اور فنی ہر اعتبار سے شاعری کو قدامت سے آزاد کیا۔ محمد حسین آزاد نے اُردو کی سب سے پہلی نظم ۱۸۶۶ء میں لکھی۔ حالیؔ نے نفس پرست عشق، دیدہ زیب حُسن، آشیانہ اور قفس اور برق و خرمن کو ماضی کا سرمایہ سمجھکر وہیں رکھا اور فطری، توصیفی، اصلاحی اور قومی شاعری کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ حالیؔ کا یہ ادبی اجتہاد شعر کے ظاہر اور باطن دونوں میں انقلاب پیدا کئے بغیر نہ رہ سکا۔ اور شعر کی ظاہری صورت یعنی زبان، استعارہ

اور کنایوں، نزاکتوں اور لطافتوں کی ایک چیستان نہیں رہی بلکہ اس کو جمہور کے مزاج کی مناسبت سے استعمال کیا گیا۔ شعر کا باطن یعنی خیال، عشق کی عنوان انگیزیوں یا یاس اور دل کی صعوبتوں کے بجائے، ماحول کی تفسیر بن گیا اور یہ اصول پیش نظر رہنے لگا کہ شاعر قوم کی آنکھ ہوتا ہے۔ شاعری اگر جزو پیغمبری ہے تو اسے صرف صنفی میلانات کے محوروں پر نہیں گھومنا چاہیئے۔ پیغمبرانہ صلاحیتیں ابن آدم میں شاعر کو اسی لئے ودیعت کی گئی ہیں کہ وہ اُس کا پیام اور اُس کا ترانہ بانگِ درا بن کر کاروان کو جادہ پیما بنائے۔

ماحول کا یہی تقاضا ہے کہ ادب خواہ وہ نثر ہو یا نظم زندگی سے براہ راست تعلق پیدا کرے۔ سرسید، آزاد حالی۔ اسمٰعیل میرٹھی۔ منتر۔ اکبر الہ آبادی نے لکیر کی فقیری کے بجائے نئے ادبی رجحانات پیدا کئے۔ ان رجحانات کا مدعا سماجی زندگی میں انقلاب تھا۔ ذہنی انقلاب تمام قسم کے انقلابوں کا نقیب اور پیش رو ہوتا ہے، چنانچہ ذہنی اور فکری صلاحیتوں کو سرمایہ داری سے نجات دلا کر اُس کے اصلی خط و خال میں پیش کرنا اور سماجی فلاح کی تعمیر میں ہمہ تن متوجہ ہونا اِسی انقلاب کا اہم مقصد ہے۔

حالی کے زمانہ میں شاعری میں جو تغیرات ہوئے وہ فنی اور فکری، داخلی اور خارجی دونوں قسم کے تھے درحقیقت یہ شاعری کی ہیئت اور مادّے میں مکمل تبدیلی کی ابتدا تھی۔

جدید شاعری کا یہ انقلاب گزشتہ جنگِ عظیم کا رہینِ منت ہے۔ اس جنگ کو نتائج کے اعتبار سے وہی اہمیت حاصل ہے جو تاریخ میں فتح قسطنطنیہ کو حاصل ہے۔ جنگ کے بعد عالمگیر سیاسی اور اقتصادی بحران، ہندوستانی قومی تحریک، تحریک خلافت، ترکِ موالات، اور عام بیداری نے یہ شعور پیدا کیا کہ ہماری سماجی اور سیاسی زندگی انتشار اور بربادیوں کا مجموعہ ہے۔ اگر تہذیب، ادب اور اقتصادی و سیاسی عظمت کو زندہ رکھنا ہے تو اس بات کی جد و جہد کرنی چاہیئے کہ ادب زندگی کی ترجمانی کرے۔ ہمارے شاعر قومی بیداری کا صور پھونکیں۔ اسی ماحول کی بدولت بنگال کا نذر الاسلام جو جنگ عظیم کا ایک سپاہی تھا باغی شاعر بن گیا۔ اُس کے آتشین نغمے بنگال میں جو ہندوستان کا اطالیہ ہے حریت اور آزادی کی فضا پیدا کرنے لگے۔ اردو شاعری میں جوش۔ آنند نرائن ملا، احسان دانش، مجاز، مخدوم، ساغر، فیض۔ سلام۔ علی سردار، علی جواد وغیرہ کا نام اس سلسلے میں ہمیشہ زندہ رہیگا کہ جدید شاعری کے یہی پیشرو ہیں جو سماجی زندگی کی بنیادوں کو طبقاتی امتیازات سے ہٹا کر یگانگت کے رنگ و وحدت میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔

جدید شاعری جو کبھی قومی اور اصلاحی تھی آج اشتراکی ہو رہی ہے۔ یہ ماحول کے تقاضوں کی صدائے بازگشت ہے۔ حالی کی شاعری کا رجحان آج باقی نہیں ہے۔ جدید شاعری کے موجودہ رجحانات پر عالمگیر اثرات کا گہرا نقش ہے۔ انھیں اثرات کی وجہ سے وہ اشتراکی ہوتی جا رہی ہے۔ فاشی نظام حکومت نے جب ادب کو اپنے پروپگنڈہ کا آلہ بنایا اور ہٹلر نے یہ کہا کہ "ادب عیش اور تفریح کی چیز ہے" اور شاعری صرف "ذہنی خوش روزہ" ہے،

ف Intellectual Holiday

بہت سے شاعر، ادیب اور فلسفی ان ممالک میں فاشیت کے پرچارک یا مبلغ بنائے جانے والے تھے، لیکن انھوں نے اس کا موقع نہیں دیا اور فاشی خطرے سے (جو ادب اور آرٹ کا جانی دشمن ہے) بچنے اور جدید ادبی رجحانات کی بنیاد ڈالنے کے لئے ایک انجمن قائم کی۔ اس تحریک اور اس انجمن کا اثر ہندوستانی ادب پر بھی پڑا۔ اور جدید ادب کی تحریک زور و شور سے شروع ہوئی۔ ہماری نثر اور ہماری شاعری نے اشتراکیت کا اس لئے سہارا لیا کہ اس میں واقعیت نگاری ہے، اور سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ ہمارے دیکھتے دیکھتے روس کے سیاسی اور سماجی نظام نے جو اشتراکیت پر مبنی ہے مزدوروں اور کسانوں کو طاقتور بنا دیا ہے اسی زمانہ میں ہندوستان میں قومی کانگریس نے پہلی مرتبہ ۱۹۳۵ء میں اشتراکی اصولوں کو پسند کیا اور کانگریس میں ایک اشتراکی جماعت کی بنیاد پڑی۔ مزدوروں اور کسانوں کی عقیدت کا سبب وہ اثرات ہیں جو احمد آباد اور بمبئی میں مل مزدوروں اور بہار میں قحط کی وجہ سے کسانوں پر پڑے۔ مزدوروں کی آئے دن کی ہڑتالوں، ٹریڈ یونین کے قانون اور بہار میں عدم ادائی لگان کی تحریک نے ہر صاحب فکر کو مزدوروں اور کسانوں کی حالت پر غور و فکر کرنے پر مجبور کیا چنانچہ جدید شاعری بھی اشتراکیت کی طرف مائل ہو گئی۔ بہرحال مزدور اور کسان ہی موجودہ اردو شاعری کے موضوع ہیں۔ چونکہ ہندوستان کے یہ عوام انتہائی افلاس وفلاکت میں گرفتار ہیں اس لئے ان کی ناداری و ادبار کے مختلف پہلو ہی نئی شاعری کے روح رواں ہیں

اس اثر اور میلان کو قبول کر کے شاعری نے یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ زندگی ایک عضویاتی (organic) حقیقت ہے اور اگر ادب اور زندگی کا ساتھ لازم و ملزوم ہے تو ادب کی حیثیت بھی ایسی ارتقا پسند حقیقت کی ہونا چاہیے جو زمانہ کی داخلی اور خارجی تبدیلیوں کی پابند رہے۔

جدید شاعری نے جہاں واقعی دنیا کی صحیح عکاسی کر کے رجعت پسندی کے طعنوں سے اپنا دامن بچایا ہے وہاں اس پر بے شمار اعتراضات بھی ہوئے ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ شاعری ایک لطیف فن ہے جس میں سیاسیات اور اقتصادیات کے خشک مسائل بیان کرنا آرٹ کا گلا گھونٹنا ہے۔ اور موجودہ شاعری جو اجتماعی شعور کی ترجمان ہے انفرادیت کی دشمن ہے۔ بعض لوگ موجودہ شاعری کو سیاسی پروپیگنڈا سمجھتے ہیں اور عصری رجحانات کی وجہ سے وہ ماورائی عناصر جو شعر کو ہر عہد اور ہر قوم کی ملکیت بنا دیتے ہیں اس میں مفقود پاتے ہیں۔ مگر ان تمام اعتراضات میں وہی فراری ذہنیت کارفرما ہے جو زمانہ کی صعوبتوں کا مقابلہ نہیں کرنا چاہتی جو الفاظ کے طلسم اور زور بیان کے دھن میں حقیقت سے آنکھ بند کرنا چاہتی ہے، ورنہ وہ ادب اور وہ شاعری ہرگز ذی روح نہیں کہی جا سکتی ہے جو ماحول کی دشمن ہو۔ کارل مارکس نے سچ کہا ہے کہ (A man thinketh as he is) ہر شخص وہی سوچتا ہے جو اس کا ماحول اسے بناتا ہے

اس عہد کے فنونِ لطیفہ کے تمام شعبوں کا تعلق جیتی جاگتی زندگی سے ہے اور وہ چیز جو ہماری زندگی سے تعلق نہیں رکھتی ہے فنونِ لطیفہ میں شمار نہیں کی جاسکتی ہے۔

ارسطو نے اسی فنِ لطیف کے متعلق کہا ہے کہ All art is the imitation of Nature یعنی تمام فنونِ لطیفہ فطرت کے مظاہروں کے پرتو ہیں، سیاسیات اور اقتصادیات سے بھری ہوئی شاعری بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں کی جاسکتی ہے۔ درحقیقت ابھی تک معیار کی اس تبدیلی کا ہماری ذہنیت پر پورے طور سے اثر نہیں پڑا۔ چنانچہ آجکل بھی شاعری کو اسی زاویۂ نگاہ سے دیکھا جاتا اور اسی کسوٹی سے پرکھا جاتا ہے جو آج سے بہت دن پہلے تنقید اور تبصرہ کا معیار تھا۔ ٹالسٹائی جیسا فراری ادیب اسی فن کے متعلق اپنے نظریۂ حسن کاری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "ادب اور شاعری کو عام فہم ہونا چاہیئے تاکہ کم سواد اور کثیر التعداد انسانوں کے لئے فائدہ بخش ہوسکیں" "آرٹ کی یہی معراج ہے کہ اس میں اتنی وسعتیں ہوں کہ وہ ہر پہلو کے لطیف اور غیر جمیل اشیاء کا امتزاج ہو" آرٹ کی روح مشاہدہ اور تخیل کا سنجوگ ہے۔ یہ اعتراض محض سطحی ہے کہ جدید شاعری صرف عصری میلانات کی ترجمان ہے اور اسے تخیل کی رفعتوں سے چنداں تعلق نہیں ہے۔ ویرل نے اس خصوص میں بڑی دانشمندانہ بات کہی ہے کہ "آرٹ زندگی کے ان عناصر کے تصور کی ازسرِنو تخلیق کو کہتے ہیں جن سے انسان کو سابقہ پڑتا اور دلچسپی ہوتی ہے" قدیم شاعری نے صرف ظاہری حصہ یعنی زبان پر احسان کیا ہے۔ نادر تشبیہوں استعاروں اور ادبی لطافتوں ہی کی بنیاد پر یہ اعتراض کئے جاتے ہیں۔ بہرحال واقعہ یہ ہے کہ قدیم شاعری نے داخلی اور فکری اعتبار سے انسانیت کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا ہے اور یہ مخالف آوازیں تفکر کا نتیجہ نہیں ہیں۔

جدید شاعری کو پروپیگنڈا سمجھنا، اس کی افادیت سے ایسا صریح انکار ہے جس میں کوئی صداقت نہیں موجودہ شاعری کا سرمایہ صرف جذبات اور وجدانیات ہی کی تحریک کا باعث نہیں ہے بلکہ وہ احساس کی شدت کو بھی تیز کرتا ہے۔ اور دل و دماغ دونوں پر اثر انداز ہوتا رہتا ہے۔ علی سردار جعفری کے یہ تین اشعار جن میں صرف واقعیت کا اظہار کیا گیا ہے محض سیاسی پروپیگنڈا نہیں ہیں بلکہ ان میں مجاہدانِ وطن کی متعدد آواز سنائی دیتی ہے۔ وہ کہتا ہے:

یہ لوہے کی سلاخیں تابکے، روکیں گی ملنے سے؟ — یہ دیواریں رہیں گی تیرے میرے درمیاں کب تک؟
تمہیں کب تک نہ آنے دیگا پھاٹک جیل خانے کا؟ — مجھے تم تک نہ جانے دیں گے آخر پاسباں کب تک؟
ہمیں اس وقت تک شاید نہ ملنے کی اجازت ہو — "غلام آباد" کہلائے گا یہ ہندوستاں کب تک؟

جعفری نے ان اشعار میں اہلِ ملک کے جذبۂ ہمدردی کو بیدار کرتے ہوئے ہماری اجتماعی بے بسی کا خاموش

افسانہ بھی سُنادیا ہے۔ بہر نوع جدید شاعری صرف سیاسی یا سماجی پروپیگنڈا ہرگز نہیں کہی جاسکتی، اسکا ادب عصری میلانات اور جاوداں آرٹ دونوں کا حامل ہے۔ اس لئے کہ شعر انسان کی اچھی صلاحیتوں اور استعداد کا مظہر ہوتا ہے جس میں تخلیقی قوت نہیں وہ شاعر نہیں۔ شعری تخلیق میں صرف انسان کے میلانات ہی کام نہیں کرتے بلکہ جمالیاتی مذاق بھی مساوی طور پر کارفرما رہتا ہے۔ جمالیاتی مذاق اچھی فطرتوں میں کچھ کمی بیشی کے ساتھ ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ جدید شعرا میں فیض کو جمالیاتی اور واقعی میلانات کا وافر حصہ ملا ہے وہ واقعیت کو اس خوش اسلوبی سے تخیئل میں سمودیتا ہے کہ اُس کی شاعری "سوز میں خلوص اور تغزل میں سیاسی تفکر" کی بدولت ایک نئی اور دلنشین آواز معلوم ہوتی ہے۔ وہ رومان کے حدود میں رہ کر کس سنجیدگی سے کیسا اہم اور بلند اعلان کرتا ہے۔ جب وہ اپنے محبوب سے کہتا ہے کہ

مجھ سے پہلی سی محبّت مری محبوب نہ مانگ

گو اس کو یہ اقرار ہے کہ

میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات　　تیرا غم ہے تو غمِ دہر کا جھگڑا کیا ہے
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات　　تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے

لیکن جب وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا　　راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

تو اُسے ان گنت صدیوں کا تاریک بہیمانہ طلسم اس قدر سہما دیتا ہے کہ وہ اُن کے پیش نظر اپنی محبوبہ سے کہنے لگتا ہے

اب بھی دلکش ہے ترا حُسن مگر کیا کیجے　　لوٹ جاتی ہے اُدھر کو بھی نظر کیا کیجے
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

فیض کی ساری شاعری جو سکون اور بیداریوں کا عجیب پُرلطف مجموعہ ہے انسانیت کو اس قدر آمادۂ پیکار بنادیتی ہے کہ وہ عزم اور استقلال کا پُتلا بن جاتا ہے

غرض جدید شاعری کو صرف سیاسی پروپیگنڈا سمجھنا سخت غلطی ہے۔ شاعری قوموں کی بیداری کے لئے نقیب کا کام دیتی ہے۔ روسی انقلاب کو بیڈنائی (Bednye) کی نظموں سے بڑی مدد ملی تھی۔ اس کی واقعیتی (Realistic) نظموں نے عوام میں ایک آگ سی بھڑکا دی تھی، اسی کی بدولت ہر طرف انقلاب! انقلاب! کے نعرے بلند ہونے لگے، اور وہ فوجیں جو جنگ سے تھک گئی تھیں تازہ جوش سے جنگ میں شریک ہوکر موجودہ روس کی تعمیر میں نمایاں حصہ لینے لگیں۔ اسکے صلے میں حکومت روس نے

بیدنائی کو ۱۹۲۳ء میں سب سے بڑا اعزاز (Order of the Red flag) آرڈر آف دی ریڈ فلیگ عطا کیا، اور اسے درباری شاعر کا درجہ دیا۔ واقعی جدید شاعری اُن جذبات وخیالات کی نمایندہ ہے، جو آج ہماری سماجی، سیاسی زندگی کی اصل روح ہیں۔

جدید شاعری نے ہیئت اور فن دونوں اعتبار سے چند خاص تبدیلیاں کی ہیں۔ بے قافیہ شاعری (Blank Verse) جس کی ابتدا حالی، آزاد، شرر اور اسمٰعیل میرٹھی نے کی تھی اس ترقی پسند جماعت کے نزدیک ایک مستقل صنف بن گئی ہے، چونکہ فنی پابندیوں کی وجہ سے بعض صاحب فکر اپنے مطالب کو لطیف پیرایہ میں بیان کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ انھیں بے قافیہ شاعری سے بڑی مدد ملتی ہے۔ لیکن یہ بات بحث طلب ہے کہ اگر یہی صنفِ سخن عام و خاص میں مقبول ہو جائے تو اُردو موسیقی فنا ہو جائیگی اور صرف اسی قسم کی موسیقی باقی رہے گی جس کو فلمی دنیا ترقی دے رہی ہے۔ بے قافیہ شاعری جدید شاعری کا طرز خاص ہے، اس میں راشد، میراجی کو امتیازی خصوصیت حاصل ہے۔ نئی شاعری میں دیہاتی شاعری کیلئے بھی ایک خاص جگہ دی گئی ہے۔ چنانچہ اس صنف میں مطلبی فرید آبادی اور ماجرہ بیگم کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

بہرکیف جدید شاعری سیاسی تفکر، اجتماعی شعور، جمہوری اور جمالیاتی احساس کا ایک پُرکیف امتزاج ہے، جسے زندہ آرٹ کہا جا سکتا ہے۔ وقت کی تبدیلیاں اور ارتقائی کیفیتیں موجودہ خرابیوں کو جو ترقی پسند شعرا میں پائی جاتی ہیں رفع کر دیں گی۔ جوش جو جدید شاعری کے بہت ممتاز پیشرو ہیں، انقلاب کے جذباتی پہلو کو زیادہ اُجاگر کرتے ہیں۔ ہم کو ماننا پڑے گا کہ ہمارے بہت سے نئے شاعر بعض اوقات متضاد باتیں کہہ جاتے ہیں، یہ سب فکر اور نظر کی کوتاہیاں ہیں۔ لیکن ان سے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ

"ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں"

جدید شاعری کا دھارا انسانیت اور زندگی کا ہم آہنگ ہے اس لئے وہ مستقبل کے لئے ایک خوشگوار بشارت ہے کہ ادب، فراریت سے دُور ہو کر عقلیت، واقعیت اور تخئیل کے امتزاج سے ہماری ذہنی تربیت میں تفکر اور احساس کی نعمتیں ودیعت کر رہا ہے۔

خوشہ چینی

جب میں جوان تھا تو میری زندگی ایک پھول کی مانند تھی۔۔۔۔ پھول جو اپنی فراوانی میں دو ایک پنکھڑیاں گرا دیتا ہے اور اُسے اپنے نقصان کا کبھی کوئی احساس نہیں ہوتا کیونکہ موسم بہار کی نسیم خود اس کے دروازہ پر بھیک مانگنے آتی ہے۔

جوانی کے اختتام پر میری زندگی ایک ایسے پھل کی مانند ہے جس کے پاس باقی بچا رکھنے کے لئے کچھ نہیں ہے اور جو اپنے آپ کو اپنی تمام شیرینی سمیت قطعی طور پر پیش کرنے کا انتظار کر رہا ہے

ٹیگور

سید اصغر علی سکندر آبادی۔

سورج اور ستارے

(از منشی جگدیش سہائے سکسینہ بی۔ اے ایل ایل بی شاہجہانپوری)

۱

اِک روز یہ کہنے لگے سورج سے ستارے
چمکے نہ کبھی لعل و گہر دن میں ہمارے
انجم کوئی کہتا ہے ہمیں کوئی کواکب
ہم اصل میں ہیں گلشنِ ہستی کے شرارے
کیا چمکے، اگر رات کو چمکے بھی ذرا دیر
جب صبح ہوئی طائرِ گردوں سے سدھارے
سُنتے ہیں چمن زارِ جہاں رشکِ جناں ہے
شب کو نظر آئے نہ کبھی اُس کے نظارے
کیا خوب! جو سوتی ہوئی دُنیا کو جگائے
وہ بند کرے دیدۂ بیدار ہمارے
تابش یہ ہماری نہ تبسّم کا گماں ہو
ہم انجمِ افلاک مصیبت کے ہیں مارے
سمجھا نہ زمانے میں کوئی راز یہ اب تک
شبنم جسے کہتے ہیں وہ آنسو ہیں ہمارے

۲

سورج نے کہا اپنی حماقت سے ہو مغموم
رہتا نہیں دل شاد کبھی شاکیِ مقسوم
جو قلب کو فطرت کا مخالف ہیں بناتے
ناقص ہیں وہ افکار، وہ اقوال ہیں مذموم
ڈرتا ہوں کہیں دن کو چمکنے کی تمنّا
کر دے نہ تمہیں رات کی تابش سے بھی محروم
زنہار تمہیں درسِ تجلّی نہ ملے گا
گر صبح کو ہو گے نہ مرے نور سے معدوم
اسرارِ بقا موت کے پردے میں نہاں ہیں
افسوس کہ تم کو یہ حقیقت نہیں معلوم
گر شمعِ لگن بادِ سحر سے نہ بجھے گی
کس طرح دوبارہ وہ سرِ شام جلے گی

جذبات حسرت

کرشمہ تھی کا احتیاطِ عشق میں ہے غم
ہم سے اظہارِ مدعا نہ ہوا
تم جفا کار تھے کرم نہ کیا
ہم وفادار تھے، جفا نہ ہوا
آرزو تیری برقرار رہے
دل کا کیا ہے رہا رہا نہ رہا
راہ و رسمِ وفا وہ بھول گئے
اب ہمیں بھی کوئی گلہ نہ رہا

ترقی کا راز

(از حضرت نجم آفندی)

تگ و دو خوب کی انسان نے ارضی شاہراہوں میں
ستارے اب کھٹکتے ہیں ترقی کی نگاہوں میں

جگہ کافی نہیں حرص و ہوس کا پیٹ بھرنے کو
ابھی اک اور دُنیا چاہیئے برباد کرنے کو

کوئی مشکل نہیں مشکل کہ سودا ابھی ہی سر بھی ہے
نگاہِ دُور بیں مریخ پر بھی چاند پر بھی ہے

ہمارا ذوقِ استبداد آخر رائیگاں کیوں ہو
زمین ماہ پر فطرت ہی تنہا حکمراں کیوں ہو

نئی سائنس کی ایجاد لے جانا ضروری ہے
وہاں بھی یہ شعاعِ مرگ پہونچانا ضروری ہے

یونہیں غرقِ سکوں قدرت کے شہپارے نہ رہ جائیں
فسادِ ارض سے محروم سیارے نہ رہ جائیں

مخل ہو درد کی آواز بھی اور خون کی بُو بھی
فضا کے مضطرب کرنے کو آہیں بھی ہوں آنسو بھی

مرتب کشمکش افلاس کی سرمایہ داری کی
مسلسل علم کی بڑھتی ہوئی ضو اور تاریکی

دماغِ ملک گیری اور مزاجِ کارفرمائی
جنوں نیرو کا اور چنگیز خانی وحشت آرائی

تعیّن پر خدا کے نامناسب ناروا جھگڑے
خدا کے نام سے مذہب پہ بے حکمِ خدا جھگڑے

زمانہ کا تلاطم کہہ رہا ہے مدعا یہ ہے
ترقی کا بہانہ ہے اور انساں چاہتا یہ ہے

فرازِ دہر کے تیور سے کیوں عیشِ سکوں ٹپکے
زمیں پر چرخ کی پُرنور قندیلوں سے خوں ٹپکے

جذباتِ منوّر

روشنیِ ازل اس نور کے پردے میں ہے
کون یہ شمع سرِ طور کے پردے میں ہے

ہو گئے جلوۂ مہتاب سے تارے محروم
تیرہ بختی شبِ دیجور کے پردے میں ہے

چاہیئے حسنِ ازل کو دلِ صافی کا حجاب
شمع کا نور بھی کافور کے پردے میں ہے

ایک ہی جام نے یہ رازِ نہاں کھول دیا
بیخودی بادۂ انگور کے پردے میں ہے

جامۂ زہد سے بھی رنگِ تمنا نہ گیا
حرصِ دنیا ہوسِ حور کے پردے میں ہے

لیونارڈو ونسی

(از سر ولیم اربن۔ مترجمہ چودھری اکبر علی، ایم۔ اے)

اطالیہ کا مشہور مورخ وساری لکھتا ہے کہ شاذ و نادر ہی قدرت کسی ایک شخص واحد کی ذات میں حسن، خوبی اور قابلیت کے تمام اوصاف جمع کرتی ہے تاکہ اُس کا ہر کام اس بات کا ثبوت ہو کہ اُس کی ذہانت و ذکاوت کسی انسانی کوشش کا نتیجہ نہیں بلکہ عطیۂ خداوندی ہیں۔ یہ ساری خوبیاں ڈی ونسی کی ذات میں یکجا نظر آتی ہیں۔ اُس کے ذاتی حسن اور اُس کی وجاہت کی تعریف مبالغہ سے بالاتر ہے، اُس کی قابلیت اس درجہ مسلّمہ ہے کہ وہ ہر مشکل کو چشم زدن میں حل کر دیتا تھا۔

کہتے ہیں کہ اُس کی دلکش گفتگو سننے والوں کے دلوں کو موہ لیتی تھی۔ وہ اپنے دائیں ہاتھ سے گھوڑے کے سخت سے سخت سُم کو اس آسانی سے موڑ سکتا تھا کہ گویا وہ سیسے کا بنا ہوا ہے۔ دیو کی سی قوت اور شیر کی سی جرأت کے ساتھ ساتھ اس کے سینے میں ایک نرم و نازک اور ذی حس دل تھا وہ بے زبان جانوروں سے بیحد پیار کرتا تھا اور انھیں بڑی چاہت سے پالتا تھا۔ شاعرانہ طبیعت ہونے کی وجہ سے وہ اُنھیں پنجروں میں بند نہیں دیکھ سکتا تھا بلکہ اکثر اوقات وہ پرندوں کی منڈی میں چلا جاتا اور بہت سے پرندوں کو خرید کر اُنھیں کھلی فضا میں چھوڑ دیتا۔

وہ ایک نقاش اور بُت تراش تھا جس کے کمال فن نے بڑے بڑے کامل الفن اُستادوں کو مات کر دیا ایک سائنس داں اور موجد تھا جس کے نظریات اور اکتشافات نے دنیا کی معلومات میں مستقل اضافہ کیا۔ عملی حیثیت سے وہ ایک انجینیر بھی تھا اور نہایت آسانی اور کامیابی سے بڑے بڑے آلات حرب بنا سکتا تھا۔ اس کے ساتھ وہ ایک باکمال شاعر، نغمہ نگار اور موسیقی داں بھی تھا۔ سائنٹسٹ۔ ناچ اور رقص میں بھی وہ یکتائے روزگار تھا۔ علم کیمیا سے بھی اُسے حیرت انگیز واقفیت تھی، اُس نے اناٹومی پر پہلی معیاری کتاب لکھی تو پھر کیا تعجب کی بات ہے کہ اُسکی ذات والاصفات نہ صرف اُس کے معصروں کے لئے بلکہ آئندہ نسلوں کے لئے وجہ حیرت بنی رہی۔

ذہانت ہمیشہ تلون پسند ہوتی ہے، لیونارڈو بھی بچپن میں اپنے باپ پیرو ڈا ونسی کے لئے بڑی پریشانی کا باعث بنا رہا۔ یہ ۱۴۵۲ء میں پیدا ہوا تھا، اس کا باپ ایک شریف گھرانے سے تعلق رکھتا تھا جس کی فلورنس میں کافی عزت تھی۔ اسکول میں لیونارڈو کے اُستاد کہا کرتے تھے کہ وہ بڑا متلوّن مزاج اور وہمی لڑکا ہے۔ وہ ایک ہی وقت میں بہت سی چیزیں پڑھنا شروع کر دیتا اور تھوڑے دنوں بعد اکتا کر سب کو چھوڑ دیتا تھا۔ لیکن یہ عجیب

بات تھی کہ گو وقتاً فوقتاً اُس نے کتنی ہی چیزیں شروع کرکے چھوڑ دیں لیکن ڈرائنگ اور ماڈلنگ (نمونہ سازی) کی مشق کو اُس نے ہمیشہ جاری رکھا۔ ایک دن اُس کا باپ ونسی نقشہ کشی کے چند نمونے اپنے مشہور نقاش دوست وراچیو کے پاس لے گیا۔ وراچیو ان نمونوں کو دیکھکر حیران رہ گیا اور بڑی خوشی سے لیونارڈو کو اپنی شاگردی میں لینا منظور کر لیا
ایک دن لیونارڈو کے اُستاد سے والمبیرازو کے پادریوں نے فرمایش کی، کہ وہ اس واقعہ کی تصویر کھینچ دے جب سینٹ جان نے حضرت عیسٰی کو بپتسمہ دیا تھا۔ کام کی کثرت کی وجہ سے اُستاد شاگرد سے کہنے لگا کہ باقی تصویر تو ختم ہوگئی ہے صرف ایک فرشتہ کی تصویر بنانا باقی ہے تم اس کی تصویر بناکر اس کام کو ختم کرڈالو۔
جب لیونارڈو نے کام ختم کیا تو حُسن وخوبی میں اُس کے بنائے ہوئے فرشتہ کی تصویر دوسری تصویروں سے بڑھ چڑھکر تھی۔ بڈھے اُستاد کو بظاہر تو خوشی ہوئی اور اُس نے دل کھول کر شاگرد رشید کو داد بھی دی لیکن اندر ہی اندر اُس کا دل اس بات سے جل گیا کہ ایک حقیر و کم عمر بچہ کمال فن میں اُس سے بازی لے گیا۔ بہر حال بڈھے اُستاد نے بادل ناخواستہ اپنی ہار مان لی، کہا جاتا ہے کہ اُس کے بعد اُس نے کبھی موقلم کو ہاتھ نہ لگایا۔
اُس وقت سے لیونارڈو کی شہرت پھیلتی گئی اور روما کے شرفا و رؤسا اُس کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ سنہ ۱۴۹۳ء میں ڈیوک لڈوا کو نے اُسے میلان آنے کی دعوت دی۔ ڈیوک مذکور مصور کی قابلیت اور اُسکی شخصیت سے بہت متاثر ہو چکا تھا۔ چنانچہ میلان ہی میں لیونارڈو نے اپنی مشہور عالم تصویر حضرت عیسٰی کی آخری دعوت (Last supper) بنائی۔ اس تصویر کے لئے اُس نے اُس لمحہ کا انتخاب کیا جب حضرت عیسٰی کے تمام حواری یہ معلوم کرنے کے لئے بیچین ہو رہے تھے کہ کون شخص اپنے آقا سے غداری کرے گا۔
لیونارڈو کے موقلم میں حیرت انگیز روانی تھی تاہم وہ کوئی تیز دست نہ تھا۔ چنانچہ جب اس تصویر کی تکمیل میں اس باکمال اُستاد کو ضرورت سے زیادہ دیر لگی تو راہب اعظم کو بڑی تشویش ہوئی اور اُس نے ڈیوک سے اسکی شکایت کی اور کہا کہ مصور کو جلد سے جلد اپنا کام ختم کرنے کی تنبیہ کرنا چاہیئے ڈیوک نے لیونارڈو سے اس بات کا ذکر کیا تو اُس نے نرمی سے جواب دیا کہ نقاش کے لئے سب سے ضروری بات یہ ہے کہ کاغذ پر نقش کھینچنے سے پہلے وہ اپنے ذہن میں اس کے ہر پہلو پر اچھی طرح غور کرلے۔ تصویر تو مکمل ہو چکی ہے صرف دو چہرے بنانا باقی رہ گئے ہیں، ایک تو میں ابتک اُس آسمانی حسن و رعنائی اور تقدس کا نقش اپنے ذہن میں نہیں جما سکا جو ہمارے آسمانی باپ کے چہرے میں پایا جاتا تھا، دوسرا یہودا کا چہرہ مجھے بیحد پریشان کر رہا ہے اور میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ ایسے آدمی کا چہرہ بنانا میری طاقت سے باہر ہے جس نے اس قدر نفع اُٹھانے کے باوجود اپنے آقا کو دھوکا دیکر اُس کے دشمن کے حوالے کر دیا ہاں اگر عجلت ہی کا خیال ہے تو پھر مجھے اتنی دردسری کی کیا ضرورت ہے، یہودا کا چہرہ تو ذہن میں نہیں آتا ہے کہئے تو اس کی جگہ راہب اعظم ہی کی تصویر بنادوں۔ ڈیوک بے ساختہ ہنس پڑا، اور جاکر راہب سے

کہہ دیا کہ لیونارڈو کو اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے دیجئے۔

آخری دعوت سے بھی زیادہ مشہور لیونارڈو کی ایک اور تصویر ہے "مونالیزا"۔ مونالیزا فلورنس کے ایک سرکاری افسر کی تیسری بیوی تھی۔ صدیوں سے اس تصویر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ فنی لحاظ سے یہ نسوانیت کے لافانی معمہ کی مکمل تفسیر ہے۔ لبوں کے خفیف اور پرمعنی تبسم اور آنکھوں کی غیر محسوس شوخی اور چمک نے بڑے بڑے نقادان فن سے خراج تحسین حاصل کیا ہے۔ فطرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ جس شخص نے اتنے شوق سے یہ تصویر کھنچوائی تھی وہ اسے نہ دیکھ سکا۔ بات یہ ہوئی کہ جب شاہ فرانس کی دعوت پر لیونارڈو کو فلارنس چھوڑ کر پیرس جانا پڑا تو چلتے وقت وہ اس تصویر کو بھی اپنے ساتھ لیتا گیا تاکہ وہاں جا کر اسے پایۂ تکمیل تک پہونچائے۔ شاہ فرانس اس باکمال فن کار سے میلان ہی میں مل چکا تھا اور مدت سے اُس کی خواہش تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح اس مایۂ روزگار شخص کو دربار شاہی میں حاضر ہونے کی ترغیب دے۔ مسلسل ناکامیوں اور اہل ملک کے حسد اور ناشکری سے یہ اُستاد کامل مصور دنیا سے دل برداشتہ ہو چکا تھا، اور اپنے آخری ایام زندگی میں اسے شاہ فرانس کی دعوت قبول کرنے کے علاوہ اپنے بہبود کی اور کوئی صورت نظر نہ آئی۔ فرانسس نے بڑی گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا اور جب بوڑھا مصور بیمار ہو گیا تو کئی دفعہ تیمار داری کی غرض سے بہ نفس نفیس اُس کے مکان پر گیا۔

ایک دن معمّر مصور کو پُرانی بیماری کا دورہ پڑا، اور مہربان بادشاہ نے اس اہل کمال کی تکلیف کم کرنے کے خیال سے اُس کے سر کو اپنے دونو ہاتھوں میں لے لیا۔ لیونارڈو کی پاک روح کو جب اس بات کا احساس ہوا کہ اس سے زیادہ قدر افزائی ممکن نہیں تو اُس کی روح اپنے محسن کے ہاتھوں میں پرواز کر گئی۔ اس طرح اطالوی مؤرخ وساری کے قول کے مطابق دنیا کے اس مصوّر اعظم کا ۱۵۱۹ء میں انتقال ہوا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس مصورِ اعظم کا مشہور عالم شہکار فرانس کے نیشنل میوزیم لادرے کی زینت کا باعث ہوا۔

"بارہ بجے"

اماں، اب میں اپنا سبق ختم کرنا چاہتا ہوں، میں صبح سے اپنی کتاب پڑھ رہا ہوں، ... تم کہتی ہو کہ ابھی صرف بارہ بجے ہیں اور ابھی دیر نہیں ہوئی ہے مگر کیا تم یہ خیال نہیں کرتیں کہ جب بارہ بجتے ہیں اُس وقت دوپہر ہوتی ہے میں آسانی سے خیال کر سکتا ہوں کہ اب سورج اس دھان کے کھیت کے کونے پر پہونچ گیا ہے اور مچھلی پکڑنے والی بڑھیا تالاب کے کنارے شام کے کھانے کیلئے چولائی جمع کر رہی ہے۔

میں آنکھیں بند کرتا ہوں تو خیال کرتا ہوں کہ اس مدار کے درخت کا سایہ زیادہ کالا ہوتا جاتا ہے اور تالاب کے اندر پانی چمکدار کالے رنگ کا معلوم ہوتا ہے۔ اگر رات کو بارہ بج سکتے ہیں تو اس وقت رات کیوں نہیں آسکتی جب صرف بارہ بجے ہیں؟

ٹیگور

سید اصغر علی سکندر آبادی

حُرّیت

(از سید محمد الیاس رضوی اجمیری)

حریت انسان کا بلند ترین تخیل اور مقدس ترین کردار ہے، اس کے ابرو کی ایک جنبش سے غلامی کی زنجیریں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر جاتی ہیں، اس کا ادنیٰ اشارۂ چشم ایک انسان کو بڑے بڑے لشکروں کے مقابلہ میں عزم و ثبات کی فاتحانہ سربلندی اور کامرانیِ جاوید کا امتیازی تمغہ عطا کر دیتا ہے۔

اس کے خالِ رخسار پر سمرقند و بخارا نثار ہیں، انسانی حقوق کی حفاظت کے لئے یہ بہترین سپر ہے۔

ہر فرعون کے لئے یہ عصائے موسیٰ ہے، اس پر جو مرتے ہیں ان کے لئے یہ دمِ عیسیٰ کا کام دیتی ہے۔

اس کی راہ میں آتشکدۂ نمرود سلگ رہا ہے، مبارک ہے وہ جو خلیل وار اس میں کود پڑے کیونکہ اس کے لئے یہ گلزار اور سلامتی کا پیام ہے۔

حریت کے نزدیک آقا و غلام، امیر و فقیر، عزیز و حقیر، خورد و بزرگ، شاہ و گدا سب کا ایک مرتبہ ہے۔ یہ محمود و ایاز، بلال و صہیب، بوبکر و عمر کو ایک ہی نگاہ سے دیکھتی ہے۔

حریت خود مختاری کے بادل پر سوار ہے، ہمالیہ کی طرح اس کے کبھی نہ جھکنے والے سر پر خود شناسی کا شاندار زرنگار تاج ہے۔ اس کا گوشہ آسمان کی نیلی چھت کو چھو رہا ہے اور اس میں پریم و اخوت کے آبدار موتی ٹکے ہوئے ہیں۔

اس کی زلفوں سے آزادیِ فکر و آزادیِ رائے کی خوشبو آتی ہے اور جدھر اس کا گذر ہوتا ہے ساری فضا معطر ہو جاتی ہے۔

جب یہ زمزمہ پیرا ہوتی ہے تو ایک دنیا اس کے نغموں سے مست و مسحور ہو جاتی ہے اُس وقت اُس کے منھ سے مساوات کے پھول جھڑتے ہیں۔

یونان میں سقراط نے اسی کی طلب میں زہر کا پیالہ پیا اور بقائے دوام سے سیراب ہوا۔

فاران کی مقدس چوٹیوں سے جن دلنواز نغموں نے تمام دنیا کو امن و سلامتی کا پیام دیا وہ حریت ہی کی دعوت تھی۔ اور نہر فرات کے کنارے بھی اسی کے اشارہ سے ایک نادر و بے مثال قربانی ظہور میں آئی جس کا ہیرو آج ایک عالمگیر غیر فانی سلطنت کا تاجدار ہے۔

استبداد و شخصیت نے ہمیشہ اس کے رخ روشن پر پردے ڈالنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ آہستہ آہستہ ان کو اٹھاتی رہتی ہے۔ اب تاریکی و ظلمت کافور ہونے لگی ہے۔ اور قریب ہے کہ تمام ہندستان بلکہ تمام عالم اسکی ضیا سے پرنور ہو جائے وہ دیکھو! مشرق کے مطلع پر اس کے نور کی "چھوٹ" سے اُجالا ہو چلا ہے۔

لڑائی کا زمانہ

(حضرت سرشار کسمنڈوی)

ہوئی اک انجمن میں باریابی
جہاں کچھ جمع تھے مفلس شرابی

کسی کا سرنگوں باچشم پُرنم
کسی کے خشک لب مصروف ماتم

کسی کو ساقیِ دوراں کا شکوہ
کسی کو تنگیِ داماں کا شکوہ

کلیجے میں کسی کے ہوک اُٹھی سی
کسی کے دل میں پیہم سنسنی سی

کسی کو رنج آشفتہ سری کا
کسی کو داغ اپنی بے زری کا

نظر میں گردشِ جورِ زمانہ
بجائے مستیِ کیفِ شبانہ

کسی کے جسم میں اک جھرجھری سی
کسی کے قلب میں داخل چھری سی

رگ و پے میں غضب کی سنسناہٹ
نفس کی آمد و شد میں رکاوٹ

زباں سمٹی ہوئی، اکڑی ہوئی سی
صدا حلقوم میں جکڑی ہوئی سی

دماغوں میں خیالاتِ پریشاں
خیالوں میں ہجومِ یاس و حرماں

نہ ان کو ہوش تھا سرگوشیوں کا
نہ ان میں جوش تھا مے نوشیوں کا

اثر خطرہ میں تھا پندار کا بھی
کوئی پرساں نہ تھا سرشار کا بھی

کشش باقی نہ تھی جامِ تہی میں
یہ پہلا حادثہ تھا زندگی میں

سبو کے پیٹ میں لُو کا لگا تھا
صراحی کا گلا سوکھا پڑا تھا

بقدرِ ظرف شاید جل چکی تھی
بطِ مے کی جوانی ڈھل چکی تھی

خُم خالی پڑے گھبرا رہے تھے
نگاہِ یاس سے تھرا رہے تھے

طلسمِ نرگسِ مستانہ ٹوٹا
کہیں شیشہ کہیں پیمانہ ٹوٹا

خُموں میں گونجتی تھیں یوں ہوائیں
فضا میں جیسے شیطانی صدائیں

گلاسوں میں رطوبت تھم چکی تھی
لبِ مینا پہ پپڑی جم چکی تھی

رخِ ساغر پہ تھی گردِ کدورت
پیالہ گردشِ قسمت کی صورت

کوئی پُرساں نہ تھا اِن چنچلوں کا عجب عالم تھا خالی بوتلوں کا
صبوحی کی جبیں بھی پُرشکن تھی نہ دلکش تھی نہ جانِ انجمن تھی
پڑے تھے اس طرح کچھ کاگ سوئے کسی کو ڈس کے جیسے ناگ سوئے
تجلّی بوتلوں کی ڈھل چکی تھی یہ ٹکڑی بھی برس کر کھُل چکی تھی
یہ محفل اُف! یہ رنگ و بُو کی محفل بالفاظِ دگر اِک ہُو کی محفل
بہت سوچا، سمجھ میں کچھ نہ آیا جسے دیکھا اُسے افسردہ پایا
بالآخر جب نہ کوئی بات پائی مرے کانوں میں یہ آواز آئی
فضا دنیا کی ہو کیونکر سہانی گرانی اور ہر شے کی گرانی!!
لڑائی کا زمانہ اللہ اللہ
خدائی تازیانہ اللہ اللہ

بطِ مے

آزادیٔ رفتار خدا خیر کرے مشروط بہ پیکار خدا خیر کرے
طیارہ کی مانند بطِ مے بھی اُڑے ساقی کا یہ اصرار خدا خیر کرے

ضعفِ بصارت

یہ جنگ یہ جنگ کے شرارے توبہ دنیا میں جہنمی نظارے توبہ
ہو ضعفِ بصارت، کہ تخیل کا فریب، دن میں بھی نظر آتے ہیں تارے توبہ

فیصلہ

خونخوار زمانہ کے ہر انداز کو دیکھ اور وقت کی رفتارِ فسوں ساز کو دیکھ
کیا فیصلہ ہوتا ہے حق و باطل کا انجام کے آئینہ میں آغاز کو دیکھ

سرشار کسمنڈوی

نیرنگِ حسن [1]

(نایکا بھید)

(از مسٹر سلیم جعفر)

(قسط پنجم)

(ب) مدھیا اتکنٹھتا (मध्या उत्कण्ठिता)

आये न कन्त कहां धों रहे भयो भोर चहै बिसि जाति सिरानी।
यों पदुमाकर बूझ्यो चहै पर बुझि सकै न सकोच की सानी धारि सकै न
उतारि सकै सु निहारि सिंगार हिये हहरानी। सूल से फूलन के फर
पै फर पै तिय फूलछरी सी परी मुरझानी ॥

"پیتم نہیں آئے، کہاں رہے، صبح ہوا چاہتی ہے رات رخصت ہو رہی ہے، یہ پوچھنا چاہتی ہے مگر شرم نہیں پوچھنے دیتی، زیور نہ پہنتے بنتا ہے نہ اُتارتے، اپنا سنگار دیکھ کر دل میں بیتابی پیدا ہوتی ہے، یہ اس کی سیج پر پھول کی چھڑی کی طرح مرجھائی پڑی ہے اور پھول کانٹوں کی طرح چبھ رہے ہیں۔

(ج) پرَوڑھا اُتکنٹھتا (प्रौढ़ा उत्कण्ठिता)

बैठी रंगरावटी में हेरत पिया की बाट आये ना बिहारी भई निपट अधीर में। देवकीनंदन कहै कारी घटा घेरि आई जानी गति प्रलै की डेरानी भय भीर मैं ॥ सेज पै सदासिव की मूरति बनाय पूजी तीन डर तीन ताकी करी तदबीर में। पाखन में सांवरे सुराखन में अछैबट ताखन में लाखन की लिखी तसबीर मैं ॥

عشرت کدہ میں بیٹھی پیتم کی راہ دیکھ رہی ہے، اُن کے نہ آنے سے بے چین ہے۔ کالی گھٹائیں گھر گھر کر آ رہی ہیں، معلوم ہوتا ہے قیامت آنے والی ہے ڈر سے دل دہلا جاتا ہے، سیج پر "سداشیو" کی مورت بنا کر پوجی اور ڈر کے تین سببوں کی تین تدبیریں کیں۔ دیواروں پر "کرشن" کی سوراخوں میں "اکشے بٹ" کی اور طاقوں میں "لکشمن" کی تصویریں بنائیں کرب عشق، باد، باراں اور آتش سے اپنے بچاؤ کی یہ تدبیریں کیں۔

(د) پرکیا اُتکنٹھتا (परकीया उत्कण्ठिता)

डर ओ नगर कैधों काहू सों झगर कैधों बीचही बगर आलि सखा बिरमायो है। लीलाधर गैल में कि भूल्यो तमरेल में किधों सु

---

[1] سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو زمانہ فروری، مارچ،، ۱۹۴۲ء

काहू खेल मे सुखान आयो है॥ दुतिही सों तोष भो कि मोही सो सयेस भो कै कलह परोस भो सुघर हीरे आयो है। कलि की न चाह धों हिये न की उछाह धों सु कौन हेत नाह धों सहेट नहिं आयो है॥

یا تو شہر میں رسوائی ہوگی اس سے ڈرے، یا کسی سے جھگڑا ہوگیا یا دوستوں نے گھر جا کر بہکایا یہ بھی نہیں تو راستہ بھول گئے یا اندھیرا چھا گیا یا ساتھیوں نے کھیل میں لگا لیا، یہ بھی نہیں تو قاصد ہی سے دل خوش کیا یا مجھ سے بگڑ گئے یا پڑوسیوں کے طعن وتشنیع سے ڈر گئے، یہ بھی نہیں تو مئے عشرت سے نفرت ہوگئی یا جوش ٹھنڈا ہوگیا، آخر میکدہ میں نہ آنے کا سبب؟

(۵) گنکا اُتکنٹھتا (गनिका उत्कण्ठता)

सेज सुधारि बिछौनन झारि सुगन्ध बगारि करी मन भाई। मराडन अंग सिंगार सिंगारन हारन पौर लगी अकुलाई॥ बाहर तें चलि भीतर आवत भीतर तें पुनि बाहर जाई। जेहर के धुनि तालहि दै तिय देहरी में जनु मैन नचाई॥

سیج درست کی۔ بستر جھاڑے، خوشبوؤں سے خوب مہکا دیا، بناؤ سنگار کیا، دروازے پر بے چین کھڑی ہے۔ اندر سے باہر اور باہر سے اندر آتی جاتی ہے، پازیب کی آواز سے تال دے کر گویا عشق کا دیوتا اُسے نچا رہا ہے۔

(۶) باسک سجّا (वासक सज्जा) خود آرا، سے کشتی کے لئے مصروف آرائش ہے۔

(۱) مُگدھا باسک سجّا (मुग्धा वासक सज्जा)

भौन के कोन में भीतर जाय के बैठि सिंगार को साज बनायो।
सुन्दर सीस को फूल दियो सिर मानो मनोज को छत्र चढ़ायो॥
देखति है दुरि द्वार की ओर न काहू सखीन सों भेद जनायो॥
देखि चरित्र नवोढ़ के मैन सु आपनी कीरति को फल पायो॥

گھر کے کونے میں بیٹھ کر زیور پہنے، خوبصورت سر پہ پھول لگایا گویا دیوتائے عشق پر چتر چڑھایا، سکھیوں سے چھپا چھپا کر دروازے کی طرف دیکھتی ہے اور کسی کو راز نہیں بتاتی۔ دیوتائے عشق اس نوخیز کے چرتر دیکھ کر اپنے کئے پر خوش ہو رہا ہے۔

(ب) مدھیا باسک سجّا (मध्या वासक सज्जा)

प्यारे लाल सारी प्यारी हीरन किनारी वारी अंगन अनंग दुति रंग चढ़ि आयो है। दामोदर कहै बाल बैठी है बिनोद भरी लाल को बिलोकिबे को मोद मढ़ि आयो है॥ झांकी झुकि झपकि झरोखा खोलि घूंघट को बदन बिलास को प्रकाश बढ़ि आयो है। जोरि के नछत्रन बिथोरि घनघोर मानो फोर रविमंडल को ससि कढ़ि आयो है॥

ہیروں کی لال کناری دار ساری پہننے سے جسم میں بے انتہا ضو پیدا ہوگئی ہے، خوشی میں سرشار

بیٹھی پیا کا انتظار کر رہی ہے۔ گھونگھٹ کھول لپک کر جھروکے میں سے دیکھنے سے چہرے کی تابانی بڑھ گئی، معلوم ہوتا ہے کہ گھرے بادلوں کو ہٹا کر اور برج آفتاب کو پار کر کے ماہتاب نکل آیا ہے۔

(ج) پروڑھا باسک سجّا (प्रौढ़ा बासक सज्जा)

भारवति है मुरव बैन सखीन सों लाख हिये अभिलाषन जो है
कोमल हासहि नैन बिलासनि अंग सुबासन के मन मोहै ॥
मुरति वंसे किंधौं तुलसी तुलसीबन मैं रति मुरति सो है ।
कुंज विराजति जोय बधू कमला जनु कुंज कुटी मंह सोहै ॥

دل میں خواہشوں کی ریل پیل کی وجہ سے سکھیوں سے طرح طرح کی باتیں بناتی ہے بیٹھی ہنستی ہنستی ہے۔ آنکھوں سے خوشی ٹپکتی ہے، دل چھیننے کو جسم معطر کیا ہے، مہ جبین کنج میں بیٹھی ہے یا تلسی جی مجسم تلسی بن میں رونق افروز ہیں یا لکشمی جی مندر میں جلوہ فگن ہیں۔

(د) پرکیّا باسک سجّا (परकीया बासक सज्जा)

पावन पलोट पोट सांझ तें सोआइ सासु कहत कहानी देवरानी नीद थिरकी। ननद पठाई रात जागिबे परोसिन के मुंद के केवार वेनि गुंदि रारवी सिरकी ॥ सारी सुक पींजरा पै पंवई गिलाफ़ डारि भति धरावत हियमें प्रीत थिर की । चंद सो बदन ढांकि झांकति झरोखा तैठि मंद कारे दीपक कमंद डारि खिर की ॥

پاؤں دبا دبا اور باتیں بنا بنا کر ساس کو سلایا، کہانی کہہ کر دیورانی کی نیند بلائی۔ نند کو رت جگے کے لئے پڑوسن کے ہاں بھیج دیا کواڑ بند کر کے چوٹی کنگھی کی۔ طوطے کے پنجرے پر ساری ڈلوا اور غلاف سے ڈھکا کر اندر رکھوایا۔ اب دل میں لہریں اٹھنے لگیں۔ چاند سا چہرہ ڈھانک کر جھروکے سے دیکھا اور چراغ کی روشنی مدھم کر کے کھڑکی سے کمند لٹکا کر بیٹھ گئی۔

(ہ) گنکا باسک سجّا (गनिका बासक सज्जा)

नीर के तीर उसीर के मंदिर धीर समीर जुड़ावत जीरे ।
त्यों पदमाकर पकंज पुंज पुरैन के पात परैन जे पीरे ॥
ग्रीषम की क्यों गनै गरमी गजगोरन चाह गुलाब गभीरे ।
बैठी बधू बनि बाग बहार मे बार बगार सेवार से सीरे ॥

پانی کا کنارہ، خس کا بنگلہ، آہستہ آہستہ چلنے والی ہوا دلوں کو ملانے کا اثر رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ کنولوں کے ڈھیر اور ان کے پتے جو ابھی پیلے نہیں پڑے ہر طرف بکھرے پڑے ہیں۔ گرمی کی کیا پروا بڑے بڑے موتیوں کی خواہش سے گلاب میں ڈوبی، بنی ٹھنی باغ میں بیٹھی ہے، سیوار سے گیلے بال

بکھرے ہوئے ہیں۔

(۷) سُوَادِھِین پَتِکَا (स्वाधीन पतिका) : جو شوہر کو اپنا غلام بنائے ہیں۔

(۱) مُگْدَھا سُوَادھِین پَتِکَا (मुग्धा स्वाधीन पतिका)

केलि कोठी तें कढ़े बाहिर प्यरी कहू न छोड़ खेल संग के सखान को दियो है री। गेह के उचित जन हास परहास करें नऊ चित में अनेक सकुच छयो है री॥ परिपूर जोबन न झलक सरीर आई उर अबहीं तें यह भावहि लियो है री। जादिन तें आई गौनहाई बाल तादिन तें सांवरो सलोनो पर टोनो सो कियो है री॥

عشرت کدہ سے گھڑی بھر کو بھی باہر نہیں نکلتے۔ ساتھیوں کے ساتھ کھیلنا چھوڑ دیا۔ گھر والے ہنسی مذاق اُڑاتے ہیں مگر کان پر جوں نہیں رینگتی۔ ابھی تک جسم میں حُسن کامل کی جھلک بھی نہیں مگر حالت یہ ہے جس دن سے مہ جبین "گونے" کے بعد آئی ہے پیا پر جادو کر دیا ہے۔

(ب) مَدْھِیَا سُوَادِھِین پَتِکَا (मध्या स्वाधीन पतिका)

ले परजंक धरे भरि अंक निसंक है स्वावत प्रेम उपायन।
चौंक परे तें परे उर लाए हियो सो हियो अनुराग सुभायन॥
लाजन हों लरजी गहिरी बरजी गहिरी कहरी कह हायन।
जागत जानि कहानी कहै अरु सोवत जानि पलोटत पायन॥

بیدھڑک گود میں لیکر پلنگ پر لٹا دیتا ہے اور محبت آمیز ترکیبوں سے سلاتا ہے چونک پڑنے پر سینہ سے لگا لیتا ہے دلوں میں دریائے محبت موجیں مارنے لگتا ہے۔ بہت شرماتی اور ظالم کو بار بار منع کرتی ہوں جس وقت جانتا ہے کہ جاگ رہی ہوں تو دل بہلانے کو قصے کہانی سناتا ہے اور جب سمجھتا ہے کہ سوتی ہوں تو پاؤں دبانے لگتا ہے۔

(ج) پروڑھا سُوَادھِین پَتِکَا (प्रौढ़ा स्वाधीन पतिका)

फूलन सों बाल की बनाय गुही बेनी लाल भाल दीनी बेंदी मृगमद की असित है। अंग अंग भूखन बनाये ब्रजभूखन जू बीरी निज कर सो खवाई करहित है॥ ह्वै के रसबस जब दैबे को महावर को सेनापति स्याम गह्यो चरन ललित है। चूम कर प्यारे को लगाय लई आंखिन सों एही प्रानप्यारे यह अति अनुचित है॥

پھولوں سے چوٹی گوندھی، پیشانی پر ٹیکا اور مُشک کی آڑی لکیر بنائی۔ جسم کا جوڑ جوڑ زیوروں سے آراستہ کیا اور پیار سے اپنے ہاتھ سے پان کھلایا لیکن جب محبت میں دیوانہ ہو کر مہ جبین کے پاؤں

سفدی لگانے کا ارادہ کیا تو اُس نے ہاتھ پکڑ کر چوم لیا آنکھوں سے لگایا اور بولی "پیارے کیا غضب کرتے ہو"

(د) پَرکِیا سوادھین پتکا (परकीया स्वाधीन पतिका)

दुरि दुरि पैर बेनी बिलुल नितम्बन पै घेरि घेरि घुमरत घाघरो घनेरा है। फेर२ फिरत निपट लचकीली कटि फेरि द्दग फेरि फेरि फेरि मुख फेरो है॥ भुज की डुलीन वा खुलीन कुच कोरनि की चाह२ परमेस भयो चित चोरो है। झुकि झुकि झुकति भरत घट ज्यों ज्यों त्यों त्यों मैन के भभूकन भरत घट मेरो है।

خوبصورت کولوں پر چوٹی گر گر پڑتی ہے۔ گھیردار گھا گھرا گھر گھر کر گھومتا ہے۔ بہت ہی لچکیلی کمر کو لچکاتی آنکھیں پھراتی اور منھ پھیر لیتی ہے۔ بازوؤں کا ہلنا اور سر پستان کا کھلنا دل چُرائے لیتا ہے، جیسے آہستہ آہستہ جھک کر گھڑا بھرتا ہے ویسے ہی شعلہائے عشق سے میرا دل بھرتا جاتا ہے۔

(ھ) گَنکا سوادھین پتکا (गनिका स्वाधीन पतिका)

अतर लजात मृगमद पछतात पारजात वारिजात सब सौरभ को तंत्र है। श्री पति अगर में अगर उदगार सी है बगर२ छबि छाजत अनन्त है॥ ही करन ही करन सुख मुख सौत को मसी करन मदन जसी करन जीकरन जंत्र है॥ पिय को रसीकरन रति को हंसीकरन तेरो री बसीकरन मंत्र है॥

عطر شرمندہ اور مُشک پشیمان ہے "پارجات" دنیا بھر کی خوشبوؤں کی روح تیار کرتا ہے۔ اگر کی لپٹیں آ رہی ہیں گھر بھر میں بےحد حبیب چھائی ہوئی ہے۔ تو تعویذ ہے دل کو خوش کرنے، سوت کا دل جلانے۔ دیوتائے عشق کو شہرت و زندگی بخشنے کا۔ تیرا وصل میں ہنس ہنس کر سسکاریاں بھرنا پیتم کو قابو میں رکھنے کا منتر ہے۔

(۸) اَبھِسارکا (अभिसारिका) یہ مَیکش خود محبوب کے پاس جاتا اور اُسے بلاتا ہے نا جانا چھپاتا ہے۔ اس لئے وقت وغیرہ کے لحاظ سے لباس زیب تن کرتا ہے۔

(ا) مُگدھا اَبھسارکا (मुग्धा अभिसारिका)

चलिये नवला वदन तें नाम तिहारे लाल।

हासी बातन में कछू हांसी निकारी हाल॥

اے لال چلو۔ اس مہ جبین کے منہ سے ہنسی ہنسی میں "ہاں" نکل گئی ہے۔

(ب) مُدھیا اَبھسارکا (मध्या अभिसारिका)

सखिन समाज तें उठाय अरबिन्दनैनी दत्त कवि कहे जान बीती जाम रतियां। भूखन बनाय पहराय जरतारी सारी हीरन किनारी दैं संवारी हंस गतियां॥ किङ्किनी की नीकी जोति झल्लर मलर होति लाज तैं नवेली के कहे न मुख बतियां॥ नूपुरन दाबि दाबि भूपर धरति पग दनत दाबि अधर हथेरी दाबि छतियां॥

رات گزرتی ہوئی سمجھ کر سکھیوں نے صحبت سے الگ لے جا کر لباس و زیور سے آراستہ کیا۔ زرتار ساری جس کے کناروں پر ہیرے ٹکے ہوئے تھے پہنائی تو معلوم ہوا کہ جسم دمک اٹھا۔ کمر کی زنجیر کی چمک جھلمل جھلمل کر رہی ہے۔ شرم سے منہ سے بات نہیں نکلتی۔ گھنگھروؤں کو دبا دبا کر زمین پر قدم رکھتی ہے دانتوں سے ہونٹ اور ہاتھوں سے سینہ دباتی ہے۔

کسی کا یاد ہے راتوں کو چھپ کے یوں آنا چھڑے چڑھائے ہوئے پائنچے اٹھائے ہوئے

(ج) پروڑھا ابھسارکا (प्रौढा अभिसारिका)

सहज सुबास जुत देह की दुगुन दुति दामिनि दमक दीप केसर कनक तें। मतिराम सुकवि सिरीस सुकुमार अंग सोहत सिंगार चारु जोबन बनक तें॥ सोयबे को सेज चली प्रानपति प्यारे पास जगत जुन्हाई जोति हंसन तनक तें॥ चढ़त अटारी गुरुलोगन की लाज न्यारी रसना दसन दाबे रसना झनक तें॥

قدرتاً خوشبودار جسم کی ضو بجلی کی چمک، چراغ، زعفران اور کندن کی دمک سے دونی ہے۔ اس نازنین کے جسم پر سنگار جوبن کی آن بان سے مل کر بہت ہی بھلا معلوم ہوتا ہے۔ پیارے کی سیج پر سونے چلی تو ذرا ہنس دی تو معلوم ہوا کہ چاندنی چھٹک رہی ہے۔ اٹاری پر چڑھتے ہوئے بڑے بوڑھوں کی شرم کا خیال آتا ہے "کردھنی" کی جھنکار سے دانتوں میں زبان دابے ہے۔

(د) پرکیا ابھسارکا परकीया अभिसारिका

सूझत न गात बीती आई अधरात अरु सोये सब जानि गुरु जन जे नगर के। छपि के छबीली अभिसार को किवार खोल्यो खुलगे सुगन्ध चारु चन्दन अगर के॥ देव कहे भौरं पुंजन आय कुंजन कुंजन तें पूछ पूछ पाछे परे पाहरू डगर के। देवता कि दामिनि मसाल कैधों जोति ज्वाला झगरे परत जोग सगरे नगर के॥

آدھی رات گزر گئی ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا۔ سمجھتی ہے کہ گھر کے بڑے بوڑھے سو رہے ہیں چھپا کر محبوب سے ملنے چلی ہے کواڑ کھولتے ہی زعفران، صندل اور اگر کی خوشبوؤں سے فضا معطر ہو گئی بھونرے

جنگل سے دوڑے اور قطاریں باندھ باندھ کر لوٹ پڑے، چوکیدار "کون ہے کون ہے!" کہتے ہوئے پیچھے دوڑے، کوئی کہتا ہے کہ دیوتا ہے، کوئی بجلی کی چمک بتاتا ہے، کوئی مشعل سمجھتا ہے اور کوئی شعلۂ جوالہ۔ اس بحث نے سارے شہر کی نیند حرام کردی۔

(۷) گنکا ابھسارکا (गनिका अभिसारिका)

रुचि पाय भंवाय दई मेंहदी जिनके संग होत मनो नग है ।
अब ऐसे में स्याम बुलोवें सखी कहि क्यों चलों पङ्क भयो मग है ॥
अधरात अंधेरी न सूझ परे भजि जोय सी दूतन को संग है ।
अब जाउं तो जात धुयो रंग है रंग राखो तो जात सबै रंग है ॥

میں نے پاؤں میں مہندی لگائی ہے جس کے رنگ سے لعل سے بن گئے ہیں۔ سکھی ایسی حالت میں شام بلا رہے ہیں کہو میں کیسے جا سکتی ہوں، راہ میں تو کیچڑ ہے، رات آدھی بھیگ چکی ہے، بھوت پریت کا بھی دھڑکا ہے جاتی ہوں تو پاؤں کا رنگ خراب ہوا جاتا ہے۔ نہیں جاتی ہوں تو سارا رنگ پھیکا ہوا جاتا ہے۔

(۸) دِوا ابھسارکا (दिवाभिसारिका) یہ روز روشن میں محبوب سے ملنے چلی ہیں۔

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

सारी जरतारी की झलक झलकत जैसी केसर को अंगराग कीनो सब तन है। तीरवन तरनि के किरनि ते दुगुन जोत जगत जवाहिर जराऊ आभरन मे ॥ कवि मतिराम आभा अंगन अंगन कैसी धूम केसी धार छबि छाजत कजन में। ग्रीषम दुपहरी मे पिय को मिलन चली जानी जात नारि ना दमारि जात बन में ॥

زرتاری کی ساری چمک رہی ہے بدن میں زعفران کا ابٹنا لگا ہوا ہے زیوروں کی چمک تیز ستاروں کی روشنی سے بھی دوچند ہے جسم کی ضو انگارہ سی معلوم ہوتی ہے۔ گلیوں میں ضوئے حسن سے دھوئیں کے سے بادل چھا رہے ہیں۔ گرمیوں کی دوپہری میں پیا سے ملنے چلی۔ معلوم نہیں ہوتا کہ کوئی عورت جا رہی ہے یا جنگل میں آگ لگی ہے۔

(۹) کرشنا ابھسارکا (कृष्णाभिसारिका) انھیں جوش جنوں اندھیری رات میں یار کے پاس لے چلا

कज्जल सी निसि सज्जल से घन तज्जल में चली संग न सत्थी'
कुंज अंधारी सिधारी हुसेन बिहारी पै आति ती सुद्धि में नत्थी ॥
किंचित दब्बत सर्प लगयो पग सर्प घसीटत एक पगत्थी ।
जोर जजीरन सों जकस्यो मनो छूट चल्यो मनमत्य को हत्थी ॥

رات کاجل سی کالی ہے۔ بادلوں میں پانی بھرا ہوا اور برس رہا ہے۔ اکیلی پیا سے ملنے چلی ہے گلیوں

میں اندھیرا ہے نشے عشق سے مدہوش ہے، کہیں سانپ پر پاؤں پڑگیا، وہ تیرے ہی لپٹ گیا، اُسے ایک پاؤں سے گھسیٹتی چلی جارہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دیوتائے عشق کا ہاتھی جو مضبوط زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا توڑا کر جا گاہے۔

شُکلا بھسارکا (शुक्लाभिसारिका) یہ چاندنی رات میں پیا سے ملنے چلی ہیں۔

सजि वृजचन्द पै चली यों मुखचन्द जाको चन्द चांदनी को मुख मन्द सो करत जात। कहै पदमाकर त्यों सहज सुगन्ध ही तें कुंजबन पुंजन में कंज से भरत जात ॥ धरत जहांई पग है सु प्यारी तहां मंजुल मजीठ ही के माठ से ढरत जात। हारन तें हीरा स्वेत सारी के किनारन तें बारन तें मुकता हजारन झरत जात ॥

بن سنور کر پیا کے پاس اس ٹھاٹھ سے چلی کہ چہرہ کی ضو کے سامنے چاندنی ماند پڑ گئی جسم کی خوشبو سے سارا جنگل مہک اُٹھا جہاں جہاں پاؤں رکھتی ہے معلوم ہوتا ہے مجیٹھوں کے مٹکے کے مٹکے ڈھلتے جاتے ہیں۔ ہاروں سے ہیرے اور سفید ساری کے کناروں اور بالوں سے موتی جھڑتے جاتے ہیں۔

(۹) پرَوَتسیت پریسی (प्रवत्स्यत्प्रेयसी) یہ وہ نائکہ ہے جس کا محبوب آمادۂ سفر ہے

(۱) مگدھا پرَوَتسیت پریسی (मुग्धा प्रवत्स्यत्प्रेयसी)

सेज परी सफरी सी पलोटति ज्यों ज्यों घय घन की गरजै री ।
त्यों पदमाकर लाजहि ते न कहै दुलही हिय को हरजै री ॥
आली कछू का कछू उपचार करै पै न पाय सकै मरजै री ।
जाय न ऐसे समय मथुरै यह कोऊ न कान्हर को बरजै री ॥

جوں جوں بادل گرجتا ہے سیج پر پڑی مچھلی کی طرح تڑپتی ہے اور شرم حال دل کہنے نہیں دیتی۔ سکھی طرح طرح کی تدبیریں کرتی ہے لیکن مرض کا پتہ نہیں چلتا۔ پیتم سے کون کہے کہ اس وقت نہ جائے۔

(ب) مدھیا پرَوَتسیت پریسی (मुग्धा प्रवत्सयत्प्रेयसी)

पी चलिबे के चली चरचा सुनि चन्दमुखी चितई दृग कोरन ।
पीरी परी नुरतै मुख पै बिलखी अलि ब्याकुल मैन मरोरन ॥
को बरजै अलि कासों कहै मन झेलत नेह ज्यों लाज हिंडोरन ।
मोती से पोय रहे अंसुवा न गिरै न फिरै बरुनीन के कोरन ॥

پیا کے جانے کا ذکر چھڑا تو مہ جبین نے کنکھیوں سے دیکھا، فوراً رنگ زرد ہوگیا۔ سکھی نے دیکھا کرا عشق نے بے قرار کر دیا کون روک سکتا ہے اور سکھی اس کا ذکر کس سے کر سکتی ہے کہ مہ جبین کا دل محبت سے بیتاب شرم کی جھولے میں جھیل رہا ہے۔ نوک مژہ پر گوہر اشک پروئے ہیں جو نہ گرتے ہیں اور نہ واپس جاتے ہیں۔

کلامِ فراق

(پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری ایم۔اے)

یوں نئی زندگی نظر آئی
وقت کے دل کی چوٹ اُبھر آئی

حسنِ قاتل کا ہے کہاں تک اثر
موت کی شکل بھی نکھر آئی

بوئے گل جس طرح کہیں بس جائے
دل میں تیری نگاہ اُتر آئی

اس طرح آج کوئی یاد آیا
جیسے اپنی مجھے خبر آئی

غنچے شبنم میں ڈوبتے ہی کھلے
کہ ہنسی بھی بچشمِ تر آئی

عاشقوں کو خوشی سے کیا، لیکن
یہ بلا بھی اُنھیں کے سر آئی

اے خدو خالِ زیست میری نگاہ
ان خطوں میں بھی رنگ بھر آئی

زندگی میری مجھکو مار چکی
اے مری موت تو کدھر آئی

ذرے ذرے میں بارہا اے دوست
تیری تصویر سی اُتر آئی

نگہِ شوق کو دعائیں دے
تیری دوشیزگی نکھر آئی

میں نے توڑا دم اس طرح کہ فراق
موت کو زندگی نظر آئی

۲

ستاروں سے اُلجھتا جا رہا ہوں
شبِ فرقت بہت گھبرا رہا ہوں

یقیں یہ ہے، حقیقت کھل رہی ہے
گماں یہ ہے کہ دھوکے کھا رہا ہوں

مبارک کنجِ زنداں سے رہائی
خود اپنے سر سے سر ٹکرا رہا ہوں

جو ممکن ہو تو لے لے اپنی آہٹ
خبر دو حسن کو، میں آ رہا ہوں

ملا کر سرحدیں خیر اور شر کی
قیامت پر قیامت ڈھا رہا ہوں

محبت اب محبت ہو چلی ہے
تجھے کچھ بھولتا سا جا رہا ہوں

وہی غم ہے وہی اُس کا تغافل
مگر میں ہوں کہ سنبھلا جا رہا ہوں

جہاں کو جگمگا دوں گا، ابھی تو
طلوعِ صبح سا تھرا رہا ہوں

حدِ جور و کرم سے بڑھ چلا حسن / نگاہِ یار کو یاد آ رہا ہوں
اثر بھی لے رہا ہوں تیری چپ کا / تجھے قائل بھی کرتا جا رہا ہوں
کبھی جانِ سکوں بھی ہو رہوں گا / ابھی تو میں تڑپتا جا رہا ہوں
خبر ہے تجھکو اے ضبطِ محبت / ترے ہاتھوں میں لٹتا جا رہا ہوں
سمجھ کر کہنی پڑتی ہے ہر اک بات / دلِ دیوانہ کو سمجھا رہا ہوں
شبِ غم یہ ہوا محسوس اکثر / فضائے زندگی پر چھا رہا ہوں

یہ سناٹا ہے میرے پاؤں کی چاپ
فراقؔ اپنی کچھ آہٹ پا رہا ہوں

جذباتِ نجم

حضرت نجم آفندی

کبھی یوں کہیں سر جھکانے چلے ہیں / جدھر ہم چلے آستانے چلے ہیں
ستائے ہوئے ہیں ستانے چلے ہیں / تہِ تیغ ہم مسکرانے چلے ہیں
کسی کی نظر میں سمانے چلے ہیں / جہاں دل نہیں دل بنانے چلے ہیں
وہ کہہ دیں جفا کو وفا کی کسوٹی / کہیں ایسے حیلے بہانے چلے ہیں
شبِ غم نہ ہو گی چراغوں سے روشن / یہ تارے کدھر جگمگانے چلے ہیں
کہاں کی قیامت، قیامت یہی ہے / خطائیں ہیں کچھ بخشوانے چلے ہیں
وہ پہلے محبت کی صورت بنا لیں / محبت کی باتیں بنانے چلے ہیں
لبھاتے ہیں کیوں مجھ کو دنیا کے جلوے / مسافر سے کیا دل لگانے چلے ہیں
کہیں نامِ دوزخ سن آئے ہیں واعظ / یہی آڑ لے کر ڈرانے چلے ہیں
نہ دیکھیں گے پھر کر مسافر عدم کے / یہ سب اپنے اپنے ٹھکانے چلے ہیں
چمن کے دلارے تھے یہ غنچہ و گل / جو خوشبو سے گلیاں بسانے چلے ہیں
بگڑ کر قلمکارِ قسمت سے نجمیؔ / محبت کی بگڑی بنانے چلے ہیں

منشی لچھمن پرشاد صدر مرحوم

(از منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی)

سخن میں لطف نہیں گرچہ ہو کسی کا سخن
اگر فصاحت حسن بیاں سخن سے گئی
(حضرت صدر)

اس سے پیشتر رسالہ زمانہ ہی کے اوراق میں اپنے خسر مرحوم علامہ منشی لچھمن پرشاد صدر کے حالات زندگی اور کلام پر دو مرتبہ روشنی ڈال چکا ہوں۔ مرحوم کا انتقال ستمبر ۱۹۳۱ء میں ہوا تھا، حالات زندگی مرحوم کے زمانۂ حیات ہی میں شائع ہوئے تھے۔ اس کے کئی سال کے بعد فن تاریخ گوئی میں مرحوم کا کمال آئینہ کیا گیا۔ ان سطور میں صدر مرحوم کی غزل گوئی کے کچھ نمونے پیش کئے جاتے ہیں:-

مرحوم کی غزلیں تعداد میں بہت زیادہ نہیں ہیں، ان کا خود تحریر کردہ قلمی دیوان میرے پاس محفوظ ہے۔ اس کا تاریخی نام "چمنستان سخن" (۱۳۱۴ھ) تجویز کیا گیا تھا۔ حالانکہ میرے لئے یہ عرض کرنا کسی قدر نامناسب معلوم ہوگا لیکن ناقدانہ ذمہ داری مجھے اس حقیقت کے ظاہر کرنے پر مجبور کرتی ہے کہ صدر مرحوم کی غزلوں میں اگرچہ پختگی فن نظر آتی ہے لیکن اس میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں پائی جاتی، جو غزل گوئی کے معاملے میں مرحوم کو اپنے معاصرین کے عام رنگ سے علیحدہ کرتی ہو تاہم یہ مسلم ہے کہ ان کے کلام سے استادانہ شان ٹپکتی ہے اور دیگر کاملان فن کی طرح ان کا کلام بھی سر آنکھوں سے لگانے کے قابل ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کی غزلوں میں اُس مرثیہ گوئی کا اثر ناپید ہے جس نے لکھنؤ کے اکثر غزل گو شعراء کے کلام پر اپنا اثر ڈالا ہے اور جس کی کثرت نے عام طور پر شعرائے لکھنؤ کو رنگ جدید کے شعراء کے بالمقابل نسبتاً پست کر دیا ہے پھر بھی وہ قاتل کے خنجر سے قتل ہونے کی ہوس کرتے ہیں۔ زنجیر و حداد کا بیان ان کے کلام میں موجود ہے۔ انھیں بھی نالہ و فغاں سے لطف حاصل ہوتا ہے۔ مگر یہ تمام باتیں اُن کی غزل گوئی کے دور اول میں پائی جاتی ہیں اور یہ اُس ماحول کا نتیجہ ہے جو ان کے پیشرو آورد اور تصنع کے دلدادہ لکھنوی شعراء نے پیدا کر رکھا تھا بعض مرتبہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ شعر خود دل پر چوٹ کھا کر نہیں کہتے ہیں پختگی فن کا خیال ہر قدم پر ان کو "آپ بیتی" نہیں کہنے دیتا۔ میرے عرض کرنے کا یہ مطلب ہے کہ جو کچھ مرحوم نے فرمایا ہے وہ جیسا کہ بالعموم اردو شاعروں میں پایا جاتا ہے، خود اُن کے ذاتی جذبات اور دلی کیفیات کا عکس نہیں ہے ہاں جہاں انھوں نے واردات قلب نظم کئے ہیں وہاں اُن کے کلام میں تاثیر بھی ہے اور پتھر سا پتھر دل رکھنے والا بھی اُن جذبات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

البتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم مشکل زمینوں میں زور طبع دکھانے پر مجبور ہو جاتے ہیں، اور ہمیں ایسی غزلوں

بہت سہم کے اٹھاتا ہوں شور نالوں کا　　کہ بیٹھ جائے کہیں جی نہ سُننے والوں کا

جب تیرا عتاب اے بتِ بے پیر نہ ہوگا　　لب پر گلۂ شومیِ تقدیر نہ ہوگا

زنداں میں جو پوچھیں ادب ضعف بدن ہے　　گستاخ کبھی نالۂ زنجیر نہ ہوگا

وا ہوگا نہ جب تک کہ ترا عقدۂ گیسو　　فرسودہ کبھی ناخنِ تدبیر نہ ہوگا

او صید فگن نازکی دست سے تیری　　سینے میں تشگافِ خلشِ تیر نہ ہوگا

مقطع میں آپ نے اس زمانہ کے مذہبی ماحول کے ماتحت فرمایا ہے کہ:-

اے صدر رسول اس کی شفاعت نہ کریں گے　　جس کو تہِ دل سے غمِ شبیر نہ ہوگا

ایک مطلع میں کیا خوب فرمایا ہے:-

اب وصل میں بھی ہجر کا دھڑکا نہیں مٹتا　　راحت میں مصیبت کا تقاضا نہیں مٹتا

یہ ضعف خیالِ شبِ گیسو نے بڑھایا　　آنکھوں سے کسی وقت اندھیرا نہیں مٹتا

احوالِ غمِ ہجر کیا عرض تو بولے　　تقدیر کا لکھا نہیں مٹتا نہیں مٹتا

اِسی ردیف میں قافیہ بدل کر ایک غزل لکھی ہے، میرے نظریہ انتخاب کے مطابق حسب ذیل شعر اچھے ہیں مگر جنابِ صدر نے انھیں قلمزد کر دیا ہے:-

اے آبِ ندامت تہِ شمشیر نہ دے غسل　　دھونے سے لکھا لوحِ جبیں کا نہیں مٹتا

آنسو کی طرح سوزِ غمِ ہجرِ بتاں سے　　چھالا تنِ لاغر سے کہیں کا نہیں مٹتا

کیا گلشنِ ہستی میں شگفتہ ہو دلِ صدر　　دھڑکا کوئی دم جانِ حزیں کا نہیں مٹتا

حسب ذیل مطلع کی پختگی خاص طور پر قابلِ داد ہے۔

ہاتھ ہم پر نہ پڑا، دل کبھی شاداں نہ ہوا　　آرزو رہ گئی قاتل کوئی احساں نہ ہوا

کس گھڑی جوششِ وحشت سے ملا مجھکو فراغ　　آہ کس روز مرا چاک گریباں نہ ہوا

کس گھڑی آتشِ فرقت کے نہ بھڑکے شعلے　　کون سا داغ چراغِ تہِ داماں نہ ہوا

مقطع میں اپنی زندگی کا صحیح مرقع کھینچا ہے۔

نہ کھلا غنچۂ خاطر کبھی اے صدر اپنا　　قابلِ سیر کسی دن یہ گلستاں نہ ہوا

مندرجۂ ذیل یک قافیہ غزل حضرت صدر کی کہنہ مشقی کی دلیل ہے:-

بلا کا اے کماں ابرو ترا تیرِ نظر نکلا　　لگا سینے سے دل میں، دل کو لیکر تا جگر نکلا

جو دیکھا سینۂ صد چاک میرا اُس ستمگر نے　　تشگافِ دل بشکلِ مرکزِ گافِ جگر نکلا

ترا آنا مجھے لے راحتِ جاں راحتِ جاں تھا　　ترا پہلو سے جانا باعثِ دردِ جگر نکلا
نہ کوئی آرزو مجھ کشتۂ حسرت کی بر آئی　　نہ کوئی حوصلہ لے راحتِ جان و جگر نکلا
نہ کیونکر قتل ہونے سے قرار آئے مجھے قاتل　　ترے خنجر کا دامن مرہمِ زخمِ جگر نکلا
مقرر زندگی میں لازم و ملزوم ہیں دونوں　　جگر آرامِ دل ٹھہرا، دل آرامِ جگر نکلا

اسی زمین میں دو غزلہ ہے، اس میں ایک شعر قابلِ ذکر ہے :-

بہار آئی تو آئی ہمصفیرو مجھکو کیا مژدہ　　قفس سے میں اگر نکلا بھی تو بے بال و پر نکلا

کہتی ہے خونِ عاشقِ مضطر کی آب و تاب　　دیکھیں تو ہم حضور کے خنجر کی آب و تاب
اپنے چراغِ زندگیِ مستعار میں　　ہے شمع زیرِ دامنِ صرصر کی آب و تاب
دو آفتاب اِک فلکِ حسن کے ہیں یہ　　ہے دونوں عارضوں میں برابر کی آب و تاب
رخصت کا نام لے کے نہ اندھیر کیجئے　　جلوے سے آپ کے ہے مرے گھر کی آب و تاب
حالِ جہاں جو دیدۂ عبرت سے دیکھئے　　جگنو کی طرح اس میں ہے دم بھر کی آب و تاب

دل کا نہ ہوش ہے نہ حواسِ جگر ہنوز　　کس کی خبر سنی ہے کہ ہوں بے خبر ہنوز
صحت ہوئی نصیب نہ اے چارہ گر ہنوز　　دردِ جگر تو کیا نہ گیا دردِ سر ہنوز
اے ابرِ چشم ہمتِ طوفاں میں کر کمی　　سوکھا نہیں ہے دامنِ مژگانِ تر ہنوز
کس کے خدنگِ ناز کے امیدوار ہیں　　کھولے ہوئے ہیں منہ جو شگافِ جگر ہنوز
صیاد تیرے جور سے فصلِ بہار میں　　آئے بہار پر نہ مرے بال و پر ہنوز
مانندِ جاں وفورِ ندامت سے ہر گھڑی　　منہ کو چھپائے رہتا ہے مجھ خستہ تن کا ہوش

پابندِ غم ہیں عشقِ بتِ حیلہ گر سے ہم　　کیونکر نہ جائیں کوچۂ الفت میں سر سے ہم
بیخود تھے یہ خیالِ بتِ فتنہ گر سے ہم　　کچھ کہتے کہتے بھول گئے نامہ بر سے ہم
اپنی خوشی اسی میں ہے تم جس میں خوش رہو　　دشمن کو دیکھتے ہیں تمھاری نظر سے ہم
چاہا نہ کچھ ہوا جو نہ چاہا وہ ہوگیا　　بے بال و پر رہے ہوسِ بال و پر سے ہم
کب جاہلوں سے دادِ سخن کی ہے آرزو　　انصاف چاہتے ہیں کچھ اہلِ ہنر سے ہم

مندرجہ بالا دو غزلیں جناب صدر کی قادر الکلامی پر دال ہیں، مگر اُن کی یہ غزل مجھے بیحد پسند ہے :-

ثباتِ دہر ہماری نظر میں خاک نہیں　　کہ اس مکان کے دیوار و در میں خاک نہیں
جہاں میں طبعِ مخالف ہے ایسی آپس میں　　کسی کی قدر کسی کی نظر میں خاک نہیں

وہ خاک پا ہے بتوں کی کہ رتبۂ اکسیر | قسم خدا کی ہماری نظر میں خاک نہیں
ازل سے حصہ میں ہر خاکی باد و آتش و آب | کچھ اور ان کے سوا میرے گھر میں خاک نہیں
سوائے حسرتِ نظارہ دیکھئے کیا ہو | تمھارے تحت تہ تیر نظر میں خاک نہیں
کسی کے شعر کو اچھا برا کہیں کیا صدر | کہ امتیاز ہی عیب و ہنر میں خاک نہیں
شباب ہی میں ہرے صدر اپنے بال سفید | اڑی تھی ایسی کبھی وہ بہر میں خاک نہیں

دیکھئے کتنی مشکل زمین میں کتنے اچھے شعر نکالے ہیں:-

تمھارے گیسوئے خمدار سر تا پا لٹکتے ہیں | یہ کالے ہم کو ڈسنے کے لئے کیا کیا لٹکتے ہیں
نہیں ہو پنچے کمر تک اُن کی بڑھکر دامن گیسو | عدم عنقا ہے لیکن بازوئے عنقا لٹکتے ہیں
یقیں ہے کل میسر ہو نہ دو گز کا کفن اُن کو | گھروں میں آج جن کے پردہ دیبا لٹکتے ہیں
نہ پوچھو جمع ہونا آبلوں کا میرے تلووں میں | نئے انگور کے خوشے ہیں، زیر پا لٹکتے ہیں

لکھنوی زبان اُن کے وطن کی زبان ہے اور انھیں اس پر بجا طور پر ناز ہے، فرماتے ہیں:-

کہیں لطف زباں چھپتا ہے اے صدر | کوئی معجز بیان لکھنؤ ہو

بعض اشعار مشکل زمین میں بہت برجستہ ہیں:-

دیکھتے ہی ترے غضب کی آنکھ | جھک گئی انجمن میں سب کی آنکھ
آ سیا کہ بند ہوتی ہے | تیرے بیمار جاں بلب کی آنکھ

اور بھی شعر ملاحظہ ہوں:-

بے ساختہ نگاہ کسی کی بدل گئی | مطلب کی بات کوئی جو منہ سے نکل گئی
وہ سخت جانی دلِ مضطر تھی وقتِ قتل | شرمندہ ہو کے ہم سے ہماری اجل گئی
بیتاب ہو گئے اُس نے کہا لفظِ مرحبا | اے صدر جس کے پاس ہماری غزل گئی

ایک ذو قافیتین غزل کے چند شعر پیش ہیں:-

بتوں کے عشق میں گو اپنی جاں بدن سے گئی | مگر نہ بوئے ہوائے بتاں کفن سے گئی
جفا کشی میں تری فرق آگیا اے دل | جو مشق نالۂ آتش فشاں دہن سے گئی
یہ مژدہ بلبلِ نالاں کو دے کوئی جا کر | کہ دن بہار کے آئے خزاں چمن سے گئی

یہ نمونۂ کلام شاہد ہے کہ جناب صدر اپنے معاصرین کے دوش بدوش ہیں، اور اردو لٹریچر اُن پر بجا طور سے فخر کر سکتا ہے۔

چاندنی رات

(فرانس کے نامور افسانہ نگار موپاساں کی ایک کہانی کا ترجمہ)

آبے میری نان" ایک پتلا لمبا اور متعصب پادری تھا، اسے یقین تھا کہ وہ صحیح معنوں میں خدا کو سمجھتا ہے ایک روز وہ گاؤں کے چھوٹے سے گرجے میں محوِ سیر تھا اور رہ رہ کر اُس کے دل میں یہ خیال آتا تھا کہ "خدا نے ایسا کیوں کیا؛ خدا نے یہ چیز کیوں بنائی؟ اس چیز کے پیدا کرنے کا کیا مطلب؟" اس کے بعد وہ اپنے آپ کو خدا کی جگہ تصور کر کے غور کرنے لگا اور تقریباً ہر چیز کی تخلیق کی وجہ معلوم کر لی۔ وہ ان آدمیوں میں سے نہ تھا جو قدرتِ حق کا نظارہ کر کے بے اختیار عاجزی سے کہنے لگتے ہیں "خدائے پاک! تیری قدرت کا اندازہ امکان سے باہر ہے، تیرے منشا و مقصد تک پہونچنا ناممکن ہے" بلکہ وہ کہتا "میں خداوندِ عالم کا پاک بندہ ہوں اور مجھے اُس کے ہر کام کی وجہ معلوم ہونی چاہیئے" وہ سمجھتا تھا کہ کارخانۂ قدرت میں کوئی چیز کسی خاص مقصد کے بغیر پیدا نہیں کی گئی۔ وہ دل ہی دل میں ہر سوال کا مکمل جواب دے لیتا تھا۔ صبح کا سہانا سماں انسان کو بستر سے اُٹھتے ہی بشاش کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے، دن کی دھوپ فصلوں کو پکانے کے لئے، بارش کھیتوں کو سیراب کرنے کے لئے۔ شام سونے کی تیاری کے لئے اور رات خوابِ راحت کے لئے بنائی گئی ہے۔

لیکن آبے کو عورتوں سے فطری نفرت تھی وہ اکثر حضرت عیسٰی کے یہ الفاظ دہرایا کرتا تھا "عورت! مجھے تجھ سے کوئی واسطہ نہیں!" وہ اس کے ساتھ یہ بھی کہتا تھا کہ خداوندِ عالم خود بھی عورت کو پیدا کر کے ناخوش : پریشان ہے۔ وہ عورت کو ایک ناپاک ہستی سمجھتا اور کہتا کہ یہی وہ ساحرہ ہے جس نے سب سے پہلے انسان ذا اپنے دام میں گرفتار کیا اور ابھی تک اپنی ناپاک حرکتوں سے باز نہیں آئی عورت اُس کے نزدیک ایک کمزور یکن نہایت خطرناک، مکار، دغا باز اور عجیب بیچین کرنیوالی ہستی تھی۔ اُسے عورت کے نرم و نازک جسم سے بھی یادہ اُس کی محبت کرنے والی روح سے نفرت تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ خدا نے عورت کو صرف مرد کی آزمائش ے لئے پیدا کیا ہے۔

اُس کے نزدیک پھیلائے ہوئے بازو اور کھُلے ہوئے ہونٹوں والی حسینہ ایک جال سے کم نہیں وہ صرف ہبہ عورتوں کو صبر و تحمل سے دیکھ سکتا تھا۔ کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ یہ گوشہ نشین عورتیں مذہبی عہد لے کر بے ضرر ہو چکی ہیں ن اس کے باوجود وہ اِن زہد و اتقا کی مورتوں سے اکثر اوقات سختی سے پیش آتا تھا۔

Abbe ۵

اُس کی نوجوان بھتیجی اُس کے گھر کے قریب ہی اپنی ماں کے پاس رہتی تھی، وہ ایک نوعمر، خوبصورت جلد باز اور شوخ وشنگ لڑکی تھی، جب ایبے اُسے پند ونصیحت کرتا تو وہ ہنس دیتی، جب وہ ناراض ہوتا تو وہ اس کی پیشانی پر بوسہ دیتی اور اُس کے گلے میں پیار سے باہیں ڈال دیتی، لیکن ایبے اُس کی محبت آمیز گرفت سے بھاگنے کی کوشش کرتا، اگرچہ اُس کی دل آویز حرکتیں ایبے کے دل میں ایک عجیب قسم کی پدرانہ محبت پیدا کرتی تھیں وہ اکثر اُس کے ساتھ اپنے خدا کی باتیں کرتا لیکن وہ ان باتوں کو توجہ سے نہ سنتی اور ایک زندہ مسرت کے ساتھ جو کہ اس کی نرگسی آنکھوں سے نمایاں ہوتی کبھی آسمان کبھی پھولوں اور کبھی گھاس کی طرف دیکھنے لگتی، کبھی کبھی وہ حسین تتلیوں کے پیچھے دوڑتی اور اُنھیں پکڑ کر چلاتے کہتی "چچا جان! دیکھئے یہ کتنی نازک اور خوبصورت ہے، اس کا رنگ کتنا دلکش ہے، بے اختیار چومنے کو دل چاہتا ہے" لیکن تتلیوں اور پھولوں کو چومنے کی خواہش دیکھکر ایبے کو بہت غصہ آتا کیونکہ اس میں اسے ہمیشہ دل کو نرم کرنے والی وہ محبت نظر آتی تھی جو ہمیشہ عورت کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔

ایک دن جب کہ وہ حجامت بنا رہا تھا اُس کی خادمہ نے اُسے بتایا کہ آپ کی بھتیجی کو ایک شخص سے عشق ہوگیا ہے اور اُس پر ایک جنون کی سی حالت طاری ہوگئی ہے، ایبے اُسی حالت میں کھڑا ہوا، اس کے چہرے پر صابن خشک ہو رہا تھا اور وہ بڑی دقت سے سانس لے رہا تھا۔ جب وہ سوچنے اور بولنے کے قابل ہوا تو چلا کر بولا "تم جھوٹ بک رہی ہو، یہ خبر بالکل غلط ہے۔" لیکن خادمہ نے اپنے دل پر ہاتھ رکھکر کہا "اگر میں جھوٹ بول رہی ہوں تو خدا مجھ سے اس کا بدلہ لے۔ میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں، رات کو جب آپ کی بہن سو جاتی ہیں تو آپ کی بھتیجی اپنے عاشق کے پاس چلی جاتی ہے، دونوں دریا کے کنارے ملتے ہیں آپ دس اور بارہ بجے رات کے درمیان جاکر سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ ایبے نے اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ پھیرنا چھوڑ دیا اور تیزی سے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ اُس کی عادت تھی کہ جب کسی سنجیدہ معاملہ پر غور کرتا تو ٹہلنے لگتا تھا۔ جب اُس نے دوبارہ حجامت بنانے کی کوشش کی تو اضطراب میں ناک سے کان تک کئی جگہ زخم لگا لئے۔

دن بھر ایبے خاموش اور غضبناک رہا، رات کے کھانے کے بعد اُس نے کچھ مطالعہ کی کوشش کی لیکن بے سود اب وہ غصے سے آگ بگولا ہو رہا تھا، جب گھڑی نے دس بجائے تو اُس نے اپنا عصا سنبھالا، دانت پیستا ہوا آگے بڑھا اور غصے کی حالت میں لاٹھی کو ایک کرسی پر دے مارا جس کی پشت دو ٹکڑے ہو کر زمین پر آ رہی۔ اس نے باہر جانے کے لئے دروازہ کھولا، لیکن حسین چاندنی دیکھکر وہیں ٹھٹک کر رہ گیا۔

دلکش چاندنی رات کے حسن بے پایاں کو دیکھکر ایبے حیرانی کے عالم میں کھو گیا۔ اُس نے لمبے لمبے سانس لینے شروع کئے، وہ مست ہوا سے اُسی طرح لطف اندوز ہوا جیسے ایک شرابی مے سرخ سے۔ وہ آہستہ آہستہ مسرت

اور حیرانی کے ملے جلے جذبات میں ڈوبا ہوا چلنے لگا، وہ بھتیجی کو بالکل بھول چکا تھا۔

جیسے ہی وہ کھلے میدان میں پہونچا کیف آور وشاط انگیز مناظر کو نشہ خیز چاندنی میں ڈوبے ہوئے دیکھکر وہ مدہوش سا ہو گیا۔ دُور بلبل سحر آفریں آواز میں گا رہی تھی۔

ایسے آگے چلتا گیا، لیکن اُس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ نہ معلوم کیوں؟ اُس نے ایسا محسوس کیا کہ کمزوری اُس پر غالب آگئی ہے۔ اور وہ اب ایک قدم بھی نہیں اُٹھا سکتا۔ وہ اسی جگہ پر حُسن فطرت کی تعریف کرنے کے لئے بیٹھ گیا، سامنے چنار کے درختوں کی ایک لمبی قطار تھی، چھوٹے سے دریا کے کنارے کے ارد گرد ایک عجیب قسم کا دُھندسا تھا جو چاند کی کرنوں کے پڑتے سے چمک رہا تھا۔ پادری پھر ٹھہر گیا۔ اُس کے دل میں کچھ شک آمیز اضطراب سا پیدا ہو گیا، پھر وہی سوالات اُس کے دل میں پیدا ہونے لگے۔ خدا نے ایسا کیوں کیا؟ جب رات بیہوشی، نیند، آرام اور اپنے آپ کو بھول جانے کے لئے بنائی گئی ہے تو پھر اسے دن سے بھی زیادہ دلکش اور طلوع و غروب سے زیادہ حسین بنانے کا منشا کیا ہے؟

آہ یہ ننھا سا چمکتا ہوا ستارہ! کیوں اس میں آفتاب عالمتاب سے بھی زیادہ دلکشی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف نازک اور جذبات اُبھارنے والی چیزوں کو روشن کرنے کے لئے بنایا گیا ہے، یہ دلکش منظر کس کے لئے پیدا کیا گیا ہے؟ بہشت سے مستیٔ نور اور شعریت کا یہ سیلاب کیوں آیا ہے؟ ایسے کو ان تمام سوالات کا کوئی جواب ذہن میں نہ آیا۔

لیکن عین اُسی وقت چراگاہ کے کنارے دو متحرک سائے ظاہر ہوئے جو کہ جھکے ہوئے چمکتے ہوئے دُھند میں ڈوبے ہوئے درختوں کے نیچے پہلو بہ پہلو چل رہے تھے، مرد ذرا قدآور تھا اور اُس کا بازو اُس کی محبوبہ کی گردن سنبھالے ہوئے تھا، وہ کبھی کبھی اس کی چاندنی میں چمکتی ہوئی پیشانی پر بوسہ بھی دیتا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ انھیں دونوں کی محبت نے گرد و پیش کے منظر میں زندگی بھر دی ہے۔ اور یہ حسین منظر محض انہیں کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

دونوں یک جان و دو قالب معلوم ہوتے تھے، اب ایسے کو یقین ہو گیا کہ یہ مدہوش کن اور حسین رات جس میں ہر طرف سکوت کی حکمرانی ہے صرف انھیں کے لئے پیدا کی گئی ہے۔

یہی تھا پادری کے سوال کا جواب زندہ جواب!

رفتہ رفتہ وہ پادری کے بہت ہی نزدیک پہونچ گئے، ایسے بالکل خاموش کھڑا تھا، معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے قلب کی حرکت بند ہو چکی ہے، اُسے خیال ہوا کہ وہ بائبل کی ایک کہانی حقیقت کے لباس میں دیکھ رہا ہے، بوز (Boaz) اور روتھ (Ruth) کی محبت

اُس نے سوچا "شاید خدا نے یہ پُرکیف چاندنی راتیں انسانوں کی محبت کو تکمیل تک پہونچانے کے لئے بنائی ہیں۔" وہ مخمورِ محبت جوڑے کے آگے سے ہٹ گیا، حالانکہ وہ اُس کی بھتیجی تھی، اُس نے اپنے آپ سے سوال کیا "کیا عشق گناہ ہے؟ کیا خدا عشق کرنے کی اجازت نہیں دیتا، تو اُس نے اس کے لئے اتنا حسین اور کیف آور سامان کیوں پیدا کیا ہے؟

وہ پریشان و شرمندہ گھر لوٹا۔ گویا وہ کسی ایسے حید میں داخل ہو گیا تھا، جہاں داخل ہونے کا اُسے کوئی حق نہ تھا۔

(اعجاز اسلام آبادی)

جذباتِ منور

(منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی)

شورِ تکمیلِ جنوں نالۂ زنجیر میں تھا
مری شہرت کا بھی پہلو مری تشہیر میں تھا

اب دعا کام جو کرتی ہے تو شرمندہ ہوں
نقص گویا مرے اندازۂ تاثیر میں تھا

لینے والوں نے لیا جائزۂ دل ہر چند
فرق پھر بھی مرے جذبات کی تفسیر میں تھا

رکھ دیا مصلحتاً تیری جفا پر الزام
میں گرفتار تو خود اپنی ہی زنجیر میں تھا

کر دیا تھا مجھے زنداں میں جنوں نے خاموش
کون پھر سلسلہ جنباں مری زنجیر میں تھا

اُف رے وہ ظلم سے انکار پس و پیش کے ساتھ
عذر سے لطف سوا عذر کی تاخیر میں تھا

تو نے تعزیر جو کی ہے تو یہ میری مرضی
ورنہ بخشش کا تقاضا مری تقصیر میں تھا

نہ ہوئی سیرِ گلستاں میں اسیری حائل
حلقہ حلقہ چمن آرا مری زنجیر میں تھا

کر دیا دل کے تقاضوں نے خطا پر مائل
اپنی جانب سے تامل مجھے تقصیر میں تھا

یہ تو مانا کہ ہوں اب میں ہی سزاوارِ عتاب
دخل تیری بھی رضا کا مری تقصیر میں تھا

آخرِ کار دعاؤں نے مچا دی ہلچل
پہلے پہلے تو بہت شک مجھے تاثیر میں تھا

دمِ پرسش لبِ گفتار کو جنبش نہ ہوئی
عذرِ تقصیر بھی شامل مری تقصیر میں تھا

اب یہ مشکل ہے کہ دوں صبحِ قیامت کو نوید
ہاں کسی وقت اثر نالۂ شبگیر میں تھا

اب جو قسمت پہ ہوں شاکر تو سکوں بھی ہے نصیب
کچھ ٹھکانا نہ مرا جادۂ تدبیر میں تھا

یاد اُس وقت کی آتی ہے تو رو دیتا ہوں
جب مرا دخل منور مری تقدیر میں تھا

تنقید کتب

ہندوستانی تہذیب کی تکمیل[1]

مسٹر کالی داس کپور ایم۔ اے، ایل۔ ٹی صوبۂ متحدہ کے ایک نامور ٹیچر ہیں جو روز مرہ تعلیم و تدریس کے علاوہ مختلف تعلیمی مسائل سے بھی خاص طور پر دلچسپی لیتے رہتے ہیں۔ تاریخی و معاشرتی معاملات کی چھان بین سے انھیں شوق ہے چنانچہ کچھ عرصہ ہوا آپ نے لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے مختلف تہذیبوں کے تصادم پر ایک تقریر براڈکاسٹ کی تھی جسے اب انھوں نے بعض ضروری اضافوں اور دلچسپ تصویروں کے ساتھ کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ کتاب کیا ہے دراصل قدیم زمانہ سے لیکر اب تک ہندوستان کی تہذیب و تمدن کی مختصر سی تاریخ ہے۔ فاضل مصنف نے اس اہم مضمون کو چند صفحوں میں سمیٹ کر گویا سمندر کو کوزہ میں بند کر دیا ہے اس کا تیسرا، چوتھا اور پانچواں باب خصوصیت سے پڑھنے کے قابل ہے تیسرے باب میں فاضل مصنف نے یہ بتایا ہے کہ قدیم ہندوستانیوں نے اپنی نوآبادیاں کہاں کہاں قائم کی تھیں اور اس وقت بھی ہندوستانی تہذیب و رسم و رواج کن کن ملکوں میں موجود ہے۔ اسی سلسلہ میں ملایا، سیام، ہندچینی، سماترا، جاوا اور بالی وغیرہ کی تاریخ بھی آگئی ہے اور چوتھے و پانچویں باب میں یہ بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کے آنے سے ہندوستان کی تہذیب و تمدن پر کیا اثر پڑا۔ اسی ضمن میں تلسی داس سورداس، کیشو، گورونانک اور کبیر کے حالات بھی آگئے ہیں۔ بہت سی تصویروں کے اضافہ نے اس مفید و سبق آموز کتاب کی اہمیت کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ زبان عام فہم اور سلیس ہے۔

خطابیات[2]

شیخ رحیم الدین صاحب کمال ظہیر آبادی نے یہ کتاب لکھکر اردو ادب کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کر دیا ہے۔ اس چھوٹی سی کتاب میں فاضل مصنف نے ہر قسم کی تقریروں مثلاً مباحثہ، نشری تقریر، ضیافتی تقریر، سپاسنامہ، وداعی تقریر، تعزیتی تقریر وغیرہ کے نمونے دیئے ہیں، اور ہندوستان کے مشہور و معروف مقررین کے مختصر حالات بھی بیان کئے ہیں۔ فن تقریر سے دلچسپی رکھنے والوں کیلئے یہ کتاب بہت مفید ثابت ہوگی

مادری زبان کی تعلیم[3]

یہ دنیا کا مسلمہ اصول ہے کہ بچوں کو اُن کی مادری زبان میں تعلیم دی جائے مگر ہندوستان میں اب تک انگریزی زبان ہی پر زیادہ تر زور دیا جاتا رہا ہے اور اسکولوں میں تقریباً تمام مضامین انگریزی ہی میں پڑھائے جاتے رہے ہیں لیکن اب ماہرین تعلیم اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ انگریزی ایک ثانوی زبان کی حیثیت سے پڑھائی جائے اور تمام علوم و فنون کی تعلیم

---

[1] قیمت آٹھ آنہ۔ ملنے کا پتہ:۔ نولکشور پریس لکھنؤ۔ [2] قیمت بارہ آنہ ۱۲؍ ملنے کا پتہ:۔ دفتر ادارۂ ادبیات اردو رفعت منزل خیریت آباد حیدرآباد دکن
[3] قیمت ۱۲؍ ملنے کا پتہ:۔ تم کسفورڈ یونیورسٹی پریس بمبئی۔

مادری زبان میں دیجائے۔ اس کتاب میں مسٹر ڈبلیو۔ ایم۔ رابرٹس ایم۔ اے نے ٹیچروں کے لئے مفید ہدایات درج کی ہیں جن پر عمل کرنے سے وہ بچوں کو ان کی مادری زبان میں عمدگی سے تعلیم دے سکیں گے۔ پوری کتاب میں چودہ باب ہیں جو اپنی اپنی جگہ سب مفید ہیں۔ یہ کتاب پرائمری اور سکنڈری اسکولوں کے ٹیچروں کے لئے خاص طور پر مفید ہے اور ہم اسکول کی لائبریریوں کے لئے اس کی خریداری کی سفارش کرتے ہیں۔ اصل کتاب انگریزی زبان میں تھی جسے منشی عبدالمجید خاں بی۔ اے منشی فاضل، کرسچین اسکول کھرڑ (پنجاب) نے اردو میں ترجمہ کیا ہے اور آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے شایع کیا ہے۔

نفسیات اور اصول تعلیم (حصۂ اول)

بچوں کی تعلیم میں نفسیات کو بڑا دخل ہے، اسی لئے ایک کامیاب ٹیچر کے لئے بچوں کی نفسیات کا واقف کار ہونا ضروری ہے مسٹر ڈبلیو۔ ایم۔ رابرٹس ایم۔ اے نے یہ کتاب ٹیچروں کی رہنمائی کے لئے لکھی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ بچوں کے نفسیات کا کس طرح مطالعہ کیا جائے۔ اسی سلسلہ میں بچوں کو تعلیم دینے کے اصول بھی بیان کئے ہیں۔ اس کتاب کے دو باب خاص طور پر مفید ہیں، ایک میں بچوں کی عادتیں سدھارنے کے گر بتائے گئے ہیں اور دوسری میں مختلف کھیلوں کے تعلیمی فوائد بیان کئے گئے ہیں۔ غرض یہ کتاب اسکول لائبریریوں میں رکھنے اور ٹریننگ اسکولوں میں پڑھائے جانے کے قابل ہے۔ قیمت ۱۲؍

ملنے کا پتہ: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس بمبئی۔

پانی کی کہانی

خوشی کی بات ہے کہ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن اب تک مختلف موضوعات پر چھوٹی بڑی تقریباً سو سوا سو کتابیں شائع کر چکا ہے۔ ادارۂ مذکور نے عوام کو سائنس کی باتوں سے روشناس کرنے کے لئے سائنس پرائمروں کا ایک سلسلہ جاری کیا ہے جس کی ایک کڑی زیر نظر کتاب ہے۔ اس میں پانی کے متعلق تمام ضروری باتیں مثلاً پانی کی شکلیں، پانی کے قدرتی ذخائر، پانی کا کھرا اور میٹھا پن، پانی کا جراثیم سے تعلق، پانی کے اجزاء ترکیبی، نباتی اور حیوانی زندگی سے پانی کا تعلق زمین کی ساخت اور موسم پر پانی کا اثر، نہریں اور دریا۔ وغیرہ یہ تمام باتیں سلیس اور دلچسپ پیرایہ میں بیان کی گئی ہیں۔ اور فاضل مصنف مولوی فیض محمد صاحب بی۔ اے تصویروں اور نقشوں کا اضافہ کرکے کتاب کو بہت ہی دلچسپ بنا دیا ہے۔ البتہ کہیں کہیں بعض ثقیل، وغیر مانوس اصطلاحیں استعمال ہوگئی ہیں مثلاً آلہ برآدہ، محلل، وتوں فشارہ وغیرہ وغیرہ۔ شائقین ادارۂ ادبیات اردو رفعت منزل خیریت آباد حیدرآباد دکن سے طلب فرمائیں۔

ارشادِ رسالت (حصۂ اول)

مولوی محمد رمضان صاحب تبسم قریشی نے پیغمبر اسلام کی بعض سبق آموز حالات و روایات کو نظم کرکے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ اخلاقی حیثیت سے بچوں کیلئے یہ کتاب مفید ہوگی کیونکہ اس میں کوئی بات کسی دوسرے مذہب یا فرقہ کے خلاف نہیں ہے زبان البتہ کسی قدر مولویانہ ہے اور شاعرانہ اعتبار سے کہیں کہیں قابل اصلاح ہے۔ لکھائی چھپائی عمدہ حجم ۴۸ صفحہ شائقین ادارۂ اسلامی دارالاشاعت محلہ اقبال گنج گجرات پنجاب سے طلب فرمائیں۔

رفتارِ زمانہ

ہندوستان کے لحاظ سے کرپس مشن کی ناکامیابی اس سال کا اہم ترین واقعہ ہے۔ مارچ نمبر میں ہم ان تجاویز کا مختصر ذکر کر چکے ہیں اُسی پرچے میں ہمارے قدیم کرم فرما پنڈت کشن پرشاد کول نے ان تجاویز اور ان کے پس منظر کے متعلق ایک غور طلب مضمون لکھا ہے۔ آخری مرتبہ جب زمانہ میں سر اسٹیفورڈ کرپس کے مشن کا ذکر کیا گیا تھا تو ہم نے پریس کانفرنس میں اُن کی توضیحات کی بنیاد پر امید ظاہر کی تھی کہ سر موصوف اپنے مشن کو کامیاب بنانے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھیں گے، افسوس یہ اُمید پوری نہیں ہوئی۔ یہ ضرور ہے کہ آپ نے ابتدا سے انتہا تک ہندستان میں نہایت صبر وتحمل کے ساتھ تمام مسائل پر غور و خوض اور تبادلۂ خیالات کیا اور اختلافات کے باوجود آخر تک اپنی شگفتہ مزاجی قائم رکھی، لیکن معلوم نہیں کیوں آخر میں ڈیفنس کے متعلق آپ کا رویہ سخت ہو گیا اور اس سے بھی زیادہ قومی وزارت کی نوعیت و اختیارات کے متعلق آپ نے شروع میں جو توضیح کی تھی اس سے بعد میں قطعی منحرف ہو گئے۔ بعض لوگوں کو تو یہاں تک شبہ ہے کہ شائد وزیر اعظم نے آپ کے اس بیان کی تائید نہیں کی جو آپ نے پریس کانفرنس کے روبرو کیا تھا اور جس کے رو سے قومی وزارت کو وہی اختیارات ملنے کی توقع ہو گئی تھی جو برطانیہ میں برٹش وزارت کو حاصل ہیں۔ یہ قصہ بھی مشہور ہے کہ بعض صوبجاتی گورنروں نے اس توضیح کے خلاف دہلی اور انگلستان دونوں جگہ بڑے زور شور سے سلسلہ جنبانی کی جس کا یہ نتیجہ نکلا کہ سر اسٹیفورڈ کرپس کو فوراً اپنا رویہ بدلنا پڑا اور "ڈیفنس" اور "کیبنٹ گورنمنٹ" دونوں کے متعلق قومی لیڈروں کے مطالبے یکقلم رد ہو گئے اصل واقعات تو عرصہ کے بعد معلوم ہوں گے لیکن یہ ضرور تعجب کی بات ہے کہ ایک وقت باہمی سمجھوتہ کے امکانات اتنے روشن ہو گئے تھے کہ دو ہی ایک دن میں ملک اور صوبوں میں قومی حکومتیں قائم ہونے کی اُمید بندھ گئی تھی لیکن اس کے بعد ہی واقعات نے کچھ ایسا پلٹا لیا کہ دونوں حلقات میں کوئی مفاہمت نہ ہو سکی۔ آخری منزل میں مسٹر لوئی جانسن نے بھی جو صدر امریکہ کے قائم مقام خاص کی حیثیت سے دہلی میں موجود تھے خاصی دلچسپی لی اور اُن کے درمیان میں پڑنے سے مصالحت کی اُمیدیں اور بھی بڑھ گئی تھیں اس سلسلے میں ہندوستان کی سیاسی جدوجہد کی تاریخ میں پہلی مرتبہ چنانچہ لارڈ ویول جیسے عالی مرتبہ نیز کی [illegible] صدر کانگریس مولانا آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو اور مسٹر جناح نے سپہ سالار ہند سے بھی بات چیت کی، مگر مولانا آزاد کے بیان کے مطابق کمانڈر انچیف نے ڈیفنس کے متعلق تو کوئی خاص بات بیان نہیں کی البتہ سیاسی گفتگو ہوتی رہی۔ ڈیفنس کے علاوہ کانگریس کا یہ بھی مطالبہ تھا کہ جو مرکزی قومی وزارت بنائی جائے اُسے وہی اختیارات حاصل ہوں جو برطانوی آئین کی رو سے برٹش وزارت کو حاصل ہیں مگر سر اسٹیفورڈ کرپس اس کے متعلق لیڈران ملک کو مطمئن نہ کر سکے۔ بلکہ انھوں نے اس بارے میں یہی کہا کہ کل معاملات وائسرائے ہند سے طے کرنا چاہئے۔ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ سر ممدوح نے وائسرائے سے خود بات چیت کر کے اس معاملے کو کیوں نہ طے کرا دیا۔ بہرحال اس تھوڑی سی بات پر یہی شبہ ہوتا ہے کہ یا تو سر اسٹیفورڈ کرپس حکام ہند کے رویہ سے مایوس ہو گئے یا برطانوی وزارت کے فیصلہ سے مجبور ہو گئے مگر برطانیہ کی سیاسی زندگی کا ڈسپلن کہئے یا انگریزی حب الوطنی کی روایات سر اسٹیفورڈ کرپس ہندوستان میں مسٹر چرچل کے سچے قائم مقام ثابت ہوئے اور ہندوستان چھوڑنے کے بعد تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے

سابقہ معتقدات بالکل پس پشت ڈال دیئے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہمارے موجودہ اختلافات اگر بالکل نہیں تو بہت کچھ برٹش پالیسی کا نتیجہ ہیں جس پر لارڈ منٹو کے وقت سے برابر عملدرآمد ہو رہا ہے مگر انھوں نے اس کی تمام تر ذمہ داری ملکی لیڈروں پر ڈال دی، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ آج تمام اہل ملک متحد بھی ہو جائیں تب بھی برطانیہ ہندوستان کو داخلی و خارجی کسی قسم کی فوری آزادی دینے کو تیار نہیں ہے جیسے کچھ ہو سر اسٹیفورڈ نے دہلی میں جو رویہ اختیار کیا وہ کراچی میں قائم نہیں رہا۔ اور برطانیہ پہونچکر تو ان کی آواز مسٹر ایمرے وزیر ہند کی صدائے بازگشت ہو گئی۔ چنانچہ پارلیمنٹ میں انھوں نے اپنے تجربات اور تجاویز کے متعلق جو بیان دیا اس میں صاف طور پر جانبدارانہ پہلو نمایاں ہونے کے علاوہ شان حکومت کا بھی کافی اظہار تھا۔ مثلاً ڈیفنس کے محکمہ کو ہندوستانی ہاتھوں میں دینے کی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے ان کا یہ فرمانا کہ یہ رد و بدل خود ہندوستانی سپاہیوں کو ناپسند ہوگا کسی طرح مناسب نہیں کہا جا سکتا ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ کوئی طبقہ یا جماعت اس بیان کی تائید نہ کریگی اور جہاں تک معلوم ہو سکا ہے حال میں کوئی ایسی بات نہیں ہوئی جس سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہو۔ اسی طرح ہندوستانی لیڈروں پر یہ الزام لگانا بھی بیجا ہے کہ انھوں نے اس غور و فکر کے دوران میں باہمی اختلافات دور کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ کانگریس پر یہ الزام بھی بیجا عائد کیا گیا ہے کہ وہ حکومت پر اپنی پارٹی کا کامل اقتدار قائم کرنا چاہتی ہے اور عوام کے سامنے جوابدہ ہونا نہیں چاہتی۔ مولانا آزاد صدر کانگریس نے ان دونوں باتوں کی قطعی تردید کی ہے اور اس بات کو بخوبی واضح کر دیا ہے کہ کانگریس جب کبھی ملک میں قومی حکومت قائم کرنے کا ذکر کرتی ہے تو اس کی مراد کبھی پارٹی گورنمنٹ سے نہیں بلکہ مشترکہ قومی گورنمنٹ سے ہوتی ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اگر برطانیہ ملکی حکومت قائم کرنے پر رضامند ہو تو کانگریس دو دن کے اندر دوسری جماعتوں سے مشورہ کر کے متفقہ وزارت مرتب کر لیگی۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ دعویٰ کہاں تک صحیح ہے اور برطانوی تجاویز کو نامنظور کرنا کہاں تک دانشمندی کی بات تھی، لیکن دو باتیں صاف ظاہر ہیں کہ اول یہ کہ برٹش گورنمنٹ ابھی اصلی اختیارات سے دستکش ہونے کو تیار نہیں معلوم دیتی دوسرے صرف کانگریس ہی نہیں بلکہ مسلم لیگ، ہندو مہاسبھا اور سکھوں نے بھی ان تجاویز کو قابل منظوری نہیں سمجھا اور اگر مختلف پارٹی لیڈروں نے خود باہمی مشورہ کی ضرورت نہ سمجھی تو سر اسٹیفورڈ کرپس ہی مختلف پارٹیوں کا ایک مشترکہ جلسہ طلب کر لیتے۔ خیر تصور کسی کا ہو بدقسمتی ملک کی ہے کہ برطانیہ اور ہندوستان کے درمیان ایسے نازک وقت پر بھی سمجھوتہ نہ ہو سکا جس سے ملکی صورت حال بد سے بدتر ہو گئی اور اب کیفیت یہ ہے کہ فریقین میں کشیدگی کے آثار نمایاں ہیں۔ سر اسٹیفورڈ کرپس پارلیمنٹ میں اعلان کر چکے ہیں کہ ان تجاویز کی واپسی کے بعد وزارت فی الحال کوئی نئی تجویز پیش نہ کریگی بلکہ آئندہ اگر کوئی تحریک ہوگی تو وہ ہندوستانیوں کی طرف سے ہوگی اور حکومت اس پر غور کریگی یعنی گورنمنٹ صورت حالات کو درست لانے کے لئے اب کوئی قدم نہ اٹھائیگی۔ دوسری طرف کانگریس کی طرف سے مولانا آزاد بھی اسی قسم کا اعلان کر چکے ہیں، رہی مسلم لیگ اُس نے قطعی خاموشی اختیار کر لی ہے۔ نتیجہ حال میں مسٹر راجگوپال آچاریہ سابق وزیر اعظم مدراس نے مسلم لیگ کی امداد حاصل کرنے کے خیال سے مسلمانوں کا اپنے علیحدہ صوبے قائم کرنے کا حق بھی تسلیم کر لیا۔ اس پر مسٹر جناح اور خاص خاص ارکان لیگ ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ مولانا آزاد نے سمجھوتہ کی بات چیت کے لیے کانگریس کی طرف سے پانچ ممبروں کی ایک کمیٹی نامزد کرنے کا خیال ظاہر کیا لیکن اس کا بھی کوئی نتیجہ نہیں ہوا

ستم بالائے ستم یہ ہے کہ حال ہی میں مسلم لیگ کے ذمہ دار لیڈروں نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ پاکستان کے متعلق مسلم لیگ کا اصرار محض ایک ابتدائی مطالبہ ہے ورنہ اصل مقصد تو اسلامی ممالک کی ایک فیڈریشن قائم کرکے دنیا میں غلبہ حاصل کرنا ہے۔ یہاں اس مسئلہ پر کسی مفصل بحث کا موقع نہیں ہے کہ پاکستان کی تجویز خود مسلمانوں کے لئے مفید ہوگی یا مضر۔ مگر موجودہ جنگ نے اسلامی ملکوں کی جو افسوسناک حالت بنا دی ہے اُس کے دیکھتے ہوئے ہندوستانی مسلم لیڈروں کے رہنمائی میں ایک اسلامی فیڈریشن کا خواب خواہ کتنا ہی دل خوش کن ہو لیکن ہونے والے واقعات سے اس کا کوئی تعلق نظر نہیں آتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی حکومتوں کی بابت کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ قائم رہیں گی یا برباد ہو جائینگی، مگر آثار یہ ہیں کہ بڑی بڑی سلطنتوں کو بھی ایک دوسرے سے اشتراک عمل کرنا پڑیگا۔ پھر لیڈران مسلم لیگ کی موجودہ روش پر جو اتفاق و اتحاد سے بے نیاز معلوم ہوتی ہے کیوں نہ انتہائی افسوس کیا جائے۔ غیر مسلم حلقوں میں اس سے بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔ اور تمام ملک میں مایوسی کے بادل چھائے ہوئے ہیں عام لوگوں کی بددلی یہاں تک بڑھ گئی ہے کہ اس قسم کی آوازیں عام ہو گئی ہیں کہ جب تک برطانیہ اپنی موجودہ پالیسی میں اصولی تبدیلی نہ کریگا اُس وقت تک نہ ہندوستان کا سیاسی مسئلہ ہی طے ہوگا اور نہ ہندو مسلمانوں کے باہمی اختلافات دور ہونگے۔ غرض اس وقت فریقین ایک دوسرے سے تنے ہوئے ہیں اور بظاہر اسباب پولیٹیکل سمجھوتہ کا فی الحال کوئی امکان نظر نہیں آرہا ہے۔ البتہ اگر کوئی اتحادی حکمران یا صدر امریکہ مسٹر روز ویلٹ وغیرہ اس مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیں تو بہت سی مشکلات خود بخود رفع ہو جائیں۔ لیکن اگر ایسا نہ ہوا تو یہ اختلاف و افتراق ملک اور سلطنت دونوں کے لئے سخت مضر بلکہ مہلک ثابت ہوگا۔ اس وقت بھی گرفتاریوں اور سختیوں کی شروعات ہو چکی ہے۔ مہینوں کی خاموشی کے بعد ملک لیڈران کی نظر بندی اور خیالات پر سختی کا دور دورہ شروع ہو گیا ہے۔ حالانکہ جنگی ضروریات کا تقاضا یہ ہے کہ گورنمنٹ اور اہل ملک دونوں میں کامل اتحاد و ارتباط قائم ہو۔

جہاں تک جنگ کا تعلق ہے اب وہ بالکل ہندوستان کے نزدیک آگئی ہے۔ برما بالکل ختم ہو چکا۔ چینی فوجوں کو برما خالی کر کے چین واپس جانا پڑا۔ انگریزی فوج [illegible] فیصدی ہندوستان واپس آگئی ہے مگر اُسے اپنا جنگی سامان برما ہی میں چھوڑنا پڑا۔ یہ [illegible] ہے کہ اس کا بہترین حصہ ناقابل استعمال کر دیا گیا ہے تاہم برما ہاتھ سے نکل جانے کے بعد ہندوستان بالکل دشمن کی زد میں آگیا ہے۔ جاپان [illegible] بمباری کرنے کے بعد آسام کے بعض مقامات پر بھی ہوائی حملہ کر چکا ہے گویا ہندوستان پر لڑائی کی شروعات ہو چکی ہے گو اس وقت وہ اپنا سارا زور چین کو زیر کرنے پر لگا رہا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ چینی قوم پرست فی الحال سخت نرغے میں پڑ گئے ہیں مگر ان کی ہمت و شجاعت کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے کہ وہ اُسی زور شور اور جوانمردی سے دشمن کا مقابلہ کر رہے ہیں اور آئندہ بھی ہمت ہارنے والے نہیں معلوم ہوتے۔ مارشل چیانگ کائی شیک نے امریکہ سے مزید امداد کی اپیل کی ہے اُن کا دعویٰ ہے کہ اگر امریکہ اپنے جنگی سامان کا جو وہ آجکل تیار کر رہا ہے دسواں حصہ بھی چین کو دیدے تو چین اس سے دہ چند فائدہ اُٹھا لیگا۔ برما کی شکست کے بعد چین کو جنگی کمک بھیجنے کی مشکلات بہت زیادہ بڑھ گئی ہیں مگر صدر امریکہ روز افزوں امداد کا وعدہ کر چکے ہیں اور اس وعدے کو پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔ اُدھار پٹہ کے قانون کا پورا فائدہ بھی چین کو مل رہا ہے۔ برطانیہ نے بھی حال

ہی میں ساڑھے پانچ کروڑ پونڈ کی مالی امداد دی ہے۔ ان سب باتوں سے اُمید تو یہی ہے کہ چین آخر تک جاپانیوں سے لڑتا رہیگا اور جلد یا بدیر جاپان کو وہاں سے پسپا ہونا پڑیگا۔

روس میں بھی اس وقت بڑے زور کی لڑائی ہو رہی ہے، جرمنی کا متوقع حملہ شروع ہوگیا ہے مگر روس نے اس کے توڑ کے لئے خود بھی خارکوف کی طرف پیش قدمی کردی اور گو وہ اس کو جرمنوں سے واپس نہیں لے سکا لیکن اس سلسلے میں جو گھمسان لڑائیاں ہوئیں اور ان میں جرمنی کے جو نقصانات ہوئے اُن کا اثر دور رس ہوگا۔ اس وقت جنگ کی عجب حالت ہے، فریقین اپنی اپنی کامیابی کے دعوے کر رہے ہیں۔ ان کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم کرنا تو اس وقت مشکل ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں معلوم ہوتا کہ جرمنی کو روس میں خلاف توقع مشکلات پیش آرہی ہیں اور روسیوں کے حوصلے پست ہونیکے بجائے اور بڑھ گئے ہیں۔ ہٹلر کو مقبوضہ ممالک میں بھی نئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ حال ہی میں اس کی خفیہ پولیس کے مشہور افسر ہیڈرک کو جس نے مخالفین کی قتل و غارتگری میں ہلاکو کو بھی مات کردیا تھا کسی نامعلوم شخص نے پراگ میں بندوق کا نشانہ بنادیا۔ مقبوضہ ملکوں کے کارخانوں اور جرمن شہروں پر برطانوی رائل ایر فورس نے ایسے زور و شور کے ہوائی حملے کرنا شروع کردیئے ہیں کہ جن سے ہزارہا آدمی ہلاک اور کروڑوں کی عمارتیں نیست و نابود ہو رہی ہیں۔ ان مسلسل حملوں سے جرمن آبادی میں ایک نئی ہلچل مچ گئی ہے اور جنگ کا رخ پلٹتا ہوا معلوم ہو رہا ہے امریکہ کے بمباروں نے بھی ٹوکیو پر ہوائی حملہ کرکے ہوائی کارناموں میں ایک نئے باب کا اضافہ کردیا ہے۔ اس وقت امریکہ میں جتنا مال تیار ہو رہا ہے اس کی مقدار دیکھتے ہوئے ماننا پڑتا ہے کہ عنقریب ہی جنگ کا پانسہ پلٹنے والا ہے۔ امریکہ نے ہندوستان کی حفاظت کے لئے کثیر التعداد فوج اور ہزارہا بمبار بھیجے ہیں، یہاں کے کارخانوں کو بھی وہ انتہائی ترقی دینے کی بے لوث کوشش کر رہا ہے جس سے جنگ کے بعد بھی ملک کو فائدہ پہونچے گا۔ غرض اگر ایک طرف جنگ کے بادل منڈلاتے ہوئے نظر آتے ہیں تو دوسری طرف ان بادلوں سے ملکی ترقی کا اُجالا بھی دکھائی دیتا ہے۔

عرض حال اپریل اور مئی کے پرچے وقت پر پریس بھیجے گئے تھے مگر کانپور کے پریس ان دنوں لیجسلیٹو اسمبلی کی فہرستیں چھاپنے میں ایسے مصروف رہے کہ اُنھوں نے معمولی کاموں کی کوئی پرواہ نہ کی اور باتوں باتوں میں ہفتوں کی دیر کردی۔ اس وقت جون نمبر کی کاپیاں پریس کے لئے بالکل تیار ہیں اور اگر مطبع نے دیر نہ کی تو جون کا پرچہ ختم ماہ سے پہلے ہی ناظرین کے پاس پہونچ جائیگا۔ جون اور جولائی دونوں نمبروں میں بعض خاص مضامین ہدیۂ ناظرین ہونگے۔ کاغذ کی گرانی حوصلہ شکن ہے مگر اس سے بھی زیادہ مصیبت یہ ہے کہ اکثر اوقات بازار میں کسی قیمت پر کاغذ دستیاب نہیں ہوتا۔ ٹیٹاگڑھ پیپر مل کی عنایت سے اس طرف تھوڑا سا کاغذ مل گیا ہے جس سے مئی و جون کا کام نکل جائیگا۔ اگر آئندہ بھی اس مل کی توجہ اور مسرس بجے نرائن سنگھ کمپنی کی عنایت ہوئی تو کام چلتا رہیگا۔ ان تمام مشکلات کا اصلی حل ناظرین زمانہ کی امداد ہے، اسی لئے تمام قدردانان رسالہ سے ہماری استدعا ہے کہ وہ اپنے اپنے حلقۂ اثر میں زمانہ کی توسیع اشاعت کی کوشش فرماکر اپنی ہمدردی کا عملی ثبوت دیں، اپنے علم دوست احباب کے نام لکھ بھیجیں تاکہ ہم خود بھی ان کی خدمت میں نمونہ بھیجکر تحریک خریداری کر سکیں۔

مینجر "زمانہ"

زمانہ

جلد ۷۸ — جون ۱۹۴۲ء — نمبر ۶

عشق کی معصومیت

(از ڈاکٹر م، حفیظ، سید، ام، اے، پی ایچ، ڈی، ڈی، لٹ)

عالم مادی میں جس کو کشش کہتے ہیں وہی عالم ارواح میں محبت کہلاتی ہے۔ جب ہم اس عالم ظاہر کے تعلقات پر خواہ وہ اپنی ذات سے متعلق ہوں خواہ دیگر اشخاص سے، غور کرتے ہیں تو سب کی تہ میں ایک اصلی سبب جس کو محبت کہتے ہیں مخفی پاتے ہیں جس پر کل ظہور عالم کا کرشمہ مبنی ہے۔ جب ہم اس عالم اسباب کو نظر غور سے دیکھتے اور فطرت کی کتاب کی ورق گردانی کرتے ہیں تو آخر میں محبت ہی کو کل معاملات کا اصلی محرک اور علت اُولیٰ پاتے ہیں۔ ایک ذی عزت شخص اپنے متعلقین کی پرورش و تعلیم کی ذمہ داریاں اپنے سر لے کر رات دن گردش میں رہتا ہے، باوجودیکہ ظاہری بندش دکھائی نہیں دیتی اور کسی زنجیر میں وہ بندھا ہوا نظر نہیں آتا لیکن غور کروگے تو زبان حال سے تمھیں یہی جواب ملے گا کہ گو وہ بظاہر آزاد ہے لیکن محبت کی زنجیروں سے بندھا ہوا ہے۔ اسی طرح اشخاص، خاندان اور قومیں باہمدیگر محبت، شفقت، اتحادِ عمل، یگانگت اور یک جہتی، رفاقت اور ہمدردی کے غیرمرئی زنجیروں سے جکڑے ہوئے مثل اجسام فلکی گھومتی نظر آتی ہیں۔ صرف محبت ہی اس عالم اسباب میں مختلف صورتوں میں کارفرما نظر آتی ہے۔ یہی زبردست قوت ہے جو عالم کو ظہور میں لائی ہے، ایکو ہم بہو سیام" میں ایک ہوں بہت ہو جاؤں) اسی قوت کا نتیجہ ہے ذات باری کے مخفی خزانہ کے انکشاف کا سبب بھی یہی لازوال قوت ہے، جو اس ذات پاک کو جو ہر طرح کی خواہش سے بے لوث ہے، اس متنوع ظہور میں وحدت سے کثرت میں لانے کا باعث ہوتی ہے۔

اسی پریم کی رسی سے بندھا ہوا انسان اس دار محن میں آ کر بے شمار مصائب کو خوشی سے برداشت کرتا ہے اور اپنی منزلِ مقصود تک پہونچنے کے لئے بیتابانہ اور والہانہ انداز میں یوں بول اُٹھتا ہے:۔

پھر نکل آؤں عدم سے سر کٹانے کے لئے — بھیج دیکھو پھر قسمت کو بلانے کے لئے

یہی محبت عالم ظاہر میں طرح طرح کا لباس پہنکر میاں بیوی، باپ اور بیٹا، عاشق و معشوق، عابد و معبود وغیرہ کے نام سے موسوم ہو کر نمایاں ہوتی اور رنگ برنگ کی کیفیت ظاہر کرتی ہے۔

باغ میں بلبل و گل، بزم میں پروانہ و شمع بھیس بدلے ہوئے پھرتی ہے محبت تیری

جن کو ہم خود غرضی کے نام سے موسوم کرتے ہیں وہ بھی در اصل اسی قوت کے مظاہرے ہیں، وہ لوگ اس خطاب کے مستحق اس لئے ہوتے ہیں کہ ان کا مرجع اور مقصد حیات درست نہیں ہوتا۔ ورنہ جو فعل ان سے سرزد ہوتا ہے یا جس شے کی کوشش میں وہ سرگرداں رہتے ہیں حقیقت میں وہ اسی لازوال قوت کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ قدرت کا یہ راز نظرتاً موجودات کے ہر ذرہ میں کارفرما نظر آتا ہے۔ جبتک کہ یہ قوت قدرت کے مقررہ قانون کے مطابق عمل پیرا رہتی ہے، عالم مادی میں وہ محبت نہیں بلکہ "کشش" کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔ جب یہی قوت ذی روح مخلوق کے عالم میں اپنا اثر دکھلاتی ہے تب وہ محبت کہلاتی ہے۔ ادنیٰ درجہ کے جانوروں کی زندگی میں محبت کے ارتقا کا آغاز ہو جاتا ہے اور اعلیٰ درجہ کے جانوروں اور معمولی درجہ کے انسانوں میں وہ کافی طور پر نمایاں ہو جاتی ہے۔ جب ہمارا کوئی عزیز مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اس کے مصائب رفع کرنے میں ہم اپنی ذاتی تکلیفوں کو بالکل بھول جاتے ہیں۔ سچے پریم کی حالت میں انسان کو اپنے آپے کی خبر نہیں رہتی۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

بہ یار محو شدم چوں حباب در دریا ز چشم خلق نہانم دگر نمی دانم

خلاصہ یہ کہ محبت کی یہی قوت جب اپنی ترقی کے دوران میں اس اعلیٰ و ارفع مقام پر پہونچتی ہے جہاں سے اس کو اپنا اصلی مرجع نظر آنے لگتا ہے اور انسان اپنے آپ میں وہ باطنی کشش محسوس کرنے لگتا ہے جو جزو کو کل سے اور عابد کو معبود سے، طالب کو مطلوب سے ہم آغوش کرتی ہے تو یہی قوت بھگتی یا عشق الٰہی کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔ جب انسان جذبات و خواہشات بہیمی سے نجات پاکر اس دنیا کی ہوا و ہوس کو ترک کر دیتا ہے اور محویت کے عالم میں اپنی ہستی کو فراموش کر دیتا ہے، اُس وقت وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ ماسوائے عشق کسی دوسری ہستی یا شئے کی طلب، اس کے نقطۂ نظر سے کسی عصیان سے کم نہیں اور وہ اگر صحیح معنوں میں کسی کا سچا طالب باقی رہتا ہے اور کسی زندگی کا متمنی رہتا ہے تو وہ یہی عشق و محبت کی زندگی ہے جس کے ذریعہ اس کو حیات ابدی اور سرور سرمدی اور روحانی کمال کا اعلیٰ و ارفع درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ اسی عالمگیر اور حقیقی نظریہ کی ترجمانی ہمارا حقیقت بیں شاعر اپنے خاص انداز میں یوں کرتا ہے ؎

ماسوا عشق ہر اک چیز ہے عصیاں اعجاز زندگی دے تو خدا دے اسی معصوم کے ساتھ

اقبال کے نظریہ کے مطابق عشق ہی انسان کی خودی کو پختہ و مستحکم کر دیتا ہے۔ بال جبریل میں فرماتے ہیں:-

عشق تیری انتہا، عشق میری انتہا تو بھی ابھی ناتمام، میں بھی ابھی ناتمام

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عشق کیا ہے عشق کا وسیع ترین مفہوم خیر و ذات بنانا یا اپنے اندر جذب کرنا ہے عشق کی اعلیٰ ترین صورت یہ ہے کہ کوئی نصب العین سامنے رکھکر اُسے حاصل کرنے کی کوشش کی جائے عشق کا حاصل یہ ہے کہ عاشق میں محبوب کی صفات پیدا کردے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے یہاں عشق کا مفہوم عشق حقیقی ہے اسرار خودی میں فرماتے ہیں:

عاشقی آموز و محبوبے طلب — چشم نوحے، قلب ایوبے طلب
ہست معشوقے نہاں اندر دلت — چشم گر داری بیا بنما ئمت
عاشقانِ او زخوباں خوب تر — خوشتر و زیبا تر و محبوب تر
دل زعشقِ او توانا می شود — خاک ہمدوشِ ثریا می شود

اور ذیل کے شعر میں تو اس حقیقت کو بالکل بے نقاب کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

عاشقِ محکم شو از تقلیدِ یار — تا کمند تو شود یزداں شکار

اسی عشق کی مثال بالِ جبریل میں اس طرح دی ہے ؎

صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبرِ حسین بھی ہے عشق — معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

یہی عشق ہے جس سے خودی میں استواری، بالیدگی اور پختگی پیدا ہوتی ہے ؎

نقطۂ نورے کہ نامِ او خودی ست — زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی ست
از محبت می شود پائندہ تر — زندہ تر، سوزندہ تر، پائندہ تر
از محبت اشتعالِ جوہرش — ارتقائے ممکناتِ مضمرش
فطرتِ او آتش اندوز زعشق — عالم افروزی بیاموز زعشق

مندرجہ بالا بیانات سے اس قدر تو ظاہر ہو گیا ہوگا کہ عشق کا حقیقی مفہوم عشق حقیقی ہے نہ کہ بوالہوسی۔ عشق ہی وہ ذریعہ ہے جو انسان کو ملائے اعلیٰ کا توذکر نہیں، خود رب العزت کے حضور میں باریاب کرتا ہے۔ عشق معرفت الٰہی حاصل کرنے کا واحد اور سیدھا راستہ ہے۔ جس کو عشق کی دولت مل جاتی ہے اُس کو خدا کے ملنے میں دیر نہیں ہوتی، چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے:۔

دولت ملی ہے عشق کی اب اور کیا ملے — وہ چیز مل گئی ہے کہ جس سے خدا ملے

اس سے ظاہر ہوا کہ بجز عشق کی رہنمائی کے معشوقِ حقیقی کا پتہ ٹھکانا نہیں مل سکتا۔ خدا تک پہونچنے کے لئے بیخودی یا خودی سے رہائی کی ضرورت ہے۔ صاحبِ عشق بجز اپنے مطلوب کے کسی کا دھیان روا نہیں رکھتا۔ مذہب عشق میں مطلوب کے سوا کسی دوسری شے یا ہستی کا خفیف سا بھی خیال "عصیاں" سمجھا جاتا ہے۔ عشق کو معصوم اس وجہ سے کہا ہے کہ وہ تمام آلام و افکارِ باطل سے نجات دے دیتا ہے۔ گناہ کا خیال دل میں آنے نہیں دیتا

چنانچہ سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

دلم خانۂ مہر یار ست و بس — ازیں می نہ گنجد درین کین کس

اسی خیال کی تائید حافظ نے دوسرے الفاظ میں یوں کی ہے ؎

عشق می ورزم و امید کہ ایں فنِ شریف — از ہنرہائے دگر موجبِ حرماں نہ شود

اِسی خیال کو حضرت اعجاز اپنے خاص انداز میں یوں ظاہر کرتے ہیں ع زندگی دے تو خدا دے اسی معصوم کے ساتھ زندگی کا صحیح مقصد اور اس کی تمنا کا اصلی مفہوم ان کے نظریہ کے مطابق اسی "معصوم" کی معیت ہے جو تمام گناہوں اور خطاؤں سے آزاد کر دیتی ہے۔

یہ مسلمہ امر ہے کہ عشق کے وسیلہ سے یکسوئی، انہماک اور جذب کی حالت پیدا ہوتی ہے۔ عشق حقیقی کی حالت طاری ہونے کے بعد کسی دوسری شئے یا ہستی کا خیال انسان کے دل میں باقی نہیں رہ سکتا۔ ہندوستان کے قدیم فلسفیوں کا عقیدہ ہے کہ گناہ کی جڑ خواہش ہے اور خواہش کا مخزن دل یا "من" ہے۔ جب تک انسان کا دل ڈانوا ڈول اور منتشر رہتا ہے اور وہ طرح طرح کے خواہشات، افکار اور تمناؤں کا شکار رہتا ہے، اس کو سکون قلب حاصل نہیں ہو سکتا۔ خواہش بجائے خود گناہ کی علت غائی ہے۔ جب انسان کے دل پر صرف ایک خواہش غالب ہو جاتی ہے تو اس کے مقابلہ میں سب خواہشیں سرد پڑ جاتی ہیں، اور وہ بجز اپنے مطلوب کے کسی کا طالب نہیں رہ جاتا۔ بہ الفاظِ دیگر عشق کے ماسوا یا مطلوب کے علاوہ کسی دوسری شئے کی خواہش کرنا انسان کو عصیان کی طرف مائل کرنے کے برابر ہے۔ انسان کی زندگی کا ماحصل اور مقصدِ اولیٰ انسانیت کے صفات کو درجۂ کمال تک پہونچانا، اپنی انانیت حقیقی کا عرفان اور اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنا ہے۔ یہ اعلیٰ مدارج صرف عشق ہی کے ذریعہ حاصل ہو سکتے ہیں۔ جس کے دل کو یکسوئی حاصل ہو جاتی ہے اس کے دل میں افکار باطل باقی نہیں رہتے۔ اسی کو مولانا جلال الدین رومی "طبیب جملہ علتہائے ما" فرماتے ہیں۔ روحانی اور اخلاقی امراض سے نجات کا اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

ہر کرا جامہ زعشقے چاک شد — او زحرص و عیب کلی پاک شد

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما — اے طبیب جملہ علتہائے ما

اے دوائے نخوت و ناموس ما — اے تو افلاطون و جالینوس ما

ان مستند ارشادات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک بار اس شعر کو پھر پڑھیئے جو اوپر درج ہو چکا ہے اور جس سے اس مضمون کا عنوان اخذ کیا گیا ہے، اور آپ خود انصاف کیجئے کہ ہمارے فاضل ہیں شاعر نے کیا کمال کیا ہے جس کی تعریف الفاظ کے امکان سے باہر ہے۔ صرف اہل دل ہی اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

"ماسوا عشق ہر اک چیز ہے عصیاں اعجازؔ — زندگی دے تو خدا دے اسی معصوم کے ساتھ"

قطعِ محبت

(از پنڈت آنند نراین مُلّا ایم۔اے۔ ایل ایل۔بی)

میں، جاؤ تم سے کوئی واسطہ نہ رکھوں گا
تمھیں پسند نہیں، طرزِ گفتگو میرا
تمھیں قبول نہیں، ذوقِ جستجو میرا
تمھیں عزیز نہیں، خوابِ آرزو میرا
میں، تم پہ جبرِ مروّت روا نہ رکھوں گا
میں، جاؤ تم سے کوئی واسطہ نہ رکھوں گا

۲

مرا نیاز، مرا شوق رائیگاں ہے، اگر
مری نگاہِ محبت تمھیں گراں ہے، اگر
جبینِ شوق مری ننگِ آستاں ہے، اگر
تمھارے در پہ سرِ مدعا نہ رکھوں گا
میں، جاؤ تم سے کوئی واسطہ نہ رکھوں گا

۳

نہیں تمھارے خیالوں میں جب گزر میرا
تمھارے دل میں نہیں جب مری کوئی پروا
تمھارے پاس نہیں جب مرے لئے کوئی جا
میں تم سے دُور کا بھی سلسلہ نہ رکھوں گا
میں، جاؤ تم سے کوئی واسطہ نہ رکھوں گا

۴

مئے عنب کے لئے جامِ گل نہیں شایاں

شعاعِ ماہ نہیں بہرِ حجرۂ زنداں
نسیمِ باغ کہاں اور قفس نصیب کہاں
کسی امید کی اب دل میں جا نہ رکھوں گا
مَیں جاؤ تم سے کوئی واسطہ نہ رکھوں گا

۵

یہ سچ ہے اس میں اذیت ضرور ہوتی ہے
طبیعت اور بھی کچھ ناصبور ہوتی ہے
میں کیا کروں کہ محبت غیور ہوتی ہے
اُسے ذلیل کروں۔ یہ روا نہ رکھوں گا
مَیں، جاؤ تم سے کوئی واسطہ نہ رکھوں گا

۶

یہ ٹھیک ہے، کہ محبت بدل نہیں سکتی
وفا سرشت کی فطرت، بدل نہیں سکتی
کسی کے دل کی حقیقت بدل نہیں سکتی
مگر میں تم سے کوئی آسرا نہ رکھوں گا
میں، جاؤ تم سے کوئی واسطہ نہ رکھوں گا

۷

گو اب وہ سلسلۂ نامہ و پیام نہیں
مری حدیثِ تمنا مگر تمام نہیں
مزاجِ عشق میں سودائے انتقام نہیں
مجھے قسم ہے کہ دل میں گلہ نہ رکھوں گا
میں، جاؤ تم سے کوئی واسطہ نہ رکھوں گا

۸

میں دل ہی دل میں سجاؤں گا ایک بزمِ خیال
جہاں نہ گردِ کدورت ہے اور نہ رنگِ ملال

جسے نہ خوفِ تغیّر ہے اور نہ بیمِ زوال
تمھیں بھی اِس سے مگر آشنا نہ رکھوں گا
مَیں، جاؤ تم سے کوئی واسطہ نہ رکھوں گا

۹

شبِ حیات کو دوں گا یہاں نویدِ سحر
یہاں بچھاؤں گا گل ہائے شوق کی چادر
یہاں لُٹاؤں گا دل کے عقیق و لال و گُہر
یہاں مَیں کوئی بھی ارماں اُٹھا نہ رکھوں گا
مَیں جاؤ تم سے کوئی واسطہ نہ رکھوں گا

۱۰

یہاں وہ شمعیں جلاؤں گا، جو جلا نہ سکا
پڑھوں گا شعر جو تم کو کبھی سُنا نہ سکا
وہ گیت گاؤں گا جو تارِ جاں پہ گا نہ سکا
مَیں کوئی ساز یہاں بے سُرا نہ رکھوں گا
مَیں جاؤ تم سے کوئی واسطہ نہ رکھوں گا

۱۱

حقیقتوں نے کیا چاک زیست کا داماں
بس اک فریبِ تصوّر ہی اب ہے راہِ اماں
اسے بھی ہاتھ سے کھو دوں، تو جاؤں گا میں کہاں
نہیں نہیں، اسے ہرگز روا نہ رکھوں گا
مَیں، جاؤ تم سے کوئی واسطہ نہ رکھوں گا

رباعی

جب طبعِ حزیں غم سے بہل جاتی ہے ۔۔۔ ہر چیز نئے سانچے میں ڈھل جاتی ہے
اے شمع! ترا سوز جلاتا ہے اُسے ۔۔۔ یا تو غمِ پروانہ میں جل جاتی ہے

نوائے گرم

(از حضرت مولانا سیماب اکبر آبادی)

ہزار پردوں میں چھپ کر بھی ضوفشاں کیوں ہو
نہاں رہا نہیں جاتا تو پھر نہاں کیوں ہو

منارِ راہ بنے، گردِ کارواں کیوں ہو
ہماری خاک بتدریج رائیگاں کیوں ہو

نیازِ عشق کو، گر ہو لحاظِ خود داری
ہو آستانہ بسر، سر بر آستاں کیوں ہو

کلی کے دل میں سمایا نہ رازِ شامِ چمن
ملا ہو ظرف نہ جس کو وہ رازداں کیوں ہو

فرشتے کیوں نہ شریکِ مہمِ دنیا ہوں
تمام عمر ہمارا ہی امتحاں کیوں ہو

جو فطرتاً نہ ہو پستی، سرشت میں تیری
تو آدمی! ترے رہنے کو خاکداں کیوں ہو

ہے مقصد ایک ہی، گو مختلف صدائیں ہیں
خلافِ نغمۂ ناقوس کے اذاں کیوں ہو

نہیں جہاں گذرِ وہم، ہائے تنہائی!
مجھے خیال یہی ہے کہ تم وہاں کیوں ہو

بنائیں کیوں نہ کہیں اور چل کے گھر اپنا
چمن تباہ بہ تقدیرِ آشیاں کیوں ہو

تو جانتا ہے، کہ ہے خوئے انتظار مجھے
جو کچھ مرے لئے ہونا ہے، ناگہاں کیوں ہو

تمہارے ساتھ مرا دل ہے، اے قفس والو
مرے اسیر نہ ہونے سے بدگماں کیوں ہو

نوائے گرم مری، ہے پیامِ بیداری
جہاں اذاں نہ دوں میں، سحر وہاں کیوں ہو

ہو جس کو دیکھ کے خوش، فطرتِ خراب پسند
نہیں نہیں وہ مری خاکِ آشیاں کیوں ہو

ہنوز اٹھی نہیں ساحل سے انقلاب کی شام
اداس ابھی افقِ صبحِ گلستاں کیوں ہو

ہم اُن کی بزم سے بے کیف اُٹھ چلے سیماب
کسی نے یہ بھی نہ پوچھا کہ سرگراں کیوں ہو

شعر و شاعری کی تنقید[1]

(از جناب نواب محمود علی خاں عرف آغا علی خاں رئیس الہ آباد)

جس طرح سے شاعری کی مسلمہ تعریف و تشریح اب تک نہیں ہو سکی اسی طرح سے کسی شاعر کے کلام پر ایسا تبصرہ کرنا دشوار ہے جو ہر شخص کے مذاق کے مطابق ہو۔ موجودہ شاعری ذہنی و روحانی کیفیات کی ایک ایسی وسیع و عالمگیر مصوّری و موسیقی ہے جس کے تحت میں نہ صرف ہر قسم کے انسانی جذبات ہیں بلکہ تمام نظامِ عالم و مناظرِ فطرت بھی ہیں۔ جو شاعر ان کی صحیح ترجمانی کی قدرت رکھتا ہو وہ فطری شاعر کہلانے کا مستحق ہے۔ یوں تو دنیا میں ہزاروں شاعر پیدا ہوئے ہیں اور ہوتے رہیں گے مگر جتنے شاعر کیفیات و جذباتِ انسانی نظامِ قدرت و مناظرِ فطرت کو سہل اور سادہ مگر دلکش طریقہ سے دکھانے کی صلاحیت رکھتے تھے انھیں کا وجود دنیائے شاعری میں باقی رہ گیا

اس موضوع پر ہزاروں مقالے لکھے گئے اور لکھے جائیں گے، اس لئے اگر اس کو بسط کے ساتھ لکھا جائے تو مضمون بہت طویل ہو جائیگا۔ میں اس مختصر مضمون میں اس بات کی کوشش کرونگا کہ مختصر سے مختصر جملوں میں اپنے خیالات کا اظہار کر سکوں۔ شاعر فطرت کے معمولی مناظر کو ایسے دلکش الفاظ میں اور جذباتِ انسانی کو ایسے لطیف و دلنشین پیرائے میں دکھاتا اور پیش کرتا ہے جس کو بہترین ادیب یا بہت بڑا فلسفی پیش نہیں کر سکتا۔ اس کے لفظوں میں وہ قوت ہوتی ہے اس کے جملوں میں وہ سحر ہوتا ہے کہ جب اس کو کوئی ذی حسن انسان دیکھتا یا سُنتا ہے تو اُس کے روح و دل پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور اُس سے وہ درس حاصل کر سکتا ہے جو کسی تقریر یا تحریر سے ناممکن ہے

شاعری فطری و خلقی چیز ہے، اکتساب و تعلیم سے اس کا تعلق محض اتنا ہے کہ اس کے ذریعہ سے معلومات میں اضافہ ہو جاتا ہے، مگر کلام میں شعریت پیدا نہیں ہو سکتی۔ شاعری کے دو جزو ہیں، ایک مصوری دوسرا موسیقی۔ اچھے اور باکمال مصور کا یہ کام ہے کہ وہ جس منظر یا کیفیت کو دکھانا چاہتا ہے ایسے دلکش اور مُوثر پیرایہ میں دکھاتا ہے کہ اس سے علاوہ صحیح کیفیت معلوم ہونے کے دیکھنے والے کے دل پر ایک خاص اثر ہوتا ہے جس جگہ پر جتنے اور جس قسم کے رنگ کی ضرورت ہوتی ہے مصور کا قلم اتنا ہی اور ویسا ہی رنگ بھرتا ہے، اگر کہیں پر ہلکے رنگ کی ضرورت ہے، اور وہاں گہرا ہو گیا ہے، یا جہاں گہرے رنگ کی ضرورت ہے وہاں ہلکا ہو گیا ہے تو وہ نہ صرف غیر فطری ہو جائیگا بلکہ اس کے اثر میں بھی نقص پیدا ہو جائیگا اور اس کی ساری دلکشی ختم ہو جائیگی۔ یہی موسیقی کی کیفیت ہے کہ اگر گانے والے کی آواز و لے میں حلاوت و شیرینی نہیں ہے تو وہ کتنا ہی باکمال کیوں نہ ہو اس کا اثر نہ محض گوش و دل پر

---

[1] یہ مضمون جنوری و فروری ۱۹۳۳ء کے رسالۂ نگار لکھنؤ کو دیکھکر لکھا گیا ہے۔

بُرا پڑیگا بلکہ وہ موسیقی کی فضا کو بھی بھیانک بنا دے گا۔
اس کی دوسری مثال یہ بھی دی جاسکتی ہے کہ رباب کے سب تار اگر اپنے موقع و محل سے ہوں اور کام میں لائے جائیں تو اُن سے اچھا نغمہ پیدا ہوگا مگر اس نغمہ کی بلند آہنگی کا کیا کہنا جب رباب بجانے والے کے روح و دل میں بھی موسیقی کی فطری کیفیت ہو۔ وہی نغمہ ایسا ہوتا ہے جو دلوں کو اور فضا کو مسحور کر دیتا ہے۔ اگر کسی شاعر میں اس بات کی فطری صلاحیت ہے کہ وہ اپنے اکثر اشعار میں مصوری و موسیقی کو اکٹھا کر سکتا ہے تو وہ شعر انسان کو نہ محض ایک درس دیگا اور اس کے دل میں وجد پیدا کرے گا بلکہ روح اور دل پر ایسا گہرا نقش ڈالے گا جو عرصے تک قائم رہیگا۔ اب رہا اچھے شعر کا معیار یعنی کون شعر کسوٹی پر پورا اتر سکتا ہے۔ اس کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ قدرت نے جس طرح انسان کے چہروں اور آوازوں میں باوجود فطری یکسانیت کے امتیازی حدیں قائم کر دی ہیں اُسی طرح سے مذاق پسند کو بھی علحدہ کر دیا ہے۔ ایک ہی شعر کسی شخص کے دل پر اتنا اثر پیدا کرتا ہے کہ وہ گھنٹوں اس کی لذت سے بہرہ اندوز ہوتا رہتا ہے اور وہی شعر دوسرے شخص پر کوئی اثر پیدا نہیں کرتا۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اُس شعر میں مصوری یا موسیقی کا کوئی جزو نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ محض اختلاف پسند ہے۔ یہ چیز ایسی نہیں ہے جس کو لفظوں میں صحیح طریقہ پر ادا کیا جاسکے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک اچھا ہیرا کسی ایسے شخص کے سامنے رکھدیا جائے جو اس کا مبصر نہ ہو تو سمجھانے والا اس کو مکمل طریقہ پر سمجھا نہیں سکتا کہ اس ہیرے میں اور مصنوعی ہیرے میں یہ فرق ہے۔ سمجھنے والا صرف اسی قدر سمجھ سکے گا کہ اس کا کٹ اچھا ہے، سڈول ہے، چمک اس میں زیادہ ہے مگر سمجھنے کی فطری صلاحیت نہ ہو تو ان شعاعوں کو اور ان لہروں کو نہ سمجھ سکے گا جو اصلی اور نقلی ہیروں میں علحدہ علحدہ ہوتی ہیں۔
میں دیکھتا ہوں کہ اکثر شعرا اس بیماری میں مبتلا ہیں کہ شعر میں اگر دلفریب و دلکش الفاظ اکٹھا کر دیئے جائیں تو موسیقیت پیدا ہو جائیگی اور اس کے کوئی نہ کوئی معنی بھی نکل آئیں گے۔ کسی اچھے لفظ کو زبردستی کسی جگہ ٹھونسنا ایسا ہی ہے جیسے کسی ہار میں کسی اچھے نگینے کو بے محل جڑ دینا۔ فطری شاعر جب کسی خیال کا اظہار کرے گا تو مناسب و دلکش الفاظ خود اپنی جگہ تلاش کر لیں گے۔

(۲) موجودہ دورِ حیات میں جس نے دنیا کی قوموں اور افراد میں اپنی خود غرضی اور درندگی سے خون آشامی اور ہلاکت آفرینی کا تباہ کن جذبہ پیدا کر دیا ہے، یہ سوال پیدا ہو گیا ہے کہ آیا شاعری سے دنیا اور انسانیت کو کوئی فائدہ پہونچتا ہے یا نقصان۔ مجھ سے یونیورسٹی کے اکثر طالبانِ علم نے بھی یہی سوالات کئے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس مسئلہ میں میں ان کو مطمئن کر چکا ہوں، اس لئے اگر اس کا اعادہ اس مضمون میں مختصراً کیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ موجودہ دورِ زندگی میں تنازعہ للبقا کی جنگ بہت سخت ہو گئی ہے۔ روح و تن کے سلسلے کو قائم رکھنے کے لئے وقت کا بیشتر حصہ کشمکشِ حیات کے نذر کر دینا پڑتا ہے جس سے طبیعت میں کرختگی و خشونت پیدا ہو جاتی ہے

اس کے رفع کرنے کے لئے طبیعت میں شگفتگی اور دل میں سوز و گداز پیدا کیا جائے تو نہ محض زندگی کا اعلیٰ مقصد فوت ہو جاتا ہے بلکہ روح و دل میں حیوانیت بڑھ جاتی ہے۔ مثلاً کسی پولیس افسر کو قریب سے دیکھئے تو آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ وہ ہر شخص کو مشتبہ نظر سے دیکھنے پر مجبور ہے، اس کا لب و لہجہ دوسرا ہے اور اس کا عام برتاؤ بھی دوسروں سے الگ ہے، اس لئے کہ اس کے سامنے ہر وقت انسانی فطرت کا سیاہ ترین رُخ رہتا ہے، اس کے برعکس اگر آپ کسی نیک طینت مذہبی پیشوا سے ملئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ ہر شخص کو نیک چلن، شریف النفس اور صادق سمجھتا ہے، اس لئے کہ وہ انسانی فطرت کے روشن رخ کو دیکھا کرتا ہے۔ ڈاکوؤں کے گروہ میں اسی شخص کی زیادہ تعریف کی جاتی ہے جس نے سب سے زیادہ بیدردی اور بے رحمی سے لوگوں کو جان سے مارا اور اُن کو لوٹا ہے۔ ان مثالوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ افراد یا قومیں جس ماحول میں رہتی ہیں اُن کا اثر اُن پر ضرور پڑتا ہے۔ افراد کی زندگی اور سوسائٹی کا مقصد محض یہ نہیں ہے کہ حیوانوں کے اس طبقہ کی طرح زندگی بسر کریں جن میں درندگی یا خشونت پائی جاتی ہے بلکہ اشرف المخلوقات ہونے کی حیثیت سے ان کا یہ بھی فرض ہے کہ دل میں سوز و گداز درد و محبت طبیعت میں لوچ، جذبات میں شگفتگی پیدا کریں تاکہ خود ان میں اور سوسائٹی میں رحم، ہمدردی اور محبت کا ماحول پیدا ہو۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب طبیعت میں (اگر کچھ بھی صلاحیت ہے) مذاق شعری پیدا کیا جائے یا اس سے لطف و حظ حاصل کرنے کا ذوق۔ اس لئے کسی ایسے شخص سے تنقید لکھانا جو اس کے لئے موزوں نہ ہو علم و ادب پر ایک ظلم ناروا ہے۔

رسالہ "اضطراب" ٹیگور نمبر

بنارس سے مسعود اختر جمال صاحب "اضطراب" کے نام سے ایک علمی و ادبی رسالہ نکال رہے ہیں۔ "اضطراب" کے ابتک کئی نمبر شائع ہو چکے ہیں۔ مسعود اختر جمال صاحب ایک خوش فکر نوجوان ہیں۔ رسالہ کو سلیقہ سے ترتیب دیتے ہیں زیر نظر پرچہ "اضطراب" کا ٹیگور نمبر ہے۔ جس میں تیس مضامین نظم و نثر ہیں ہر مضمون کا ڈاکٹر ٹیگور کے سوانح حیات، کردار یا تصانیف سے کچھ نہ کچھ ضرور تعلق ہے۔ اس نمبر میں ڈاکٹر ٹیگور کے ڈرامہ "سنیاسی" بعض افسانوں اور نظموں کے ترجمے بھی ہیں جو بہت عمدہ ہیں۔ اس پرچے میں مولانا سیماب اکبرآبادی کا ایک خط اور جمال صاحب کی طرف سے اس کا جواب بھی چھپا ہے سیماب صاحب نے اپنے خط میں ڈاکٹر ٹیگور کی عظمت و بین الاقوامی شہرت کو گھٹانے کی بیکار کوشش کی ہے۔ مگر جمال صاحب نے لیاقت و متانت کے ساتھ ان کو جواب دیا ہے۔ بہر حال اس نمبر کے تمام مضامین پڑھنے کے قابل ہیں۔ لکھائی چھپائی اچھی، کاغذ عمدہ، ضخامت ۱۱۲ صفحات، قیمت بارہ آنے

ملنے کا پتہ:۔ دفتر رسالہ اضطراب۔ چاند ٹیرے حویلی۔ بنارس

قصرِ ویراں

(از جناب راجہ مہدی علی خاں)

ڈوبا شفق کی جھیل میں خورشید خاوری
مہکے ہوئے چمن کی ہوائیں اُداس ہیں
کھڑکی میں آسمان کی حیراں ہے چاند بھی
سوئی ہوئی بہار کے چہرے پہ یاس ہے
آتی نہیں ہے دُور سے کوئل کی اب صدا
ہر سال آکے دیکھتا ہوں تیرے گھر کو میں
سُنتا ہوں اب بھی یاں ترے قدموں کی میں صدا
یہ گھر اداس اس کے گرد جو شئے ہے اُداس ہے

انگڑائی لے کے غرب سے لیلائے شب اُٹھی
کیا کھو چکی ہیں آج فضائیں؟ اُداس ہیں
شاید مری طرح سے پریشاں ہے چاند بھی
غمگین دل کی طرح گلستاں اُداس ہے
گاتی نہیں ہے گیت مسرت کے اب ہوا
اب تک عزیز ہوں ترے دیوار و در کو میں
خوشبو سے تیری اب بھی ہے مہکی ہوئی فضا
جو مُرتی ہے دل میں وہی آس پاس ہے

اِک بار آج پھر مری چشم اشکبار ہے
یہ قصر میری آرزوؤں کا مزار ہے

غنچہ

نہیں، غنچوں کو کھول کر شگوفہ بنانا تمھارا کام نہیں ہے۔
غنچہ کو ہلاؤ جلاؤ، لیکن اس کو شگوفہ بنانا تمھاری طاقت سے باہر ہے۔
تمھارا مس اس کو آلودہ کر دیتا ہے، تم اس کی پنکھڑیوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتے ہو اور انھیں خاک میں پھیلا دیتے ہو
لیکن نہ کوئی رنگ ظاہر ہوتا ہے اور نہ کوئی خوشبو
آہ! غنچوں کو کھول کر شگوفہ بنانا تمھارا کام نہیں ہے۔
وہ غنچوں کو کس سادگی سے کھول دیتا ہے۔
وہ اُس پر ایک نظر ڈالتا ہے اور زندگی کا عرق اس کی رگوں میں حرکت کرنے لگتا ہے
اس کے سانس کے ساتھ پھول اپنے بازو پھیلا دیتا ہے اور ہوا میں پھڑ پھڑانے لگتا ہے۔
دل کی تمناؤں کی طرح رنگ تیزی سے باہر نکل پڑتا ہے اور خوشبو ایک عجیب راز کا اظہار کرنے لگتی ہے۔
وہ جو غنچہ کو کس آسانی سے کھلا سکتا ہے۔

ٹیگور

سید افضل سکندرآبادی

نیرنگِ حسن

یا

(نایکا بھید)

(از مسٹر سلیم جعفر)

(ج) پْرَوڑھا پَتِ ...... (प्रौढ़ा प्र०) (मध्या प्र०)

जाही जुही मल्लिका चमेली मन मोदिनी की कोमल कुमोदिनी उपमा खराब की। कहै पदमाकर त्यों तारन बिचारन को बिगर गुलाब अजगैबी गैर आब की॥ चूर करी चोखी चांदनी की छबि छलकत पलक में लीनी छीन आब महताब की। पा पर कहत पीय कापर पैरेंगी आज गरद गुलाब की अवाई आफ़ताब की॥

دلاویز جاہی۔ جوہی۔ موتیا۔ چمیلی۔ اور نرم و نازک کمودنی اب قابلِ تشبیہ نہیں رہیں بیچارے تارے بیکیا میں لیکن غیب ہی سے اُن کی آب و تاب جاتی رہی۔ چاندنی کا غرور چور چور کر دیا اور مہتاب کی تابانی [illegible] پیا کے پاؤں پڑ کر پوچھتی ہے کہ اب کیسے خاک میں ملانے چلے، گلاب کو آفتاب کو۔

(د) پَرکیا پَتِ ...... (परकीया प्र०) ......

बात बिटोक की टेर कहै कहूं गागर रीतियै आनि दिखावै।
सूनो के पाय तो आपहि रोकि के आज रहो कहि यों ललचावै॥
झांकि झरोखो अजान सी है के बिदेह के पीर को गीतन गावै।
प्यों परदेस को चाहै चल्यो पै परोसिन सों कहूं जान न पावै॥

زور زور سے باتیں کرتی اور خالی گھڑا آکر دکھاتی ہے۔ تنہائی کا موقع ملتا ہے تو روک کر کہتی اور یوں لالچ دیتی ہے "آج تو یہیں رہ جاؤ" بے خبر بن کر جھروکے سے جھانکتی اور درد فرقت کے گیت گاتی ہے پیا پردیس سدھار رہے ہیں، سب کچھ کرتی ہے مگر پڑوسن سے چھپاتی ہے۔

(ہ) گَنِکا پَتِ ... (गनिका प्र०)

चलत पीय परदेस को बरजि सकौं नाहिं तोहि।
लै ऐहो आभरन जो जियत पाइहो मोहि॥

پیا، تم پردیس چلے، تمھیں کون روک سکتا ہے۔ واپسی پر زندہ پاؤگے تبھی تو زیور پہناؤگے

(۱۰) آگت پَتِکا (आगत पतिका) پیا پردیس سے واپس آگئے دل باغ باغ ہے۔

ٰ سلسلہ کے لئے ملاحظہ فرمایئں زمانہ بابت فروری، مارچ، اپریل، مئی ۱۹۱۳ء

(۱) مُگدھا اگت پتکا (मुग्धा आगत पतिका)

कानि करै गुरु लोगन की न सखीन की सिख नहीं मन लावति ।
ऐड़ भरी अंगराति खरी कत घूंघट मे नए नैन नचावति ॥
मंजन कै दृग अंजन आंजति अंग अनंग उमंग बढ़ावति ।
कौन सुभाव री तेरो परयो खिन आंगन में खिन पौरि मैं आवति ॥

(سکھی کہتی ہے) نہ گھر کے بڑے بوڑھوں کا پاس و لحاظ ہے نہ سہیلیوں کے کہنے کا کچھ خیال۔ مستی میں کھڑی کھڑی انگڑائیاں لے رہی ہے اور شوخی سے آنکھوں کو قرار نہیں۔ مستی مل گئی، سُرمہ لگایا گیا اور اُمنگوں سے بوٹی بوٹی پھڑک رہی ہے۔ اے تیری یہ کیا عادت پڑ گئی ہے۔ کبھی آنگن میں آتی اور کبھی ڈیوڑھی میں جاتی ہے۔

(ب) مَدھیا اگت پتکا (मध्या आगत पतिका)

आज सखी नन्दी कर प्यार विभूखन भूखन दै पठए हैं ।
मङ्गल मूल बनाय विचित्र सु फूल दुकूल निहारि नए हैं ॥
आनद की सु घरी सिगरे मन बांछित काज भए हैं ।
बूझति तोकहं बासर के कह री अब केतिक जाम गए हैं ॥

آج نند نے زیور پہنا اور پیار کر کے بھیجا ہے۔ اُس نے خوشی مجسّم اور حیرت انگیز پھول بنا کر نیا دوپٹہ اُڑھایا عیش و عشرت کی ساعت آگئی۔ سب نامرادیاں مراد ہوگئیں۔ پوچھ رہی ہے کہ دن کتنا گزرا ہے۔

(ج) پْروڑھا اگت پتکا (प्रौढ़ा आगत पतिका)

परदेस ते सुन्दर पीतम आए सुने प्रति हास बढ़े सिगरे ।
उर कराठ लगाय लई ललना गहि गाढ़ अनन्द सों अंक भरे ॥
तरकी सुतनी दरकी अंगिया मनिमालन ते महि लाल गिरे ।
जनु पी के मिले तिय के हिय के अंगरा बिरहागिन के निकरे ॥

یہ سُن کر کہ پیتم پردیس سے آگئے پھولی نہیں سماتی۔ پکڑ کر سینہ سے لگا لیا اور نشۂ محبت میں ڈوبی ہوئی ہے۔ سینہ بند کے بند ٹوٹ گئے اور وہ مسک گیا۔ ہار کے لعل ٹوٹ کر زمین پر گر پڑے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پیتم کے ملنے سے بیوی کے جسم سے آتشِ ہجر کی چنگاریاں نکل رہی ہیں۔

(د) پرکیّا اگت پتکا (परकीया आगत पतिका)

आए री पीय परोसन के सु भई सुनि मो मन मोद मई है ।
हौं कवि दूलह वाकी दसा लहि जात भरी तन ताप तई है ॥
मोहि बकावै सबै घर की सु कहौ वह बेदन कौन भई है ।
और के आनंद आनंद होत जरै जिय को यह रीत नई है ॥

یہ سُن کر کہ پڑوسن کے یہاں پیا آئے ہیں دل میں محبت نے جوش مارا۔ میں دیکھنے گئی تو آتشِ عشق نے بے تاب

پھونکا۔ سب گھر والے بگڑ رہے ہیں۔ کوئی پوچھے کون سا غضب ہو گیا۔ کسی کو خوش ہوتے دیکھکر جلنا یہ تو کچھ انوکھی ہی بات ہے

(۵) گتکا اگت پتکا (गविका आगत पतिका)

कालह की सांझ ही तें सजनी हौं खरी दुचिती असुवान बहाऊं।
आज तो वायस मो घर आय के बोलि गयो सखि होत पहाऊं॥
जो अबके अपनी इन आखिन सन्तन प्यारे को देखन पाऊं।
रागिनी रागहि जाऊंगी वागहि कागहि पागहि पाग बंधाऊं॥

اے سکھی کل شام سے پریشان ہوں آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ کوّا آج گھر پر آ کر بول گیا ہے پیا مہمان ہونگے۔ اگر اس بار میں اُنھیں اپنی ان آنکھوں سے دیکھ لوں تو باجے گاجے کے ساتھ محبت میں ڈوبی ہوئی باغ جاؤنگی اور کوّے کے پگڑی بندھاؤں گی۔

باب ششم

یہاں تک اسباب خارجی مدار تقسیم تھے۔ لیکن اب رنگ طبیعت باعث فرق و امتیاز ہے یعنی محض جبلت و خلقت سے بحث ہے۔

اُتّما (उत्तमा) پیتم کے عیب و ہنر کچھ نظر نہیں آتے۔ آنکھوں پر محبت کی پٹی بندھی ہے۔

झांके फुलबाग में झरोखे अनुराग भरी देखे तहां आप ऐसे चरित बिहारी के।
कवि दूलह बखानत बने ना जैसे लहलहे लोचन ललित सुकुमारी के॥
फूल अंग अंग बाढ़े उरज उतंग फैली छबि की तरंग मुखचन्द के उजारी के।
ज्यों ज्यों परनारी पिय लेत भरि गोद त्यों त्यों हिय होत परम प्रमोद प्रानप्यारी के।

جھروکے سے پائیں باغ میں محبت سے بیتاب ہو کر دیکھا تو پیتم کو عجیب ہی رنگ میں پایا۔ آنکھوں سے خوشی سی ٹپکنے لگی۔ پھولی نہیں سماتی۔ اُٹھا ہوا سینہ اور اُبھر آیا۔ حسن کی لہریں عضو عضو میں دوڑ گئیں۔ چہرہ دمک اٹھا جیسے جیسے پیتم غیر عورت کو چھاتی سے لگاتے ہیں اُس کا دل باغ باغ ہوا جاتا ہے۔

مَدھیَما (मध्यमा) پیتم سیدھے رہیں تو یہ بھی سیدھی ورنہ ٹیڑھے تو یہ بھی ٹیڑھی۔

फैल रही चैत की सु चांदनी रुचिर कैधों केतकी सुबास छायो सहन अटारी को।
बेनी कवि दम्पति रमत रति रंगन में पति के बदन कढ़यो नाम और नारी को॥
भौंहे सतराय तिरछौहे मुख नाय अलसौहे बड़ो घूंघट झुकायो स्याम सारी को।
मानो एकबार ही अन्धारो को पसारो भयो छपो चन्द बिन्दु मनो कारो घटा कारी को॥

چیت کی دلفریب چاندنی چھٹک رہی تھی اور محل اور اٹاری کیتکی کی خوشبو سے مہک رہے تھے عین وصل میں پیا کے منہ سے غیر عورت کا نام نکل گیا۔ ابرو میں بل پڑ گئے۔ منہ پھیر لیا۔ افسردہ خاطر ہو کر منھ پر کالی ساری کا گھونگٹ ڈال لیا معلوم ہوتا تھا کہ یکایک اندھیرا چھا گیا اور چاند کو کالی گھٹا نے آغوش میں لے لیا۔

اَدھما (अधमा) پیتم خوشامد کرتے ہیں اور یہ اکڑتی جاتی ہیں۔

पांवरी आनि भिरवारी मनो पजनेस सदा चित देत है फेरी ।
जी की कठेठी अठेठी गंवारिन नेक नहीं कबहूं हंस हेरी ॥
आंधरे रूप के जोम तें बावरी जानि परै परपीर ना एरी ।
नन्दकुमारहि देख दुखी छतियां कसकी ना कसाइन तेरी ॥

روز دروازہ پر آکر فقیروں کی طرح پھیری لگاتا ہے مگر سنگ دل گنواری نے کبھی زخمِ دل پر مرہمِ تبسم کا پھاہا نہ رکھا۔ زعمِ حسن میں اندھی ہو رہی ہے، اس لئے کسی کی تکلیف کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ اے قسائی نندکمار کو دیکھکر کبھی تیرے دل کو ٹھیس نہ لگی اور اُس میں درد نہ اُٹھا؟

باب ہفتم

صانعِ ازل کی صنایعِ مختلفہ کی نیرنگیاں دیکھئے۔ گو نہیں کہہ سکتے کہ اس میں سرشت کو دخل نہیں لیکن اس کی نوعیت بدلی ہوئی ہے۔ باب ششم کی اور اس کی تقسیم میں یہ فرق ہے کہ وہاں نیرنگیوں میں محبوب کی روش اور اُس کے تاثرات کو دخل ہے۔ یہاں قدرت نے پیکرِ آب و گل میں جو اختلاف رکھے ہیں، وہ ان کی وجہ سے فطرت میں جو نیرنگی پیدا ہو گئی ہے وہ دکھائی گئی ہے اوصاف یہ ہیں:۔

پدمنی :- (पद्मिनी)

तन अमोल कुन्दन बरन सम सिरीस सुकुमार ।
सुच्छम भोजन रस सरति सो पदमिनी निरधार
तन सुबास दृग सलज सुभ मन सुचि करम पुनीत ।
इन सुबरनबरनी लई जगत निकाई जीत ॥

رنگ کندنی خوبصورت، لذیذ و نفیس غذائیں پسند، سیا شرت سے گریز، جسم خوشبودار، آنکھوں میں حیا، نیک دل، نیک افعال۔ کندنی رنگ والی نے ان باتوں سے دنیا کو تسخیر کر لیا ہے۔

چترنی (चित्रिनी)

जिहि मृगनैनी को रहे नृत्य गति में ध्यान।
चोप सदा पिय चित्र सों वह चित्रिनी सुजान ॥

ہر وقت گانے بجانے میں مگن پیا کی تصویر دیکھتی رہتی ہے۔

سنکھنی (संखिनी)

देह छीन मोटी नसैं कुच लघु निलज निसंक ।
कोपवती नरव दन्त रुचि संखिनी पी के अंक ॥

دُبلی پتلی، رگیں موٹی موٹی، چھاتیاں بیٹھی ہوئی، بے حیا، غصہ ناک، ناخن اور دانت بڑے بڑے شہوت پرست

ھستنی (हस्तिनी)

थूल अंग लोमन छयो गोरी भूरे केस ।
मजगौनी दुरगन्धनी भनी हास्तनी भेस ॥

جسم موٹا رونگیں دار، گوری، بال بھورے، چال آہستہ، جسم بدبودار (پست قامت مغرور حسن)

مزدوری و سرمایہ داری

(از حضرت فاروق محشر بدایونی)

موسم گرما کا عالم اور وہ تپتی زمیں / تھی تمازت سے عرق آلود ذرّوں کی جبیں
ہو رہی تھیں شام کی رنگین بزم آرائیاں / جا رہے تھے آسماں پر بادلوں کے کارواں
دید کے قابل تھا وہ دلکش سماں بازار کا / ہلکی ہلکی دھوپ میں منظر در و دیوار کا
رنگ سڑکوں کا نکھر جاتا تھا دھو جانے کے بعد / آگ اُگلتی تھی زمیں چھڑکاؤ ہو جانے کے بعد
راستے کے حاشیوں پر مالیوں کی تھی قطار / تھے کھڑے ہاتھوں میں لٹکائے ہوئے پھولوں کے ہار
تھا دُکانوں پر خریداروں کا جمگھٹ جا بجا / قہقہوں کے شور سے تھرائی جاتی تھی فضا
چار جانب دوڑتی پھرتی تھیں گھوڑا گاڑیاں / مختصر یہ ہر طرف تھا اِک ہجوم بے اماں

جا رہا تھا آہ اِک مزدور گھبرایا ہوا
بیکس و غمگیں زمانے بھر کا ٹھکرایا ہوا

چلتے چلتے اِک بساطی کی دُکاں پر رُک گیا / اپنے مطلب کی کوئی شے دیکھنے کو جھک گیا
ناگہاں اِک آئینہ پر جا پڑی اُس کی نظر / دل کی دُنیا ہل گئی غم کا مرقع دیکھ کر
مضمحل نظریں پیامِ آرزو دیتی ہوئی / عارضوں پر جھرّیاں سی کروٹیں لیتی ہوئی
میلا میلا چیتھڑا کانوں پہ لپٹائے ہوئے / اِک پھٹا سا دوہرا کاندھے پہ لٹکائے ہوئے
اینٹھی اینٹھی سی رگوں میں چلبلاتا اضطراب / جسم میں انگڑائیاں لیتا ہوا باسی شباب
رونگٹے خورشید کی کرنوں کے جھلسائے ہوئے / نیلگوں رخسار لوؤں کی تھپیاں کھائے ہوئے
اِک پھٹی سی جیب میں کچھ ٹوٹی پھوٹی بیڑیاں / رُخ پہ ٹھیرا سا ہوا مظلوم آہوں کا دھواں
جھلملاتے سے ہوئے آنکھوں کے بے روغن چراغ / کھردرے بدرنگ ہاتھوں پر چلم پینے کے داغ
ہر طرف چھائی ہوئی حرماں نصیبی کی گھٹا / آستینیں بھی پھٹی کرتے کا دامن بھی پھٹا
مسکراتے تیوروں کی آڑ میں ہمت کا زور / جسم پر بہتا ہوا میلے پسینے کا گھور

بے حسی رُخ پر مگر دل میں اُمنگیں بے قرار
ہلتا جلتا ایک مُردہ آرزوؤں کا مزار

اِس طرف تو یہ سماں تھا دلخراش و دل فگار — اُس طرف گذرا چلا جاتا تھا اک سرمایہ دار
آئینہ میں پڑ گیا جب اس کا عکسِ لاجواب — اور بھی مزدور کے سینے میں مچلا اضطراب
جا رہا تھا راہ میں نشہ سا برساتا ہوا — ہر قدم پہ خاک کے ذرّوں کو مہکاتا ہوا
کج ادا غمزوں سے رنگِ خود نمائی آشکار — دہر کی بے مہریوں کا ایک رنگیں شاہکار
فیلِ بے زنجیر کی صورت اکڑتا جھومتا — آپ ہی اپنے لبوں کی سرخیوں کو چومتا
مُنھ سے سگرٹ کے دھوئیں پیہم اڑاتا جارہو — خوں ستارہ رہ کے بیچارے کسانوں کا لہو
بوئے پیراہن سے مستانہ ہوائیں عطر بیز — جھلملاتی مست آنکھوں میں تبسّم برق ریز
دوڑ جاتی تھی لبوں پر مسکراہٹ بار بار — عارضوں پر خون کے آنے کی آہٹ بار بار
مٹ گئیں ساری تمنائیں دلِ مجبور کی — مضمحل ہو کر نگاہیں جھک گئیں مزدور کی
یک بیک آنکھوں میں اُس کی آ گئے اشکِ الم — دیکھکر مزدوری و سرمایہ داری کو بہم

آنسوؤں میں صبر کی کشتی ڈبو کر چل دیا
آئینے کی طرح خود حیران ہو کر چل دیا

حیف کس درجہ فسوں گر ہے زمانے کا چلن — اک طرف عیش و مسرت اک طرف رنج و محن
ایک وہ ہیں ہر گھڑی بشاش ہے جن کی جبیں — ایک وہ ہیں جن کے ہونٹوں پر ہنسی آتی نہیں
ایک وہ ہیں جو خود انسان کو بناتے ہیں شکار — ایک وہ جو بن گئے ہیں لقمۂ سرمایہ دار
ایک وہ ہیں جو ستمگر سنگدل مغرور ہیں — ایک وہ ہیں جو نہتّے فاقہ کش مزدور ہیں

آسماں نے کس مصیبت میں انھیں ڈالا نہیں
آہ! کوئی بے کسوں کا پوچھنے والا نہیں

رباعی

جب صبح جبیں غم سے بہل جاتی ہے
ہر رنج کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے
اے شمع اثر اسقدر جلاتا ہے اسے
تا نغمۂ پروانہ میں جل جاتی ہے

لطیف انور

چترکوٹ میں خانخاناں کا آخری ہندی مشاعرہ

(از بھگوتی پرشاد سنہا، ایم۔ اے۔ منشی کامل (الہ آباد)

مذاقِ سخن خدا کی ایک دین ہے جس کی برکت سے صاحب ذوق نہ صرف ایک ہی زبان سے بہرہ اندوز ہونا چاہتا ہے بلکہ اُس کی ہوس زباندانی دن دُونی رات چوگنی ہوتی جاتی ہے۔ وہ جب ایک زبان سے لذت آشنا ہوجاتا ہے تو دوسری کا لُطف اُٹھانا چاہتا ہے بعد ازاں تیسری سے، اور یہ سلسلہ عمر بھر قائم رہتا ہے اور مرتے دم تک اُس کی ہوس پُوری نہیں ہوتی۔ مجھے بھی بچپن سے اُردو اور فارسی کے درس وتدریس کا موقع ملا، زیادہ تر اُردو فارسی کے شاعروں کا کلام پڑھتا رہا، مگر یکایک جی چاہا کہ ہندی شعرا کا کلام بھی دیکھوں، کچھ دنوں یہ شغل بھی رہا بعد ازاں ہندی شعرا کے حالات سے واقفیت کا شوق ہوا، اور حتی الامکان ان کا علم بھی حاصل کیا مسلسل مطالعہ نے یہ خیال پیدا کیا کہ اُردو داں اصحاب کی خدمت میں ہندی زبان کے کچھ باکمال شعرا کو مع اُن کے چیدہ اور پسندیدہ کلام کے پیش کیا جائے تو بہتر ہوگا۔

یہ ضرورت اس طرح محسوس ہوئی کہ ہندوستان میں اُردو داں اور فارسی خواں اصحاب ہمیشہ اُن واقعات تشبیہات تلمیحات اور استعارات کو برتتے رہے جو کہ اس ملک سے بالکل علاقہ نہ رکھتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُردو کے دورِ قدیم کے شعرا نے رائج الوقت فارسی کی شاعری کا تتبع کیا۔ اُنھوں نے ملکی معاملات، قومی جذبات اور وطن کی دوسری باتوں کو اپنی طبع نازک پر بار سمجھا۔ مگر فی زمانہ قومیت اور حب الوطنی کا جوش ہر دل و دماغ میں سمایا ہوا ہے، حالی اور آزاد کی روش بھی اس بات کی مقتضی ہے کہ ہندوستانی چیزوں کو اُردو شاعری میں جگہ دی جائے۔ ہندی شاعری قومیت اور وطنیت کے جذبات سے لبریز ہے۔ اس لئے یہ امر ضروری ہے کہ ہندی شعرا کے ہندوستانی جذبات تشبیہات تلمیحات اور استعارات سے بہت نہیں تو کچھ نہ کچھ ضرور استفادہ کیا جائے۔

ہندی زبان کے ابتدائی دور سے لیکر اب تک بہت سے شاعر ہو گئے ہیں اُن کا یکے بعد دیگرے بیان کرنا اور اُن کے کلام پر تنقیدی نظر ڈالنا مشکل ہے اور طوالت چاہتا ہے۔ اس لئے اس مضمون میں صرف ایک دور کے چند ہمعصر شعرا کو یکجا کر کے ایک خیالی کوی سمیلن (مشاعرہ) کی بنیاد ڈالی گئی ہے جس کے بانی مبانی عبدالرحیم خانخاناں قرار دیئے گئے ہیں۔ مشاعرہ کا انعقاد چترکوٹ کے پُر فضا مقام میں کیا گیا ہے اور سمبت ۱۶۶۲ بکرمی کاتک سدی پورنماشی کی رات کو شاعر مشاعرہ میں رونق افروز ہوتے ہیں اس بزم سخن میں اس زمانہ کے ممتاز شاعر بلا امتیاز فرقہ و مذہب جمع کئے گئے ہیں۔

یہ خیالی مشاعرہ کئی وجہ سے اہمیت رکھتا ہے، اولاً اس میں اُس زمانہ (عہدِ اکبری کا آخری زمانہ) کے باکمال شعرا کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی گئی ہیں۔ دوسرے مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہمی ارتباط اور ایک دوسرے کی

رواداری اور قلم دوستی کو دکھایا گیا ہے۔ تیسرے کوئی سمسیا (समस्या) یا طرح نہیں دی گئی ہے۔ اس لئے ہر شاعر نے قید و بند سے آزاد ہو کر اپنی خواہش کے موافق اپنا کلام سُنایا ہے۔ جس کا مطلب ہم نے آزادی سے بیان کیا ہے موقع بموقع ہندوستانی صنائع، تشبیہات اور تلمیحات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اگر ناظرین اس کو ایک مختصر تاریخی افسانہ خیال کریں تو کچھ مضائقہ نہیں۔ کیونکہ اس میں نام تاریخی ہیں اور اُن کے کلام بھی اصلی ہیں۔ مگر اُن کی صورتیں اُن کے اطوار، اُن کے حرکات و سکنات، اُن کے طریق بود و ماند غرض ساری رنگینی رنگ افسانہ کی منت کش ہے۔ مغلیہ حکومت میں اکبر و جہانگیر کا زمانہ پیش نظر رکھا گیا ہے اور اُسی زمانہ کے لباس سے ان کو آراستہ و پیراستہ کیا گیا ہے چنانچہ اُسی زمانہ کی روش کے بموجب ان کی وضع و قطع بھی بنائی گئی ہے۔"

عبد الرحیم خانخاناں کے نام نامی سے کون واقف نہ ہوگا۔ بیرم خاں کے سپوت اور اکبر کے نو رتنوں میں سے تھے۔ ان کی فیاضی کی گنگا شیوہ بیان ہندی اور ایرانی شاعروں کے کشت امل کی آبیاری کرتی تھی۔ اُن کی سخاوت ان کی شجاعت کی ہم عناں تھی۔ بہت سی مہمیں، مُخیص کے تیغ براں سے سر ہوئیں۔ مگر فلک کج رفتار نے اُن کو آخر کار مفلوک الحال کر ہی دیا۔ جہانگیری عہد نے اُن سے بے وفائی کی جس بادشاہ کے باپ نے ان کو وہ مال و دولت، ثروت و سامان بخشا تھا اُس نے ان کو قید کر لیا ایک وہ زمانہ تھا کہ رحیم شاعروں اور گویوں کو سونے چاندی کے برابر تُلواتے تھے، جواہرات سے منھ بھرواتے اور اشرفیوں سے ڈھکواتے تھے اور ایک وقت وہ آ گیا کہ کوڑیوں کو محتاج ہو گئے، ادبار و بدبختی نے اُن کی سخاوت و شجاعت سب پر پانی پھیر دیا اگر عہد اکبری اُن کے کمال کا زمانہ تھا تو جہانگیری عہد اُن کے زوال کا باعث ہوا۔

کہا جاتا ہے کہ سمبت ۱۶۸۲ بکرمی میں جب جہانگیر نے ان کو رہا کیا تو ان کی عمر ترسٹھ چونسٹھ برس کی تھی، وہ دنیا سے بیزار ہو گئے، اس مصیبت میں خدا یاد آیا۔ بہت غور و خوض کے بعد طے کیا کہ کہیں تنہائی میں پناہ گزین ہوں اور سادہ زندگی کا لطف اُٹھائیں، وہ آزادی کے ساتھ اچھی صحبت کا لطف اُٹھانا چاہتے تھے۔ پہلے تو اُنھوں نے کاشی، دوارکا، اجودھیا، یا برندابن جانے کا خیال کیا مگر آخر میں اُن کے دل نے اپنے خیالات کی ترجمانی ذیل کے دوہے میں کی جو کہ اُن کے لئے شمع ہدایت ہوا۔ دوہا:۔

چترکوٹ میں رم رہے، رحمن اودھ نریش جا پر بپدا پرت ہے، سو آوت یہ دیش

चित्र कूट में रमि रहे रहिमन अवध नरेश

जापर बिपदा परति है, सो आवत यहि देश

(ترجمہ) اے رحیم جس پر مصیبت پڑتی ہے وہ چترکوٹ میں پناہ لیتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جس کی ہمدرد فضاؤں نے ان کے ایام وحشت نوردی میں رام چندر جی کا، من بھی اپنی طرف کھینچ لیا۔

ممکن تھا کہ رحیم گھبرا کر چترکوٹ چھوڑ جاتے مگر وہاں اس وقت اُن کے پریمی فطرت نگار تلسی داس جی مقیم تھے۔ وہ

اپنے شاگرد رشید مادھوداس جی کے ساتھ اکثر چترکوٹ آتے جاتے رہتے اور بھگوت بھجن کا آنند لیتے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے شام کا وقت تھا تاریکی گہری ہوتی جاتی تھی کہ رحیم تھکے ماندے وہاں پہونچے۔ اس وقت تلسی داس جی ہاتھ منھ دھوکر سندھیا کی تیاری کر رہے تھے۔ رحیم کو دیکھکر اُن کی طرف لپکے اور گلے لگا لیا۔ پھر دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں تو ایک دوسرے کا منھ تکتے تھے اور بول نہ سکتے تھے۔ سچ ہے سچی محبت ایسی ہی ہوتی ہے۔ اس کے بعد رحیم صاحب وضو کر کے مصروف عبادت ہو گئے ایک طرف یہ سربسجدہ تھے اور دوسری طرف تلسی داس جی اپنی سندھیا اور ایشور دھیان میں مصروف تھے۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے بعد دونوں کو فرصت ملی، اس وقت گوسائیں جی کے شاگرد نے موسم کے پھل اور دودھ رحیم کے سامنے لا کر رکھدیئے انھوں نے اِن چیزوں کو بڑی خوشی سے کھایا۔ بہت دیر تک بات چیت ہوتی رہی۔ آدھی رات گذرنے پر رحیم صاحب خواب راحت میں مشغول ہوئے اور تلسی داس جی بھی بسرام کرنے لگے۔

عبدالرحیم کی رہائی، ان کا چترکوٹ جانا اور تلسی داس جی سے ملاقات ایسی باتیں نہ تھیں کہ کسی کو خبر نہ ہوتی اور پھر خانخاناں کی جود و سخا کے منت کش۔ گنگا پرشاد متخلص بہ گنگ رحیم کے فیضانِ رحمت سے مالا مال اور دنیا کی تکلیفات سے بے نیاز ہو چکے تھے۔ اپنے مربّی کو کیونکر بھول سکتے تھے۔ رہائی کا مژدہ سنتے ہی سب سے پہلے تلسی داس جی کے آشرم پر پہونچے۔ رحیم کو چترکوٹ پہونچے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ مسلمان شاعر بھی اُن کے سایۂ عاطفت میں آنا شروع ہو گئے۔ ایک دن دوپہر کے وقت عثمان غازیپوری یکایک رحیم کی قیام گاہ پر آپہونچے۔ رحیم کی رہائی اور تلسی و گنگ وغیرہ کی ملاقات کی خبر ہندوستان کے کونے کونے میں آہستہ آہستہ پہونچنے لگی اور شاعرانِ سخن سنج کھنچ کھنچ کر چترکوٹ کی سطح مرتفع پر آنے لگے۔ عثمان غازیپوری کے بعد سید مبارک علی بلگرامی آئے، اور پھر گوسائیں بٹھل داس کے دو برگزیدہ شاگرد رس کھان اور رہا باموک؟ اس طرح رحیم کے ہاں شاعروں کا مجمع ہو گیا تو اُن کو اکبری دربار کے پُرانے مشاعرے یاد آ گئے۔ شاہی تکلفات اور دربار کی بہاروں کی یاد نے تڑپا دیا۔ شاعروں کی نواسنجی سے خوش ہو ہو کر انعام و اکرام دینا اور لوگوں کو مالا مال کرنا ایسے واقعات تھے کہ یاد آئے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ تلسی داس جی سے کہنے لگے "گوسائیں جی گذرے ہوئے کوی سمّیلن یاد آ رہے ہیں مگر اب شعر و شاعری کی وہ دھوم مشکل ہے"۔ سوامی جی نے بڑے اطمینان سے کہا "آپ کیوں اتنے متفکر ہیں، اکبری دربار کے مشاعروں (سمّیلنوں) سے بھی بڑھ چڑھ کر محفلیں منعقد کی جا سکتی ہیں: انتظام کی بھی ضرورت نہیں، دیوالی کے ایام ہیں، ہندوستان کے کونے کونے سے آدمی سمٹے چلے آ رہے ہیں دیوالی کے دن اعلان کرا دیجئے کہ ستی انوسویا کے پوتر استھان پر ایک مشاعرہ ہو گا پھر دیکھئے کہ کیا ہوتا ہے۔ مگر یہ مشاعرہ دیوالی کے پندرہ دن بعد کیجئے تا کہ دُور و نزدیک کے لوگوں کو اس کی خبر مل جائے اور دلدادگانِ شعر و سخن جمع ہو سکیں۔

دیوالی کو یہ اعلان عام کیا گیا کہ ستی انسویا کے پوتر استھان پر آئندہ پورنماشی کو ایک کوی سمّیلن ہو گا جس کو اس میں شریک ہونا ہو ڈیڑھ پہر رات گئے وہاں پہونچ جائے۔ اس مشاعرہ کی خبر ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئی۔ ہندی کے

مشہور گویّوں کو بھی اس کا پتہ لگ گیا۔ دیوالی کے ایام میں ہر جگہ کے راجہ مہاراجہ چترکوٹ کی زیارت کو آئے تھے۔ جے پور کے راجہ جے سنگھ کے پردھان منتری وہاں موجود ہی تھے اس اعلان کا حال سُن کر وہیں ٹھہر گئے اور اپنے یہاں سے بہاری لال کو بھی بُلا لیا۔ اورچھا نریش مہاراجہ رام سنگھ نے اپنے بھائی راجہ اندرجیت سنگھ کو کیشو کے ساتھ آنے کو کہلا بھیجا، کیشو اپنے بڑے بھائی بلبھدر مصر کو اپنے ساتھ لے آئے اس مشہور عالم مشاعرہ کی خبر سنتے ہی سندرداس ایک نوجوان شاعر بغرض شرکت چترکوٹ کی زیارت کو چل کھڑا ہوا۔ غرض کہ ایک اچھی خاصی بزم شعراء عرصۂ وجود میں آ گئی

اب ناظرین کرام ان شعراء کی نغمہ سنجیوں اور شیوہ بیانیوں سے لطف اندوز ہوں:۔ سبھوں نے رحیم صاحب ہی سے سری گنیش کرنے کو کہا اُنھوں نے بھی اس درخواست کو بسر و چشم قبول کیا اور سنبھل کر بیٹھ گئے، اور ان دوہوں کو بڑے شوق سے پڑھنے لگے:۔

ریت پریت سب سوں بھلی، بیر نہ ہت مت گوت ۱ رحمن یا ہی جنم کا بہُر نہ سنگت ہوت

رحمن بپدا تو بھلی، جو تھوڑے دن ہوئے ۲ ہت اَن ہت یا جگت میں، جان پرت سب کوئے

جے گریب سوں ہت کریں دھنیہ رحیم وے لوگ ۳ کہاں سداما باپڑو، کرشن متائی یوگ

چھما بڑن کو چاہئے چھوٹن کو اُتپات ۴ کا رحیم ہر کا گھٹیو جو بھرگو ماری لات

रीति प्रीति सब सौं भली बैर न हित मित गोत १ रहिमन याही जनम की बहुरि न सङ्गति होत ।।

रहिमन बिपदा तू भली, जो थोरे दिन होय । २ हित अनहित या जगत में जान परत सब कोय

जे गरीब सों हित करें धनि रहीम वे लोग ३ कहां सुदामा बापरो कृष्ण मिताई योग ।।

क्षमा बड़ेन को चाहिये छोटन को उत्पात ४ का रहीम हरि को घटयो जो भृगु मारी लात

(ترجمہ) (۱) اے رحیم یہ انمول جنم بار بار ملنے کا نہیں اس لئے محبت کی رسم ہر فرد بشر کے ساتھ اچھی ہے، دشمنی تو دوست عزیز و اقارب سے بھی اچھی نہیں۔

(۲) رحیم صاحب فرماتے ہیں کہ اے مصیبت تو بھی اچھی ہے اگر تھوڑے دنوں رہے، کیونکہ تیرے آ جانے سے بہی خواہ اور بدخواہ کا پتہ لگ جاتا ہے۔

(۳) اے رحیم وہ لوگ قابل تحسین و آفرین ہیں جو غریب پرور ہوتے ہیں، یہ بندہ نوازی نہیں تو اور کیا ہے کہ راجہ کرشن چندر غریب سُداما کی آؤ بھگت میں کچھ کور کسر اٹھا نہ رکھی۔

(۴) ہوتی آئی ہے کہ چھوٹے لوگ شرارت اور خطائیں کرتے ہیں اور بزرگ ہستیاں بخشتی رہتی ہیں، اے رحیم بشنو بھگوان کا کیا بگڑا اگر بھرگو ایسے رشی نے اُن کے سینہ پر لات ماری۔

رحیم کے بعد چوہتر سال کے کہنہ مشق شاعر کیشو کے بڑے بھائی بلبھدر مصر نے اپنی کوتیا سُنائی۔ آپ کو اپنی زبان پر بڑا ناز تھا۔ شاعرانہ ترکیں ملی تھی۔

پاٹل نین کوک ند کے سے دل دوؤ، بلبھدر باسر اودھ ندی لکھی بال میں

شوبھا کے سروور میں باڈو کی آبھا کی دھوں دیودھن بھارتی ملی ہے پنیہ کال میں
کام کے برت کے دھوں ناسکا اُڈُپ بیٹھیو، کھیلت شکار ترونی کے مکھ تال میں
لوچن ستاسات میں لوہت لکیر مانو باندھے جگ میں لال ریسم کے جال میں

पारत नयन कोकनद के से दल दोऊ भलभद्र बासर क्तनींदी लखी बाल मैं।
शोभा के सरोवर में बाड़व की आभा के धौं देवधुनि भारती मिली है पुन्य काल मैं॥
काम के बरत के धौं नासिका उडुप बैठ्यो खेलत सिकार तरुनी के मुख ताल मैं।
लोचन सितासित मैं लोहित लकीर मानो बांधे जुग मीन लाल रसम के जाल मैं॥ ۱

بلبھدر مصر جی نے کہیں ایک سندری کو دن میں سو کر اُٹھتے ہوئے دیکھ لیا اُس کی خماری انکھڑیاں اُن کی نگاہوں میں ایسی چڑھ گئیں کہ بن دیکھے چین نہیں پڑتا۔ شاعر تو تھے ہی تخیل کے پرواز نے اُن کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا۔ کہتے ہیں کہ سندری کی خماری انکھڑیاں ایسی سُرخ ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ لال کنول کی دو پنکھڑیاں (دل) ہیں صرف یہی نہیں بلکہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حُسن کے تالاب میں آگ کی روشنی پھیلی ہے۔ یا یوں کہیئے کہ گنگا جی سرسوتی جی سے بڑے مبارک موقع پر مل رہی ہیں پھر بھی اتنے ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ عشق کے دیوتا کو ماہی گیر بنا کر نازنین کی کشتی نما ناک پر بٹھا کر آرام کے چہرے کے تالاب میں شکار کھیلتا ہوا دکھاتے ہیں۔ یہاں پر اُس کی آنکھوں کی سفیدی اور سیاہی میں سُرخ سُرخ ڈورے اس طرح شوبھا دیتے ہیں کہ گویا اُس ماہی گیر نے آنکھوں کی دونوں مچھلیوں کو سرخ ریشم کے جال میں کس کر باندھ لیے ہیں۔

مصر جی کے بعد اُنکے چھوٹے بھائی کیشو کی باری آئی جنکو ہندی زبان کا اُستاد سمجھنا چاہیئے کیونکہ وہ تیاؤں کے مصنف تھے بوڑھاپے میں بھی زندہ دلی باقی تھی حُسن کی اداؤں کا کیا خوب خاکہ کھینچا ہے

کی دھوں مکھ کمل یہ کملا کی جیوتی ہوتی کی دھوں چارو مکھ چند چندر کا چرائی ہے
کی دھوں مرگ لوچنی مریچکا مریچ کے دھوں روپ کی روچر روچی سوچی سوں ڈہائی ہے
سوربھ کی سوبھا کی دسن گھن دامنی کی کیشو چتُر چت ہی کی چترائی ہے
اے رے گوری بھوری تیری تھوری تھوری ہانسی میری موہن کی موہنی کی گراکی گورائی ہے

किधौं मुख कमल ये कमला की ज्योति होति किधौं चार मुख चन्द चन्द्रका चुराई है।
कि धौं मृग लोचनि मरीचिका मरीचि के धौं रूप की रुचिर रुचि सुचि सों दुराई है॥
सौरभ की सोभा की दसन घन दामनी की केसव चतुर चित हीकी चतुराई है।
एरी गोरी भोरी तेरी थोरी थोरी हांसी मेरी मोहन की मोहिनी की गिरा की गुराई है॥

کیشو نے کہیں اپنی حسینہ کو مسکراتے دیکھ لیا اُس کو مخاطب کر کے کہتے ہیں اے میری بھولی بھالی نازنین! یہ تیرا زیر لب مسکرانا سے کنول جیسے چہرہ پر لکشمی جی کی ضیا ہے یا تیرے چاند جیسے خوبصورت چہرے نے مہتاب کی چاندنی چُرائی ہے یا ان غزالیں آنکھوں

کے لئے سراب کی چمک ہے یا تو تو نے اپنے چہرے کے دلکش حسن کو ہوشیاری سے چھپا لیا ہے، اتنا کہنے کے بعد کیشو اپنے آپ خیال کرتے ہیں کہ یہ زیر لب تبسم ملاحت کا حسن ہے کہ لبوں کے بادل سے دانت بجلی کی طرح نکل کر چمک اٹھتے ہیں مگر پھر ان سے نہیں رہا گیا اور اس ابروسے کہہ اٹھتے ہیں کہ یہ تیرا تبسم پنہاں کچھ نہیں ہے بلکہ تیری طبیعت کی ہوشیاری اس طرح تیرے چہرے سے ٹپک رہی ہے پھر بے ساختہ کہہ اٹھتے ہیں کہ اب میں سمجھا کہ یہ کیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ میرے موہن کی دلکش آواز ہی کا حسن ہے جو بصورت تبسم زیر لب نمایاں ہے
نازنین کے زیر لب خندہ مکان یا تبسم کو کسی اردو شاعر نے نہیں بیان کیا، قدر بلگرامی کا شعر ہے:-

لب پر ہنسی جو آئی دنداں کھلے دہن میں چمکی یمن میں بجلی جا کر گری عدن میں

جیسے ہی کیشو نے اپنی کویتا ختم کی ایک دلی آواز نے آہستہ سے کہا کہ میری بھی سن لیجئے یہ آواز مرد کی نہیں بلکہ عورت کی تھی۔ پروین رائے نامی جو کہ گو کہ بھی تھی مگر عشق مجازی کے راستے کو چھوڑ کر عشق حقیقی کے راستے پر چل نکلی تھی:-

دوہا اونچے ہوئے سُر بس کئے، سم ہوسے نر بس کین اب پتال بس کرن کو، دھڑک پیا نو کین
ऊँचे हैव सुर बस किये. सम हैव नर बस कीन अब पताल बस करन को. ढरकि पयानो कीन

معراج کمال پر پہونچ کر تو میں نے دیوتاؤں کو خوش کیا اور جب میں متوسط درجہ پر پہونچی تو انسان کو اپنے قبضہ میں لائی۔ اب اس وقت جبکہ میری ڈھلتی جوانی ہے، پاتال کے باشندوں کو بس میں کرنے کی تیاری کر رہی ہوں"

سیتل سمیر ڈھار منجن کے گھنسار امل انگوچھے آچھے من سے سدھاری ہوں
دے ہوں نا پلک الک لاگن پلک پر ملی ابھی رام آچھی تپن اتاری ہوں
کہت پروین رائے اپنی نہ ٹھور پائے سُن بام نین یا بچن پرتی پاری ہوں
جب ہی ملیں گے موہن اندر جیت پران پیارے داہنوں نین موندی توہیں سوں نہاری ہوں

सीतल समीरा ढार मंजन के घनसार अमल अंगोछे मन से सुधारि हौं।
दे हौं ना पलक एक लागन पलक पर मिलि अभिराम आछी नयनि उतारि हौं॥
कहत प्रवीनराय अपनी न ठौर पाय सुन वाम नैन या बचन प्रतिपारि हौं।
जब ही मिलेंगे मोहिं इन्द्रजीत प्रान पयारे दाहिनो नयन मुंदि तोही सौं निहारि हौं॥

وعدۂ وصل ہے اور پران پیارے نہیں آئے ہیں مگر آنے کی بڑی امیدیں ہیں کیونکہ پروین رائے کی بائیں آنکھ پھڑک رہی ہے اس وقت کے خیالات کو پروین رائے اس طرح بیان کرتی ہے کہ کافور کا منجن کر کے اور صاف انگوچھے سے اپنے آپ کو سنواروں گی ٹھنڈی ہوا کرتی رہونگی۔ اپنی خوبصورت پلکوں کو ایک دوسرے سے نہ ملاؤنگی بلکہ ہمہ تن چشم انتظار بنی رہونگی اپنے محبوب سے مل کر تپ عشق اچھی طرح بجھاؤں گی۔ وہ پھر عالم بیخودی و مستی میں کہتی ہے کہ اے میری بائیں آنکھ یہ شرط رکھ کہیں اس بات کو پورا کر دکھاؤں یعنی جس وقت ہی میرے پران پیارے مہاراجہ اندرجیت سنگھ ملیں گے اسی وقت میں اپنی آنکھ کو بند کر کے تجھی دا بائیں آنکھ سے دیکھونگی

اس کے بعد حسن پرست بہاری لال نے اپنی نشاط انگیز کوتا سنائی

بال چھبیلی تیوں میں بیٹھی آپ چھپائی — ارگٹ ہو پانوس سی پرگٹ ہوت لکھائی
سہج سیت پچ توریا پہرت آتی چھب ہوت — جل چادر کے دیپ لوں جگمگات تن جوت
لونے مکھ دیٹھہ نہ لگے یوں کہہ دینوں ایٹھ — دونی ہو وے لگن لگی دیئے ڈیٹھنو ویٹھ
برجین دونی ہٹ چڑھے نا سکوچے نہ سکائے — ٹوٹت کٹ دمچی پچک لچک لچک بچ جائے

बाल छबीली तियनु में बैठी आप छिपाई — अरगट हो पानूस सी प्रगट होति लखाई ॥
सहज सेत पंच तोरिया पहिरत अति छबि होति — जल चादर के दीप लौं जगमगाति तन जोति ॥
लोने मुंह डीठि न लगे यो कहि दीनो ईठि — दुनी ह्वै लगन लगी दिये डिठोनो डीठि ॥

(۱) وہ چھبیلی (سندری) بہت سی عورتوں کے بیچ میں اپنا چہرہ کو گھونگھٹ میں چھپا کر بیٹھی مگر اس کا چہرہ اتنی احتیاط پر بھی اس طرح نظر آنے لگا جیسے فانوس کے اندر شمع روشن ہو۔

(۲) سفید مہین ہلکی پنچ توریہ کی ساڑی زیب تن کرنے سے اُس موہنی (حسینہ) کے حسن کو چار چاند لگ جاتے ہیں اور پانی کے جھرنے (آبشار) کے پیچھے رکھے ہوئے چراغ کی طرح اُس کے جسم کی ضیا چمک اٹھتی ہے۔

(۳) ایک سکھی نے ایک حسین بھولی کی پیشانی پر کاجل کا کالا ٹیکہ اس واسطے لگا دیا کہ اُس کے حسین چہرہ پر کسی کی نظر بد کا بُرا اثر نہ پڑے لیکن اس کالے ٹیکہ سے اُس کے چہرے کا حسن ایسا بڑھ گیا کہ اُس کے چہرے پر دیکھنے والوں کی پہلے سے بھی زیادہ نظریں پڑنے لگیں۔

اس کے بعد کوی مبارک بلگرامی سے فرمائش ہوئی کہ آپ بھی کرپا کر کے کچھ سنائیے۔ انھوں نے عذر و معذورت کی مگر جب ہر طرف سے اصرار ہوا تو ذیل کے چھند کو بڑے سوز و ساز سے پڑھنے لگے:۔

کنک برن بال نگن لست بھال موتن کے مال اُر سوہین بھلی بھانت ہے
چندن چڑھائی چارو چندمکھی موہنی سی پرات ہی نہائی بگو دھار سے مسکات ہے
چنری بچتر سیام سج کے مبارک جو ڈھانک نکھ سکھ تے نپٹ سکوچات ہے
چندر میں لپیٹ کے نکھت مانو دن کو پرنام کئے رات چلی جات ہے

سب جگ پیرت من کو جھکیو چتیہ بہ ہیر — تو کیول کو ایک تل سب جگ ڈاریو پیر
چیبک کوپ رسری الک تل سو پرس درگ بیل — بارس بیس سنگار کی سینچت من متھ چھیل

कनक बरन बाल नगन लसत भाल मोतिन के माल उर सोहैं भली भांति है।
चन्दन चढ़ाई चारु चंदमुखी मोहिनी सी प्रात ही अन्हाइ [illegible] पारे [illegible] है ॥
चुनरी बिचित्र स्याम सजि कै मुबारक जू ढांक नख सिख तें निपट [illegible]चाति है।

चन्द्र मैं लपेटि कै समेटि कै नखत मानो दिन को प्रणाम किये रात चली जाति है ॥

सब जग पेरत तिलन को थक्यो चित्र यह हेरि। तव कपोल को एक तिल, सब जग डारयो पेरि॥

चिबुक कूप रसरी अलक तिल सु चरस दृग बैल बारी बैस सिंगार की सींचत मनमथ छैल ॥

ایک سنہرے رنگ والی نوخیز ناہرو جس کے ماتھے پر زلف کی لٹیں ناگنوں کی طرح شوبھا دے رہی ہیں اور جس کے سینہ

موتیوں کے مالے پڑے ہیں۔ نور کے تڑکے صبح کے وقت نہا دھو کر نکھر اٹھی ہے۔ اس نے بھر چندن لگایا اور اب کھڑی کھڑی مسکراتی ہے

اس پر اس نے کالے رنگ کی عجیب و غریب چُنری (ساڑی) زیب تن کی ہے جس میں وہ اپنے آپ کو سر سے پیر تک ڈھک کر سکڑی

اور شرمائی سی نظر آتی ہے۔ اس وقت اس کی نرالی سج دھج دیکھکر ایسا ظاہر ہوتا ہے گویا کہ رات چندرما کو لپیٹ کر اور تاروں

سمیٹ کر دن کو پرنام (سلام) کرکے چلی جا رہی ہے۔

س (۱) مبارک صاحب کہتے ہیں کہ تمام دنیا تیلوں کو کولھو میں پیلتی ہے لیکن اے نازنین میں یہ حالت دیکھکر متحیر ہوں کہ

تیرے رخسارہ کا تل تمام دنیا کو پیسے ڈالتا ہے۔

(۲) زنخدان کنواں ہے زلفیں رسی بنی ہیں اور تل موٹ یا چرسا کا کام دیتا ہے اور آنکھیں بیچاری بیل ہیں۔ اسی طرح سے

حضرت عشق اے نازنین تیری ابھرتی جوانی کو سینچ رہے ہیں۔

مبارک صاحب کے بعد جس کوی کی باری آئی اسکا نام گنگا پرشاد تخلص گنگ ہے یہ بہت خوشحال شاعر تھے اور تفکرات دنیاوی سے آزاد رہتے تھے انھوں نے نظم

بیٹھی تھی سکھن سنگ پیا کو گون سنیو سکھ کے سموہ میں بیوگ آگ بھرکی

گنگ کہے تربدھ سوگندھ لے پون بہیو لاگت ہی تاکے بھئی بتھا جر کی

پیاری کو پرس پون گیو مانسر پہ لاگت ہی اورے گت تن بھئی مانسر کی

جل چر جرے او سوار جری چھار بھیئو جل جری گیو پنک سوکھیو بھوم در کی

बैठी थी सखिन संग पिय को गवन सुन्यो सुख के समूह में वियोग आग भरकी।

कहे गंग त्रिविधि सुगन्ध लै पवन बह्यो लागत ही ताके तन भई बिथा जरकी ॥

प्यारी को परसि पौन गयो मानसर पँह लागत ही औरै गति भई मानसर की।

जलचर जरे औ सेवार जरि छार भयो जल जरि गयो पङ्क सूख्यो भूमि दरकी ॥

گنگ کوی ایک نازنین کی زبان سے شوہر سے جدا ہونے کی تکلیف بیان کرتے ہیں۔ وہ اپنے سکھیوں اور ہمجولیوں

کے پاس آنند کے ساتھ بیٹھی تھی کہ شوہر کے جانے کی خبر سننے میں آئی یکایک خوشی اور خوشحالی کی [illegible] آگ بھڑک اٹھی

اس وقت ٹھنڈی اور معطر آہستہ آہستہ ہوا چلنے لگی۔ اس کے چلتے ہی کل جسم میں فرقت کی [illegible] وہ ہوا

اس نازنین کو چھو کر مانسرور گئی اور اس کے چھو لینے سے مانسرور کی بھی حالت [illegible] سوار بھی

جل کر خاک ہوگئی پانی سوکھ گیا کنول کمہلا گئے اور یہاں تک تپش ہجر نے اپنا اثر دکھایا کہ زمین میں بھی دراڑیں پڑ گئیں
گنگ کے بعد رس خاں کی باری آئی، یہ بڑے رسک جیو ہیں۔

رس خان

مانس ہوں تو وہی رس خاں بسوں برج گوکل گاؤں کے گوارن

جو پسو ہوں تو کہا بس میرو چروں نت نند کے دھینو منجھارن

پاہن ہوں تو وہی گر کو جو دھریو کر چھتر پورندر دھارن

جو کھگ ہوں تو بسیر کروں مل کالندی کول کدمب کی ڈارن

سیس گنیس مہیش دینس سوریس ہو جاہی نرنتر گاویں

جاہی انادی اننت اکھنڈ اچھید ابھید سو وید بتاویں

جاہی ہیئے لکھیہ آنند ہوے جڑ موڑھ ہیئے رس کھان کہاویں

تاہی اہیر کی چھوہریاں چھچھیا بھر چھاچھ پہ ناچ نچاویں

मानस हौं तो वही रसखानि बसों ब्रज गोकुल गांव के ग्वारन।

जौ पसु हौं तौ कहा बस मेरो चरौं नित नन्दकी धेनु मंझारन ॥

पाहन हौं तो वही गिरि को जो धरयो कर छत्र पुरन्दर धारन।

जौ खग हौं तो बसेरो करौं मिलि कालिन्दी कूल कदम्ब की डारन ॥

सेस गनेस महेस दिनेस सुरेसहु जाहि निरन्तर गावैं।

जाहि अनादि अनन्त अखराड अछेद अभेद सुबेद बतावैं ॥

जाहि हिये लखि आनंद है जड मूढ़ हिये रसखानि कहावैं।

ताहि अहीर की छोहरियाँ छछियां भरि छाछ पै नाच नचावैं ॥

رس خاں صاحب کرشن بھگتی کی محویت میں کہتے ہیں کہ اے کرشن میرا تو آوا گون کے بارے میں کچھ بھی بس نہیں ہے اس پر بھی میں کسی حالت میں اس دنیا میں آؤں تو آپ ہی سے متعلق رہوں یعنی اگر میں انسانی جامہ میں آؤں تو برج کے گوکل گاؤں کے گوالوں اور اہیروں میں بسوں۔ اور اگر جانوروں کی جون میں پیدا ہوں تو میں نند جی کے گایوں کے بیچ میں رہ کر چروں اور اگر میں پتھر ہوں تو اسی پہاڑ کا جس کو آپ نے اندر کی بارش سے بچانے کے لئے ہاتھ پر اٹھایا تھا اور اگر میں پرندہ ہوں تو میرا بسیرا جمنا جی کے کنارے قدم کے درخت کی شاخوں پر ہو۔

جس ذات پاک کی سیس ناگ جی، گنیش جی، شیو جی اور اندر جی ایسے دیوتا دعا و ثنا کرتے ہیں اور جسے وید مقدس ازلی ابدی، جزو لاینفک اور فرق سے بے بتاتے ہیں جس کو دیکھ کر خوش ہونے والا نادان آدمی بھی رس خان کہلاتا ہے اس کو

امیر کی لڑکیاں تھوڑے سے سکّے پر ناچ نچاتی ہیں۔

اس کے بعد سن رسیدہ اور فن شاعری کے دلدادہ عثمان خاں بیجوری کی باری آئی:۔

عثمان خاں بیجوری

تب لہو سہیئے برہ دکھ جب لگ آوسو وار — دکھ گئے تب سکھ ہے جانے سب سنسار

کہاں سو بکرم سکبندھی، کہاں سو راجہ بھوج — ہم ہم کرت ہرائے گئے ملا نہ کھوجے کھوج

तबलह सहिये बिरह दुख जब लगि आव सो वार   दुख गये तब सुख है जाने सब संसार ॥

कहां सो विक्रम सकबंधी, कहां सो राजा भोज   हम हम करत हेराइगे, मिला न खोजे खोज॥

جب تک وصل کا وقت نہ آوے تب تک ہجر کی تکلیفیں برداشت کیجئے، کیونکہ یہ ساری دنیا جانتی ہے کہ دُکھ کے بعد ہی سکھ ہوتا ہے۔

آج سمبت چلانے والے مہاراجہ بکرماجیت اور راجہ بھوج بھی نہ معلوم کہاں غائب ہو گئے جن کے علم و کمال کی ساری دنیا میں دھوم تھی۔ ایسی بڑی بڑی ہستیاں ہم ہم کرتی ہوئی یعنی خودی میں ڈوبی ہوئی دنیا سے چل بسیں اور ایسی غائب ہوئیں کہ ڈھونڈھنے پر بھی پتہ نہیں چلتا۔

عثمان کے بعد سیناپتی کی باری آئی چنانچہ انھوں نے یہ کوتا سنائی:۔

سیناپتی

بِبِدھ برن سرچاپ تے نہ دیکھیت مانو منی بھوشن اتار دھرے بھیش ہیں

اُنّت پیودھر برسی رس گری رہے نیکے نہ لگت پھیکے سوبھا کے نہ لیس ہیں

سیناپت آئے تین سرد رتو پھولی رہے آس پاس کاس کھیت کھیت جہوں دیس ہیں

جیون ہرن کمبھ جونی کے اودے تے بھئے برشا بردھ تاکے سیت مانو کیس ہیں

کاتک کی رات تھوری تھوری سیاراتی سیناپتی کو سہاتی سکھی جیون کے گن ہیں

پھولے ہیں کمود پھولی مالتی سگھن بن پھولی رہے تارے مانو موتی ان گن ہیں

اودت ودیل چند چاندنی چھٹکی رہی رام کیسو جیس ادھ اوردھ گگن ہیں

تمیر ہرن بھیو سیت ہے برن سب مانوں جگت چھیر ساگر مگن ہیں

बिबिध बरन सूरचाप तन देखियत मानो मनि भूषन उतारि धरे भेष हैं।

उन्नत पयोधर बरसि रसु गिरि रहे नीके न लगत फीके सोभा के न लेस हैं ॥

सेनापति आये ते सरद रितु फूलि रहे आस पास कास खेत खेत चहुं देस हैं ॥

जीवनहरन कुंभ जोनि के उदै ते भए बरषा बिरध ताके सेत मानो केस हैं॥

कातिक की रात थोरी थोरी सियराति सेनापति सुहाति सुखी जीवन के गन हैं।

फूले हैं कुमुद फूली मालती सघन बन फुलि रहे तारे मानो मोती अनगन हैं ॥
उदित विमल चँद चाँदनी छिटकि रही राम कैं सो जस अध ऊरध गगन हैं।
तिमिर हरन भयो सेत है बरन सब मानहु जगत छीर सागर मगन है ॥

طرح طرح کے رنگ والے دھنش (قوس قزح) اب نہیں دکھلائی دیتے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سنی ہوشن (گنے) آمادہ کر کے دئے ہیں اُونچے اُونچے بادل برس کر اپنے رس کو گرا چکے ہیں وہ اچھے نہیں معلوم ہوتے پھیکے پڑ گئے ہیں اُن کی خوبصورتی بھی جاتی رہی۔ اے سیتاپتی شرونت (موسم سرما) کے آنے سے چاروں طرف کانس کھیت کے کھیت پھول رہے ہیں۔

جمنوں کو ہر نیوا اے اگست کے نکلنے پر بارش پوری ہو گئی ہے اور یہ اُس کے سفید بال ہیں۔ کاتک کی راتوں کی ہلکی ہلکی خنکی سیتا پتی کو بہت بھلی معلوم ہوتی ہے اور یہ آدمیوں کو بہت خوش و خرم کر دیتی ہے جنگل میں کنول پھولا ہے اور مالتی بھی پھولی ہے۔ آسمان پر تارے اس طرح سے چھٹکے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ ان گنتی موتی بکھرے ہوئے ہیں۔ روشن چاند کے اُگنے پر چاندنی پھیل رہی ہے، یہ سفیدی رام چندر کے جس (نور و جلال) کی طرح روشن ہے آسمان اس وقت بہت پر رونق ہے۔ اندھیرے کو معدوم کر دینے والا سفید رنگ ہی چاروں طرف نمایاں ہے سب چیزیں اس طرح سفید ہو گئی ہیں گویا کہ تمام دنیا دودھ کے سمندر میں غرقاب ہو گئی ہے۔

سیتا پتی کے بعد سندر داس کو پڑھنے کا موقع ملا جو ایک خوبرو مگر خدا پرست جوان ہیں:۔

سندرداس

دیکھہو دُرمتی یا سنسار کی

ہری سوں ہیرا چھاڑی ہاتھ تیں باندھت موٹ بکار کی　　نانا بدھ کے کرم کماوت خبر نہیں سر بھار کی
جھوٹے سکھ میں بھول رہے ہیں پھوٹی آنکھ گنوار کی　　کوئی کھیتی کوئی بنجی لاگے کوئی آس ہتھیار کی
اندھ دھوندھ میں چہوں دسی دھائے سدھ لبسری کرتار کی　　نرک جانے کے مارگ چلئے سُنی سُنی بات لبار کی
اپنے ہاتھ گلے میں باہی پاسی مایا جار کی　　بارم بار پکار کہت ہوں سو ہیں سرجن ہار کی
سندر داس منس کری چھئے ہے دیہہ چھنک میں چھار کی

देखहु दुरमति या संसार की। हरिसे हीरा छाड़ि हाथ ते बांधत मोट बिकार की॥
नाना बिधि के करम कमावत खबर नहीं सिर भार की　　झूठे सुख में भूल रहे हैं फूटी आंख गंवार की॥
कोई खेती कोई बनजी लागे कोई आस हथ्यार की　　अंध धुंध में चहुदिस धाये सुधि बिसरी करतार की
नरक जान के मारग चाले सुनि सुनि बात लबार की　　अपने हाथ गले में बाही पासी माया जार की॥
बारम्बार पुकार कहत हौं सो है सिरजन हार की　　सुन्दरदास बिनस करि जैहै देह छिनक में छार की

اس دنیا کی بیوقوفی ملاحظہ کیجئے ایشور جیسا ہیرا چھوڑ کر یہی گناہوں کی گٹھری باندھتا پھرتا ہے۔ طرح طرح کے پاپ کرتا رہتا ہے اور اپنے سر کے بوجھ (بار گناہ) کا ذرا بھی خیال نہیں کرتا گنوار جھوٹے سکھ میں متوالا ہے یہ تو سراسر اُس کی آنکھ پھوٹنے کا ثبوت ہے۔ کوئی کھیتی کرتا ہے۔ کوئی تجارت

کرتا ہے اور کوئی فنِ سپہگری کا ماہر بنتا ہے۔ اسی طرح سے لوگ اندھا دھند چاروں طرف دوڑتے پھرتے ہیں لیکن اس خالق کو بھول گئے ہیں یہ سب لوگ جاہل باتونی لوگوں کی باتوں میں آکر دوزخ میں پہونچا ئے جاتے ہیں۔ راستہ پر گامزن ہیں۔ اس طرح ان سادہ لوحوں نے اپنے گلے میں مایا جال اور دنیاوی بھرم جال کا پھندا ڈال لیا ہے۔ میں بار بار اس بات کو اس پاپن ہار کی قسم کھا کھا کر کہتا ہوں کہ اے سندر داس یہ مٹی کا بنا ہوا جسم تھوڑی دیر میں نابود ہو جائے گا۔" اسکے بعد بابا ملوک داس کی باری آئی یہ بڑے خدا شناس اور تخلیہ پسند آدمی ہیں ست سنگ کے پریمی مگر دنیا سے بیزار

دین دیال سنی جب تے تب تے ہیہ میں کچھو ایسی لسی ہے | تیرو کہائے کے جاؤں کہاں میں تیرے ہت کی پٹ کھینچ کسی ہے
تیروئی ایک بھروس ملوک کو تیرے سمان نہ دوجو جسی ہے | اے ہی مراری پکار کہوں اب میری ہنسی نہیں تیری ہنسی ہے

दीन दयाल सुनी जब तें तब तें हिय में कछु ऐसी बसी है ।
तेरो कहाय के जाउँ कहां मैं तेरे हित की पट खैंच कसी है ॥
तेरोई एक भरोसे मलूक को तेरे समान न दूजो जसी है ।
एहो मुरारी पुकारि कहौं अब मेरी हसी नहीं तेरी हंसी है ॥

غریب نواز نے جب سے ہماری استدعا سن لی ہے تب سے میرے جی میں یہ بات سما گئی ہے کہ اے دینا ناتھ تیرا کہلا کر اب میں کسی کے سایۂ عاطفت میں کیا جاؤں۔ میں نے تو تیری ہی عنایت کی کمر بند کسی ہے۔ ملوک کو تو صرف آپ ہی کا بھروسہ ہے آپ کا سا بندہ نواز اور بہی خواہ تو کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ اے کرشن میں (ملوک داس) باآواز بلند کہتا ہوں کہ اگر اب میرا بیڑا پار نہ ہوگا اور میرا ادھار نہ ہوا تو تمہارا ہی ٹھٹھا اڑیگا اور میرا کچھ نہ بگڑے گا۔" اب فقرات نگار تلسی داس کی باری ہے تھے یہ عرفان سحر خیز خوش الحانی کرنے والے تھے کہ اس وقت دیکھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا زمانہ کا ہیچ بنا کے

اب لوں نسانی اب نہ نسیہوں | رام کرپا بھو نسا سرانی جاگے پھر نہ ڈسیہوں
پایوں نام چارو چنتامنی اُر کر تے نہ کھسیہوں | شیام روپ سوچ روچر کسوٹی چت کنچنہی کسیہوں
پربس جانی ہنسیوں ان اندرن نج بس ہوئے نہ ہنسیہوں | من مدھوکر پن کر تلسی رگھو پت پد کنول بسیہوں

अब लौं नसानी अब न नसैहौं । राम कृपा भवनिसा सिरानी जागि न डसैहौं ॥
पायों नाम चारु चिन्तामनि उर करतें न खसैहौं श्याम रूप सुचि रुचिर कसौटी चित कंचनहिं कसैहौं
परबस जानि हंस्यों इन इन्द्रिन निज बस ह्वै न हंसैहौं । मन मधुकर पन करि तुलसी रघुपति पद कमल बसैहौं

اب تک عمر میں بہت کچھ کھو چکا ہوں لیکن اب ایسا موقع آ گیا ہے کہ میں کسی طرح سے کچھ بھی ضائع نہیں کر سکتا ہوں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ رام چندر جی کی مہربانی سے دنیا کی رات ختم ہو گئی ہے اور اب میں جاگ پڑا ہوں ہوشیار ہو گیا ہوں اور اب خواب غفلت کا غلبہ مجھ پر نہیں ہو سکتا ہے اب مجھے رام نام کا بیش قیمت ہیرا (چنتامن) مل گیا ہے وہ کسی طرح سے میرے دل اور ہاتھ سے باہر نہیں جا سکتا علاوہ بریں میں اپنے چت کے کندن کو شیام روپ بھگوان کی خوبصورت کسوٹی پر پرکھوں گا۔ جب تک میرے حواس ظاہری و باطنی میرے قبضہ میں نہ تھے وہ میری تضحیک کرتے تھے اب وہ سب میرے قبضہ میں ہیں مجھے کوئی کیا بنائے گا۔ واسطے دعوے سے کہتا ہوں کہ میں اپنے من یا طبیعت کو جو کہ بھونرے کی طرح ہے رگھوپتی کے کنول جیسے قدموں میں بسا دونگا

ڈاکٹر اقبال

(از حضرت اقبال ماہر الہ آبادی)

دفترِ اہلِ سخن میں اِک کمی پاتا ہوں میں — دہر کو اقبال! تیرا ماتمی پاتا ہوں میں
فلسفہ بے مثل تیرا فلسفی پاتا ہوں میں — مایہ دارِ علم تیری زندگی پاتا ہوں میں

ہمنوا بلبل کا تھا قمری کا ہم آواز تھا
فہم انساں سے جو بالاتر تھا تو وہ راز تھا

عندلیبِ جرمنی[ے] کا ہمنوا جاتا رہا — بزم میں شعر و سخن کا سب مزا جاتا رہا
اے دریغا پیکرِ مہر و وفا جاتا رہا — وہ چمن سے طائرِ رنگیں نوا جاتا رہا

رونقِ محفل جو تھا وہ صاحبِ محفل نہیں
اِک جہاں کا درد و غم جسمیں تھا وہ اب دل نہیں

قید تھا مضمونِ بامِ عرش تیرے دام میں — تھی مئے شیراز کی اک موج تیرے جام میں
صورتِ سیماب تو بیچین تھا آرام میں — زندگی اُلجھی تھی تیری دورِ صبح و شام میں

ہر نظر اقبال تیری التفات آمیز تھی
محفلوں میں تیری گویائی نشاط انگیز تھی

مضطرب ہیں جان کھوتے ہیں لہو روتے ہیں ہم — تیرے غم میں رات دن اشکوں سے منھ دھوتے ہیں ہم
لیکے پہلو میں دلِ صد پارہ کب سوتے ہیں ہم — اے فدائے قوم تجھ پر نوحہ گر ہوتے ہیں ہم

رہنما تھا پردہ دارِ قوم تھا اقبال تو
درسِ بیداری تھا تو بانگِ درا اقبال تو

درد میں ڈوبی ہوئی شاعر تری آواز تھی — یہ صدائے سازِ آوازِ شکستِ ساز تھی
تو اگر خاموش تھا چشمِ حقیقت باز تھی — ہر ادا تیری بشر کی زندگی کا راز تھی

لب پہ تھا مرغِ تخیل کے محبت کا پیام
سب کو بھر کر دے گیا تو بادۂ اُلفت کا جام

ے گوئٹے

ترجمانی کر رہا ہے تیری خود دیوان تیرا | اتحادِ باہمی تھا تیرے دل کا مدعا
چاہتا تھا تو کہ بن جائے شوالہ اک نیا | شور ہو ناقوس کا جس میں مؤذن کی صدا

ہستیٔ مطلق تھی اُلجھی اختلافِ نام میں
فرق کچھ پایا نہیں تو نے رحیم و رام میں

اے کہ جس کے قبضۂ قدرت میں ہے ہم سب کی جاں | جو ہے مسجودِ خلائق جو ہے خلاقِ جہاں
مُرغِ خوش الحاں چلا ہے اب سوئے باغِ جناں | شاخِ سدرہ پر ہو اس رنگیں نوا کا آشیاں

جو فرشتہ خو ہیں یاروں سے جدا ہوتے نہیں
پردہ کر لیتے ہیں آنکھوں سے فنا ہوتے نہیں

جذباتِ ہادی

(از جناب ہادی مچھلی شہری)

صدقے ہے کیفِ وصل غمِ انتظار پر | قربان کیوں نہ جاؤں دلِ بے قرار پر
میری بہار اسی میں ہے اے زینتِ بہار | نازاں ہوں اپنے دامنِ صد تار تار پر
اِک اِک ورق ہے آئینۂ آفتِ خزاں | اترائیں گل نہ ہستیٔ ناپائیدار پر
دیکھوں غمِ فراق سے ملتی ہے کب نجات | آنکھیں گڑی ہیں گردشِ لیل و نہار پر
طولِ امل نے رنجِ جدائی مٹا دیا | آتی ہے اب ہنسی دلِ امیدوار پر
تازہ انھیں سے یاد مری بیکسی کی ہے | کچھ پھول تم جو ڈال گئے تھے مزار پر
تقدیر میری کوششِ ترکِ شراب کی | لکھی ہوئی ہے دامنِ ابرِ بہار پر
محرومِ التفات رہے شیوہ ہائے عشق | اُن کی نظر ہوئی نہ مرے حالِ زار پر
اس بے خبر کو راحتِ منزل کی کیا خبر | نقشِ قدم جو بن کے رہا رہ گزار پر
کب تک شعارِ ضبط کو بدنام دل کرے | کب تک مٹے مری نگہِ بار بار پر
ہادی فراغبالیٔ اہلِ جہاں غلط | قابو کسے ہوا ہے غمِ روزگار پر

مصوّر کا تخیّل

(ایک انگریزی شاہکار کا ترجمہ)

(از مولوی مقصود علی، سی۔ٹی)

وہ نہ فانی مسرتوں کا متلاشی ہے نہ اُن کے لئے کوشاں۔
لیکن اپنے آپ کو اُن جمیل محسمات کے بوسوں سے سیراب کرتا ہے۔
جو اُس کے تخیل کی وسعتوں میں آباد ہیں۔
طلوعِ آفتاب سے غروبِ آفتاب تک وہ اُس منعکس نہر پر غور
کرتا ہے، جس کو سورج کی شعاعوں نے روشن اور درخشاں بنا دیا ہے۔
زرد تتلیاں عشق پیچاں کی بیلوں میں منظر کی کیفیت کو دوبالا کر رہی ہیں۔
لیکن وہ ان چیزوں کو قابلِ اعتنا تصور نہ کرتے ہوئے
فطرت کی اُس حقیقتِ مسلمہ کا انکشاف کرتا ہے...... جو حیاتِ انسانی
کے مقابلہ میں قطعاً لازوال وغیر فانی ہے۔"
(شیلے)

ڈاکٹر ٹامسن ایک آرام کرسی پر دراز تھا اور سامنے پڑے ہوئے مریض کی عجیب وغریب علالت پر غور وفکر کر رہا تھا، کبھی کبھی وہ غیر ارادی طور پر اپنی نگاہیں اُٹھاتا اور کمرہ کی بے شمار تصویروں کو جو اُس کی زینت بڑھا رہی تھیں ایک نظر سے دیکھ لیتا تھا، بالآخر اُس کی توجہ ایک نامکمل تصویر پر مبذول ہوئی جو پینٹنگ بورڈ پر آویزاں تھی۔ کمرہ انواع واقسام کے رنگین پردوں اور چلمنوں سے آراستہ تھا پینٹنگ بورڈ کے قریب ایک میز رکھی ہوئی تھی جس پر مختلف رنگوں کی پیالیاں اور دیگر مسالوں کے ڈبے رکھے ہوئے تھے۔ یہ سب بے ترتیب اور گرد آلود تھے، جس سے معلوم ہوتا تھا کہ عرصہ سے اُن کو استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ مریض کو ہوا سے محفوظ رکھنے کے لئے سب کھڑکیاں خاص اہتمام سے بند کر دی گئی تھیں۔ صرف ایک کھڑکی کسی قدر کھلی ہوئی تھی مگر اُس پر بھی ایک ہلکا ریشمی پردہ پڑا ہوا اور گرد کی ہوا سے اٹکھیلیاں کر رہا تھا۔ جب ہوا کا جھونکا بارش کی بوچھار کے ساتھ یکایک کھڑکی سے داخل ہوتا تھا تو یہ پردہ کبھی نیچے اُڑتا اور کبھی اُوپر۔ مریض کی حالت بہت نازک اور قابلِ رحم تھی، وہ بستر پر پڑا ہوا تھا، اُسکی ہڈیاں اور رگ وریشہ اُس کے نحیف ونزار جسم سے چمک چمک کر سارس کی نرم ونازک ٹانگوں کی یاد دلا رہے تھے۔

یکایک مریض اُٹھکر بیٹھ گیا اور ڈاکٹر سے متوجہ ہونے کی درخواست کی، ڈاکٹر متحیر رہ گیا۔ مریض نے نہایت

سنجیدگی سے نقاہت آمیز لہجہ میں کہنا شروع کیا :-

"آپ جانتے ہیں کہ میں مصور ہوں اور آغاز شباب ہی سے یہ کوشش کرتا رہا کہ اپنے حریفوں کو نہ صرف اپنے مرقعوں کے خریداروں کی تعداد میں اضافہ کرکے نیچا دکھاؤں۔ بلکہ فن کی مختلف نمائشوں اور مقابلوں میں بھی اُن سے سبقت لے جاؤں۔ مگر اس خیال کی تکمیل ہونے سے پہلے ہی میں اس مرض میں مبتلا ہوگیا جو سریع الاثر ہونے کے ساتھ میرے حواس پر بھی مستولی ہوگیا۔ حسن و جمال کے مشاہدہ نے میرے دل میں ایک حقیقی تڑپ پیدا کردی ہے اور مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میری روح محبت و صداقت کی دیوی سے متاثر ہوچکی ہے جو وہم و خیال کی دنیا میں آباد مگر ہماری پہونچ سے باہر ہے۔ اب جذبات کا ہیجان اور حسیات کا تلوّن کارفرما ہے۔

میں ایک حسنِ کامل کا متلاشی تھا،

تخیل کی پرواز نے جو ایک مصور کے دل کی روشنی اور روح کی بالیدگی کا دوسرا نام ہے میرے لئے ایک دوسری دنیا کا دروازہ کھول دیا۔ یعنی خواب و خیال کی دنیا۔

میں رات دن اپنے نگارخانہ میں دنیا و مافیہا سے بےخبر پینٹنگ بورڈ پر مصروف رہنے لگا۔ لیکن میں ان تصاویر کو.... نہیں نہیں، اُن مرقعوں کو جو میرے تخیل کا نتیجہ تھے تیار ہوتے ہی فوراً پھاڑ ڈالا کرتا تھا کیونکہ یہ میرے حسن کامل کے معیار پر پورے نہ اُترتے تھے۔ میرا رنگین تخیل اُس حسن مجسم کو منظر عام پر لانے میں میری رہبری کرتا رہتا لیکن میری انگلیاں صفحۂ کاغذ پر اُس خیالی مرقع کو قلمبند نہ کرسکیں جس سے مجھے حصول مقصد کی توقع ہوتی۔ اُس حسن کامل کی شعاعیں میرے دماغ میں ہمیشہ رقص کرتی رہیں۔ میرے تخیل کے نقرئی پردہ پر اُس کی ضیا پاشیاں بھی ہوتی رہتیں لیکن میرا کاغذ اُس کا چربہ نہ اُتار سکا۔"

مصور بمشکل اتنا کہہ پایا تھا کہ تنفس کے دورے نے اُسے ہمیشہ کے لئے خاموش کردیا۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

آغازِ محبت

مسرت کیف افزائے اذیت ہوتی جاتی ہے ۔۔۔ اذیت درد افزائے مسرت ہوتی جاتی ہے
گماں کیا اب تو یہ ایمان ہے اے ہمنشیں میرا ۔۔۔ انھیں مجھ سے مجھے اُن سے محبت ہوتی جاتی ہے

طلوعِ آفتاب

ہنگامِ سحر اونگھتی خاموش فضا میں ۔۔۔ تاریک گھٹا ٹوپ گھِر چھائی ہے ہر سُو
ایسا نظر آتا ہے نکلتا ہوا خورشید ۔۔۔ جیسے کسی بیمار کے رخسار پہ آنسو

تنقیدِ کتب

وارداتؔ

یہ کتاب اُردو ادب کے مشہور و معروف محسن پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب کیفی دہلوی کے منظوم کلام کا ایک دلپسند مجموعہ ہے کیفی صاحب ایک عالم متبحر اور کہنہ مشق ادیب و شاعر ہیں مسلسل پچاس سال سے آپ اُردو زبان کی اہم خدمت کر رہے ہیں۔ اُردو کی توسیع و ترقی کی ہر تحریک میں آپ عملی حیثیت سے سرگرم حصہ لیتے رہے ہیں۔ اسلئے اگر آپ کے مجموعۂ کلام کو گذشتہ نصف صدی کے ادبی رُجحانات کا خلاصہ سمجھا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اس مجموعے میں قدیم و جدید شاعری کے ہر قسم اور ہر طرز کے قابل قدر نمونے موجود ہیں۔ زمانۂ تصنیف کے لحاظ سے کیفی صاحب نے اپنے کلام کو پانچ دَور میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے دَور میں ابتدا سے سنہ ۱۸۸۶ء تک کا کلام درج کیا گیا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ثقاتِ اُردو کی طرف بہت کم توجہ فرماتے تھے۔ چنانچہ اس دَور کا زیادہ تر حصہ فارسی میں ہے مگر ایک دُعائیہ قصیدہ مہاراجہ کشمیر کی شان میں ہے، جو فن اور تخیل دونوں لحاظ سے چنداں قابل اعتنا نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ یہ طویل قصیدہ صرف چند گھنٹوں کی فکر کا نتیجہ ہے اور کیفی صاحب نے یقیناً اسے محض تاریخی حیثیت سے درج مجموعہ کیا ہے

دوسرا دور سنہ ۱۸۸۶ء سے شروع ہوکر سنہ ۱۸۹۹ء تک ختم ہوتا ہے۔ اس دَور میں مختلف عنوانوں پر بہت سی نظمیں اور غزلیں ہیں، لوریاں اور رباعیاں بھی ہیں۔ اس دَور کے کلام میں تدریجی ترقی پائی جاتی ہے مگر طبیعت "بسیار گوئی" کی طرف مائل معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۸۹۰ء میں آپ نے ایک نظم "شوکت ہند" کے عنوان سے لکھی تھی جس میں اکتیس بند ہیں اور ہر بند میں کم سے کم گیارہ شعر ہیں۔ اس نظم میں پنڈت جی نے پراچین بھارت کی شوکت دکھائی ہے۔ اسی دَور کی ایک نظم "شاخ نبات" بھی نہایت مزیدار ہے اور ترکیبوں میں شیرینی اور لفظوں میں چاشنی کوٹ کوٹ کر بھری ہے، اور کیوں نہ ہو یہ نظم آم کی شان میں ایک برجستہ طولانی قصیدہ ہے جس کا کوئی شعر لفظی رعایت یا تلازمہ سے خالی نہیں ہے۔

تیسرے دور میں سنہ ۱۹۰۰ء سے سنہ ۱۹۲۰ء تک کا کلام ہے، اس دَور کو ہم کیفی صاحب کی شاعری کا عنفوان شباب کہہ سکتے ہیں۔ اس زمانہ کے کلام میں روانی بھی ہے اور ندرت و رنگینی بھی، تخیل میں پرواز بھی آگئی ہے۔ اس دَور کے کلام میں ایک رزمیہ نظم بھی بہت خوب ہے جو اس موقعہ پر کہی گئی تھی جب سنہ ۱۹۱۴ء کی جنگ یورپ میں ہندوستانی فوجیں فرانس میں گئی تھیں اور وہاں اُن کا خیر مقدم کیا گیا تھا، اس کے دو بند بطور نمونہ درج ذیل ہیں:-

کون آتے ہیں جو قلبِ زمیں کانپ رہا ہے ‏ ‏ کیا قلب زمیں، چرخ بریں کانپ رہا ہے
یورپ کا ہر اک حصن حصیں کانپ رہا ہے ‏ ‏ وہ کون ہے رن میں جو نہیں کانپ رہا ہے

کیوں آج ہے لرزہ میں سما اور سمک بھی
سجدے میں کماں بن گیا کیوں پیر فلک بھی
کیوں عرصۂ حشر آج یہ میدانِ وغا ہے کیوں صف میں غنیموں کی تلاطم سا بپا ہے
کیوں بم کی طرح قلب عدو آج پھٹا ہے کیوں ہوش غبارہ کی طرح پا بہ ہوا ہے
ہے شور یہ اعدا میں، گئی ہاتھ سے بازی
لو سورما وہ ہند کے آتے ہیں، وہ غازی

اسی دور کے کلام میں ایک نظم "ہمارے شاعر" کے عنوان سے ہے جسے ہمارے شاعروں کو ضرور پڑھنا چاہیئے کیونکہ اکثر اصحاب کو اس نظم کے آئینہ میں اپنا چہرہ نظر آئیگا۔

چوتھے دور میں سنہ ۱۹۲۰ء سے سنہ ۱۹۳۰ء تک کا کلام ہے جس میں صفائی، پختگی اور سنجیدگی تو زیادہ پائی جاتی ہے البتہ شعریت کم ہو گئی ہے اور قومیت و وطنیت بڑھ گئی ہے۔ اس میں بزرگان قوم کی وفات پر مرثیے ہیں، ہندو مسلمانوں کے نفاق پر دلی رنج و افسوس کا اظہار کیا گیا ہے۔ اکثر نظموں میں پند و نصیحت کا عنصر غالب ہے۔

پانچواں دور سنہ ۱۹۳۱ء سے شروع ہوتا ہے اور بفضلہ اب تک جاری ہے، اس دور کی خصوصیات میں "یاد ماضی" "رام بھجن" اور پند و نصیحت داخل ہیں۔ چنانچہ اس زمانہ کی نظموں کو حضرت کیفی کے تبرکات سمجھنا چاہیئے۔

سنہ ۱۹۲۶ء سے سنہ ۱۹۳۰ء تک ہمارے مخدوم کیفی صاحب نے روحانیات، جمالیات، عشقیات، شبابیات وغیرہ پر بھی کئی دلچسپ نظمیں لکھی ہیں۔

شروع میں مولوی سید ہاشمی فرید آبادی کا "تعارف" اور اس کے بعد منصور احمد مرحوم ایڈیٹر "ادبی دنیا" کا لکھا ہوا "تذکرہ" ہے جس میں تالیف مصنف کے حالات زندگی کے علاوہ آپ کے کلام پر سیر حاصل تنقید بھی کی گئی ہے۔ اس طرح یہ مجموعۂ کلام کیفی صاحب کے شاعرانہ زمول کی ایک مکمل داستان ہے جس کی شائقین اردو کو تہ دل سے قدر کرنا چاہیئے۔[1]

اس کی لکھائی چھپائی، جلد سب عمدہ ہے ضخامت ۲۰×۳۰ تقطیع کے ۵۱۲ صفحات قیمت پانچ روپیہ صہ[1]

دیوان جوشش[2]

یہ عظیم آباد (بہار) کے مشہور شاعر محمد روشن تخلص جوشش کا مجموعۂ کلام ہے۔ جوشش سنہ ۱۱۵۱ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے تھے۔ اس طرح گویا اس دیوان کی زبان تقریباً دوسو برس کی پرانی زبان ہے، مگر اس کے بہت سے شعر بالکل آجکل کی زبان میں ہیں۔ انجمن ترقی اردو نے یہ دیوان شائع کر کے گویا اردو زبان اور بہار پر احسان کیا ہے۔ روزمرہ کے چند شعر نمونۃً ملاحظہ فرمائیے ؎

---

[1] ملنے کا پتہ: رام لال سوری اینڈ سنز انارکلی لاہور۔ [2] ملنے کا پتہ: انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی۔

سوئے حرم یا طرفِ بت کدہ تن الغرض اے شیخ جدھر جائیے
دونوں جگہ جلوہ گرِ یار ہے خواہ اِدھر خواہ اُدھر جائیے

چشمِ وحدت سے گر کوئی دیکھے بت پرستی بھی حق پرستی ہے

روٹھ بیٹھا ہے مجھ سے وہ جوشش تن کوئی جا کر اُسے یہ سمجھائے
آرزو ہی میں تیرے ملنے کی آہ کیا یہ غریب مر جائے؛

تمام کلام اس قسم کا نہیں ہے، وہ زمانہ بڑی بڑی سنگلاخ زمینوں میں کہنے اور قافیہ پیمائی کرنے کا تھا۔ چنانچہ جوشش بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ قاضی عبدالودود صاحب نے جنھوں نے دیوان مرتب کیا ہے مختلف تذکروں سے جوشش کے حالاتِ زندگی جمع کئے ہیں اور اس کا مقدمہ بھی بڑی محنت سے لکھا ہے۔ ۱۰۰ صفحے ضخامت قیمت عہ

تاریخ منظوم سلاطین بہمنیہ

یہ کتاب دراصل ابوالفتح ضیاء الدین محمد المعروف بہ سید امجد حسین بن سید اشرف الحسینی الایازی خطیب جامع مسجد ایلچپور برار کی کتاب تاریخ دکن امجدیہ کا چوتھا باب ہے۔ اصل کتاب جو فارسی زبان میں ہے گیارہ باب میں، اس کا چوتھا باب ساٹھ صفحوں کا ہے جس کا ترجمہ اُردو نظم میں برار کے کسی شاعر سہیل نامی نے مثنوی کی صورت میں کیا ہے۔ اس کی زبان نہایت صاف و رواں ہے قدیم طرز پر اس میں پہلے حمد و نعت اور اس کے بعد چھوٹے چھوٹے چونتیس ۳۴ ابواب میں سلاطین بہمنیہ کے مختصر حالات بیان کئے گئے ہیں۔ حسن گانگو بہمنی کے حالات میں شاعر نے لکھا ہے:۔

تواریخ میں اس طرح ہے لکھا حسن کی تھی یہ حالتِ ابتدا
برہمن تھا دہلی میں قانون گو منجم بھی تھا اور قانونگو
مگر عہد وہ شاہ تغلق کا تھا برہمن ملازم تھا شہزادہ کا
ملازم تھا اس بہمنی کا حسن پریشاں، گرفتارِ رنج و محن

حسن کے مالک کو "گانگو" اور برہمن تو اکثر مورخین نے لکھا ہے لیکن "قانونگو" کسی نے نہیں لکھا۔ بہر حال کتاب دلچسپ ہے اور شاہ تغلق کے انتقال سے ذکر کلیم اللہ شاہ بہمنی" تک ختم ہوئی ہے۔ اس مثنوی کی بعض باتیں تاریخ کا پایہ نہیں رکھتیں بلکہ محض روایات کی بنا پر قلمبند کی گئی ہیں تاہم مثنوی دلچسپ ہے قیمت ایک روپیہ ملنے کا پتہ انجمن ترقی اُردو دہلی۔

فن شاعری

یہ کتاب ارسطو کی تصنیف (Poetics) کا اُردو ترجمہ ہے جو مسٹر عزیز احمد بی۔ اے پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد نے بڑی محنت سے کیا ہے۔ اس کتاب میں ارسطو نے فن شاعری پر فلسفیانہ بحث کی ہے اور رزمیہ و المیہ شاعری کا مفصل موازنہ کیا گیا ہے۔ پانچویں باب میں المیہ شاعری کو رزمیہ شاعری سے افضل ثابت کرنے کی کوشش

کی گئی ہے۔ آخر میں ایک ضمیمہ میں ان یونانی شاعروں کا تذکرہ کیا گیا ہے جن کے نام ارسطو کی کتاب میں آ گئے ہیں۔ اس ترجمہ کے لئے جو بڑی محنت سے کیا گیا ہے مولوی عزیز احمد صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں۔ قیمت ۱۲ؔ ملنے کا پتہ: انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی

حیوانی دنیا کے عجائبات

اس کتاب میں مولوی عبدالبصیر خاں صاحب پروفیسر علیگڑھ یونیورسٹی نے مختلف جانوروں کے طرز زندگی، عادات ان کی ذہانت اور عمروں پر دلچسپ روشنی ڈالی ہے اور دیمک کا حال کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ سب سے زیادہ دلچسپ اور پرلطف وہ باب ہے جس میں سانپ خور جانوروں کے حالات بتائے گئے ہیں۔ آخر کے دو بابوں میں سچے موتیوں کی تاریخ، ان کے پیدا ہونے کے مقامات اور بننے کے طریقے بھی مع نقشہ جات سمجھائے گئے ہیں۔ اس کتاب میں تین سو جانوروں کی تصویریں بھی درج ہیں لیکن بعض بعض تصویریں ایسی بھی ہیں جن کے حالات کتاب میں درج نہیں ہیں۔ ۲۶/۲۹ × ۲۰ تقطیع کے ڈیڑھ سو صفحات ضخامت۔ قیمت دو روپیہ ؏ ملنے کا پتہ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی

ہماری غذا

یہ کتاب لفٹنٹ کرنل رابرٹ میکلین کونور (جنوبی ہند) کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے جسے سید مبارز الدین احمد رفعت نے اردو کا جامہ پہنایا ہے اور ڈاکٹر غلام دستگیر صاحب ایم بی۔ بی۔ ایس کی نظر ثانی کے بعد انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی نے شائع کیا ہے۔ اس میں پروٹین۔ حیاتین اور مختلف غذاؤں کے نفع نقصان بیان کئے گئے ہیں حجم ۱۵۲ صفحات قیمت ۱۲ؔ

قومیت اور بین الاقوامیت

مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی نے مختلف موضوعات پر مختلف اہل قلم سے بارہ مقالے لکھوائے تھے چنانچہ یہ کتاب بھی مولوی محمد قاسم صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی کا لکھا ہوا ایک طویل اور سبق آموز مقالہ ہے جس کا مطالعہ موجودہ سیاسی طالبعلموں کے لئے بہت مفید ہوگا۔ فاضل مصنف نے "قومیت اور بین الاقوامیت" پر بحث کرتے ہوئے مختصر طور پر دنیا کی تمام قوموں کی سیاسی تاریخ پر روشنی ڈالی ہے۔ لکھائی چھپائی، کاغذ اوسط، ضخامت ۱۶۱ صفحات، قیمت ایک روپیہ
ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ ملیہ، دہلی۔

دیس کی لیلا

یہ تین جزو کی چھوٹی سی کتاب میاں عبدالمجید بھٹی "اڈیٹر ہونہار" لاہور کے چودہ گیتوں کا مجموعہ ہے۔ ان گیتوں کی دھن تو خود بھٹی صاحب یا ان کے احباب کو معلوم ہوگی، لیکن ان گیتوں میں ترنم ضرور ہے۔ رہا زبان وہ نہ خالص اردو ہے نہ خالص ہندی بلکہ فارسی لفظوں کی کثرت نے اس کو نہ ادھر کا رکھا نہ ادھر کا۔ بعض بعض جگہ سیاسیات کی بھی جھلک ہے اور بعض کا موضوع دلیش بھگتی یا قوم پرستی ہے۔ بہرحال گیت برے نہیں ہیں۔ شروع میں مولانا چراغ حسن حسرت کا ایک مختصر دیباچہ ہے۔ لکھائی چھپائی کاغذ سب عمدہ۔ ضخامت تین جزو۔ قیمت چار آنہ ۴ؔ
ملنے کا پتہ: ہونہار بک ڈپو، لاہور

رفتارِ زمانہ

اس ماہ لڑائی کے قریب قریب ہر محاذ میں ناگوار واقعات پیش آئے۔ محوری طاقتوں نے موسم گرما کا حملہ جس کا عرصہ سے اندیشہ تھا بڑی سرگرمی سے شروع کر دیا ہے، اور شمالی افریقہ اور روس دونوں ملکوں میں غیر معمولی حالات پیدا ہو گئے ہیں، لڑائی کا سب سے زیادہ زور تو اس وقت روس میں ہے اسکے بعد شمالی افریقہ اور چین کا نمبر ہے۔ روس اور افریقہ دونوں میدانوں کی لڑائیاں ساتھ ساتھ چل رہی ہیں۔ لیبیا میں مہینوں کی خاموش تیاریوں کے بعد ۲۶ مئی کو جنرل رومیل نے ان اتحادی مورچوں پر جو غزالہ سے بیر حاکم تک پھیلے ہوئے تھے بڑے زور شور سے حملہ کر دیا جس کا برطانی فوج نے اپنی پوری طاقت سے مقابلہ کیا لیکن یہ ٹکر اس قدر سخت تھی کہ دونوں فریق تھک کر چور ہو گئے۔ برطانی جرنیلوں کا خیال تھا کہ جنرل رومیل کو دوبارہ حملہ آوری میں کچھ دیر لگے گی لیکن اُن کا یہ خیال غلط ثابت ہوا اور جرمن فوجوں نے دم لینے کی مہلت نہ دی۔ ایک ہفتہ تک سخت جنگ ہوتی رہی لیکن کوئی فیصلہ کن نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ ۱۳ جون کو جنرل ریچی نے اپنی لائن کے وسط سے دشمن پر شدید حملہ کرنا چاہا لیکن عیار دشمن نے سامنے کے میدان میں اپنی توپیں اس طرح چھپا رکھی تھیں کہ ان کا حال کسی کو معلوم نہ ہوا اور اتحادی ٹینک اِن کے جال میں پھنس گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تین سو اتحادی ٹینکوں میں سے دو سو تیس ٹینک اُسی دن ضائع ہو گئے اور اتحادی فوجوں کو مجبوراً غزالہ، بیر آدم، بیر حاکم اور عکرمہ سے پیچھے ہٹ کر مصر و لیبیا کی سرحد پر اپنا مورچہ قائم کرنا پڑا۔ اس نقل و حرکت میں طبرق سے رسل و رسائل کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا جس کی قلعہ نشین فوج دس ماہ سے بڑی پامردی سے غنیم کے پے در پے حملوں کا مقابلہ کر رہی تھی۔ اس مصیبت میں پھنسنے کے بعد اسکو بھی ہتھیار ڈالنا پڑے۔ فوجی ماہروں کا خیال تھا کہ طبرق کی فوج کے پاس کم سے کم تین ماہ کی رسد کا سامان ہے اس لئے وہ دشمن کے محاصرہ کا بخوبی مقابلہ کرتے رہیں گے اور اس عرصے میں اُن کے پاس کسی نہ کسی طرح مزید کمک پہونچ جائیگی لیکن واقعات نے حیرت انگیز پلٹا کھایا اور مہینوں کی جانبازی آن کی آن میں ملیامیٹ ہو گئی۔ لیبیا میں ایک سال کے دوران میں چالیس ہزار قیدی برطانی فوج کے ہاتھ لگے اور چار سو میل کا رقبہ انگریزوں کے ہاتھ آ گیا تھا لیکن جنرل رومیل کی چالاکانہ چالوں کی بدولت اس مرتبہ تقریباً پچاس ہزار سپاہیوں کا نقصان اُٹھانے کے علاوہ اتحادی فوج کو مقبوضہ رقبہ خالی کر کے ڈیڑھ سو میل پیچھے ہٹنا پڑا۔ اس طرح جنگ لیبیا کا افسوسناک خاتمہ ہو گیا۔ طبرق کے نکل جانے سے [illegible] اور اسکندریہ کی پوزیشن بھی نازک ہو گئی ہے چنانچہ اس وقت ان دونوں پر سختی سے حملے ہو رہے ہیں۔ اتحادی فوجوں کو مصر کی سرحد سلوم سے ہٹ کر مرسا مطروح پر مورچہ قائم کرنا پڑا لیکن رومیل کی فوج سامنے سے حملہ کرنے کے بجائے جنوب کی طرف سے گھوم کر اتحادی فوج کے پیچھے پہونچ گئی جس کی وجہ سے اتحادیوں کو مرسا مطروح بھی خالی کر کے اسکندریہ کے پاس العلمین پر مورچہ قائم کرنا پڑا اس مقام پر اس وقت بڑی زبردست لڑائی ہو رہی ہے۔ جنرل آچنلک نے جنرل ریچی کو ہٹا کر جو اب تک لیبیا کی فوج کے کمانڈر تھے اتحادی سپاہ کی کمان خود اپنے ہاتھ میں لے لی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ جب سے یہ رد و بدل ہوا ہے دشمن کی پیشقدمی رک گئی ہے اور فریقین کو تازہ کمک پہونچ رہی ہے۔ خیال [illegible] ہے کہ جنرل آچنلک نے مصر کو دشمن کے حملہ سے بچا لیا ہے

لوگ صبر و استقلال کے ساتھ اس معرکہ آرائی کو دیکھ رہے ہیں اور اتحادیوں کی طرف ہیں۔ وزیر اعظم مصر نحاس پاشا اتحادیوں کے ساتھ تمام ملکی معاہدوں کا پورا پورا احترام کر رہے ہیں لیکن حتی المقدور خود حکومت مصر کو لڑائی کی تباہ کاریوں سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ اسی لئے اُنھوں نے گورنمنٹ مصر کی طرف سے غیر جانبداری کا اعلان کیا ہے مصری پارلیمنٹ کا ایک خفیہ اجلاس بھی ہو چکا ہے اور شاہ مصر اور وزیر اعظم دونوں اس امر میں متفق معلوم ہوتے ہیں کہ اتحادیوں کا ساتھ دینے کے باوجود جہاں تک ممکن ہو اپنے ملک کو محوری طاقتوں کی براہ راست ٹکر سے بچائے رہیں۔

روس | روس میں مصر سے بھی زیادہ خونریز لڑائیاں ہو رہی ہیں، یہاں جرمن دو محاذ پر لڑ رہے ہیں، کریمیا میں سباسٹوپول کی بندرگاہ کے لئے دوسرے جنوبی روس یعنی یوکرین میں علاقہ خارکوف کے واسطے جرمن آٹھ ماہ سے سباسٹوپول کا محاصرہ کئے ہوئے تھے اور روسیوں کی ہمت و استقلال نے دشمن کی فوج کے چھکے چھڑا دیئے۔ لیکن اس مرتبہ ہٹلر نے وہاں کے قلعوں پر بے شمار فوج، ٹینکوں اور ہوائی جہازوں سے حملہ کیا، ایک ایک دن میں ایک ایک ہزار بم پھینکے اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی پھر بھی روسیوں کی قلعہ نشین فوج بڑی بہادری سے مقابلہ کرتی رہی مگر جب دشمن نے مہینوں کی مسلسل کوشش کے بعد ہر طرف سے راستے بند کر دیئے اور حفاظتی فوج کے پاس سامان جنگ اور رسد بھی نہ رہا تو اُنھوں نے مجبور ہو کر سباسٹوپول کو خالی کر دیا مگر ہتھیار پھر بھی نہ ڈالے بلکہ جزیرہ نمائے خزرسن کی طرف چلے گئے۔ سباسٹوپول کا ہاتھ سے نکل جانا واقعی بہت افسوسناک ہے۔ یہ مشہور تاریخی قلعہ نہایت مضبوط اور اہم تھا اور بحیرہ اسود میں روسی بیڑہ کا مستقر بھی یہیں تھا جس بہادری اور جوانمردی سے روسیوں نے سباسٹوپول کی حفاظت کی ہے وہ اس جنگ کی تاریخ میں آب زر سے لکھی جائیگی۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ ان معرکوں میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ جرمن اور پچاس ہزار روسی کام آئے غرض روسیوں نے اپنی ملکی حفاظت کا پورا حق ادا کیا اور ایک ایک انچ زمین کے لئے خون کی ندیاں بہا دیں اور جب سارے شہر کی اینٹ سے اینٹ بج گئی اور اس کا بچانا ناممکن ہو گیا تو ہر ممکن طریقے سے بندرگاہ کو جرمنوں کے لئے بیکار بنا کر اسے خالی کر دیا جس بہادری اور پامردی سے اہل روس اس لڑائی کو جاری رکھے ہوئے ہیں اس سے تمام دنیا کی نگاہ میں اُن کی اور اُن کے نظام حکومت کی عزت بہت بڑھ گئی ہے۔

خارکوف کا میدان ابھی تک انسانی خون سے لالہ زار بن رہا ہے۔ جب جرمن جنرل فان بوک نے مشرق کی طرف بڑھ کر دریائے ڈونیٹز کو پار کرنا چاہا تو مارشل تموشنکو نے جرمن فوج پر دباؤ ڈالنے کی غرض سے خارکوف پر حملہ کر دیا جہاں کئی دن تک گھمسان لڑائی ہوتی رہی، مارشل تموشنکو خارکوف کو فتح کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے مگر اُنھوں نے لاکھوں جرمنوں کو تیغ کے گھاٹ اُتار دیا جس کی وجہ سے جرمن فوج اس قدر کمزور ہو گئی کہ وہ روستوف کی طرف پیش قدمی نہ کر سکی اور ہٹلر کو فوجی نقصانات پورے کرنے کے لئے تازہ دم فوج میدان جنگ کی آگ میں جھونکنے پڑے۔ تازہ دم کمک پہونچنے کے بعد جرمنوں نے دو طرف سے حملے کئے ایک تو خارکوف کے جنوب کی طرف اور دوسرا خارکوف کے شمال میں کرسک کی طرف۔ ان حملوں کا مقصد کوپیانسک یا ملحقہ علاقہ [illegible] اور کرسک پر قبضہ کرنا تھا چنانچہ اس مقصد میں دشمن کو بہت کچھ کامیابی حاصل ہو گئی ہے اور مارشل تموشنکو کی فوجوں کو پیچھے ہٹنا پڑا ہے [illegible] کا مقصد روستوف اور [illegible] پر قبضہ کرنا ہے، روستوف کا کیسپیا [illegible] ہے [illegible] کا ایک اہم اسٹیشن ہے۔ اگر دشمن [illegible] پر قابض ہو گیا تو شمالی اور جنوبی [illegible] فوج [illegible] اور شمال کی طرف سے مارشل تموشنکو [illegible] تمام [illegible]

کا مقصد کاکیشیا کا راستہ صاف کرنا اور کاکیشیا کی روسی فوج کی رسد اور کمک روکنا ہے۔ جرمنوں کا اصلی مقصد تو یہی ہے کہ کسی نہ کسی طرح کاکیشیا کے تیل کے چشموں پر قبضہ کرلیں۔ اس وقت روسیوں کی پوزیشن بہت تشویش انگیز ہو گئی ہے لیکن روس کا بچہ بچہ اپنے وطن کو دشمن کے قدموں سے پاک کرنیکا بیڑہ اُٹھا چکا ہے اور امریکہ و برطانیہ روسیوں کو برابر مدد پہونچا رہے ہیں چنانچہ برطانیہ دو ہزار سے زائد ٹینک بھیج چکا ہے اور امریکہ بھی ہر قسم کا ضروری سامان روانہ کر رہا ہے۔ اسلئے ہم روس سے مایوس نہیں ہیں

یورپ اور افریقہ میں لڑائیوں کے ساتھ ساتھ ہوائی معرکوں کا سلسلہ بھی جاری ہے چنانچہ جون کے مہینہ میں برطانوی ہوائی جہازوں نے جرمنی اور اُس کے مقبوضہ علاقوں پر دن رات ملاکر کل چالیس۴۰ حملے کئے۔ خاص جرمنی کے پانچ مقامات پر سولہ۱۶ حملے کئے گئے۔ دو مرتبہ ایک ایک ہزار ہوائی جہازوں کی جمعیت نے حملے کئے، ان حملوں میں کل دو سو اکتر برطانوی ہوائی جہاز ضائع ہوئے اور ایک سو اکاون۱۵۱ ہوائی جہاز مشرق وسطیٰ میں تباہ ہوئے۔ جرمنوں کے پینتیس ہوائی جہاز برطانیہ پر پینسٹھ ہوائی جہاز یورپ پر اور ایک سو پینسٹھ مشرق وسطیٰ میں تباہ ہوئے۔ جن میں سے ترپن۵۳ مالٹا پر تباہ ہوئے۔ اس ماہ جنگ کی تاریخ میں پہلی مرتبہ امریکہ کے ہوائی جہازوں نے بھی یورپ میں حملے کئے۔ ان حملوں میں اس وقت تک برابر اضافہ ہوتا رہے گا، جبتک جرمنی کو اپنے اعمال کی پوری سزا نہ مل جائیگی۔

جنگ چین | چین و جاپان کی لڑائی اب چھٹے سال میں داخل ہوئی ہے۔ مگر چینیوں کے دم خم وہی ہیں جو پہلے تھے۔ جاپان اس وقت خاص طور پر چین کے مشرقی صوبوں کو اپنے قبضے میں لینے کی کوشش کر رہا ہے جو سمندر کے کنارے واقع ہیں تاکہ وہاں کے چینی اڈّوں سے جاپان پر ہوائی حملے نہ ہوسکیں۔ چین کی لڑائی کی اس وقت عجب کیفیت ہے۔ کبھی کوئی شہر چینیوں کے ہاتھ سے نکل جاتا ہے اور کبھی وہ پھر اُن کے قبضہ میں آجاتا ہے۔

جاپانیوں نے امریکہ کے جزائر الیوشن کے بعض مقامات پر بھی قبضہ کرلیا ہے۔ جن میں کسکا زیادہ اہمیت رکھتا ہے امریکن اور آسٹریلین ہوائی جہازوں کے حملے نیوگنی، نیو برٹش، تیمور اور دوسرے جاپانی مقامات پر بھی ہو رہے ہیں اور بہت سی امریکن فوجیں آسٹریلیا پہونچ گئی ہے۔ امریکہ اس وقت ہر محاذ جنگ کی فوجی مدد کر رہا ہے۔ خیال ہے کہ ۱۹۴۲ء کے آخر تک امریکن فوج میں ۴۸ لاکھ سپاہی بھرتی ہو جائیں گے اس وقت بھی اُن کے لاکھوں سپاہی یورپ اور ایشیا میں موجود ہیں۔ حال ہی میں مسٹر چرچل نے پارلیمنٹ میں بتایا ہے کہ اس وقت امریکہ اور برطانیہ کے ساڑھے ۹ لاکھ سپاہی دشمن سے مقابلہ کے لئے مختلف ملکوں میں جمع ہو گئے ہیں۔ اور برطانیہ اور امریکہ دونوں روس کی لڑائی کو اپنی لڑائی سمجھے ہوئے ہیں۔ ماہ جون کا سب سے اہم واقعہ وہ معاہدہ ہے جو موسیو مولوٹاف وزیر خارجہ روس کے خفیہ دورہ برطانیہ و امریکہ کے بعد ہی ایک طرف روس اور برطانیہ اور دوسری طرف روس اور امریکہ کے درمیان ہوا ہے۔ ایک وقت تھا کہ برطانیہ کے ارکان حکومت روس کے نام سے بدظن تھے لیکن اس جنگ میں روسیوں نے جس اُولوالعزمی اور مستقل مزاجی کا ثبوت دیا ہے اور گورنمنٹ اور عوام روس میں جو حیرت انگیز یکجہتی و یگانگت نظر آرہی ہے اُسکی وجہ سے برطانیہ کے رویہ میں حیرت انگیز انقلاب پیدا ہو گیا ہے چنانچہ جب موسیو مولوٹاف لندن پہونچے تو وزیر اعظم مسٹر چرچل نے اُن کی دل کھول کر آؤ بھگت کی اور حضور بادشاہ سلامت نے انکو شرف باریابی دیا۔ واشنگٹن میں بھی وہ کئی دن تک صدر امریکہ کے معزز مہمان رہے۔ برطانیہ نے جنگ روس

کے آغاز میں روس سے جو راضی نامہ کیا تھا وہ بیس سال کے لئے ایک مستقل معاہدہ کی صورت میں تبدیل ہو گیا ہے۔ امریکہ اور روس میں بھی اسی لائن پر ایک نیا راضی نامہ طے ہو گیا۔ ان معاہدوں کی رو سے اتحادی طاقتوں میں سے کوئی حکومت جرمنی اور اُس کے ساتھیوں سے اُس وقت تک جداگانہ صلح نہ کریگی جب تک جرمنی کی حکومت میں اُصولی تبدیلی نہیں ہوتی۔ اٹلی کے متعلق اس قسم کی کوئی شرط نہیں ہوئی ہے اور جاپان کا بھی اس معاہدہ میں کوئی ذکر نہیں ہے کیونکہ اس وقت تک روس اور جاپان کے تعلقات دوستانہ ہیں۔ اس معاہدے میں فریقین نے یہ بھی وعدہ کیا ہے کہ کوئی فریق دوسرے فریق کے اندرونی معاملات میں دخل نہ دیگا۔ اس معاہدہ کا فوری نتیجہ تو یہ سمجھنا چاہیئے کہ امریکہ اور برطانیہ دونوں نے جلد ہی یورپ میں ایک دوسرا محاذِ جنگ قائم کرنے کا مصمم ارادہ ظاہر کیا ہے۔ چنانچہ خیال ہے کہ اکتوبر ۴۲ء تک اتحادی اس ارادہ کو تکمیل تک پہونچا سکیں گے۔ اس وقت تک امریکہ اور برطانیہ کی فوجی طاقت میں بہت بڑا اضافہ ہو جائیگا اور ہٹلر کی فوجیں تھکی ہوئی ہونگی اور اٹلی جہاں اس وقت بھی تھکاوٹ کے آثار نمایاں ہیں اسکی زیادہ امداد نہ کر سکے گا۔ اسی وجہ سے امریکہ کے اکثر ماہرینِ جنگ کا خیال ہے کہ یہ جنگ غالبًا اسی سال ختم ہو جائیگی اور اگر ایسا نہ ہو سکا تو ۱۹۴۳ء میں تو محوری طاقتوں کا زور ختم ہو جانے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں معلوم ہوتی۔

مسٹر چرچل کا سفرِ امریکہ بھی اس ماہ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ وزیرِ اعظم برطانیہ پہلے بھی دو مرتبہ صدرِ امریکہ سے ملاقات کرنے جا چکے ہیں۔ ان ملاقاتوں سے دونوں جمہوریتوں کے باہمی تعلقات بہت کچھ قریب ہو گئے ہیں۔ چنانچہ اس مرتبہ یورپ میں ایک دوسرا محاذِ جنگ قائم کرنے کے متعلق متفقہ فیصلہ ہو گیا ہے۔ یہ محاذ کب اور کہاں قائم ہوگا اسکے بابت کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے لیکن اہل الرائے اصحاب کا اندازہ ہے کہ اکتوبر یا نومبر تک جرمنی کو ضرور کسی نہ کسی نئے محاذ پر اتحادیوں کا مقابلہ کرنا پڑیگا۔ جرمنی اس چال کی اہمیت سے بخوبی واقف ہے اسلیئے وہ آنیوالے جاڑوں سے پہلے ہی روس کی لڑائی کا قصہ تمام کر دینا چاہتا ہے لیکن باوجود اس کے کہ اس وقت روس کی فوجیں کئی جگہ سخت نرغے میں پھنس گئی ہیں اور جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے انکو کئی اہم مقامات خالی کرنا پڑے ہیں لیکن روس کا بچہ بچہ اس بات کا تہیہ کئے ہوئے ہے کہ چاہے کچھ ہو جائے مگر جرمنی کا مقصد پورا نہ ہونے پائے۔

اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ مسٹر روزویلٹ اور مسٹر چرچل کے درمیان ہندوستان کے مسئلہ کے متعلق بھی تبادلۂ خیال ہوا ہوگا۔ ان دنوں صدرِ امریکہ کے پاس اُن کے خاص قائم مقام مسٹر جانسن بھی موجود تھے جو سر اسٹیفورڈ کرپس کے زمانہ میں ہندوستان میں مقیم تھے اور ہمارے قوم پرست لیڈروں سے بالمشافہ بات چیت کر چکے ہیں مگر اسکے متعلق وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے۔ برٹش گورنمنٹ بظاہر حالات کا مطالعہ کر رہی ہے اور کرپس مشن کی ناکامیابی کے بعد وزیرِ ہند کئی مرتبہ اس بات کو دُہرا چکے ہیں کہ برٹش گورنمنٹ اپنے اعلان کردہ اصولوں پر قائم ہے اور رہیگی لیکن فی الحال از خود کوئی نئی بات چیت کرنے کیلئے تیار نہیں ہے۔ اس خشک اور غیر مفید اعلان کے بعد سب سے اہم واقعہ صاحب گورنر جنرل کی انتظامی کونسل کی مزید توسیع ہے۔ یعنی اب اس کونسل کے ممبروں کی تعداد گیارہ سے پندرہ کر دی گئی ہے اور برٹش گورنمنٹ کی تاریخ میں پہلی مرتبہ سکھ، پست اقوام اور یوریشین جماعت کے قائم مقام باضابطہ طور پر کونسل میں شامل کئے گئے ہیں اور ڈیفنس کا محکمہ جنگی محکمہ سے علیحدہ قائم کیا گیا ہے اور یہ پہلی دفعہ ہندوستانی ممبر کے چارج میں دیا گیا ہے۔ سر مدلیار اور جام صاحب نوانگر جنگی وزارت اور بحرالکاہل کی جنگی کونسل کے ممبر مقرر کر کے انگلستان بھیجے گئے ہیں مگر سر مدلیار بدستور ایگزیکیٹو کونسل کے ممبر بنے رہیں گے۔

نئے ممبروں میں وائسرائے کی نظرِ انتخاب نے سر پی سی راما سوامی۔ سر جے۔ پی سریواستو یہ۔ سر محمد عثمان۔ سر جگیندر سنگھ۔ ڈاکٹر امبیدکار اور سر ای۔ سی بنتھال جیسے لایق اور تجربہ کار لیڈروں کو اپنی کونسل میں شامل کر لیا ہے۔ اور مدراس بمبئی بنگال پنجاب صوبہ متحدہ اور صوبہ متوسط سب کی نمایندگی بھی ہو گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سب ممبر اپنی اپنی جگہ معزز قابل۔ با اثر اور چیدہ لوگ ہیں لیکن اصولی حیثیت سے ابھی تک کونسل کی ساخت میں فرق نہیں ہوا ہے چنانچہ جنگی محکمہ کے علاوہ مالی اور ریلوے کے محکمے ابھی تک انگریز افسروں ہی کے ماتحت رکھے گئے ہیں۔ بہرحال ملک میں اس توسیع کا کسی خاص جوش و خروش سے استقبال نہیں کیا گیا ہے۔ کانگریس اور لیگ سے قطع نظر رائٹ آنریبل ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو نے بھی اس توسیع کو قابلِ اطمینان نہیں سمجھا ہے۔ اس بات سے بھی لوگوں کو مایوسی ہوئی ہے کہ توسیع شدہ کونسل کا کوئی ہندوستانی ممبر ریلوے کا انچارج نہیں بنایا گیا، سر ای۔ سی بنتھال جو اس کے افسر اعلیٰ مقرر ہوئے ہیں ایک مشہور و معروف انگریز تاجر ہیں جنکو سودیشی تجارت سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ مجموعی حیثیت سے نئی کونسل کے ہندوستانی اور یوروپین ممبروں کی تعداد میں دو اور ایک کا تناسب ہے۔ ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے اس کونسل کو قومی وزارت کا درجہ نہیں دیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ آئندہ بھی کل اختیارات حضور وائسرائے ہی کے ہاتھ میں رہیں گے اور وہ خود ہر معاملے میں صاحب وزیرِ ہند کے دستِ نگر ہونگے۔ عرصہ ہوا لارڈ کرزن نے اپنے وائسرائیٹی کے زمانے میں برٹش گورنمنٹ کے دخل در معقولات سے آزادی چاہی تھی، لیکن اُن کا یہ مطالبہ منظور نہیں کیا گیا تھا اور ابھی تک ذرا ذرا سی بات میں وزیرِ ہند ہی کو کلی اختیارات حاصل ہیں۔ اور کسی اہم معاملے میں وائسرائے یہ اختیار خود کوئی نیا قدم اٹھا نہیں سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں کونسلروں کے اختیارات خواہ مخواہ محدود ہونگے۔ چنانچہ سر جگدیش پرشاد جو انڈین سول سروس کے ایک ممتاز ترین رکن ہیں اور سالہا سال تک وائسرائے کی کونسل کے ممبر رہ چکے ہیں اس بات کی علانیہ شکایت کر چکے ہیں کہ ممبران کونسل کے اختیارات بہت محدود ہیں

یہ توسیع کونسل ملک کو اگست ۱۹۴۰ء کی پیشکش سے آگے نہیں بڑھا سکی۔ اور کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کے رویہ میں اس سے کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔ ظاہر ہے کہ اس وقت یہی دونوں ملک کی سب سے اہم اور سب سے بڑی سیاسی جماعتیں ہیں ان دونوں کا باہمی نفاق بھی ابھی تک قائم ہے۔ اور گو مسٹر راجہ گوپال اچاریہ سابق وزیرِ اعظم مدراس نے مسٹر جناح کے مطالبے کی حمایت کر کے اپنے کانگریسی رفیقوں کی بُرائی لینے کے علاوہ تمام قوم پرست مسلم لیڈروں کی پوزیشن نازک بنا دی لیکن مسٹر جناح کے رویہ میں اس وقت تک کوئی قابلِ ذکر فرق نہیں آیا ہے۔ البتہ بنگال اور پنجاب میں حال میں جو واقعات رونما ہو رہے ہیں اُن سے مسٹر ممدوح اور مسلم لیگ دونوں کو کافی صدمہ پہونچے گا۔ صوبہ بنگال میں مسٹر فضل الحق وزیرِ اعظم نے کئی ماہ ہوئے مسلم لیگ کے خلاف علانیہ علمِ بغاوت بلند کر دیا ہے۔ اور اپنی وزارت کو نئے سر سے ہندو مسلمانوں کے اتفاق و اتحاد کے اصول پر ترتیب دیا ہے چنانچہ وہ پہلے سے کہیں زیادہ کامیاب اور ہر دلعزیز ہو گئے ہیں۔ پنجاب میں سر سکندر حیات نے مسٹر جناح اور دیگر ارکان لیگ سے کوئی مشورہ کئے بغیر سکھوں سے قابلِ قدر سمجھوتہ کر لیا ہے مجلس وزارت میں بھی سکھوں کی رائے سے تبدیلی کر لی ہے۔ اس سمجھوتہ کی رُو سے سکھوں کی کئی پرانی شکایتیں جو انھیں قومی حیثیت سے سر سکندر حیات کی وزارت سے تھیں رفع ہو گئی ہیں۔ اب سر ممدوح پنجاب کے تجارت پیشہ لوگوں کی شکایتیں دور کرنے کی طرف بھی متوجہ ہو گئے ہیں اور آپ عنقریب ہی ہندو لیڈروں کی رفعِ شکایات کا بھی ارادہ رکھتے ہیں۔ ہم کو افسوس ہے کہ بعض سربرآوردہ ہندو اخبارات نے سر سکندر کی ان مفید ملک کوششوں کو

خواہ مخواہ شک و شبہ کی نظر سے دیکھا مگر مسٹر ساورکار صدر ہندو مہاسبھا نے اس مصالحانہ کوشش اپنے دلی اطمینان کا اظہار کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سر سکندر نے یہ اہم سمجھوتہ کرکے نہ صرف اپنی وزارت کو غیر معمولی تقویت پہونچائی ہے بلکہ صوبہ اور ملک دونوں کی اہم خدمت انجام دی ہے۔ مسٹر فضل الحق بھی بنگال میں خالص فرقہ وارانہ اصولوں پر حکومت کرنے کی کوشش کر چکے ہیں۔ مگر جب انھیں یہ محسوس ہوا کہ اس راہ میں طرح طرح کی مشکلات پیدا ہونے کے علاوہ خود مسلمانان بنگال کے لئے یہ پالیسی مفید ثابت نہیں ہوئی تو انھوں نے بڑی ہمت و دلیری کے ساتھ اتحاد و اتفاق کے اصولوں پر اپنی وزارت میں تبدیلیاں کر دیں۔ ہم ان دونوں باتوں کو بہت بڑی اہمیت دیتے ہیں اور دل سے خواہشمند ہیں کہ عام طور پر تمام ملک میں ان اصولوں کی تقلید کی جائے۔

اس ماہ کئی نامور لیڈر ملک کو داغ مفارقت دے گئے سر ابراہیم رحمت اللہ ملک کے مُسن و معمّر رہنماؤں میں تھے۔ تعلیم و تربیت دونوں لحاظ سے وہ ایک تجربہ کار اور محب وطن کاروباری شخص تھے۔ شاید اسی وجہ سے وہ انگریز افسروں پر آسانی سے حاوی رہتے تھے۔ کہتے ہیں کہ بمبئی گورنمنٹ کے رکن کی حیثیت سے وہ اپنے سکریٹریوں کی سب باتیں توجہ سے سننے کے بعد ہمیشہ اپنے فیصلہ پر قائم رہتے تھے اور ان کے تمام اعتراضات کو صرف یہ کہکر ختم کر دیتے تھے کہ "ایک تجربہ کار کاروباری کی حیثیت سے میں کہہ سکتا ہوں کہ جو رائے میں نے قائم کی ہے اُسی کے بموجب کام ہو سکتا ہے"۔ سر رحمت اللہ ایک راسخ الخیال مسلمان ہونے کے باوجود مسلمانوں کے لئے ہندوؤں سے متحد و متفق ہوکر رہنے کے بڑے قائل تھے۔ چنانچہ بمبئی کے تمام اردو مدارس میں انھوں نے مقامی زبان کی تعلیم لازمی قرار دینے کی زبردست حمایت کی۔ وہ متحدہ ہندوستان اور بااثر مرکزی حکومت کے بھی سرگرم حامی تھے۔ غرض آپ اپنے وقت کے بہت بڑے محب وطن تھے۔

۵۲ سال کی عمر میں ڈاکٹر راگھویندر راؤ ممبر ایگزیکٹو کونسل گورنمنٹ ہند کی وفات ایک ملکی سانحہ ہے۔ آپ صوبہ متوسط کے اگزیکٹو کونسلر اور قائم مقام گورنر بھی رہ چکے تھے۔ اس کے بعد وہ وزیر ہند کے مشیر ہوکر لندن گئے مگر تھوڑے عرصہ کے بعد لارڈ لنلتھگو نے ان کو گورنمنٹ ہند کا سول ڈیفنس ممبر بناکر ہندوستان واپس بلا لیا۔ ہندوستان آکر ان کی صحت اچھی نہیں رہی پھر بھی انھوں نے اپنے محکمہ کا کام بڑی مستعدی اور سرگرمی سے انجام دیا۔ آپ کسی زمانہ میں کانگریس کے پُرجوش ممبر اور سودیشی تحریک کے بڑے زبردست حامی تھے، چنانچہ گورنری صوبہ متوسط اور اگزیکٹو کونسلری گورنمنٹ ہند کے زمانہ میں بھی آپ خالص کھدر پوش رہے۔ افواہ تو یہ ہے کہ جب سر اسٹیفورڈ کرپس ہندوستان آئے تو آپ نے ان سے ملکی اختیارات کے متعلق بہت صاف صاف گفتگو کی جس کو سر ممدوح نے پسند نہیں کیا۔ لیکن آپ نے ملکی حقوق کی وکالت میں اس کی کوئی پرواہ نہ کی۔ بہرحال آپ ایک سرگرم اور بےخوف محب وطن تھے۔ ان کی ناوقت وفات ملک اور گورنمنٹ ہند دونوں کے لئے ایک ناقابل تلافی صدمہ ہے۔

نوٹ - ششماہی جلد جنوری لغایت جون ۱۹۴۲ء کی فہرست مضامین اس پرچہ کے ساتھ شایع ہو رہی ہے۔ قدردانان زمانہ اسے احتیاط سے اپنی جلدوں کے ساتھ محفوظ کرلیں۔ افسوس ہے کہ کاغذ کی کمیابی اور مطبع کی بےتوجہی سے تاخیر اشاعت کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے جس کے واسطے ہم ایک مرتبہ پھر ناظرین زمانہ سے عذرخواہ ہیں ——— **منیجر**

فہرست مضامین زمانہ جلد ۷۸ جنوری لغایت جون ۱۹۴۲ء

تصویر:- پنڈت آنند نراین مُلّا

(حصۂ نثر)

(حصۂ نظم)

زمانہ

جلد ۷۹ | اگست ۱۹۴۲ء | نمبر ۲

مغل یا تاتاری

(۶۱۷ قبل مسیح سے ۱۸۵۷ عیسوی تک)

(از قادری محمد شبیر احمد علوی ناظر کاکوروی۔ بی۔ اے)

مغلوں کی ابتدائی تاریخ تقریباً مفقود ہے، کوئی مستقل تاریخ ایسی نہیں ہے جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ یہ مغل کیوں کہلائے اور ان کی کیا عمرانی و سیاسی حیثیت تھی، اُن کے رسم و رواج کیا تھے۔ جہاں تک معلوم ہوا ہے مانگ (ماغ) کے معنی بہادر کے ہیں، اسی لفظ سے اس مشہور خاندان کی ابتدا ہوئی جو قرون وسطیٰ میں مغل اعظم کے نام سے تعبیر کیے گئے۔

ہم کو چین کے کیانگ خاندان کی تاریخ میں پہلی بار ایک جنگجو قبیلہ کا حال ملتا ہے جو ۶۱۷ قبل مسیح سے ۱۹۰ء تک حکمران رہا۔ یہ لوگ منگولیا کے باشندے تھے جہاں پہاڑیاں اور ریگستان ہیں، اسی لئے یہ خانہ بدوش قبائل اپنے مویشیوں کے گلّے چرانے کے لئے دوسرے شاداب ممالک میں چلے جایا کرتے تھے۔ چین میں پہلی بار ان کو اجیر سپاہیوں کی حیثیت سے بھرتی کیا گیا، جس سے اس خانہ بدوش قبیلہ میں جنگی اسپرٹ پیدا ہو گئی، اور یہ لوگ گھومتے پھرتے اور غارت گری کرتے رہے۔

ترکوں کے قراخطائی قبیلہ کے زوال کے بعد جنھیں علاؤ الدین خوارزم شاہ نے شکست دی تھی یہ لوگ مہذّب دنیا کے لئے مستقل مصیبت بن گئے۔ اس سے قبل یہ لوگ ریگستان ہی میں رہتے تھے اور دنیا اُن کے مظالم کی ہوش رُبا داستانوں سے باخبر نہ تھی، لیکن اس شکست کے بعد ہی ایک فتنۂ تاتاری اس زور سے اُٹھا کہ دنیا کا شیرازہ منتشر ہو گیا اور تاتار سے خراسان تک بلکہ شام کے حدود تک تمام ممالک بے چراغ ہو گئے، کم و بیش چالیس لاکھ

نفوس کے خونِ ناحق سے زمین لالہ زار بنی۔ سیکڑوں ہزاروں شہر خاک ہو گئے، مدرسوں اور خانقاہوں کی اینٹ سے اینٹ بج گئی، علمی خزانوں کا ورق ورق اُلٹ گیا۔ لیکن اسلام بقول مولانا شبلی کچھ ایسا سخت جان تھا کہ ان ہنگاموں پر بھی زندہ بچ گیا۔ تورہ چنگیز خانی سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ بدھ مذہب کے پیرو اور مہاین فرقہ سے تعلق رکھتے تھے، لیکن اس مذہب کا اثر ان پر برائے نام تھا کیونکہ وہ اوہام میں مبتلا ہو کر اجرام سماوی کی پرستش کرتے تھے لیکن بایں ہمہ وہ خصوصیت سے بہادر اور جفاکش تھے، قومیت کا اُن کو بہت خیال رہتا تھا، چنانچہ فرقہ وارانہ تعصب بھی ان میں بہت تھا۔ اُن کے سردار قبیلہ کو "خان" کہتے تھے اور جو کچھ وہ کہتا وہ مذہبی احکام و روایات سے بھی زیادہ وقیع تصور کیا جاتا۔ مذہب قانونی حیثیت رکھتا تھا، لیکن اُن کا فوجی نظام بہت مکمل تھا اور وہ لوگ فوجی قوانین کے تحت حسب ذیل کمیشنوں میں منقسم تھے:۔

امیران دہ۔ امیران صدہ۔ امیران ہزار اور امیران تمان۔

۶۱۷ ہجری میں چنگیز خاں ایک غارت گر کی شان سے اُٹھا اور فوری انتظامات کے لئے کچھ قواعد و ضوابط مرتب کر لئے جو تورہ چنگیز خانی کے نام سے اب بھی مشہور ہیں۔ چنگیز اور اس کے جانشینوں نے جو ناقابل تحریر مظالم انسانیت پر توڑے اُن سے دنیا بخوبی واقف ہے۔ جو شخص ان کا مزاحم ہوا انھوں نے بلا خیال جنس، عمر و مرتبہ بے دریغ موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ اُن کو کشت و خون کا کچھ ایسا شوق تھا اور اُنھوں نے اس قدر جانیں تلف کیں کہ انسانی قتل انھیں کھیل معلوم ہونے لگا۔ چنانچہ ایک شہر میں غارت گری و آتش زدگی کے بعد جو مصیبت زدہ جوان اور ضعیف العمر عورتیں رہ گئیں اُنھیں ایک میدان میں برہنہ ہونے کا حکم دیکر ناخنوں اور دانتوں سے لڑنے کے لئے مجبور کیا گیا اور اس کے بعد ان سب کو تہ تیغ کر دیا گیا۔ ان کی خونریزی کا ایک اور واقعہ یہ ہے کہ جب والی ہرات نے بغاوت کی تو سولہ لاکھ آدمی قتل کر دیئے گئے، بخارا مسمار کر دیا گیا، پہلے شہر میں آگ لگائی گئی مساجد، خانقاہیں اور مدرسے برباد کئے گئے اور ہر طرح کی مذہبی گستاخیاں کی گئیں۔ بخارا کا ایک بدنصیب کسی نہ کسی طرح خراسان چلا گیا۔ اُس سے وہاں کے لوگوں نے سوالات کئے۔ ان سب کا ایک مختصر جواب جو اس شخص نے دیا وہ آج تک تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے کہ "مغل آئے، کھودا، جلایا، قتل کیا، لوٹا، چلے گئے اور بس۔"

ان کی باقاعدہ تاریخ یا یوں کہا جائے کہ ان کے مظالم کی مفصل روداد چنگیز خاں کے وقت سے شروع ہوتی ہے جو ۱۱۶۲ء عیسوی میں اپنی قوم کے اُصول مروجہ کے مطابق بادشاہ تسلیم کر لیا گیا۔ اس نے اپنی غارت گرانہ شان سے تاتار سے خراسان و شام تک اپنی قوت و استبدادیت کا سکہ بٹھا دیا۔ چین کے شمالی نصف حصہ اور پیکن کے مشرق میں چیچی تک مغرب میں اپنا رعب و اقتدار قائم کر کے ایک خود ساختہ حکومت

قائم کرلی۔اس کی کامیابی ایک خاص واقعہ سے متعلق ہے۔

سلطان علاءالدین خوارزم شاہ کے دربار میں اس کا ایک سفیر تھا جسے بعض غیر ذمہ دار لوگوں نے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔چنگیز خاں نے خوں بہا اور اُس شخص کو طلب کیا جس کی حکمرانی کے زمانہ میں وہ سفیر قتل کیا گیا تھا، یہاں ان ایلچیوں سے بہت بدسلوکی کی گئی اور اُن کی داڑھیاں نوچ ڈالی گئیں، جب یہ ایلچی چنگیز کے دربار میں پہونچے تو اُس کے غصّہ کی کوئی انتہا نہ رہی، اور وہ ماوراءالنہر کے خوبصورت شہروں کو مسمار و غارت کرتا ہوا دریائے آمو تک پہونچ گیا، اُس کے وحشیانہ مظالم نے خوارزم۔ بلخ خراسان، مشرقی ایران۔قندھار، غزنی۔خوجند تاشقند، لوز، بخارا، سمرقند، مرو، نیشاپور اور ہرات کو تباہ و برباد کردیا۔اس واقعہ نے چنگیز کی قوت کا دنیا میں سکّہ بٹھا دیا۔

لین پول کے قول کے مطابق امیر خسرو نے مغلوں کا مندرجہ ذیل خاکہ کھینچا ہے جو یقیناً ایک خوفناک مرقع ہے:۔

"وہ لوگ اونٹوں پر سوار ہوتے ہیں، اُن کا جسم فولاد کا ہوتا ہے، سر منڈے رہتے ہیں، آنکھیں بہت چھوٹی اور تیز ہوتی ہیں جیسے برنجی برتن میں کوئی سوراخ کردیا جائے۔اُن کے زنگ کی طرح اُن کا چمڑا بھی خوفناک ہوتا ہے۔ چہرے جسم میں ایسے لگے ہوتے ہیں گویا اُن کے گردن ہی نہیں ہے۔رخسار ملائم چمڑے کی بوتلوں کے مانند ہوتے ہیں جن میں جھریاں اور مہاسوں کی کوئی حد نہیں رہتی۔اور ان کی ناک ایسی چوڑی ہوتی ہے کہ منہ پر ناک ہی ناک معلوم ہوتی ہے۔ایک رخسار کی ہڈی سے دوسرے رخسار کی ہڈی تک ان کا منہ پھیلا رہتا ہے، اُن کے نتھنے پُرانی قبریں معلوم ہوتی ہیں جن سے لبوں تک بال لٹکے رہا کرتے ہیں۔ موچھوں کی لمبائی کی بھی کوئی حد نہیں ٹھوڑی پر برائے نام داڑھی ہوا کرتی ہے اُن کے منہ پر جو نصف سیاہ اور نصف سفید ہوتے ہیں، بال اور میل دونوں اس طرح جگہ گھیرے رہتے ہیں گویا کسی خراب زمین پر کوئی درخت اُگ آیا ہو؟"

جس زمانہ میں چنگیز خاں دنیا کو زیر و زبر کررہا تھا خواجہ فریدالدین عطار نیشاپور میں تھے۔نیشاپور کی غارتگری میں ایک مغل نے خواجہ صاحب کو پکڑکر قتل کردینا چاہا، برابر سے ایک مغل بولا ہزار دینار میں اس کو میرے ہاتھ بیچ ڈالو خواجہ صاحب نے قاتل سے کہا کہ اتنی کم قیمت پر مجھے ہرگز فروخت نہ کرنا، میری قیمت اس سے کہیں زیادہ ہے۔ اس پر ایک اور مغل آنکلا، اُس نے کہا کہ اس غلام کو میرے ہاتھ ایک توبڑہ گھاس کے معاوضہ میں بیچ ڈالو۔خواجہ صاحب نے گرفتار کرنے والے سے کہا کہ ضرور بیچ ڈالو میری قیمت اس سے بھی کم ہے۔خواجہ صاحب کی، خلاف بیانی کو وہ تمسخر سمجھا اور اُن کو شہید کردیا۔مغل نے خواجہ صاحب کو شہید تو کردیا لیکن ان کا قتل بے اثر نہیں رہ سکتا تھا چنانچہ قاتل کو جب اُن کی عظمت کا حال معلوم ہوا تو وہ توبہ کرکے مسلمان ہوگیا اور اُن کے مزار کا مجاور بن گیا اور مرتے دم تک اسی خدمت میں زندگی بسر کی۔ (ریاض العارفین)

ہندوستان میں سب سے پہلے مغلوں کا نام بارھویں صدی عیسوی کے آخری ربع میں سُنائی دیا جب وہ

اپنے مشہور سردار چنگیز کی سرکردگی میں ایک باضابطہ منظم جماعت بن گئے۔ یہ عہد اُن کے اُٹھتے ہوئے جوش اور بڑھتی ہوئی فتوحات کے لئے بہت ہی موزوں ثابت ہوا، کیونکہ اُس وقت اسلامی اتحاد میں خلل پیدا ہوگیا تھا اور مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی سلطنتیں جابجا قائم تھیں، مصر، فلسطین۔ شام میں سلطان صلاح الدین شیر دل کے جانشین حکمران تھے ایشیائے کوچک میں سلجوقیوں کا پرچم لہرا رہا تھا، بغداد میں ہارون و مامون کے نام لیوا حکومت کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ خیوا۔ بخارا اور خراسان میں بھی مستقل سلطنتیں قائم تھیں لیکن ان میں کوئی اتحاد یا اتفاق نہ تھا۔ آپس میں خانہ جنگیاں جاری تھیں، چین میں تنگ خاندان کا زوال ہوچکا تھا۔ ان تمام متمدن ملکوں میں فتنہ و فساد اور طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ چین میں منگ اور کن قبائل برسرِ حکومت تھے جنھوں نے رعایا پر ایسے سخت مظالم کئے کہ لوگوں کو آخرکار ہتھیار سنبھالنا پڑا۔ اور اُن کے سردارِ اعظم چنگیز نے سب کو ایک پرچم کے نیچے جمع کرکے کن خانوادہ کے خلاف جنگی مظاہرے شروع کردیئے، اور رفتہ رفتہ اس نئے لشکر میں خطائی، قرغیزی، اور تاتاری قبائل سب بلاتفریق و امتیاز شامل ہوگئے۔ سنہ ۱۲۱۳ء میں چنگیز نے پیکن کو تسخیر کرکے ختن۔ کاشغر۔ ترکستان بخارا۔ سمرقند کو فتح کیا۔ روسیوں نے مقابلہ کیا لیکن انھیں شکست ہوئی۔ اب مغلوں کی قسمت عروج پر تھی صرف بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑانا باقی رہ گیا تھا۔ ہندوتوں کی جنگ انھیں نے شروع کی اور یورپ کے حدود تک پہونچ گئے۔ چنگیز کا وزیر یلوچیسی بہت بڑا مدبر، علم و فضل کا سرپرست اور فنونِ لطیفہ کا عاشق تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اگر کسی مفتوحہ علاقہ کو مذہبی آزادی میسر آتی تھی تو وہ اسی کی کوشش کا نتیجہ ہوتی تھی۔ سنہ ۱۲۲۷ء میں چنگیز مرگیا، اور تھوڑے عرصہ کے لئے دنیا کو اطمینان کی سانس لینے کا موقع مل گیا۔

چنگیز خاں کے بعد اُس کا بیٹا اگدئی خاں سردار ہوا، اُس نے چین کا بقیہ ملک فتح کیا اور سنہ ۱۲۴۰ء میں پولینڈ پر حملہ کیا اور سنہ ۱۲۴۱ء میں ہنگری کو فتح کیا۔ لیکن اُسی سال اگدئی خاں کا انتقال ہوگیا ورنہ وہ پورا یورپ فتح کرلیتا سنہ ۱۲۵۱ء میں منگو خاں سردار ہوا، اُس نے اپنے بھائی قبلائی خاں کو چین کا گورنر مقرر کیا۔ سنہ ۱۲۶۰ء میں منگو خاں کا انتقال ہوگیا اور قبلائی خاں سردار تسلیم کرلیا گیا۔ سنہ ۱۲۹۴ء میں قبلائی خاں بھی دنیا سے رخصت ہوا۔ اس کی موت سے مغلوں کی استعماریت کو بہت بڑا دھکا لگا۔ اُن کا اتحاد شکست ہوگیا۔ اور ان میں بھی مختلف چھوٹی چھوٹی سلطنتیں قائم ہوگئیں۔

مغلوں کا قدیم مذہب شمنانی[1] تھا جو پہلے بودھ کی تعلیمات سے مستفید ہوا (بعض کا خیال ہے کہ وہ لامذہب تھے) مگر بعد میں توہمات کا مخزن بن گیا۔ اُن کے عروج کے وقت ہر ملت کے افراد نے اپنے دین کی تلقین کی۔ ان کے دربار میں بڑے بڑے اکابر علما و فضلا موجود رہتے تھے لیکن سب سے زیادہ ناکامی مسیحی مبلغین کو ہوئی۔ اگرچہ قبلائی خاں عیسائی نہ تھا لیکن وہ مسیحی تعلیمات کو بہت پسند کرتا تھا، اس لئے اُس نے پولو برادران کے ذریعہ سے پوپ کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ اپنے مبلغین

[1] از شمن یعنی بت پرست (ا۔ ز) [2] آتشکدہ۔ دولت شاہ۔ شعرالعجم جلد ۲۔

کو چین روانہ کیے لیکن وہ زمانہ خود یورپ کے افتراق و انشقاق کا تھا۔ کوئی پوپ تسلیم نہ کیا گیا تھا اسی لئے کوئی مبلغ یورپ سے نہ جا سکا۔

چنگیز خاں کے بعد اُس کا بیٹا اُغتائی خاں (اگدی خاں) جب اصفہان پہونچا تو اس نے فوراً قتل عام کا حکم دیدیا۔ اس زمانہ میں کمال اسمٰعیل خلاق المعانی اصفہانی (۶۲۶ھ) گوشہ نشین ہو چکے تھے اور شہر کے باہر ایک زاویہ میں رہتے تھے، چونکہ لوگ ان کا ادب کرتے تھے اور کوئی شخص ان سے تعرض نہ کرتا تھا اس لئے اکثر لوگ اپنے جواہرات وغیرہ اُن کے گھر میں لاکر بطور امانت رکھدیا کرتے تھے۔ اُن کے گھر میں ایک کنواں تھا جو اِن امانتوں کا خزانہ بن گیا تھا۔ شہر کی غارت گری میں ایک مغل اس طرف آنکلا اور ایک پرند کو غلیل سے مارنا چاہا۔ اتفاق سے زہ گیر اُڑکر کنوئیں میں جا پڑی، ترک کنوئیں میں اُترا تو زر و جواہر کا انبار دیکھکر اُس کی آنکھیں کھل گئیں، سمجھا کہ اور بھی خزانے گڑے ہونگے، کمال اسمٰعیل کو پکڑا کہ پتہ بتاؤ، انھوں نے لاعلمی ظاہر کی۔ اس نے غصہ میں آکر اُن کا خاتمہ کردیا۔ کہتے ہیں کہ مرتے وقت انھوں نے یہ رباعی کہہ کر اپنے خون سے دیوار پر لکھدی:-

دل خوں شد و شرط جانگدازی این است   در حضرت تو کمینہ بازی این است
با این ہمہ ہیچ دم نمے باید زد   شاید کہ ترا بندہ نوازی این است

ایک اور بھی رباعی ریاض الشعرا میں موجود ہے:-

این کشتہ نگر کمال اسمٰعیل است   قربان شدنش نہ از رہ تعجیل است
قربان تو شد کمال اندر رہ عشق   قربان شدن از کمال اسمٰعیل است

(آتشکدہ - دولت شاہ - شعرالعجم جلد ۲)

ہندوستان میں مغلوں کا حملہ سلطان التمش کے وقت سے شروع ہوتا ہے۔ ۶۱۸ھ میں سلطان جلال الدین خوارزم شاہ مغلوں سے بھاگ کر ہندوستان آیا، اور دریائے سندھ میں جبکہ وہ تازہ ۱۲ سو فٹ کی اونچائی سے گر رہا تھا نہایت بہادری اور شجاعت سے اپنا گھوڑا ڈال دیا۔ چنگیز یہ جرأت دیکھکر دنگ رہ گیا۔ ۶۳۹ ہجری میں مغلوں نے لاہور پر دوبارہ حملہ کیا۔ ملک قراقش نے جو لاہور کا حاکم تھا جب لوگوں کو اپنے موافق نہ دیکھا تو نصف شب کو لاہور سے بھاگ کر دہلی کی جانب چلا گیا اور شہر لاہور مغلوں کے مظالم کا شکار رہوا۔

سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد میں ماوراء النہر، ایران، روم و افغانستان سے بہت سے شاہزادے اور شاہزادیاں مغلوں کے خوف سے ہندوستان آکر آباد ہوئے۔ سلطان نے اِن خانماں بربادوں کو بڑی عزت سے ہندوستان میں رکھا اور اُن کے لئے متعدد محلّے دہلی میں آباد کئے۔

جمیع علما و فضلا و کملا و مشائخ و شہزادے سلطان کے بڑے بیٹے مشہور خان شہید کے مکان میں مجتمع رہتے۔ سب شہزادے دست بستہ کھڑے رہتے تھے، صرف دو شاہزادے جو تخت کے کونوں پر بیٹھتے

تھے وہ خلفائے عباسیہ کی اولاد میں تھے۔

ناصر الدین کے زمانہ میں بھی مغلوں کا حملہ ہوا، یہ حملہ بھی سخت تھا جس میں بہت کافی خوں ریزی ہوئی۔ اس حملہ کی قیادت دنیا کی بدنام ترین ہستی کے سپرد تھی جو ہلاکو کے پرہیبت نام سے آج بھی تاریخ میں بدنام ہے۔ اسی کے ہاتھوں ۲۷ جنوری ۱۲۵۸ء کو خلافت عباسیہ کا چراغ ٹھنڈا ہوا، اور علم و ہنر کا معدن، ترقی و تہذیب کا مخزن، اسلامی دنیا کا چشم و چراغ بغداد تباہ و برباد ہوا۔ دار السلام بغداد کی تباہی سے ایشیائے کوچک پر تعصب و جہالت کا اندھیرا چھا گیا۔ سعدی نے اس موقع پر نہایت مؤثر و دردانگیز مرثیہ لکھا ہے جس کا مطلع یہ ہے:-

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں بر زوال ملک معتصم امیر المومنیں

تیرھویں صدی میں ان ستم کیش کی بدولت جو تباہی و بربادی اسلامی ممالک کی ہوئی اُس کی صحیح تصویر عرب اور ایرانی مورخین نے بہت دردانگیز الفاظ میں کھینچی ہے۔ یہ حملہ مغلوں کا سخت ترین حملہ تھا جس کے آگے بخت نصر کا حملہ پھیکا پڑ گیا۔ دنیا پر بالعموم اور مسلمانوں پر بالخصوص جو مصائب نازل ہوئے اُن کا اندازہ بیان سے باہر ہے۔ علم تباہ اور عالم فنا ہو گئے۔ خراسان جو علم و فضل کا مرکز اور عالموں کا معدن تھا تباہ ہو گیا۔ وارثان علم و ہنر نذر شمشیر ہوئے، اور سائنس و ادب کا قحط الرجال پڑ گیا۔ ہلاکو نے دنیا کو خلیفہ کے وجود سے خالی کر دیا۔ تمام علمی و ادبی کارنامے یا تو نذر آتش ہو گئے یا دجلہ کی خاموش آغوش میں دفن کر دیے گئے۔ پانچ صدیوں کی محنت شاقہ سے جمع کیے ہوئے ادبی خزانے جہالت کی قربان گاہ کے بھینٹ ہو گئے۔ لیکن جہاں مغلوں نے دنیائے اسلام کو تباہ کیا وہاں اُنھوں نے باطنیوں کا بھی قلع قمع کر دیا جن کی شرارتوں نے عرصہ دراز سے دنیا کو مصیبت میں ڈال رکھا تھا۔ اسی ہلاکو نے سلطان ناصر الدین کے عہد میں (۱۲۶۰ء ۶۵۸ھ) میں ہندوستان کو ماوراء النہر سے سفارت بھیجی جس کا دہلی میں بہت بڑے تزک و اہتمام سے استقبال کیا گیا۔ قصر سفید میں ناصر الدین مغل سفیر سے ملا۔ دربار کی شان و شوکت دیکھ کر سفیر کے ہوش بجا نہ رہے۔ اکثر مورخین کا خیال ہے کہ اسی شان و شکوہ نے ہلاکو خاں کو ہندوستان آنے سے باز رکھا۔ ناصر الدین کے ابتدائی دور حکومت میں بھی ملتان کے اطراف میں مغلوں نے حملہ کیا تھا لیکن شاہی فوج کی آمد کا حال سُن کر پسپا ہو گئے تھے۔

ہلاکو کے بعد اُس کا بیٹا تگودر تخت سلطنت پر بیٹھا اور جب ترکوں اور عربوں سے اس کا میل جول بڑھا تو وہ مسلمان ہو گیا، لیکن پھر بھی مغلوں کی ایک کثیر جماعت اپنے قدیم مذہب کی پابند رہی۔

بلبن کے عہد میں ایک خوفناک حملہ ہوا جس میں اُس کا بڑا لڑکا سلطان محمد شہید ہوا۔ جسے تاریخ میں خان شہید کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ امیر خسرو اس شہزادہ کے ندیم خاص تھے۔ بلبن کے بعد ہندوستان پر چھوٹے چھوٹے حملے ہوا کیے لیکن ان کی کوئی نمایاں حیثیت نہ تھی۔ السلطان المعظم علاء الدنیا والدین ابو المظفر محمد شاہ السلا

کے سن جلوس (۱۹۔ رمضان ۶۹۵ ہجری) کے دوسرے سال امیر داؤد بادشاہ ماوراالنہر نے دریائے سندھ کو عبور کرکے گذشتہ شکستوں کا بدلہ لینے کے لئے ایک لاکھ جرّار مغلوں کے ساتھ ہندوستان پر حملہ کردیا، اور بقول برنی ان "ملعونوں" نے جس قدر دیہات تھے اُن کو جلاکر خاکستر کردیا۔ اور کوہ جرس کے گاؤں کو اس بری طرح جلایا کہ اُس کے شعلے مفصلات تک پہونچے اور ان سکان ارض کی چیخ پکار شہنشاہ المعظم کے کانوں تک پہونچی۔ علاءالدین نے الغ خاں کو مع میمنہ کے روانہ کیا۔ یہ دونوں فوجیں جالندھر کے قرب وجوار میں مقیم ہوئیں، اور ۶۹۵ ہجری کے ماہ ربیع الآخر میں (۱۲۹۶ عیسوی) میں گو مغلوں کی تعداد برنی کے الفاظ میں "چیونٹی اور ٹڈیوں" کی طرح تھی مگر ان کو شکست فاش ہوئی، اور اُن کے بیس ہزار سپاہی میدان میں کام آئے۔ باقی چوبی شکنجوں میں گرفتار کرکے دربار سلطانی میں حاضر کئے گئے جہاں وہ اُسی وقت موت کے گھاٹ اُتار دئے گئے۔

لیکن اس حملہ سے کہیں بڑھکر وہ حملہ تھا جو ۱۲۹۸ء میں قتلغ خواجہ بن داؤد خاں کی رہنمائی میں (۲۰ تمن کے ساتھ) ہندوستان پر ہوا۔ وہ دریائے سندھ کو عبور کرکے سیدھا دارالخلافت پر حملہ آور ہوا۔ اور اُس کا محاصرہ کرلیا۔ قرب وجوار کے لوگ بھاگ بھاگ کر شہر میں پناہ گزین ہوئے اور شہر ومفصلات ہر جگہ سخت بے چینی کے آثار رونما ہوگئے، تمام شہر مقفرد پناہ گزین لوگوں سے اس قدر بھرگیا کہ کسی مسجد اور سرائے میں بھی تل رکھنے کی گنجایش نہ رہی۔ شہنشاہ علاءالدین نے امراؤ ملوک کی امداد سے ایک جدید فوج بھرتی کرکے مقابلہ کے لئے بھیجی۔ بقول فرشتہ سلطان کوتوال شہر علاءالملک کو دہلی کا حاکم مقرر کرکے تین لاکھ گھوڑوں اور دو ہزار سات سو ہاتھیوں کے ساتھ سیری کے میدان میں خیمہ زن ہوا۔ چند اُمرا نے مغلوں سے صلح کرنے کا مشورہ دیا، جس کو سلطان نے سختی سے رد کردیا اور کہا کہ "اگر میں تم لوگوں کے مشوروں پر عمل کرنا شروع کردوں تو ایک دن بھی سلطنت دہلی پر حکومت نہ کرسکوں"۔

بہرحال میدان کیلی میں طرفین میں طبل جنگ بجنے لگا۔ اس جنگ میں ملک ہزبرالدین نے اس قدر مغل قتل کئے کہ فرشتہ کی روایت کے مطابق "صحرا میں اُن کی لاشوں کے انبار لگ گئے"۔ غرض مغلوں کو شکست ہوئی اور وہ میدان سے بھاگ گئے۔ ملک ہزبرالدین اٹھارہ کوس تک اُن کے تعاقب میں گیا۔ الماس بیگ نے اُس کا ساتھ نہ دیا۔ مغلوں نے راستہ میں کمین گاہ اختیار کی اور جب اُنھوں نے دیکھا کہ ہزبرالدین تن تنہا رہ گیا ہے اور کوئی امدادی فوج اُس کے عقب میں نہیں رہی تو فوراً کمین گاہوں سے نکل پڑے اور ظفر خاں پر حملہ کردیا، اور سپہدار قتلغ خواجہ نے بھی باگ موڑی ملک ہزبرالدین اُن میں پھنس گیا۔ مغلوں نے ہزبرالدین کے گھوڑے کو تیر سے مار ڈالا اور قتلغ خواجہ نے سفید جھنڈی ہلاکر ہزبرالدین سے کہا کہ تم حق نمک ادا کرچکے ہو، اب ہم تم کو تمھارے مرتبہ سے زیادہ عزت دیں گے لیکن بہادر ہزبرالدین نے یہی جواب دیا کہ "خدمت انجام دیتے ہوئے جان دینے سے زیادہ عزت کسی دوسری چیز

میں نہیں ہے" اور بہادرانہ جان دیدی۔ مغل دوبارہ جنگلوں میں پوشیدہ ہو گئے۔

سنہ ۷۰۳ھ میں ماوراءالنہر میں جب یہ خبر پہونچی کہ سلطان علاءالدین چیتوڑ پر حملہ کرنے کے لئے گیا ہے اور دارالسلطنت خالی ہے، تو طرغی مغل ایک لاکھ بیس ہزار سوار لے کر دوڑ پڑا۔ بادشاہ یہ خبر سُن کر دہلی میں آیا۔ طرغی نے جمنا کے کنارے دہلی کا محاصرہ کرلیا۔ بادشاہ کے پاس عمدہ فوج نہ تھی کیونکہ امرا بوجہ محاصرہ کے کول اور برن میں مقیم تھے۔ مغلوں نے دہلی میں گھُس کر توشہ خانہ سے غلّہ نکال لیا اور بہت فساد مچایا، بادشاہ و لشکر دونوں سیری میں خیمہ زن تھے۔ دو ماہ تک فریقین اسی طرح بغیر کسی مقابلہ کے خیمہ زن رہے۔ بالآخر طرغی ایک شب کو معہ فوج کے دہلی سے چلا گیا۔ علاءالدین کے عہد میں سنہ ۱۳۰۵ء میں علی بیگ و ترپال خواجہ (از اولاد چنگیز) ایک لاکھ چالیس ہزار سواروں کے ساتھ تبت کی راہ سے اُتر کر کوہ شوالک کے دامن سے قتل و غارت کرتے قصبات کو جلاتے اور غلاموں و لونڈیوں کی تعداد میں اضافہ کرتے ہوئے امروہہ تک پہونچ گئے۔ جب علاءالدین کو اطلاع ہوئی تو ملک نائب کافور اور غازی ملک تغلق کو لشکر گراں کے ساتھ مقابلے کے لئے بھیجا۔ امروہہ کے قریب سخت مقابلہ ہوا علی بیگ اور ترپال خواجہ زندہ گرفتار کئے گئے اور دوسرے لوگ تلوار کے گھاٹ اُترے۔ غازی ملک کو اس بہادری کے صلے میں پنجاب کی حکومت تفویض ہوئی، اور قیدیوں کو ہاتھیوں سے کچلوا ڈالا گیا اور حکم دیا گیا کہ سیری کے برج میں مغلوں کے سروں کو بجائے پتھر کے استعمال کیا جائے۔ اور اُن کا خون اور ہڈیاں جدید عمارتوں میں ملبے کے بجائے استعمال ہو۔ اس سے مغلوں پر کافی ہیبت طاری ہوگئی اور وہ عرصہ تک ہندوستان پر حملہ آور نہ ہوئے۔

(۲)

ساتویں صدی ہجری کے آخر میں چنگیز خاں کے دارالسلطنت قراقورم میں اس کے بڑے بھائی اوغستان خاں کی اولاد کے بعد تولی خاں چنگیزی کی فرمانروائی تھی۔ اسی زمانہ میں اُن کے قبضہ میں مشرقی ترکستان اور منگولیا کے قدیم ملک کے علاوہ چین کا تمام ملک بھی آگیا تھا۔ چین کی مشہور نہر انھیں لوگوں کی یادگار ہے۔ چین کی فتح کے بعد ان لوگوں نے ایک نیا شہر بالیغ کے نام سے آباد کیا اور قراقورم کے بجائے اُس کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ اُس وقت تک جبکہ سنہ ۱۳۶۸ء ہجری میں چینیوں نے اُن کی حکومت کا خاتمہ کرکے اپنی حکومت قائم کی وہ دوسرے چنگیزی قبیلوں سے بے تعلق رہے۔ ان لوگوں کے دربار میں امیر احمد بناکتی مولانا بہاءالدین بخاری، قاضی علاءالدین طوسی، مولانا بدرالدین بیہقی اور مولانا حمیدالدین سمرقندی وغیرہ اکثر مسلمان سرکاری عہدوں پر فائز رہے لیکن

۱؎ لڑائی کا مقام بحث طلب ہے۔ الیٹ ڈاسن نے جلد سوم صفحہ ۱۶۲ میں اس کو جالندھر کے مضافات میں لکھا ہے اور ضیاءالدین برنی نے فیروز شاہی میں جار مجھور لکھا ہے۔ جرن مہجور طبقاتِ اکبری میں ہے اور جرن منجور بدایونی میں ہے اور فرشتہ نے اس مقام کو لاہور بتلایا ہے بہرحال فرشتہ یقیناً غلط ہے۔ جرن مہجور، جرن منجور، جار مجھور اور جرن مہجور چونکہ جالندھر سے ملتے جلتے ہیں ممکن ہے کہ وہ جالندھر ہو۔

۲؎ ۲۰ تمن = ۲ لاکھ۔ فرشتہ صفحہ ۱۰۴ نولکشوری

یہ شاخ دولتِ اسلام سے محروم رہی اور ان میں کوئی بادشاہ مسلمان نہ ہوا۔
ہرات میں چنگیزی مغلوں کا عزیز ایک مغل خاندان برسرِ حکومت تھا، قندھار و غزنی پر بھی مغل حکمران تھے۔ ہرات و غزنی کے دونوں خاندان فرمانروائے ایران کے ماتحت تھے اور ماوراء النہر یعنی سمرقند و بخارا کے علاقہ میں چنگیز خاں کے بیٹے چغتائی خاں کی اولاد برسرِ حکومت تھی۔ ایران، خراسان، عراق، آذربائیجان، کردستان تولی خاں کے بیٹے ہلاکو خاں کے قبضہ میں تھے۔ اس سلطنت کو سلطنت ایران کہا جاتا تھا۔ اسی حکومت میں ایشیائے کوچک کا وہ حصہ بھی شامل تھا جو آج کل اناطولیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مشرقی ترکستان کے بعض اضلاع دشت قبچاق، ماسکو تک اور کبھی کبھی آذربائیجان کا صوبہ بھی شامل ہو جایا کرتا تھا، یہ حکومت جوجی خاں کے تصرف میں تھی۔
ایشیائے کوچک کے مغربی حصہ کو ساتویں صدی ہجری کے آخری زمانہ تک سلجوقی ترکوں نے مغلوں سے بچایا، پھر سلجوقی حکومت کی جگہ عثمانی دولت (۶۹۹ھ) میں شروع ہوئی جو بہت ہی جلد ایک طاقتور سلطنت بن کر یورپ کے وسطی حصہ تک پھیل گئی۔ شام کے علاقہ پر ہلاکو خاں کی اولاد بار بار حملے کرتی رہی اور جس طرح ہلاکو خاں مصر کی مملوکی سلطنت کے مقابلہ میں ناکام رہا تھا اسی طرح اس کی اولاد بھی ہمیشہ مصریوں سے شکست کھاتی رہی۔ ہندوستان میں خلجیہ سلطنت اور مغلوں کی حکومت کے درمیان دریائے سندھ حدِ فاصل بنا ہوا تھا۔ ہندوستان پر غزنی۔ ہرات۔ ایران کی مغلیہ حکومتوں کے اکثر حملے ہوا کرتے تھے لیکن ان کو ہمیشہ ناکامی ہوئی۔ ہلاکو کی اولاد میں نکودار ہی نے اپنے وزیر خواجہ شمس الدین کی ترغیب و تحریک سے مذہب اسلام قبول کیا، اور سلطان احمد خاں کے لقب سے ملقب ہوا (۶۸۱ھ) اس کے مسلمان ہوتے ہی اس کے بھتیجے ارغون خاں نے جو خراسان کا حاکم تھا اس کے خلاف سازش شروع کر دی اور مغل سرداروں نے اس کا ساتھ دیا کیونکہ ان کے مقدس احکام "تورہ چنگیزی" پر عمل درآمد نہ رہا تھا۔ اس لئے ۶۸۳ھ میں احمد خاں کو شہید کیا گیا اور ارغون خاں (ابن اباخان ابن ہلاکو) تخت نشین ہوا جس نے خواجہ شمس الدین کو بھی اسی جرم میں شہید کر دیا۔ اور بوقا نامی ایک شخص کو وزیر بنایا، بعد میں اس وزیر کی شرارتوں سے واقف ہو کر اس کو بھی قتل کر دیا اور ایک یہودی کو سعد الدولہ کا خطاب دیکر وزیر اعظم بنایا، جس نے جا بجا مسلمان علماء کو قتل کیا سعد اللہ کہنے کو تو یہودی تھا لیکن دراصل وہ عیسائی اور مسیحی جماعت کا زبردست حامی تھا۔ چونکہ مغل مسلمانوں کا خون بہانے سے بہت خوش ہوتے تھے اس لئے بہت سے عیسائی یہودی ان متعصب مغلوں کے دربار میں جمع ہو گئے۔ اسی طرح گجرات و دکن کے ہندو بھی اُن کو اپنا نجات دہندہ بتاتے اور سلطنت اسلامیہ کو ان کے ہاتھوں تہس نہس کرانے کے لئے اُن کے دربار میں پہونچے۔ ارغون خاں ہندوؤں کی جانب بہت مائل تھا۔ چنانچہ کتاب اوسماق مغول کا اقتباس حسب ذیل ہے:۔

"وارغون اعتقادے بہ جوگیان ہند وطریقۂ ایشاں پیدا کردہ بود، جوگی آمدہ اُورا گفت کہ معجونے می سازم کہ از اثراو عمر دراز شود و ارغو خاں در فریب اُو آمدہ آں معجون بوقلموں خورد و مدتے مداومت نمود، مرضے پیدا کرد و خواجہ امین الدین طبیب دوائے او نمود مرض رو بہ انحطاط آورد جوگی مذکور سرجام شراب بوے داد ومرض بار دگر عود نمود" [1] (آئینۂ حقیقت نما ص۲۶۴)

ارغون خان حجاز پر حملہ کرکے خانۂ کعبہ کو منہدم کرنے کا فیصلہ کرچکا تھا کہ بیمار ہوکر ہفت سالہ حکومت کے بعد ۶۹۰ہجری میں فوت ہوا۔ سرجان مالکم اپنی تاریخ ایران میں رقمطراز ہیں کہ:-

"اس (سعد الدولہ) وزیر کو بادشاہ پر بہت اختیار تھا اور عیسائیوں کی پاسداری کرتا تھا۔ اور اُن کی بہت خدمت کرتا تھا۔ لیکن مسلمانوں سے اُس کو قلبی عداوت تھی حتیٰ کہ جملہ اہل اسلام عہدہ داروں کو معزول کردیا اور اُنھیں دربار میں آنے کی ممانعت کردی۔ پوپ نکلسن چہارم نے ایک طویل خط میں اُس کا شکریہ ادا کیا۔ مسلمانوں کو بہت خدشہ تھا کہ مبادا خانۂ کعبہ "کلیسا" بن جائے، عیسائیوں کے لئے بہت سے مراعات تھے۔"

ارغو خاں کے بعد اُس کا بھائی گیخاتو خان ممالک ایران وخراسان کا فرمانروا ہوا اور اُس نے ۱۳ میں کاغذ کا سکہ جاری کیا، اُسی کی نقل محمد تغلق نے ہندوستان میں کی تھی۔

ارغو خاں کا بیٹا غازان خاں جو خراسان کا گورنر تھا ۶۹۴ھ میں امیر نوروز (مغل) نے حضرت شیخ الاسلام مولانا صدر الدین حموی کی تحریک وتبلیغ سے اسلام قبول کیا۔ چنانچہ ماوراء النہر میں اسلام زور پکڑنے لگا۔ ایسا کی تحریک سے غازان خان بھی مسلمان ہوگیا۔ اسی سال غازان خان نے تخت سلطنت حاصل کیا جس سے اسلام کی قوت اور بھی بڑھ گئی۔ امیر نوروز کو خراسان کی گورنری عطا ہوئی۔ خراسانیوں کی صحبت کی وجہ سے اُس نے شیعہ جماعت کو ترجیح دی اور سنّیوں پر مظالم ڈھائے۔ مگر غازان خاں محض برائے نام مسلمان تھا اور ارکان دین کا پابند نہ تھا اور مغلوں کی قوم عموماً غیر مسلم تھی۔

غازان خاں نے سلطان مصر کے مقابلہ میں فوج بھیجی اور ہندوستان میں تغلغ خواجہ کو ایک لشکر جرار روانہ کیا۔ لیکن یہ واقعات ۶۹۸ھ سے ۶۹۹ھ تک کے ہیں۔ سرجان مالکم کا خیال ہے کہ غازان نے تورہ چنگیزی کو دوبارہ رائج کیا۔ اسلام سے اُس کو دلی نفرت تھی لیکن ایران پر قبضہ کرنے کے لئے اُس نے ظاہرہ اسلام اختیار کرلیا۔ ورنہ مصر وشام پر اُس نے محض اس لئے حملہ کیا کہ مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دے اور اسی پوپ ہشتم سے مسلمانوں کے خلاف امداد مانگی۔ چنانچہ عیسائی بادشاہوں نے حسب الحکم پوپ ہشتم شام کے حملہ میں اُس کی امداد کی۔ سرجان مالکم کا خیال ہے کہ "وہ جب تک جیا عیسوی مذہب کا معتقد رہا مگر یہ بات بھی نا معلوم ہے کہ اُس نے کھلم کھلا عیسائی ہونے کا اعتراف کیا۔"

غازان خاں نے ۷۰۲ھ میں دوبارہ شام و مصر پر حملہ کیا۔ اس بار مغلیہ سپاہ حلب تک پہونچ گئی لیکن
عباسی خلیفہ ابوالربیع مستکفی باللہ اور ملک الناصر سلطان مصر دونوں مغلوں کے مقابلے کو آئے اور شکست فاش
دیکر حملہ آوروں کو بھگا دیا۔ اسی ندامت میں غازان خاں ۷۰۳ھ میں مرگیا۔ اُس کے بعد اُس کا بھائی ایتو الجی
جو غازان خاں کی طرح برائے نام مسلمان تھا محمد خدابندہ کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ خدابندہ نے حقیقتاً
ابومسلم خراسانی استاجیس آذربائیجانی، ابن مقنع بدخشانی، حسن بن صباح قہستانی کی ناکامیوں کا بدلہ لینا
شروع کیا۔ محمد خدابندہ نے حکم جاری کیا کہ حکومت میں کوئی شخص حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ اور اہلبیت کے سوا
دوسرا نام نہ لے۔ خطبہ میں کسی دوسرے صحابی کا نام نہ لیا جائے۔ وہ خود ارکان مذہب سے ناآشنائے محض تھا
اور اپنے احکام کی خلاف ورزی کرنے والوں کو قتل کر دیتا تھا، چنانچہ اُس وقت سے تفضیلیت جس کو بعد میں
شیعیت کے نام سے تعبیر کیا گیا، اور سُنّیوں میں بہت بڑی خلیج حائل ہوتی گئی۔ اس حکم پر اُس کے بعد بھی عرصہ
تک سختی سے عملدرآمد ہوا کیا۔ ایران۔ خراسان۔ فارس۔ آذربائیجان۔ کردستان۔ عراق۔ سیستان میں مغلوں
کی خون آشامی خون کے دریا بہاتی رہی جس سے محبت و اخوت کے بجائے فریقین میں تعصب پیدا ہو گیا۔ سر جان مالکم اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ:-

"ایران کے باشندوں میں شیعوں کے مذہب کو ظاہر کرنے والا اور ترقی دینے والا یہی تھا کیونکہ جو سکہ اُس نے
مضروب کیا اُس پر بارہ ۱۲ اماموں کے نام تھے۔"

۷۱۱ھ میں اُس نے سلطان مصر کے خلاف ایک جنگی مظاہرہ کیا اور اسی سلسلہ میں شام پر حملہ کیا۔ اور بیمان مغول میں اس حملہ کا ذکر اسطرح کرتے ہیں:

"ونوشتہ اند کہ دریں یورش پنجاہ ہزار دینار درکار تیاری مجانیق صرف شدہ بود و ہزار و پانصد زرہ از دیار
فرنگ آوردہ بودند و دولیست و شصت سر اسپ با چلیپائے اطلس و زینہائے زریں و دو ہزار و پانصد اشتر
جہت تغییر سامان و نود چرخ دور انداز و یازدہ ہزار خروار تیر پولاد و صد خروار قارورۂ نفت و صد خروار
کوس و سی صد و شصت مرد نقاب با کلہائے تیز منقار و پنجاہ ہزار پوست جہت گزارنیدن احمال و اثقال
از دیار مرتب شدہ بودند ...." (آئینہ حقیقت نما صـ ۶۸)

شام میں ان خبروں نے تہلکا ڈال دیا۔ مصر کا بادشاہ ملک الناصر حملہ کے لئے تیار نہ تھا۔ ایشیائے کوچک
اور ماوراء النہر کی کوئی حکومت محمد خدابندہ (ایجاتیو) کے مد مقابل نہ تھی۔ اُس زمانہ میں ابن تیمیہ (امام) نے بڑا کام
لیا کہ دمشق و شام و مصر میں جاکر اس جدید فتنہ کے سدِ باب کے لئے لوگوں کو آمادہ کیا، کیونکہ اُس وقت شیعیت
وسنیت کا مسئلہ نہ تھا بلکہ جاہل متعصب غیر مسلم مغل اپنی پیہم شکستوں کا بدلہ مسلمان حکمرانوں سے اس طرح
لے رہے تھے کہ دنیا نے ہلاکو کے مظالم کو فراموش کر دیا۔ اس موقعہ پر کپک خان والی ماوراء النہر نے بھی ساتھ دیا اور محمد خدابندہ
کو شکست فاش ہوئی اور اس اتحاد نے مغلوں کو بہت عرصہ کے لئے خاموش کر دیا۔ خراسان کے علاقہ قندھار، غزنی

وغیرہ چغتائی حکومت (کیبک خاں چغتائی) میں آ گئے اور ہرات بھی ایران کی سیادت سے آزاد ہو گیا۔ ۷۱۶ھ میں الجایتو (محمد خدا بندہ) کا انتقال ہوا اور اُس کا بڑا لڑکا سلطان ابوسعید بہادر خاں (عمر ۱۲ سال) دار السلطنہ سلطانیہ میں تخت نشین ہوا۔ ابوسعید نوعمر تھا۔ امیر چوپان یلاوزی کی کوششوں سے اُس کو تخت نصیب ہوا لہٰذا اُس کو وزارت عظمیٰ اور مدار المہامی کا منصب عطا کیا گیا۔ یسور اغلی چغتائی (کیبک چغتائی کا بھائی) سے خراسان بن امیر چوپان کا بارہا مقابلہ ہوا۔ آخر ۷۲۱ھ میں یسور کو شکست فاش ہوئی اور وہ اس صدمہ سے جانبر نہ ہو سکا۔ سلطنت ایران کا رنگ وہی تھا جو الجایتو کے وقت میں تھا۔ اُس کے اسلام کا اندازہ اس سے ہو سکتا کہ وہ بین الاُختین کا قائل تھا۔ یعنی دو لنڈی خانم و ساتیبک خانم (خاتون) ابوسعید کی حقیقی بہنیں بیک وقت اُس کے عقد میں تھیں۔ غرض امیر چوپان کو اور ایران و خراسان کے مغلوں کو اسلام سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ البتہ اکثر بادشاہ مسلمانوں کے سے نام رکھنے لگے تھے۔ غضب یہ ہوا کہ امیر چوپان کے ایک بیٹے نے جو اناطولیہ (ارض روم) کا گورنر تھا نبوت و مہدیت کا بھی دعویٰ کیا۔ اس کے بعد ۷۲۵ھ میں امیر چوپان سلی روزی وزیر اعظم کی بیٹی بغداد خاتون کی وجہ سے جس کی شادی امیر حسن جلائر سے ہوئی تھی اور جس پر سلطان ابوسعید عاشق ہو گیا تھا، ایسی ناگفتہ بہ باتیں پیش آئیں کہ امیر چوپان اور سلطان ابوسعید میں ناچاقی ہو گئی اور سلطان و وزیر کے دلوں میں کدورت پیدا ہو گئی ۷۲۰ھ کا پورا سال اسی طرح گزرا۔ ترمشرین خاں (ابن داؤد خان چغتائی) جو کیبک خان اور یسور اغلی کا بھائی تھا اور چغتائیوں کا سلطان اور مسلمان تھا غزنی میں فوجیں جمع کر کے خراسان و ایران پر حملہ کا ارادہ کیا۔ امیر چوپان کو جب یہ باتیں معلوم ہوئیں تو اُس نے اپنے بیٹے امیر حسن سلدوز کی سرداری میں ایک ہزار لشکر ابوسعید کو خوش کرنے اور ترمشرین خاں کو برباد کرنے کی نیت سے روانہ کیا۔ ترمشرین خان ابھی جنگی تیاریوں کو مکمل نہ کر سکا تھا کہ یکایک اُس پر حملہ ہوا۔ غزنی کے قریب ۷۲۶ھ میں لڑائی ہوئی جس میں ترمشرین خاں کو شکست ہوئی، شہر غزنی تباہ و برباد کیا گیا اور امیر حسن نے سلطان محمود غزنوی کے مقبرہ کو بھی تباہ کر دیا۔

"در حوالی غزنین امیر حسن ظفر یافتہ در غزنین قتل و غارت بسیار نمودہ حتی کہ مجاوران مقبرہ سلطان محمود غزنوی را نیز اسیر کردہ لشکر او بے ادبی ہائے بسیار با مقابر کردہ در سنہ ست و عشرین و سبعمائۃ واپس بخراسان رفت" (ادسماق منول)

بہر حال سلطان ابوسعید کی ناراضی میں اضافہ ہو گیا۔ امیر چوپان وزارت سے معزول ہوئے اور خواجہ غیاث الدین محمد ابن خواجہ رشید الدین کو منصب وزارت عطا ہوا۔ خواجہ غیاث الدین کے وزیر ہوتے ہی سنیوں کے مصائب دُور ہو گئے۔ امیر چوپان باغی ہو کر خراسان پر قابض ہو گیا مگر ۷۲۸ھ میں قتل کیا گیا۔ ۱۳ ربیع الآخر ۷۳۶ھ کو سلطان ابوسعید کا انتقال ہو گیا اور ایران و خراسان و عراق میں طوائف الملوکی پھیل گئی جو تیمور لنگ کے زمانہ تک قائم

(۳)

ترمشیرین خاں ۷۲۷ھ میں اپنی برداشتہ خاطر فوج لیکر ہندوستان کو (سلطان محمد تغلق کے عہد میں) تباہ کرنے آیا اُس وقت سلطان محمد تغلق کو تخت نشین ہوئے صرف دو سال ہوئے تھے۔ فرشتہ نے رائی کا پہاڑ بنایا ہے، لکھتا ہے:-

"ترمشیرین خاں بن داؤد خاں حاکم توراں چغتائی کہ شجاعت رستم و عدالت کسریٰ در وے جمع بود و پادشاہ مسلمان بود با سپاہ افزوں از اقطار و امطار و اوراق و اشجار قاصد تسخیر ہندوستان شدہ۔ در شہور سبع و عشرین و سبع مأتہ داخل ایں حکومت شدہ و از ملتان و ملتان تا دوازدہ دہلی تاختہ و غارت کردہ ظاہر ان معسکر خود ساخت و سلطان محمد تغلق شاہ صرفہ در مقابلہ و مقاتلہ ندیدہ از راہ عجز و نیاز در آمدہ و جمیع از اہل اعتبار را واسطہ ساختہ از نقود و جواہر آں مقدار را کہ موجب تسلی خاطر ترمشیرین خاں شود پیشکش کرد۔ .... و عرض و ناموس سلطنت خرید کردہ ترمشیرین خاں بظاہر بہ دہلی کوچ کرد لاکن بہ سمت گجرات کہ سر راہ بود نہب و غارت کردہ و مال عالم بدست و غلامان کثیر بردہ غانماً غالماً مراجعت وطن کردہ ضیائے برنی از ملاحظہ روزگار ایں واقعہ را در تاریخ خویش مرقوم نساختہ۔"

فرشتہ کی غلط بیانیوں کی کوئی انتہا نہیں ہے اول تو اُس نے سنہ غلط لکھا ہے۔ ترمشیرین خاں ۷۲۹ھ میں آیا اور اُسی سال واپس چلا گیا۔ فرشتہ نے یہ واقعہ ۷۲۷ھ میں لکھا ہے۔ عجیب تر بات یہ ہے کہ ضیاء برنی نے اس جرم کے اخفاء کی کوشش کی ہے جو ناممکن ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ترمشیرین خاں محمد تغلق سے امیر چوپان کے حملہ کے متعلق مشورہ کرنے آیا تھا اُس کو خود حملہ سے کوئی تعلق نہ تھا، ممکن ہے کہ پُرانے زمانے میں مغلوں نے جو حملے متواتر کئے تھے اُن کی یاد آ گئی ہو اور اس لئے فرشتہ نے کئی صدیوں کے بعد جدید تحقیقات کرکے محمد تغلق کے جرائم میں ایک اضافہ کر دیا ہو۔

محمد تغلق غازی ملک کا فخر اسلاف بیٹا تھا جس کے نام سے مغل کانپتے تھے وہ اس قدر آسانی سے ہتھیار ڈال کر خوشامد نہیں کر سکتا تھا۔ ترمشیرین خاں کے ساتھ محمد تغلق نے ایسا عمدہ برتاؤ کیا کہ اُس نے خراسان واپس جاکر اپنے داماد امیر نوروز کو بہت سے سرداروں کے ساتھ محمد تغلق کی امداد کیلئے بھیجا۔ چنانچہ فرشتہ خود اسکا اقرار کرتا ہے:-

"امیر نوروز خویش ترمشیرین خاں کہ بادشاہزادہ چغتائی بود با بسیارے از اُمرائے ہزارہ و صدہ بہندوستان آمدہ و ملازمت سلطان محمد شاہ اختیار کرد۔"

مغل اس واقعہ کے بعد ہندوستان میں سلطان محمد تغلق کی زندگی میں ایک بار اور آئے، یہ اُس وقت کا واقعہ ہے جب کہ محمد تغلق نے بیان قلی خاں کے وزیر اعظم امیر قزعن سے جس سے اُس کے بہت اچھے تعلقات تھے مغلوں سے امداد طلب کی ہے۔ امیر قزعن نے پانچ ہزار مغلوں کا ایک رسالہ التون بہادر کی رہنمائی میں ہندوستان بھیجا سلطان دریائے سندھ کو عبور کر رہا تھا۔ ان کو دیکھکر بہت خوش ہوا اور بہت خاطر و مدارات کی جب سلطان محمد تغلق کا انتقال ہو گیا اس

رسالہ نے امیر نوروز سے ہندوستانی امراء کی محسن کشی کے قصے سن کر اور نفسی نفسی دیکھکر اپنے ملک کو واپس جانے کا قصد کیا اور واپسی میں جو مال غنیمت ملا لوٹ لیا۔ امیر نوروز بھی سلطان کی وفات کے بعد اپنے ملک کو چلا گیا۔ انہوں نے غارت گری بھی کی اور اپنے ملک کو واپس گیا، اب عرصہ تک مغلوں کا حملہ ہندوستان پر نہ ہوا۔

آٹھویں صدی ہجری کے وسط یعنی سلطان محمد تغلق کے آخر ایام حکومت تک تمام مملکت ہند ایک مرکزی حکومت سے وابستہ اور دہلی کی سلطنت میں شامل تھی۔ پچاس سال کے بعد یعنی آٹھویں صدی ہجری کے آخر میں یہی عظیم الشان سلطنت پارہ پارہ ہو کر بہت سی خود مختار سلطنتوں میں منقسم ہو گئی۔

(۴)

مغلوں کا چنگیزی خاندان جب تک اسلام سے نا آشنا رہا برابر ہندوستان پر مغلوں کے حملے ہوتے رہے ان حملوں کو خاندان غلامان، خاندان خلجیہ اور غیاث الدین تغلق (غازی ملک) نے ہمیشہ بڑی ہمت و مستعدی سے رد کر کے مغلوں کے قدم ہندوستان میں جمنے نہ دیئے۔ اس کے بعد چنگیزی مغل مسلمان ہو کر سلطان محمد تغلق کے حلیف بن گئے اور پھر ہندوستان پر کوئی حملہ نہ کیا۔ سلطان فیروز تغلق کے عہد میں جب ہندوستان کی اسلامی حکومت پارہ پارہ ہونے والی تھی اُسی زمانہ میں مغلوں کا چنگیزی خاندان قعر مذلت میں گر کر برباد ہو گیا اور اُس کے آثار پر ایک نئی عمارت بنی۔ یہ اُن مغلوں کے اجداد تھے جنھیں آئندہ صدیوں کی ہندی دنیا نے "مغل اعظم" کے باشوکت و شکوہ لقب سے یاد کیا۔

اس نئے خاندان کے بانی کا نام تیمور تھا، جو اپنی جنگجوئی اور ملک گیری کے اعتبار سے چنگیز کا نقش ثانی تھا۔ فرق یہ تھا کہ چنگیز مسلمان نہ تھا اور تیمور (صاحبقران) مسلمان تھا۔ تیمور نے سنہ ۸۰۰ ہجری میں ہندوستان پر حملہ کیا۔ اس وقت ہندوستان کی سیاسی فضا مکدر تھی۔ تاتار خان ابن ظفر خاں نے جو نصرت شاہ کا وزیر اور پانی پت میں مقیم تھا اقبال خاں سے شکست کھا کر اور نصرت شاہ کو تنہا چھوڑ کر اپنے باپ کے پاس گجرات کی طرف چلا گیا۔ سارنگ خاں لودی حاکم دیپالپور و خضر خاں حاکم ملتان کو شکست دیکر ملتان سے بیدخل کر چکا تھا۔ خضر خاں بھاگ کر میوات کے جنگلوں میں سرگردان تھا۔ اقبال خاں لودی برادر سارنگ خاں نصرت شاہ کو دہلی سے میوات بھگا کر ناصر الدین محمود کو تنہا دہلی کا سلطان بنا چکا تھا۔ تیمور کا حملہ مسلمان مغلوں کا پہلا حملہ تھا جس میں اُن کو فتح اور کامیابی ہوئی۔ تیمور اپنی تزک میں لکھتا ہے:۔

"خبر رسید کہ ہر ہر گوشہ و ہر ہر جا در ہندوستان جداگانہ حاکم خود مختار ہستند۔ ایں خود مختار امرا صاحب تخت و تاج ہستند۔ سیہ ملتان ملو خان برادر سارنگ خان حکومت می کند و لاہور را فتح کردہ افواج جمع می کند، از ہر صوبہ ہند مدعی سلطنت موجود است"

حقیقت یہ ہے کہ اگر ہندوستان کی حکومت تہس نہس نہ ہو گئی ہوتی تو مغلوں کو اس بار بھی ناکامی ہوتی اور خاصکر ایسی حالت میں تو اُس کا ناکام رہنا یقینی تھا جس کا ذکر خود تیمور یوں کرتا ہے:۔

"چوں برائے حملۂ ہند قصد کردم فوجم و سرداران من ایں رائے را پسند نہ کردند، و از بسیار مشکل مخالفت ایشاں بہ رضامندی یا خموشی تبدیل کردم"

ہندوستان کے حملہ سے پہلے ہی ایران، خراسان، ترکستان پر اُس کی حکومت قائم ہو چکی تھی، لیکن سرداران فوج اس تجویز کو اس لئے ناپسند کرتے تھے کہ پہلے کئی بار شکستیں کھا چکے تھے۔ تیمور اپنی تزک میں یہ بھی لکھتا ہے کہ ہندوستان پر حملہ کرنا آسان نہ تھا۔ سرحدی قبائل کی طاقت بہت بڑھی ہوئی تھی، ان پر فتح حاصل کرنا مشکل تھا۔ جب موسیٰ خاں مرا اور افغانستان پر تیمور کا قبضہ ہوا اُس وقت اُس نے اپنے پوتے پیر محمد کو تیس ہزار سواروں کے ساتھ کوہ سلیمان کے درہ سے ملتان کی طرف جس پر سارنگ خاں قابض تھا، روانہ کیا۔ پیر محمد کوہ سلیمان کے لودی، لوخان اور نیازی قبائل سے لڑتا بھڑتا ملتان پہونچ گیا۔ سارنگ خاں میدان میں کام آیا۔ پیر محمد ملتان پر قابض ہو گیا، تیمور پنجاب میں داخل ہوا اور عادل خاں کو شکست ہوئی، چنانچہ لاہور پر تیمور پر قبضہ ہو گیا۔ شیخا گکھڑ اور اُسکے بھائی جسرت گکھڑ نے حاضر ہو کر اظہار نیازمندی کیا، تیمور نے لودیوں کے دشمن کی عزت افزائی کی۔

"والتفات درباره او بجد رسید کہ اگر بخشیے یا مشرے میرسیدند کہ نسبت خود بہ شیخا گکھڑی کردندے ہیچ یک از افراد عساکر منصوره را زہره آں نہ بود کہ متعرض شوند۔ (فرشتہ)

شیخا کو پنجاب کے اصلاح کی حکومت تفویض کی اور لاہور کے قلعہ میں فرشتہ (محمد قاسم) کے دادا ہندو شاہ کو اپنی طرف سے مامور کر کے تیمور ملتان کی جانب متوجہ ہوا، جہاں اُس کا پوتا مرزا پیر محمد قابض تھا۔ ۸۰۹ھ (صفر) میں تلبنہ کو غارت کرتا ہوا اجودھی (پاک پٹن) سے پچاس کوس (پنجاہ کروه) پر قلعہ بھٹنیر پر حملہ کیا۔

"راؤ مل جی کہ حاکم آنجا بود از حنا وید کفار ہند بود در قواعد سرداری و قلعداری بہتر از وے در ہندوستان کسے نبود وخود را بہادری نامید چہ بزبان ہندی بہادر را راؤ می گویند از قلعہ بر آمده در کنار شہر صف آراست۔ (فرشتہ ص ۲۲۵)

امیر تیمور صاحبقراں اجودھی میں مزار حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر کی درگاہ کی زیارت اور وہاں کے باشندوں کو امان دے کر چلا گیا۔ بھٹنیر کے راجہ کو شکست ہوئی اُس نے ایک سیّد کے ذریعہ سے جان بچالی۔ اُس نے شیخ سعدالدین نبیرۂ حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر سے سفارش کروائی، تیمور نے معاف کر دیا اور خلعت گراں بہا بھی راجہ کو عنایت کیا۔ لیکن اسی حالت میں راجہ کے بھائی اور بیٹوں نے تیمور کی سپاہ پر حملہ کر دیا، مجبوراً تیمور نے قلعہ کو مسمار کرنے کا حکم دیا چنانچہ بھٹنیر کا قلعہ مسمار کر کے خاک کے برابر کر دیا گیا۔ شہر ویران ہو گیا۔ وہاں سے سرستی فتح آباد کے قلعوں کو مسمار کر کے سامانہ پہونچا، یہاں کے سرکش جاٹوں اور راجپوتوں کو جو راہزنی میں شہرۂ آفاق تھے چُن چُن کر قتل کیا۔ اور سامانہ۔ کیتھل پہونچکر اپنے لشکر کا جائزہ لیا اور پانی پت پہونچکر لونی کے ہندوؤں کو شکست دیکر قلعہ فتح کیا۔

"ایں قلعہ لونی میان آب ہنڈون وجمن واقع شد۔ ہنڈون آبے است عمیق، سلطان فیروز مرحوم از آب آکالی بریده ودریں محل آب جمن اتصال داده واکثر متوطنان آنجا مجوس بودند۔" (فرشتہ ص ۲۲۶)

تیمور اب دہلی میں فاتحانہ داخل ہو گیا، جنگ سے پہلے ان قیدیوں کو جو تعداد میں بہت زیادہ ہو گئے تھے قتل کیا۔ عبدالقادر بدایونی کہتے ہیں کہ

"اِن قیدیوں میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی، قتل ہونے سے نہ ہندو بچے اور نہ مسلمان۔"

۷۔ ربیع الاول ۸۰۱ھ کو دہلی کے قریب معرکہ کارزار گرم ہوا، دہلی والوں کو شکست ہوئی۔ اقبال خاں دہلی میں محصور ہوگیا۔ ناصرالدین محمود گجرات کی طرف فرار ہوگیا۔ اقبال خاں بھی مجبوراً برن چلا گیا۔ تیمور پندرہ[۱۵] دن تک دہلی میں مقیم رہا، دہلی تقریباً ویران ہوگئی۔ پھر دہلی سے فیروزآباد ہوتا ہوا پانی پت پہونچا۔ میرٹھ کا قلعہ بھی اسی بار مسمار کیا گیا۔ دامن کوہ سوالک (سہارنپور کا ضلع) کو تاخت و تاراج کرتا ہوا گنگا کو عبور کرکے بجنور کے علاقہ میں داخل ہوا۔ اور وہاں سے جمّوں پر حملہ کرکے وہاں کے راجہ کو گرفتار کیا۔ اور وہ مسلمان ہوگیا۔ شیخا نے حکم عدولی کی اس لئے قتل کیا گیا اور اُس کی جگہ خضر خاں کو لاہور، دیبالپور و ملتان کا حاکم مقرر کیا گیا۔ اُس کے بھائی جسرت کو بھی گرفتار کرلیا اور کابل کے راستہ سے سمرقند چلا گیا۔ لیکن جسرت موقع پاکر قیدخانہ سے نکل بھاگا، اور پنجاب میں واپس آکر اپنے بھائی کی جگہ سردار بن گیا۔

تیمور جب ہندوستان میں تھا تو قسطنطینیہ کے عیسائی قیصر نے بایزید یلدرم کے خلاف امداد چاہی۔ عراق آذربائیجان۔ ایشیائے کوچک اور شام کے مشہور اسلامی عمارات اور آثار کو برباد کیا، مگر تیمور نے انگورہ کے مشہور تاریخی میدان میں ترکان عثمان کی بڑھتی ہوئی طاقت کو برباد ہونے اور بایزید یلدرم کو قید ہونے سے بچا دیا۔

مغلوں نے اب ہندوستان پر آخری بار ایک اور حملہ کیا، چنانچہ پانی پت کی معرکہ آرائی نے ہندوستانی حکومت کا چراغ ہمیشہ کے لئے گل کردیا۔ اور قسام ازل نے زمام سلطنت مغلوں کے ہاتھوں میں دیدی۔ ۱۵۲۶ء میں خود ہندوستانیوں نے مرزا ظہیرالدین محمد بابر کو بلایا اور تخت ہندوستان نذر کیا۔ اس کے بعد مغلوں کو ہندوستان میں ایک عارضی شکست ہوئی اور ہمایوں کچھ دنوں کے لئے ایران چلا گیا، لیکن ۱۵۵۶ء میں اس کے سپوت اکبر نے پانی پت کی دوسری لڑائی میں پانسہ پلٹ دیا۔ اور اس مغل اعظم کے وہ زریں کارنامے شروع ہوئے جن سے مہذب دنیا باخبر ہے۔ ۱۷۶۱ء میں تیسری دفعہ مغلوں کی کشتی میدان پانی پت میں گرداب بلا میں پھنسی لیکن ابھی کچھ سانس باقی تھی بچ نکلی۔ تاہم تاکے مغلیہ سلطنت ۱۸۵۷ء میں مرض الموت میں مبتلا ہوکر ہمیشہ کیلئے خاک رنگون میں روپوش ہوگئی۔

---

[۱] تیمور نے جب شیراز پر حملہ کیا تو خواجہ حافظ شیرازی کو طلب کیا اور کہا میں نے تمام عالم کو اس لئے تباہ کیا کہ سمرقند اور بخارا کو آباد کروں، تم ان کو ایک تل کے عوض دیئے ڈالتے ہو:-

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل ما را   بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

خواجہ صاحب نے کہا انھیں فضول خرچیوں کی بدولت تو اس فقر و فاقہ تک نوبت پہونچی ہے۔ (شعر العجم حصہ ۲ صفحہ ۲۰۰ مطبوعہ لکھنؤ)

[۲] عیسائی قیصر کانسٹنٹائن تھا۔ [۳] بایزید یلدرم خلافت عثمانیہ کا آٹھواں فرمانروا تھا جسکو ۱۴۰۲ء میں انگورہ (انقرہ) کے تاریخی میدان میں تیمور نے قید کرکے مغربی مصنفوں کیلئے ایک دلچسپی کا سامان مہیا کردیا۔ یہ ایک عجیب تاریخی نکتہ ہے کہ ترک ہمیشہ انگورہ میں شکست پاتے ہیں اور پھر پہلے سے زیادہ طاقتور ہوکر دنیا میں اپنی زندگی کا ثبوت دیتے ہیں۔

الٰہی! تیری دنیا میں یہ کیسا شورِ محشر ہے!

(از مسٹر ہادی حسین، انڈین سول سروس (آسام)

الٰہی! تیری دنیا میں یہ کیسا شورِ محشر ہے! 　　 یہ قوموں کا تصادم ہے کہ سیّاروں کی ٹکر ہے؟
قصورِ انساں کا ہے یا فتنۂ چرخِ ستمگر ہے؟

یہ سینے سے زمیں کے کیوں لہو کی ندیاں جاری؟ 　　 بنی ہے وہ فلک کا تختۂ مشقِ ستمگاری؟
کہ ہے بر روئے کار انسان کا ذوقِ خود آزاری؟

قتال آرا ہوئے ہیں عرصۂ پیکار میں انساں، 　　 ہیں محو اک معرکے کی جیت میں اور ہار میں انساں،
مقابل ہیں خدائے جنگ کے دربار میں انساں،

یہ اک تیغ سے سلجھائیں عقدے اُن مسائل کے 　　 نہیں منت کش حل جو محبت کے دلائل کے۔
یہی اب ہیں، یہی انداز تھے ان کے اوائل کے،

جب ہتھیار ان کے تھے تو دان کے ناخن و دنداں 　　 نہ تھی شرمندۂ تہذیب ان کی فطرتِ عریاں،
نہ یہ سیرت میں انساں تھے، نہ تھے صورت ہی میں انساں۔

ہیت کے خط و خال سے تھی ابتدا ان کی؛ 　　 بنی صدیوں میں جا کر ہیئتِ انساں نما ان کی؛
بہیمیت ہے لیکن اب بھی جزوِ اک طبع کا ان کی۔

باہم آپس کا مرنا مارنا ہے اب بھی کام اُن کا 　　 تنازع للبقا ہے ذکر و فکر صبح و شام ان کا
ہے موقوف اب بھی اوروں کی تباہی پر قیام ان کا۔

سی صورت ہے اب بھی جیرہ دستی کی عملداری، 　　 اُسی صورت ہے طاقتور کو حقِ بیکس آزاری،
وہی ہے جد و جہدِ زندگانی کی تبہ کاری

ہے فرق اتنا کہ اب لڑتے ہیں انساں عقل و حکمت سے 　　 ہیں جو شہکارِ علم و فن، اُن آلاتِ ہلاکت سے
تفنگ و توپ، زورِ زر، تدابیرِ سیاست سے۔

بنا اپنے علم و عقل سے آلاتِ شیطانی، 　　 تباہی پر تلی ہے آپ اپنی نوعِ انسانی۔
ہے عبرت کا مقام اُس کی یہ دانائی، یہ نادانی۔

عجب مجموعۂ اضداد ہے انساں کی فطرت بھی غضب کی ہے ستم ایجاد اُس کی عقل و حکمت بھی
سمجھ آتے نہیں لیکن ترے اسرارِ قدرت بھی ۔

اگر انساں کی فطرت کو تجھے ایسا بنانا تھا، اگر کام اُس کا اپنے اور پرائے کو ستانا تھا
اگر انجام اُس کا آپ اپنے کو مٹانا تھا،

تو بہتر تھا کہ، اے خالق، تری صناعئ قدرت نہ کرتی اختیار اِس شاہکارِ عجب کی صورت
نہ ہوتا ننگِ موجودات یہ اعجوبۂ خلقت،

عطا کر کے جسے تو نے شرف اپنی خلافت کا بنایا ساری دنیا کے لئے سرچشمہ آفت کا
ترے آئینے پر یہ داغ ہے زنگِ کثافت کا؛

ہے یہ اِک نقشِ نازیبا ترے تصویر خانے میں کہ ہے دستِ قضا مصروف اب جس کے مٹانے میں
تعجب ہے کہ کیا مقصود تھا اس کے بنانے میں؟

اگر مبنی ہے نیکی پر تری تسلیم آفاقی، اگر نافذ ہے اِس اقلیم میں آئینِ اخلاقی
بُرائی اس میں فانی ہے بھلائی اس میں ہے باقی،

تو نیکی پر عمل کرنے سے کیوں معذور ہے انساں؟ بدی کی قوتوں سے کس لئے مجبور ہے انساں
ترا انصاف جانے کس لئے مقہور ہے انساں!

ازل سے فطرت اُس کی کس لئے ہنگامہ پرور ہے؟ اور اُس کی ساخت میں کیوں عنصرِ تخریب مضمر
قصور انساں کا ہے یارب! کہ یہ اُس کا مقدر ہے؟

رُباعیاتِ جوشؔ

(۱)
قدرت انساں سے بے حجاب نہیں
میدانِ عمل وسیع ہے [illegible] نہیں
[illegible] دوراں کا مزاج
قدرت کے مصالح سے ہم آہنگ نہیں
جوشؔ ملیح آبادی

(۲)
اک عمر میں ہوتی ہے بصیرت پیدا
ہوتی ہے خدا [illegible] دولت پیدا
اک عمر میں [illegible] آ جاتا ہے
خود علم سے ہوتی ہے بصیرت پیدا
جوشؔ ملیح آبادی

جنگ کا اثر دیہات پر

(محمد ناصر علی صاحب ایم۔ اے لکچرار شعبۂ معاشیات عثمانیہ یونیورسٹی)

جنگ کے اثرات بہت وسیع اور دُور رس ہوتے ہیں، زندگی کا تقریباً ہر شعبہ براہ راست یا بالواسطہ ی یا کلی طور پر اس سے متاثر نظر آتا ہے۔ سیاست، معیشت اور معاشرت پر اس کے ایک ساتھ اثرات پڑتے ہیں ق صرف اس قدر ہے کہ کسی شعبے میں یہ اثرات زیادہ نمایاں ہوتے ہیں کسی میں کم۔ خاص طور پر سیاست، معیشت معاشرت براہ راست اس کے زیر اثر ہیں۔ ان میں بھی معاشی زندگی پر اس کا بہت گہرا اثر پڑ رہا ہے۔ اس مون میں ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ دیہات کی معاشی زندگی پر جنگ کا کیا اثر پڑ رہا ہے۔

ہندوستانی آبادی کا تقریباً نوّے فی صدی حصہ دیہاتوں میں رہتا ہے اور اُن کی اکثریت زراعت سے ی حاصل کرتی ہے۔ گرانی سے کاشتکاروں کو فائدہ پہونچتا ہے اور ارزانی سے یہ نقصان میں رہتے ہیں۔ جنگ کی سے چند اجناس کے سوا تمام کی قیمتیں بڑھ گئی ہیں۔ قیمتوں کی گرانی یا ارزانی کی عام حالت کو معلوم کرنے کا ایک یہ انڈکس نمبر یا اشاری عدد ہے۔ اشاری اعداد کے تیار کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ معمولی حالات میں کسی ایک وقت کوئی ایک چیز یا ایک ہی قبیل کی ایک سے زائد چیزوں کی قیمتوں کو جمع کر کے ان کی تعداد پر تقسیم کیا جاتا ہے۔ اوسط نکلے اُسے بنیاد قرار دیکر (۱۰۰) کے مساوی فرض کرتے ہیں اور آئندہ قیمتوں کی تبدیلیوں کو فی صد اضافے یا تخفیف صورت میں ظاہر کیا جاتا ہے۔ اگرچہ اس طریق پر مختلف اعتراضات کئے جاتے ہیں تاہم قیمتوں کی عام سطح کی بلندی پستی کو معلوم کرنے کا یہی طریقہ رائج ہے۔ کلکتے کی تھوک قیمتوں کے اشاری اعداد کے تختے میں جولائی ۱۹۱۴ء کی قیمتوں کو (۱۰۰) فرض کر کے آئندہ تبدیلیوں کو اس کے تناسب سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس تختے میں موجودہ جنگ کی ابتدا سے ایک مہینہ قبل یعنی اگست ۱۹۳۹ء میں چاول، جوار، گیہوں اور اسی قبیل کی آٹھ چیزوں کی قیمتوں کا اشاری عدد صرف (۸۳) تھا۔ جنگ کی ابتدا کے ساتھ ہی اس میں دس درجوں کا اضافہ ہوگیا۔ دسمبر ۱۹۳۹ء تک بڑھ کر (۱۰۵) پہونچ گیا اور بعد کے مہینوں میں یعنی جنوری ۱۹۴۰ء تا مئی ۱۹۴۱ء اس میں مقابلتاً تخفیف رہی لیکن جون ۱۹۴۱ء میں (۱۰۵) سے بھی بڑھکر (۱۱۴) تک پہونچ گیا اور دسمبر ۱۹۴۱ء میں (۱۲۹) رہا۔ ان اعداد سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ غلے کی قیمتیں کس قدر چڑھ گئی ہیں۔ دالوں کی قیمتوں کا بھی یہی حال ہے۔ اگست ۱۹۳۹ء میں دالوں کی قیمتوں کا اشاری عدد صرف (۹۶) تھا۔ بعد کے مہینوں میں طلب و رسد کے حالات کی مناسبت سے

موافق اور مخالف تغیرات کے ساتھ بہ حیثیت مجموعی بڑھتے ہوئے دسمبر ۱۹۴۱ء تک (۱۳۴) ہوگیا، مگر روغندار تخموں کی قیمتوں کی سطح کچھ زیادہ بلند نہ ہوسکی۔ اگست ۱۹۳۹ء میں ان کا اشاری عدد (۱۰۱) تھا اور جنوری ۱۹۴۲ء میں (۱۰۸) تک بڑھ سکا۔ خام جوٹ اور روئی کے اشاری اعداد اگست ۱۹۳۹ء میں ترتیب وار (۷۵) اور (۶۴) تھے فروری ۱۹۴۲ء میں (۷۲) اور (۷۳) رہے۔ ان اعداد کی روشنی میں نیز روزمرہ خرید و فروخت کے تجربہ سے شہروں میں رہنے والے لوگ عام طور پر یہی خیال کریں گے کہ کاشتکار بہت فائدے میں ہیں کیونکہ اجناس کی قیمتیں مجموعی حیثیت سے بڑھ گئی ہیں۔ لیکن جنگ کے پہلے تین مہینوں میں جو گرانی رہی وہ زیادہ تر تخمین یا سٹہ بازی کا نتیجہ تھی۔ اور اس سے زیادہ تر دلال اور بڑے بڑے تاجر مستفید ہوئے۔ کیونکہ انھوں نے جنگ سے بہت عرصہ قبل ہی آیندہ مانگ اور قیمتوں میں غیر معمولی اضافے کے متعلق پیش بینی شروع کردی تھی۔ اور کثیر پیشگی رقومات دیکر سستے داموں پر خرید چکے تھے۔ جب جدید فصلیں پک کر تیار ہوئیں تو کاشتکاروں کے لئے منافع کمانے کے موقعے نکل آئے لیکن اس کے باوجود کاشتکار حقیقی اضافے سے پورے طور پر فائدہ نہ اٹھا سکے جس کی اہم وجہ فروخت پیداوار کے گوناگوں نقائص ہیں۔ زراعتی پیداواروں کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ یک وقت پک کر تیار ہوتی ہیں۔ جب فصل کی کٹائی کا زمانہ ہوتا ہے تو اجناس کی کثرت ہوتی ہے ظاہر ہے کہ کثرت کے ساتھ قیمتیں لازمی طور پر کم ہوجاتی ہیں۔ اچھی قیمتیں حاصل کرنے کی ایک صورت یہ ہوسکتی ہے کہ کاشتکار اجناس کا ذخیرہ جمع کریں اور پیداوار کو روک رکھ کر بتدریج فروخت کریں۔ لیکن وہ ایسا نہیں کرسکتے کیونکہ ایک طرف تو وہ مفلس و قلاش ہوتے ہیں دوسری طرف ان کے ذمے مختلف مطالبات ہوتے ہیں مثلاً قرض، مالگزاری، لگان، تخم ریزی کے مصارف اور دیگر اخراجات۔ یہ ایسی مدات ہیں جن کے لئے فوری رقم کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس لئے کاشتکار پیداوار کو مقابلتاً کم قیمت پر فروخت کرنے کے لئے مجبور ہوجاتے ہیں۔ اگر پیداوار کو منظم بازاروں میں فروخت کیا جائے تو اس سے مقابلتاً زیادہ آمدنی ہوسکتی ہے لیکن منڈیوں کی مسافت، ناقص ذرائع آمدورفت اور باربرداری کے بڑھے ہوئے مصارف کی وجہ سے اکثر کاشتکار مجبوراً پیداوار کو مقامی دلالوں یا ساہوکاروں کے ہاتھ فروخت کردیتے ہیں، یا زیادہ سے زیادہ قرب و جوار کے ہفتہ واری بازار میں فروخت کرتے ہیں لیکن وہاں بھی بڑے خریدار عام طور پر دلال اور ساہوکار ہی ہوتے ہیں۔ ان بازاروں میں عموماً ناقص معیار باٹ استعمال کئے جاتے ہیں، اور تولنے اور ناپنے کے طریقے بھی ناقص ہوتے ہیں۔ دیہات میں تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ پیداوار کا بہت بڑا حصہ مقامی ساہوکاروں کے ہاتھ فروخت ہوتا ہے۔ ساہوکار اپنے مفاد کے پیش نظر نہ صرف بڑے وزن اور پیمانے استعمال کرتے ہیں بلکہ تولنے اور ناپنے کے طریقے بھی انہیں کے مفید مطلب ہوتے ہیں۔ مزید براں ساہوکاروں کا یہ ایک عام اصول ہے کہ جب کبھی انھیں قیمتوں کے بڑھنے کی توقع ہوتی ہے

تو وہ کثیر رقومات پیشگی دے کر کاشتکاروں سے وعدہ لیتے ہیں کہ فصل کی کٹائی کے بعد جملہ پیداوار یا اس کا مقررہ حصہ ایک معینہ قیمت پر اُن کے ہاتھ فروخت کیا جائے گا، خواہ اُس وقت بازار کا بھاؤ کچھ بھی کیوں نہ ہو۔ اکثر کاشتکار تخم ریزی کے زمانے میں اس قسم کی پیشگی رقومات حاصل کرتے ہیں اور حسب وعدہ اختتام فصل پر پیداوار ساہوکار کے ہاتھ فروخت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ان حالات میں یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ اجناس کی اعلیٰ قیمتوں سے کاشتکار کو بہت فائدہ ہو رہا ہے۔ شہروں میں اجناس کی جو اعلیٰ قیمتیں ادا کی جا رہی ہیں ان میں کاشتکاروں کے علاوہ کئی اور حصہ دار شریک ہیں، مثلاً محلہ واری خوردہ فروش، بازاروں کے تھوک فروش، باربرداری ادارے مثلاً ریلوے اور موٹر سروس، صوبوں، ضلعوں اور تعلقوں کے تھوک فروش، دیہاتوں کے مقامی دلال اور ساہوکار۔ اس سب کے منافعے منہا کرنے کے بعد خود کاشتکار کے لئے بہت کم حصہ بچ رہتا ہے۔

کاشتکار کی آمدنی پر اثر ڈالنے والے مزید دو اُمور ہیں جنھیں کسی طرح نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں سے ایک مصارف پیدائش یا اخراجاتِ کاشت ہیں، اور دوسرے مصارف رہائش یا اخراجات زندگی۔ جنگ کی بدولت جہاں پیداوار کی قیمتوں میں اضافہ ہوگیا ہے تو ساتھ ہی ساتھ کاشت کے اخراجات بھی بڑھ گئے ہیں۔ کاشتکار اس وقت زیادہ فائدہ میں رہتے جبکہ قیمتوں میں اضافہ ہوتا اور اخراجات کاشت حسب سابق برقرار رہتے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ شہروں کے کارخانوں میں کام کی کثرت کی وجہ سے قرب وجوار کے کثیر التعداد مزدور وہاں منتقل ہو رہے ہیں۔ لہٰذا شہروں کے نواحی دیہاتوں میں زرعی اجرتیں تھوڑی بہت بڑھ گئی ہیں۔ اجناس کی قیمتوں میں اضافہ کے ساتھ ساتھ تخم کی قیمتوں میں بھی زیادتی ہوگئی ہے۔ کھاد، زراعتی مشنری، ترقی یافتہ آلات اور قدیم آلات کے لوہے کے حصوں کی قیمتیں بھی گراں ہوگئی ہیں۔ زراعتی کاروبار میں چمڑا بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اور اس کی قیمتیں بھی زیادہ ہوگئی ہیں۔ اگست سنہ ۱۹۳۹ء میں اس کی قیمتوں کا اشاری عدد (٦٣) تھا فروری سنہ ۱۹۴۲ء میں (۹۳) رہا۔ اخراجات پیدائش میں اضافے کا ایک اور سبب چارے کی قلت اور گھی کی گرانی ہے۔ نقل وحمل میں نہ صرف مزید دقتیں پیدا ہوگئی ہیں، بلکہ شرح نقل وحمل بھی زیادہ ہوگئی ہے۔ ان حالات کے تحت اخراجات کاشت کا بڑھ جانا لازمی ہے۔

اخراجات کاشت میں اضافہ ہونے کے علاوہ اخراجات زندگی بھی بڑھ گئے ہیں۔ آمدنی میں اضافے کا مفید اثر خوشحالی کی صورت میں اس وقت نمودار ہو سکتا ہے جب زر کی قوت خرید میں کمی نہ ہو۔ یعنی دیگر ضروری چیزیں گراں نہ ہوں۔ کاشتکار کے بارے میں ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں گرانی کی وجہ سے اس کی آمدنی میں تھوڑا بہت اضافہ ہوا ہے اس کے ساتھ ہی اخراجات کاشت اور اخراجات زندگی بھی بڑھ گئے ہیں۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ کاشتکار کو کھانے کے لئے چاول جوار اور دالیں وغیرہ خود اس کے کھیت سے حاصل ہوتی ہیں تو پھر بھی اسے دوسری چیزیں بازار

سے خریدنی پڑتی ہیں۔ دھوتی، چادریں اور گھریلو استعمال کے دوسرے کپڑوں کی قیمت کافی بڑھ گئی ہے ستمبر ۱۹۳۹ء تک دھوتی کے کپڑے کی تھوک قیمت نو آنے چھ پائی فی پونڈ تھی ستمبر ۱۹۴۱ء تک بڑھکر ایک روپیہ سات آنے فی پونڈ ہو گئی۔ اسی طرح چادروں کی قیمت آٹھ آنے نو پائی فی پونڈ سے بڑھکر ایک روپیہ چھ آنے دس پائی فی پونڈ ہو گئی۔ گھریلو استعمال کے دوسرے معمولی کپڑوں کی قیمت سات آنے فی پونڈ سے بڑھکر ایک روپیہ چار آنے ایک پائی فی پونڈ ہو گئی۔ کاشتکار کمبل کے بغیر نہیں رہ سکتے، یہی اُن کا اوڑھنا بچھونا اور سب کچھ ہے۔ جنگ سے قبل جو کمبل دو سوا دو روپیہ میں ملتا تھا، اب ڈھائی تین روپیوں سے کم میں نہیں ملتا۔ چپلوں کی قیمت بھی بڑھ گئی ہے جو چپل پہلے ایک اور سوا روپیہ میں ملتی تھی اب ڈیڑھ اور پونے دو روپیے میں مل رہی ہے۔ نمک کی قیمت اگست ۱۹۳۹ء کے مقابل مئی ۱۹۴۲ء میں بارہ روپیہ سکۂ عثمانیہ فی پلہ سے بڑھکر تیرہ روپیے دس آنے فی پلہ ہو گئی ہے۔ دیا سلائی کا ایک گروس دو روپیے آٹھ آنے کے بجائے چار روپیے آٹھ آنے میں مل رہا ہے۔ انڈی کا تیل، کھوپرے کا تیل، اور میٹھا تیل۔ ان سب کی قیمتیں بھی چڑھ گئی ہیں۔ انڈی کا تیل دیہاتی عام طور پر روشنی کے لئے استعمال کرتے ہیں، کھوپرے کا تیل سر کے لئے اور میٹھا تیل ساگ سالن میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اِن چیزوں کی قیمتوں میں اضافے کی وجہ سے اخراجاتِ زندگی بھی زیادہ ہو گئے ہیں۔

نقل وحمل کی دقتوں، فروختِ پیداوار کے گوناگوں نقائص، ساہوکاری لین دین کی خرابیوں، اخراجاتِ پیدائش اور اخراجاتِ زندگی میں اضافے کی بنا پر اعلیٰ قیمتوں سے خود کاشتکاروں کو زیادہ فائدہ نہیں پہونچ رہا ہے، اور ان کا بڑا حصہ ساہوکاروں، دلالوں اور بڑے بڑے تاجروں کی جیب میں جا رہا ہے۔ موجودہ حالات میں کاشتکار اعلیٰ قیمتوں سے اس وقت ممکنہ استفادہ کر سکتے ہیں جبکہ وہ اپنی دقتوں کا حل انجمن ہائے امدادِ باہمی کے ذریعہ کرنے کی کوشش کریں۔ جنگ کے زمانہ میں نقل وحمل کی دقتیں اور شرحِ باربرداری کا اضافہ ناگزیر ہے۔ مگر انجمنوں سے کمتر شرح پر قرضے حاصل کئے جا سکتے ہیں، تخم، کھاد اور آلات کی خریدی بھی ان کے ذریعہ کی جا سکتی ہے، گرم بازاری کے زمانہ میں ساہوکار عام طور پر کاشتکاروں کو قرضہ کی ترغیب دے کر انھیں اپنے زیرِ اثر کر لیتے ہیں، اسی زمانے میں انجمن ہائے امدادِ باہمی کاشتکاروں کی زیادہ خدمت انجام دے سکتی ہے، خاص طور پر فروختِ پیداوار کی انجمنوں کے لئے ترقی، کامیابی اور ہردلعزیزی کے وسیع موقعے موجود ہیں۔ جنگ کی وجہ سے کاشتکاروں کو بہ حیثیتِ مجموعی ضرور فائدہ پہونچ رہا ہے لیکن اتنا نہیں جتنا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ البتہ کاشتکاروں کی آمدنی میں نمایاں اضافہ ہو سکتا ہے اگر وہ انجمن ہائے امدادِ باہمی کو اپنی ترقی کا ذریعہ بنائیں۔

کاشتکاروں کے بعد دیہی آبادی میں مزدور طبقہ قابلِ ذکر ہے۔ زراعتی مزدوروں پر جنگ کا مخالف اثر پڑ رہا ہے کیونکہ کھانے پینے کی چیزوں اور لباس کی قیمتوں میں اس قدر اضافے کے باوجود ان کی اجرتیں اب بھی تقریباً تمام

دیہی علاقوں میں قدیم مقررہ معیار کے مطابق ادا کی جارہی ہیں، جو دیہات صنعتی مرکزوں سے قریب ہیں وہاں اجرتوں میں کچھ اضافہ ضرور ہوا ہے، لیکن گرانی کے تناسب سے یہ ناقابلِ لحاظ ہے۔ دیہات میں اجرتوں کی ادائیگی کے بھی دو طریقے ہیں۔ ایک بہ شکل جنس اور دوسرے بہ شکلِ زر۔ موجودہ حالات میں مزدوروں کے لئے جنس کی شکل میں اجرتوں کا ملنا نفع بخش ہے کیونکہ اجناس کی قیمتیں نسبتاً گراں ہیں۔ لیکن اجرتوں کی ادائیگی ہر وقت اجناس کی شکل میں نہیں ہوتی۔ رواج کے مطابق کبھی تو بطور جنس دی جاتی ہیں اور کبھی زر کی شکل میں ادا کی جاتی ہیں۔ بہرحال مجموعی حیثیت سے زراعتی مزدوروں پر گرانی کا زیادہ بار پڑ رہا ہے[1]۔

غزل

(نواب محمود علی خاں عرف آغا علیخاں رئیس الہ آباد)

مٹا دے سب کو مگر یہ مزار رہنے دے
یہ تیرے عشق کی ہے یادگار، رہنے دے

دماغ جاں کو معطّر کئے ہے زلف تری
ہٹا نہ اس کو یونہی سوگوار رہنے دے

بہت دنوں میں ملایا ہے تجھ سے قسمت نے
ابھی نہ روک مجھے اشکبار رہنے دے

حریم ناز میں جاؤں گا جب بدل دینا
ابھی تو دل یہ مرا اختیار رہنے دے

عروج حسن نے بخشی ہے عشق کی لذّت
مٹا نہ اس کو مرا افتخار رہنے دے

سکوں میں ملتی ہے کب اتنی عشق کی لذت
میں خوش ہوں دل کو مرے بیقرار رہنے دے

فراق دوست سے ماتم کدہ ہے دل میرا
نہ چھیڑ اس کو ابھی سوگوار رہنے دے

گناہگار ہوں میں نام آگیا لب تک
اُٹھا نہ سر کو مرے شرمسار رہنے دے

یہ کیا کہا کہ تڑپنا ہے جرم عشق، مگر
یہ میرا دل ہے اسے بیقرار رہنے دے

چمک اُٹھے در و دیوار ہاں تجلّی سے
نیا فریب شبِ انتظار رہنے دے

ذلیل و خوار نہ ہوں جاکے بزم عرفاں میں
حرم میں مجھکو ابھی بادہ خوار رہنے دے

اُڑا جو خاک کا ذرّہ گرا وہ پستی میں
بلند کر نہ مجھے خاکسار رہنے دے

حریم ناز کے جلووں کا حال مجھ سے نہ پوچھ
نیازِ عشق کا کچھ اعتبار رہنے دے

ابھی سے حال اسیرِ قفس کا ہے ابتر
سنا نہ قصۂ فصلِ بہار، رہنے دے

غم و نشاط ہیں محمود کی طبیعت میں
مٹا خوشی کو غمِ روزگار رہنے دے

---

[1] پچھلے ماہ یہ مضمون لاسلکی نشرگاہ حیدرآباد دکن سے نشر کیا گیا تھا۔

پیشکش

(شیخ محمد یوسف ظفر بی۔ اے)

تیرا ممنونِ محبت ہی نہیں ہوں اے دوست — تیرا احسان ہے یہ بھی کہ زباں رکھتا ہوں
اِک اچھوتا سا تصور ہے مری آنکھوں میں — ایک مخصوص سا اندازِ بیاں رکھتا ہوں
لاکھ مایوسِ تمنا ہوں، مگر پہلو میں — دل کو آزادِ غمِ سود و زیاں رکھتا ہوں
یہ بھی ہے تیری عنایت کہ جہاں میں رہ کر — ساری دنیا سے جُدا اپنا جہاں رکھتا ہوں
تیری آنکھوں کی حکایت ہے زبانی میری — جس کو اپنی کہوں وہ بات کہاں رکھتا ہوں

تیرا ممنون ہوں اے روح و روانِ جذبات
اپنے شعروں کی تجھے روح و رواں رکھتا ہوں

سوچتا ہوں کہ کسی دن مرے نغموں کی صدا — روح کے آئینہ خانے میں اُتر آئے گی
تیری تحریکِ نظر اور مرے اشعار کی ضد — وقت کے رُخ پہ درخشندہ نظر آئے گی
چاند کی مشعلیں گُل ہوں گی سنبھالے لیکر — دُھول تاروں کی اُڑے گی تو خبر آئے گی
حادثے بڑھ کے مٹا دیں گے فریبِ دُوری — رات آئے گی یہ بے زادِ سفر آئے گی
شام رقصاں نظر آئے گی مرے گیتوں پر — اور گاتی ہوئی شعروں کو سحر آئے گی

سوچتا ہوں، اسی عالم میں اسی صورت میں
تو مرے سامنے اے جانِ ظفر آئے گی

آئے گی تُو — تجھے معلوم ہے پھر کیا ہوگا؟ — تجھکو میں تیری نگاہوں سے چھپا رکھونگا
خامشی ہوگی زباں میری، ملاقات کے وقت — دل کو قربت کی شعاؤں سے بچا رکھونگا
کھلتے کھلتے تری آنکھوں کی حیا سے بچ کر — جو بھی آئے گا مرے لب پہ روا رکھونگا
آزماؤں گا ارادوں کی زباں زوری کو — بات فردا پہ نہ پھر کوئی اُٹھا رکھونگا
دل تو موہوم سی اِک شے ہے، نہ جانے کیا ہو — پیشکش کے لئے کچھ اس سے سوا رکھونگا

زندگی آئے گی پہنانے مجھے تاجِ بقا
میں ترے قدموں پہ یہ تاجِ بقا رکھوں گا

غالب کی زندگی میں اُردو کلام کی اشاعت

(پروفیسر مہیش پرشاد، مولوی فاضل، ہندو یونیورسٹی بنارس)

پچھلے دنوں میرزا غالب کے اُردو دیوان کی طباعت کے باب میں بہت کچھ لکھا گیا ہے، تاہم میں یہ دیکھتا ہوں کہ اُردو دیوان کے ابتدائی اڈیشنوں کی بابت بہت ہی کم لوگوں کو پوری واقفیت ہے۔ چنانچہ اس موقع پر مختصراً محض یہ بتلا دینا چاہتا ہوں کہ مرزا کا اُردو کلام اُن کی زندگی میں کب کب چھپا۔

مرزا کے اُردو دیوان کا سب سے زیادہ پورانا چھپا ہوا نسخہ جو اب تک میری نظر سے گزرا ہے اُس کے پہلے صفحے پر یہ الفاظ ہیں:-

"دیوان اسداللہ خاں غالب تخلص

مرزا نوشہ صاحب کا مشہور کا دہلی میں سید محمد خان بہادر کے چھاپہ خانہ کے لیتھو گرافک پریس میں شہر شعبان ۱۲۵۷ سنہ ہجری مطابق ماہ اکتوبر ۱۸۴۱ء عیسوی کو سید عبدالغفور کے اہتمام میں چھاپا ہوا۔

اِسی دیوان کے متعلق مولوی کریم الدین صاحب نے تذکرۂ شعرائے اُردو صفحہ ۳۴۲ میں یہ لکھا ہے:-

"مطبع سیدالاخبار میں درمیان ۱۸۴۳ء کے چھپا تھا۔"

مخفی نہ رہے کہ سر سید احمد خاں صاحب کے بھائی سید محمد خاں صاحب "سیدالاخبار" نامی ایک اخبار نکالتے تھے اسی وجہ سے اُن کا پریس "مطبع سیدالاخبار" کے نام سے مشہور ہوا دیوان کے شروع کے صفحے پر ۱۸۴۱ء درج ہے لیکن مولوی کریم الدین صاحب نے ۱۸۴۳ء لکھا ہے میرے نزدیک بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ طباعت ۱۸۴۱ء میں شروع ہوئی اور ۱۸۴۳ء میں اختتام کو پہونچی۔

اس کے بعد کا چھپا ہوا جو دیوان میں نے دیکھا ہے اُس کے سرورق کے الفاظ یہ ہیں جن سے وقت و مقامِ طباعت پر روشنی پڑتی ہے:-

"دیوان اُردو تصنیف مشتری اوج حق پژوہی و خدا دانی رصد بند فلک البروج معارف سبحانی افصح فصحائے دوراں شہنشہ شعرائے ممالک ایران و ہندوستان دقاق غواص در رموز سخن سنجی و نکتہ دانی خلاق مضامین و معانی سرآمد اربابِ فضل و کمال مہر سپہر نبالت و اجلال جناب مستطاب منبع الالقاب میرزا اسداللہ خاں بہادر دام اللہ برکاتہم و حسناتہم المتخلص بغالب و اسد بہ تصحیح و مقابلہ جناب مصدر المدوح در مطبع دارالسلام دہلی واقع محلہ حوض قاضی مہینہ اقل العباد عنایت حسین در ماہ مئی ۱۸۴۷ء باہتمام نورالدین احمد لکھنوی علیہ انطباع پوشید۔"

اُردو دیوان غالب کا تیسرا اڈیشن ۲۰ محرم ۱۲۷۸ھ (۲۹ جولائی ۱۸۶۱ء) کو مطبع احمدی دہلی سے باہتمام مرزا امو جان شائع ہوا۔ اِس دیوان کے اخیر میں مرزا کے الفاظ یہ ہیں:۔

"یہ دیوان اُردو تیسری بار چھاپا گیا ہے"

اِن الفاظ سے ظاہر ہے کہ جن اڈیشنوں کو میں نے اڈیشن اول و دوم قرار دیا ہے اون کو اُسی طرح سمجھنے میں کسی طرح کی غلطی نہیں ہوئی ہے۔

اِس کے بعد چوتھا اڈیشن وہ ہے جو ماہ ذی الحجہ ۱۲۷۸ھ (جون ۱۸۶۲ء) میں مطبع نظامی کانپور سے شائع ہوا اصل بات یہ ہے کہ تیسرا اڈیشن جس صورت میں چھپا اُس سے مرزا بہت بیزار ہوئے اور میر مہدی حسین مجروح کو اپنے خط مرقومہ ۹ اگست ۱۸۶۱ء میں لکھا:۔

"دیوان اُردو چھپ چکا۔ ہائے! لکھنؤ کے چھاپے خانے نے جس کا دیوان چھاپا اُس کو آسمان پر چڑھا دیا حُسنِ خط سے الفاظ کو چمکا دیا۔ دلّی پر اور اُس کے پانی پر اور اُس کے چھاپے پر لعنت اصاحب دیوان کو اس طرح یاد کرنا جیسے کوئی کُتّے کو آواز دے۔ ہر کاپی دیکھتا رہا ہوں، کاپی نگار اور تھا متوسط جو کاپی میرے پاس لایا کرتا تھا وہ اور تھا۔ اب جو دیوان چھپ چکے حق التصنیف ایک مجھ کو ملا۔ غور کرتا ہوں تو وہ الفاظ غلط جوں کے توں ہیں یعنی کاپی نگار نے نہ بنائے، ناچار غلط نامہ لکھا وہ چھپا، بہر حال خوش و ناخوش کئی جلدیں مول لوں گا، اگر خدا چاہے تو اسی ہفتے میں تین مجلد اصحاب ثلثہ کے پاس پہونچ جائیں، نہ میں خوش ہوا ہوں نہ تم خوش ہو گے۔"

علاوہ بریں چوتھے اڈیشن کے اخیر میں جو الفاظ ہیں اُن سے بھی تیسرے اڈیشن کی حالت پر مناسب روشنی پڑتی ہے:۔

"بخدمت اربابِ سخن عرض کرتا ہے امید وار رحمت و غفران محمد عبد الرحمٰن بن حاجی محمد روشن خان طیب اللہ ثراہ کہ اس سے پہلے دیوان بلاغت نشان جناب نواب اسد اللہ خان غالبؔ کا دہلی میں چھپا لیکن بسبب سہو و نسیان کے بعض مقام میں تغیر و تبدل ہوا اس لئے جناب مجمع لطفِ بے کراں محمد حسین خاں صاحب دہلوی نے بعد نظر ثانی اور تصحیح جناب مصنف کے ایک نسخہ میرے پاس بھیجا، میں نے بافضال ایزدی مطابق اس نسخہ کے شہر ذی حجہ ۱۲۷۸ھ مطبع نظامی واقع شہر کانپور میں صحت تمام اور درستی کمال سے چھاپا۔"

پانچواں اڈیشن ۱۸۶۳ء (۱۲۷۹ھ) میں مطبع مفید خلائق آگرہ میں رائے بہادر منشی شیو نراین کے اہتمام سے چھپا۔ اس میں پہلے قطعات ہیں پھر مثنوی، قصائد، غزلیات اور رباعیات۔ برخلاف اس کے پہلے چار اڈیشنوں و مروجہ اڈیشنوں میں غزلیات و قصائد مثنوی قطعات اور رباعیات ترتیب وار ہیں۔ اس کی حقیقت یوں ہے

کہ مرزا کے اُردو دیوان کا ایک قلمی نسخہ رام پور اسٹیٹ لائبریری میں ہے اُس میں قطعات ابتدا میں ہیں اسی قلمی نسخے کو مرزا نے ۱۸۶۲ء میں کسی کاتب سے نقل کرایا اور اُسی نقل کے سہارے یہ پانچواں اڈیشن شائع ہوا۔ ہاں یہ بھی واضح رہے کہ اس پانچویں اڈیشن کا منقول قلمی مسودہ الہ آباد کے نامور وکیل ہائیکورٹ پنڈت گوپی ناتھ کنزرو صاحب کے پاس ہے۔ اسی مسودے کو مرزا نے منشی شیونراین صاحب کے پاس چھپنے کے لئے بھیجا تھا اور اسی کا ذکر خصوصیت کے ساتھ مرزا کے اُن خطوط میں ہے جو منشی شیونراین صاحب کے نام ہیں۔

علاوہ بریں یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ "نگارستانِ سخن" کے نام سے ایک کتاب مطبع احمدی دہلی میں ۲۷ صفر ۱۲۷۹ھ (۲۴ اگست ۱۸۶۲ء) کو چھپی تھی، جس میں اُستاد ذوق، مرزا غالب اور حکیم مومن خاں کا کلام پہلو بہ پہلو چھپا ہوا ہے۔ بادشاہ بہادر شاہ ظفر کا کہا ہوا سہرا اور حضرت ظہیر دہلوی کا بھی کچھ کلام اسی میں ہے۔ القصہ مذکورہ بالا مطبوعات کے سوا اور کوئی مطبوعہ نسخہ ابھی تک میں نے نہیں دیکھا جس میں مرزا کا کلام جداگانہ یا کسی اور کے کلام کے ساتھ اُن کی حیات میں شائع ہوا ہو۔

سالنامہ نیرنگِ خیال ۱۹۴۲ء

لاہور کے مشہور و معروف رسالہ نیرنگ خیال کا سالنامہ بابتہ ۴۲ء جو خاص اہتمام سے شائع ہوا ہے گرانمایہ مضامین نظم و نثر کا ایک دلچسپ مجموعہ اور مختلف قسم کی تصاویر کا ایک دلکش مرقع ہے۔ نثر کے مضامین میں ٹیگور کا "زرتشت اور ایران"، سر ظفر اللہ کا "خطاب بہ نوجوانان"، خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی کا "ناکام" خاص طور پر قابل قدر ہیں۔ نظموں میں جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی کی نظم "حال و مستقبل"۔ حضرت طرفہ قریشی کی "شاعر کا تسلط" خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ سہا صاحب مجددی، اختر شیرانی صاحب کی غزلیں بھی خوب ہیں۔ اس سالنامہ کی ایک اور قابلِ قدر خصوصیت یہ ہے کہ اسمیں علامہ اقبال مرحوم پر پندرہ خاص مضامین درج کر دیئے گئے ہیں۔ ان مضامین میں ڈاکٹر اقبال کے کلام اور اُن کے فلسفہ پر مختلف پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے۔ یہ مضامین بطور خود اردو کا ایک نادر تنقیدی مجموعہ ہیں جسے قدر شناسان اقبال کو اپنی لائبریریوں میں ضرور رکھنا چاہیئے۔

غرض اس سالنامے میں صاحبانِ ذوق کے لئے اچھا خاصہ سامان دلچسپی فراہم کر دیا گیا ہے اور لطف یہ ہے کہ سنجیدہ و متین مضامین کے پہلو بہ پہلو اسمیں "ادب لطیف" کے نمونے بھی موجود ہیں جس سے اس نمبر کی دلچسپیوں میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ تصویروں میں غالب کی تصویر بہت قابل قدر ہے۔ کاغذ کی گرانی بلکہ کمیابی کے زمانہ میں ایسے نفیس و ضخیم پرچے کی اشاعت پر حکیم محمد یوسف صاحب اڈیٹر نیرنگ خیال تمام قدر دانان اُردو کی دلی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اسکی لکھائی چھپائی بھی عمدہ ہے۔ ضخامت دو سو صفحات قیمت دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ: دفتر نیرنگ خیال لاہور

موجِ شراب

(از حضرت شایق ہندو)

سکر انگیز فضا ہے تو ہوا موج شراب
گل کھلائیگی کوئی اب کی نیا موجِ شراب

کثرتِ لالہ و گل سے ہے زمیں کشتیٔ مے
جلوۂ رنگِ شفق سے ہے فضا موجِ شراب

آج قبلہ سے ہے اک ابر دھواں دھار اٹھا
کیا کرے دیکھیے اب نامِ خدا موجِ شراب

فیضِ میخانہ کو ساقی نے کیا ہے دوچند
چشمِ مستانہ سے اٹھتی ہے جدا موجِ شراب

دستِ جاناں کا یہ اندازِ تصرف دیکھو
دم کے دم میں گئی بن آبِ بقا موجِ شراب

عود کرتا نہ جنوں موسمِ گل میں کیا کیا
بن گئی بدرقۂ آب و ہوا موجِ شراب

جلوۂ گل ہے حنائے سر ناخن ہندو
اہلِ غفلت پہ ہے انگشت نما موجِ شراب

رباعیاتِ آرزو

(حضرت آرزو لکھنوی)

(۱)

مل سکتی ہو جب خوشی تو کیوں غم مانگوں
ساقی کے ہوتے کس لیے سم مانگوں
محتاج نہیں جب سے طلب کرنا ہے
جنت بھی بہشت سے اگر کم مانگوں

آرزو

(۲)

دنیا کو طلب کروں کہ عقبیٰ مانگوں
ہے کم سے بھی کم جتنا زیادہ مانگوں
دنیا ہے وہ بے طلب طلب سے بڑھ کر
اس پہ بھی اگر مانگوں تو اب کیا مانگوں

آرزو

سیماب صاحب اور شعرائے متقدمین

(از حضرت شوکت اعظمی)

اُردو شاعری کو مصحفی، آتش اور امیر پر جتنا بھی ناز ہو کم ہے۔ زمانہ ہوگیا اُس وقت کی اُردو اور آج کی اُردو میں زمین و آسمان کا فرق ہوگیا ہے، دنیا بدل گئی خیالات بدل گئے بلکہ اُردو شاعری کا رنگ ہی دوسرا ہوگیا ہے۔ اب اُن کے کلام پر اصلاح دینا یا اُن کے کلام میں نقص نکال کر اپنی اصلاح پیش کرنا حماقت ہے۔

ڈاکٹر عندلیب شادانی کی بالغ نظر نے میر اور حافظ میں عیب نکالے مگر اُن کو اصلاح دینے کی جرأت نہ کرسکے۔ جناب سیماب اکبرآبادی کی ہمت پر آفریں کیجیے کہ انھوں نے اساتذۂ متقدمین اور متاخرین کو اپنی دستورالاصلاح ۱۹ میں بے نقاب کر دیا۔

وہ اہم غلطیاں کیا ہیں جو حضرت آتش لکھنوی اور شیخ مصحفی سے سرزد ہوئیں، ملاحظہ ہوں جناب سیماب کی توجیہات اور اصلاحیں

(۱) آتش :- داغِ دل خونِ جگر ہے نعمتِ الوانِ عشق ۔۔۔ سیر اپنی جان سے ہو جاتے ہیں مہمانِ عشق

اصلاح مصحفی :- داغِ دل زخمِ جگر ہے نعمتِ الوانِ عشق ۔۔۔ سیر اپنی جان سے ہو جاتے ہیں مہمانِ عشق

ارشادِ سیماب :- "خواجہ آتش کا دوسرا مصرع قابلِ ترمیم تھا جس میں "جاتے" دبتا ہے، مگر اُستاد نے اس پر قلم نہیں لگایا یہ عیب ذراسی توجہ سے دُور ہوسکتا تھا یعنی مصرع یوں بنا دیا جاتا "سیر ہو جاتے ہیں اپنی جان سے مہمانِ عشق" اب وہ دبنے گرنے کا عیب تو جاتا رہا مگر میری رائے میں اب بھی مصرع بے عیب نہیں ہے۔ "مہمان" قافیہ میں بصیغۂ واحد ہے گو معناً غلط نہیں مگر احتیاطاً اگر یہ مصرع یوں ہوتا تو کوئی عیب نہ رہتا :-

"سیر ہو جاتا ہے اپنی جان سے مہمانِ عشق"

عرضِ خاکسار :- سیماب صاحب کے دونوں اعتراض اپنی نوعیت کے لحاظ سے انوکھے ہیں۔ نیچے ذیل کے خط کشیدہ دبتے ہوئے الفاظ ملاحظہ فرمائیے :-

میر :- سرہانے میر کے آہستہ بولو ۔۔۔ ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

غالب :- ہائے اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب ۔۔۔ جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

امیر :- امیر جاتے ہو بتخانے کی زیارت کو ۔۔۔ ملے جو راہ میں کعبہ سلام کر لینا

اب سیماب صاحب اپنی اصلاح پر نظرِ ثانی فرمائیں۔

کیفی :- پھر زندگی میں آنے کو ہے کوئی انقلاب ۔۔۔ پھر حسبِ حال گردشِ دوراں ہے آجکل

اصلاح سیماب : پھر زندگی میں آنے کو ہے تازہ انقلاب ۔۔۔ پھر سازگار گردشِ دوراں ہے آجکل

الم :- بڑھ گئیں حیرانیاں آئینے کی یہ دیکھ کر ۔۔۔ جلوۂ حیرت فزا آئینہ جوہر میں ہے

اصلاح سیماب :- بڑھ گئیں حیرانیاں آئینے کی یہ دیکھ کر ۔۔۔ اک نیا جلوہ کدہ آئینہ جوہر میں ہے

شفق :- جفاؤں پر انھیں اپنی ندامت ہوتی جاتی ہے ۔۔۔ محبت اب حقیقت میں محبت ہوتی جاتی ہے
اصلاح سیماب :- انھیں اپنی جفاؤں پر ندامت ہوتی جاتی ہے ۔۔۔ محبت اب حقیقت میں محبت ہوتی جاتی ہے

سیماب صاحب کو اصولاً شفق کی پوری غزل کی ردیف بدل دینا چاہیئے تھی۔

حضرت آرزو لکھنوی کا شعر ہے :-

کھسیانی ہنسی ہنسنا اک بات بنانا ہے ۔۔۔ ٹپکے ہوئے آنسو کو پلکوں سے اٹھانا ہے

خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ آرزو صاحب نے "ٹپکے ہوئے" کے ساتھ آنسو بصیغۂ واحد کیوں استعمال کیا

حضرت داغ کی ایک اصلاح ملاحظہ ہو :-

احسن :- ہائے پڑ جاتے ہیں ناسور ہمارے دل میں ۔۔۔ ایسا کچھ زہر بھرا ہے ترے مژگانوں میں
اصلاح داغ :- گہرے پڑ جاتے ہیں ناسور ہمارے دل میں ۔۔۔ ایسا کچھ زہر بھرا ہے ترے مژگانوں میں

احسن صاحب کے یہاں بھی "ناسور" بصیغۂ واحد تھا لیکن فصیح الملک نے اس پر قلم نہیں لگایا۔

۲۔ صبا لکھنوی :- جانبِ دشت جو ہیں چاک گریباں نکلا ۔۔۔ کوہ فرہاد سے مجنوں سے بیاباں نکلا
اصلاح آتش :- گھر سے وحشت میں جو میں چاک گریباں نکلا ۔۔۔ کوہ فرہاد سے مجنوں سے بیاباں نکلا

ارشاد سیماب :- اصلاح سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ آتش لفظ "وحشت" کسی نہ کسی طرح شعر میں لانا چاہتے تھے لیکن
مگر اس کے ساتھ "گھر سے" ایک اور زائد فقرہ بھی چلا آیا جس کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ اگر یہ مصرع یوں ہوتا تو کیا برا تھا

" جوشِ وحشت میں جو میں چاک گریباں نکلا "

عرض خاکسار :- اصلاح اچھی ہے لیکن یہ سمجھ میں نہ آیا کہ سیماب صاحب اصلاح دیتے وقت اپنے شاگردوں کے اشعار حشو
و زوائد سے کیوں پاک نہیں فرماتے جیسے آغاز صاحب کے شعر پر سیماب صاحب کی اصلاح ہے۔

آغاز :- زندگی بھی موت بھی اب غم کرے ماتم کرے ۔۔۔ اس قدر انجام عبرتناک ہے آغاز کا
اصلاح سیماب :- زندگی بھی موت بھی ہے آج اُس کی سوگوار ۔۔۔ کس قدر انجام عبرتناک ہے آغاز کا

سمجھ میں نہیں آتا کہ "زندگی بھی موت بھی ہے" کے فقرے میں ایک "بھی" کیا تصور کیا جائے۔ ذرا شوق سندیلوی کی غزل کا
ایک شعر ملاحظہ ہو جس کی اصلاح پر سیماب صاحب کو ناز ہے اور جو بطور موازنہ "دستور الاصلاح" کے صفحہ آخر پر دیگئی ہے:

شوق سندیلوی :- چمن کی سیر سے کیا خاک اپنا جی بہلے ۔۔۔ کہ ہم یہاں ہیں مگر دل تو کوئے یار میں ہے
اصلاح سیماب :- چمن کی سیر سے کیا خاک اپنا جی بہلے ۔۔۔ یہاں وہ بات کہاں ہے جو کوئے یار میں ہے

خدا معلوم سیماب صاحب کے بنائے ہوئے دوسرے مصرعہ کا پہلا "ہے" کیا سمجھا جائے۔

۳۔ صبا لکھنوی :- نہ جیب ہے نہ گریباں میں تار باقی ہے ۔۔۔ یہ سن رہا ہوں کہ فصلِ بہار باقی ہے
اصلاح آتش :- نہ جیب کا ہے نہ دامن کا تار باقی ہے ۔۔۔ جنوں کا جوش ہے فصلِ بہار باقی ہے

ارشاد سیماب :- میں ہوتا تو خواجہ صاحب سے کہتا کہ حضرت اس شعر کو یوں بنا دیجئے :-

نہ جیب میں نہ گریباں میں تار باقی ہے ہنوز شورشِ فصلِ بہار باقی ہے

عرض خاکسار:- سیماب صاحب جو جی چاہے فرمائیں لیکن "جیب" اور "گریبان" ہم معنی لفظ ہیں، ثبوت میں لغت حاضر ہے۔

سخت تعجب ہے کہ سیماب صاحب نے مومن اور غالب کے یہاں عیب جوئی کیوں نہیں فرمائی۔

۴۔ امیر مینائی:- غضب داغ تو نے دیئے اے فلک کلیجہ گلِ نیلوفر ہو گیا

اصلاح اسیر: غضب[۵] چٹکیاں ہیں تری اے فلک کلیجہ گلِ نیلوفر ہو گیا

ارشاد سیماب: میرے خیال میں "ہیں" کی جگہ "تھیں" ہونا چاہئیے۔ ردیف بھی یہی چاہتی ہے، مگر یہ بہت نازک بات ہے۔

مصرع یوں ہو سکتا تھا:- "غضب چٹکیاں تو نے لیں اے فلک"

عرض خاکسار: یہ ضروری نہیں کہ جو چیز سیماب صاحب کے خیال میں غلط ہو اس کو اساتذہ بھی تسلیم کر لیں۔ اہل فن اس عیب کو عیب نہیں سمجھتے اور کلیہ ہمیشہ حال ہی میں نظم کرتے ہیں۔ ذیل کے اشعار میں زمانوں کا فرق ملاحظہ ہو:-

آتش:- دل ہی آتش کا تاب نہ لایا ورنہ محبت زہر نہیں ہے

آتش:- پیشِ نظر ہوا وہی جو کچھ یقیں کیا دنیا تمام دام گہِ اعتبار ہے

نقادِ بے مثال حضرت بیخود موہانی کی اصلاح ہے:-

شوق:- دیکھ ظالم تیرے فریادی نے وقتِ بازپرس وہ ہوا باندھی کہ سَم میدانِ محشر ہو گیا

بیخود:- کچھ خبر ہے تیرے فریادی نے رکھتے ہی قدم وہ ہوا باندھی کہ سَم میدانِ محشر ہو گیا

حضرت شفق کی اصلاح ملاحظہ ہو:-

شوق:- اب کہاں ہے وہ جوانی کا طلسمِ دل فریب اِک تماشا تھا کہ جو اے شوق دم بھر ہو گیا

شفق:- صبحِ پیری خواب ہے گویا جوانی کا خیال شوق جو تکو اک تماشا تھا جو دم بھر ہو گیا

اب شعرائے متاخرین کا دور آتا ہے۔ منیر شکوہ آبادی، امیر مینائی، شوق قدوائی جیسے اساتذہ کو بھی سیماب صاحب [۶] اصلاح دی ہے۔

شہید مچھلی شہری:- شوخیِ رفتارِ ناز اے فتنہ قامت دیکھنا ٹھوکریں کھاتی ہے اُٹھنے پر قیامت دیکھنا

اصلاح منیر:- رتبۂ حسنِ خرام اے فتنہ قامت دیکھنا دیتی ہے تعظیم اُٹھ اُٹھ کر قیامت دیکھنا

ارشاد سیماب:- پہلے مصرع سے "اے" بھی نکل جاتا تو مصرع اور زیادہ چست ہو جاتا اور مخاطبہ غیر ضروری کی ضرورت نہ رہتی

"رتبۂ حسنِ خرامِ فتنہ قامت دیکھنا"

عرض خاکسار:- مگر اس کو کیا کیجئے کہ زبان یوں ہی ہے "اے جانے والے دیکھ کے چل" "اے فتنہ قامت اپنا رتبۂ حُسنِ خرام دیکھ"۔ اب "اے" نکل جانے کے بعد نہ صرف اضافتیں غیر ضروری ہو گئیں بلکہ یہی واضح نہیں ہوتا کہ رتبۂ حسنِ خرام فتنہ قامت کون دیکھے؟

---

۵ صنم خانۂ عشق میں یہ مصرع یوں ہے "غضب ہیں تری چٹکیاں اے فلک" ۶ بہاراں۔ ص ۳۱۳ ۷ اصلاح سخن۔ ص ۳۴

۶۔ شبیر:۔ وہ محبت سے کسی کا وقتِ رخصت دیکھنا ۔۔۔ وہ مرا گھبرا کے منہ باچشمِ حسرت دیکھنا

اصلاح منیر:۔ وہ لگاوٹ سے کسی کا وقتِ رخصت دیکھنا ۔۔۔ وہ مرا سوئے فلک اے چشمِ حسرت دیکھنا

ارشادِ سیماب:۔ اس میں بھی مخاطبۂ غیر ضروری معلوم ہوتا ہے، پورا مصرع یوں بدل دیا جاتا تو بہتر تھا:۔

"آسماں کی سمت وہ میرا بحسرت دیکھنا"

عرضِ خاکسار:۔ افسوس سیماب صاحب کو اصلاح کی دھن میں ہر استاد کے شعر کا ہر ضروری لفظ غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔
چشمِ حسرت کو مخاطب کرکے دیکھنے میں جو لطف ہے اس کا تعلق ذوقِ سلیم سے ہے۔

۷۔ جلیل مانکپوری:۔ رنگنا یہ رخ کی اور یہ عالم نقاب کا ۔۔۔ دامن میں کوئی پھول لئے ہے گلاب کا

اصلاح امیر:۔ رنگنا یہ رخ کی اور یہ عالم نقاب کا ۔۔۔ دامن میں تم تو پھول لئے ہو گلاب کا

ارشادِ سیماب:۔ دوسرے مصرع میں "دامن" اب بھی بے جوڑ سا ہے "رنگِ رخ" اور "عالمِ نقاب" دامن میں نظر نہیں آتا۔

عرضِ خاکسار:۔ سیماب صاحب کو دامن میں جو کچھ نظر نہ آجائے وہ کم ہے "عالم" کے صحیح معنی تو نظر انداز نہیں ہو گئے ممکن ہے کہ
پہلے مصرع کے ہر دو "یہ" کو زور دیکر پڑھنے سے "عالم" کے معنی صاف ہو جائیں اور "عالمِ نقاب" دامن میں نظر نہ آئے۔

۸۔ کوثر حیدرآبادی:۔ کہا جو اُن سے عنایت کبھی کبھی ہوگی ۔۔۔ بگڑ کے بولے اگر جان پر بنی ہوگی

اصلاح امیر:۔ کہا جو اُن سے عنایت کبھی کبھی ہوگی ۔۔۔ تو ہنس کے بولے کہ جب جان پر بنی ہوگی

ارشادِ سیماب:۔ پہلے مصرع میں "کبھی" کی تکرار خلافِ مفہوم ہے، پوچھنا یوں چاہئے تھا کہ "مجھ پر بھی کبھی عنایت ہوگی؟" یا
"مجھ پر کب عنایت ہوگی؟" مصرع اس طرح بدل دیا جاتا تو یہ عیب بھی نکل جاتا "کہا جو اُن سے عنایت کب آپ کی ہوگی؟"

عرضِ خاکسار:۔ تکرار خلافِ مفہوم کی ایک ہی رہی، کیا پوچھنے کا یہ طریقہ نہیں ہو سکتا ہے کہ "مجھ پر کبھی کبھی تو آپ کی عنایت ہوگی؟"
لکھنوی اساتذہ اس قسم کی تکرار خلافِ مفہوم جائز رکھتے ہیں۔

۹۔ افسر امروہوی:۔ یا اُن کی جستجو میں ہے یا آرزو میں ہے ۔۔۔ دو حال سے نہیں کوئی خالی زمانے میں

اصلاح شوق قدوائی:۔ یا اُن کی جستجو میں ہے یا اُن کی یاد میں ۔۔۔ دو حال سے نہیں کوئی خالی زمانے میں

ارشادِ سیماب:۔ شعر میں تقابلِ ردیفین کا عیب جو اصلاح کے بعد پیدا ہوا ہے اس کی اصلاح اب کون کرے

عرضِ خاکسار:۔ وہی جو عیب جوئی میں کامل ہو، لیکن سیماب صاحب اس غزل کے مطلع کو ایک بار پھر گنگنا کر اصلاح دیں۔

اپنی حیات چند نفس ہے زمانے میں ۔۔۔ گذرے قفس کے گوشے میں یا آشیانے میں

ہاں کیا اچھا ہو کہ سیماب صاحب ذیل کے تقابلِ ردیفین بھی دور فرما کر اس ناچیز کو بذریعہ رسالۂ ہذا مطلع فرمائیں:۔

آتش:۔ ہستی کا داغ دھو جو تلاشِ حیات ہے ۔۔۔ نقشِ خودی مٹا جو تمنا نشاں کی ہے

امیر:۔ لپٹ کے تم سے تصور میں کوئی سوتا ہے ۔۔۔ کدھر خیال تمہارا ہے کچھ خبر بھی ہے

فصیح الملک داغ مرحوم شاید تقابلِ ردیفین کے عیب سے واقف نہ تھے، کیا اچھا ہو اگر اُن کے لائق شاگرد جناب سیماب
اکبرآبادی اُن کی دی ہوئی اصلاح پر زحمتِ اصلاح گوارا فرمائیں:۔

احسن :- سب سمجھتا ہوں رقیبوں کے کنائے حضرت   مجھکو نادان نہ سمجھے کوئی انجانوں میں

اصلاح داغ :- سب سمجھتا ہوں رقیبوں کے کنائے دل میں   مجھکو نادان نہ سمجھے کوئی انجانوں میں

احسن :- ہائے پڑجاتے ہیں ناسور ہمارے دل میں   ایسا کچھ زہر بھرا ہے ترے نشتر کانوں میں

اصلاح داغ :- گھر سے پڑجاتے ہیں ناسور ہمارے دل میں   ایسا کچھ زہر بھرا ہے ترے مژگانوں میں

خیر داغ تو پھر داغ ہی تھے۔ سیماب صاحب نے دانستہ یا نادانستہ اس عیب کو اپنے شاگرد کے یہاں باقی رہنے دیا:-

شفق ٹونکی :- خود اپنے حال پر رہ کے اب افسوس ہوتا ہے
الٰہی کیا سے کیا اب دل کی حالت ہوتی جاتی ہے

اصلاح سیماب :- خود اپنے حال پر اب تو مجھے افسوس ہوتا ہے
الٰہی کیا یہ میرے دل کی حالت ہوتی جاتی ہے

کیا اچھا ہو کہ سیماب صاحب خود اپنی اصلاح ملاحظہ فرمائیں جو بطور موازنہ دستور الاصلاح کے صفحہ آخر پر درج ہے۔

شوق سندیلوی :- ہماری خاک اڑاتی ہے پیچ دے کے ہوا
ہنوز رنگِ اثر عشق زلفِ یار میں ہے

اصلاح سیماب :- دھواں بھی شمع لحد کا مری پریشاں ہے
ہنوز رنگِ اثر عشق زلفِ یار میں ہے۔

کلامِ صدر

(از مسٹر صدر الاسلام صدر۔ ڈی۔ ایس۔ پی)

کیا ہے دعوائے شورِ الفت نبے جو دم پر تو دل لگی ہو
جتائے دیتے ہیں تجھکو اے دل کہیں نہ بیکار کی ہنسی ہو

وفا کا شیوہ رہا نہ باقی، بھلایا اندازِ دوستی کو
کہوں میں دنیا میں کس سے جاکر شریکِ احوالِ بیکسی ہو

اسی میں روحانیت ہے پنہاں، یہی طریقہ نجات کا ہے
وفا میں ہم کو بتا رہے ہیں عدو سے اندازِ دوستی ہو

ملالِ فرقت بدل گوارا فنائے ہستی ہے عینِ عشرت
وہی تو جوہر ہے زندگی کا کہ جس عمل میں تری خوشی ہو

تڑپتوں پر ہو سوزِ فرقت تو ٹھنڈی سانسیں بھی روکے رہنا
چلے نہ دامانِ صبر ہرگز جو آگ دل میں دہک رہی ہو

اگر ہو راضی کہ غم اٹھائیں تو غم کی ہم کو ہے شادمانی
وہی خوشی ہے ہمارے دل کی کہ تم کو جس بات کی خوشی ہو

وفا کا دعویٰ کیا ہے ہم سے تری رضا پہ بھروسہ کرکے
نہیں ہے پروا ذرا بھی اسکی خدائی بھر کو جو دشمنی ہو

دوائے صحت یہی ہے اے دل عمل کریگا تو خیر ہوگی
بتائے دیتے ہیں اُف نہ کرنا کھٹک ذرا بھی جو درد کی ہو

چلے ہو محفل میں اونکی اے صدر جگہ بھی پاؤگے بیٹھنے کی
کہیں نہ قسمت پھرے پہ نکلکر تو کیا ہی غیرت میں دل لگی ہو

"وہ خط"

(سید مقبول حسین احمدپوری، بی اے۔ ایل ایل بی)

تحریر نہیں، کیف کی تصویر تھا وہ خط!

ہر لفظ پہ ہوتی تھی دھڑک دِل کی مرے تیز
تھی اُس میں لکھی ایسی ہی رُودادِ جگر بیز

کیا اُسمیں لکھا تھا؟ نہ کہونگا یہ کسی سے
کیا اُسمیں اثر تھا؟ مجھے مطلب ہے اِسی سے

ہاں، پڑھکے وہ تحریر، وہ دنیا نظر آئی
اُمید نے بھی خواب میں جو دیکھ نہ پائی

خود جیسے محبت نے کہا زیرِ تبسم،
"ہو خوب جو اِس آن ملیں خوب سا ہم تم

یوں آج کوئی ہم کو بہم دیکھ نہ پائے
شکوہ نہیں ہر ایک سے، غم دیکھ نہ پائے

گر کوئی حسیں روح اِدھر آئے تو رُک جائے
یوں دیکھ کے کچھ کہہ نہ سکے دُور ہی تھرّائے

سُننے لگے خاموش کوئی دُور کا گانا
ہر یاد اُسے اپنی محبت کا زمانا

اِک آہ بھرے سَرد سی، سرگرمِ فغاں ہو
اِک چیخ بھی نکلے کہ مرے دوست کہاں ہو؟"

اُس آہ سے اِک آگ کا شعلہ بھی لپک کر
گھُل جائے اُسی خواب میں کچھ دُور چھلک کر

یہ دیکھ کے ہم تم بھی بھریں آہ تڑپ جائیں
جب دل پہ رکھیں ہاتھ اُسی غم کی دھڑک پائیں

تم ہم سے کہو "سیکھ لیا قلب نے ملنا"
ہم تم سے کہیں "دیکھ لیا غم نے یہ ملنا"

غم جو کہ محبت کو بڑے ناز سے پالے
آخر میں کرے کرب کی شدت کے حوالے"

تحریر نہیں، کیف کی تصویر تھا وہ خط!

کپتان

(ایک قصہ)

(شیورانی دیوی پریم چند)

پرتاپ سنگھ پہلے سپاہی کی حیثیت سے فوج میں بھرتی ہوا، شادی کے قبل وہ ملازم ہوچکا تھا، اپنے والدین کا اکلوتا، کنتی کو بیاہ کر لایا۔ شادی کے تھوڑے ہی دن بعد وہ کپتان ہوگیا۔ کنتی سے بولا "تم بڑی نصیب ور ہو، بولو اس خوشی کے انعام میں کیا لوگی"؟

"کیا لونگی؟ یہ سوال تو بیڈھب ہے۔"

"ارے بھئی، نصیب کا کچھ تم بھی تو لوگی یا نہیں؟"

"تو آپ کچھ نہ کچھ دینا ہی چاہتے ہیں؟"

"ہاں، ہاں دینا ہی چاہتا ہوں، کیونکہ جب نوکر ہوا تھا تو کبھی میں نے کپتانی کا خواب بھی نہ دیکھا تھا۔ اب جو یہ عہدہ ملا ہے تو تمھارے ہی نصیب کی برکت ہے۔"

"پہلے یہ تو بتائیے تمنے کے ساتھ کون کون سی چیزیں شامل ہیں؟"

"کہتا تو ہوں جو چیز مانگو آج دینے کو تیار ہوں، ہاں دو چیزیں نہ مانگنا میری تلوار اور بندوق۔"

"اور اگر میں وہی مانگوں؟"

"بھئی یہ چیزیں سپاہی کی جان سے بھی زیادہ قیمتی ہوتی ہیں۔ انھیں دینے کے بعد سپاہی رہ ہی کیا جاتا ہے محض بے دست وپا، اور یہ تم کو بھی منظور نہ ہوگا۔"

"میں مذاق کرتی تھی، عورت اپنے شوہر سے انھیں مانگ بھی تو نہیں سکتی۔"

"اس کے علاوہ تمھیں سب کچھ مانگنے کا حق حاصل ہے۔"

"اول تمھارا پیار، دوسرے تمھارا نام اور جیش، اتنی ہی چیزیں مانگ رہی ہوں۔"

کنتی کے منھ پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے "تم ہونری بے وقوف، تم نے مانگا ہی کیا، بلکہ اُلٹے مجھی کو دیا۔"

"کوئی عورت اس سے زیادہ اور کیا لینے کی حقدار ہوسکتی ہے؟"

"نصیب تمھارے ہوں اور اس کا پھل میں چکھوں! سچ کنتی میں تمھیں پاکر نہال ہوگیا، اس کے آگے دنیا کی ساری چیزیں پھیکی ہیں۔" یہ کہتے ہوئے، پرتاپ نے کنتی کو گلے سے لگا لیا۔

کنتی :- "میں اپنے ہی لئے یہ سب چیزیں مانگ رہی ہوں، تمھارے لئے نہیں۔
پرتاپ :- یہ تو تمھاری سخاوت ہے، شادی کے قبل میں سوچتا تھا تم آ رہی ہو پیر کی بیڑی بننے کے لئے، گھبرا رہا تھا
لیکن تم تو ہاتھ کا ہتھیار بن گئیں، اب مجھے یقین ہے کہ میں اپنے عہدہ کی ذمہ داریاں پوری طرح نباہ سکونگا"
نباہ سکنے والی بات سُن کر کنتی کے دل میں جیسے مسوس سی پیدا ہوئی، اور آنکھوں میں آنسو جھلجھلا اُٹھے۔
پرتاپ :- ہائیں، کنتی! یہ کمزوری کیسی؟
کنتی جھینپتی ہوئی بولی "نہیں کچھ نہیں آپ فضول کہتے ہیں۔
کنتی شرمندہ ہو کر شوہر کے پاس سے اُٹھکر اندر چلی گئی، پرتاپ بھی باہر چلا گیا۔

(۲)

پرتاپ کے نام حکم آیا کہ تم لڑائی پر جاؤ، ایک ہفتہ کے اندر۔ وہ آکر کنتی سے بولا "مجھے تو حکم آگیا، جنگ پر جانا ہے افسوس کچھ دن بھی تمھارے ساتھ رہ کر زندگی کا لطف نہ اُٹھا سکا، ان کمبختوں کو لڑائی کی سوجھی ہے"
کنتی جانے کا نام سنتے ہی سراسیمہ ہو گئی "ارے! ابھی؟ ایک ہی ہفتہ کے اندر؟"
"ہاں، یہی تو میں بھی افسوس کر رہا ہوں"
"کیا یہ میرے دو دن کے عیش خواب تھے"
"تمھیں سوچو، جہاں محبت اور فرض، نام اور جنس کی خواہش ہو وہاں کیا فرض ٹھیک ٹھیک ادا ہو سکتا ہے؛ نسبت تو بزدل بنا دیتی ہے، پیاری محبت سے کوسوں دور بھاگتی ہے، اور پھر تمھاری مانگ پوری ہوگی، تم نے یہی تو مانگا تھا، تمھیں خوش ہونا چاہیئے۔ مجھے خوشی خوشی بدا کرو، اور ایشور سے دعا کرو وہ ہم دونوں کو پھر ملائے۔"
کنتی کے سینے پر جیسے بوجھ سا رکھ گیا، اپنے اوپر جھلائی، اُس نے کیوں ایسی چیزیں مانگیں جو ہم دونوں کے عیش میں حارج ہوئیں۔ ایشور سے دعا کرنے لگی کہ مجھے وہ قوت دے جس سے نِیچے گئے ہوئے الفاظ کو میں پورا کر سکوں اور میرے دیوا ایشور فتحیاب ہو کر آئیں، وہی میرے سُکھ کے دن ہونگے۔"

پرتاپ اپنے درد کو دباتا ہوا ہونٹوں پر مسکراہٹ لانا چاہتا ہے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہنسی اُس سے دُور بھاگنا چاہتی ہے کیونکہ اس کے اندر تو درد تھا، درد کے ساتھ مسکراہٹ کب رہے؟ کنتی کے گلے میں باہیں ڈالتا ہوا بولا "کنتی! تو میری شکتی ہے، اگر تم میں ذرا بھی بزدلی آئی تو سمجھ لو میں پورا بزدل بن جاؤں گا اس وقت تم محبت کو ٹھکرا دو اور فرض کو گلے لگاؤ، جس سے ہم دونوں کا بیڑا پار ہو۔"
"میں کیا کروں؟ میری آنکھوں میں آپ ہی آپ آنسو اُمڈے چلے آ رہے ہیں، مجبور ہوں، تم ٹھوکر مارو تو شاید میں اپنے فرض کو پہچان سکوں۔"

"کنتی! کیا تجھے معلوم نہیں ہے؟ مرد سب کچھ دیکھ سکتا ہے لیکن عورت کے آنسو نہیں دیکھ سکتا، وہاں وہ اور بزدل ہو جاتا ہے، اب تو میں اپنے فرض کا چیر ہو چکا ہوں، واپس آجاؤں تو سمجھنا میں تمھارا پتی ہوں۔"

"یہ تو میرے جیون کی چیز ہے اس کو بھی آپ بھلانے کو کہتے ہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"یہ تو جانتی ہو کہ فرض کا بندھن سب سے مشکل ہوتا ہے، اسی کو ہم دونوں نے اپنایا ہے۔ تو بھلا بھول کہاں ہوتا ہے جہاں خارتہ ہو، اب خوشی خوشی مجھے بدا کرو۔"

کنتی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، بولی "پھر وہی سنسان اور میں اکیلی۔"

"تمھارے بزرگوں میں جتنی دیویاں ہو چکی ہیں جن کی تم اولاد ہو، تم نے پڑھا ہوگا کہ وہ رن سے پیٹھ دکھا کر لوٹے ہوئے شوہر کا منھ نہیں دیکھتی تھیں، اور کہتی تھیں کہ میرا پتی بزدل نہیں ہو سکتا وہ تو سورگ لوک گیا، اس سے ملنے میں بھی جاتی ہوں، اور جلتی ہوئی چتاؤں میں جل جاتی تھیں۔ تم بھی انھیں کی اولاد ہو تم مجھے بزدل نہ بناؤ، پھر تم ایسے بردان مانگنے والی، نام اور جنس، نہ بزدل ہو سکتی ہو اور نہ بزدل بنا سکتی ہو، اب تم میرے جانے کی تیاری کر دو۔"

اس روز ساری رات کنتی کو چین نہیں پڑا، کیا کل وہ چلے جائیں گے؟ اور کب آئیں گے یہ بھی نہیں معلوم۔ مہینہ، چھ مہینہ یا سالوں کے لئے چلے جائیں گے۔ اسی طرح کروٹیں بدلتے ہوئے صبح ہو گئی، کنتی ایشور سے پرارتھنا کرتی تھی رات ہی رہتی دس پانچ روز تو اچھا تھا۔ رات کو کنتی کو یہ پد یاد آیا اور وہ گنگنانے لگی:۔

سجن سکارے جائینگے نین مرینگے روئے
بدھنا ایسی رین کر بھور کبھی نا ہوئے

اور بڑے بڑے رونے لگی، بڑبڑائی۔ واہ رے فرض نام اور جنس! یہ بڑی اچھی چیز اور کانٹے سے بھری ہوئی اس کا ملنا اتنا مشکل ہے۔ جب اپنے کو تپا دے اور دھول میں ملا دے تب کہیں جا کر بڑی مشکل سے نام اور جنس ماتھے پر چمکتا ہے۔

وہ سوچ سوچ کر رو رہی تھی، پرتاب کی آنکھ کھلی۔ کنتی کی حالت دیکھکر بولا "آخر تم کیا کر رہی ہو"

کنتی پھر جھینپتی ہوئی بولی "کچھ نہیں، میں جاگ اٹھی ہوں۔"

پرتاپ:۔ "ارے تم جھینپتی کیوں ہو؟ میری بھی تو وہی حالت ہے، آؤ آج مل لیں، پھر جو قسمت میں ہوگا، ہوگا۔"

اتنے میں رات کو بھیجے ہوئے موٹر سے چلنے کے لئے آواز آئی۔

"کپتان صاحب! سواری آگئی۔"

گھر کے نوکر نے بھی آواز دی "سرکار!"

ان دونوں کی آوازیں دونوں سُن رہے ہیں لیکن کسی میں جواب کی تاب نہیں ہے۔

کافی پکار کے بعد آنسو خشک کرکے منھ پر پانی کے چھینٹے دیکر پرتاپ باہر نکلا "کیا ہے بھئی؟"

نوکر:۔ "جانے کا وقت ہو گیا سرکار!"

کنتی نوکر سے سامان رکھواتی ہے خود دہی اور اکشت لاکر پرتاپ کے ماتھے پر روچنا لگاتی ہے اور پیر چھوکر کہتی ہے "سوامی فتحیاب ہوکر آنا"۔

پرتاپ خود دُکھی تھا، وہ سمجھ رہا تھا اندر کے کتنے دردوں کو چھپا کر یہ الفاظ اُس کے منھ سے نکلے ہیں۔ بولا "پریم کا کنتھ کٹھن ہے پیاری" کنتی کو گلے سے لگا لیا۔

کنتی بھی ساتھ ہی بمبئی تک پہنچانے گئی۔

دونوں ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے، مگر نہ کوئی کچھ بولتا ہے نہ ایک دوسرے سے کچھ کہتا ہے، اپنے ہی میں جیسے کھوئے ہوئے ہوں۔ اپنے آپ کو قابو میں لانے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن ہمت ان سے کوسوں دُور بھاگ رہی ہے۔ گاڑی میں اور بھی ہم سفر ہیں آپس میں کانا پھوسی کر رہے ہیں "یہ جیسے ہیں ایک ہی گھر کے دونوں"۔ ایک نے پرتاپ سے پوچھا "کہاں جا رہے ہیں صاحب؟"

پرتاپ غافل سا بولنے کی خواہش نہ ہوتے ہوئے بھی بولا "باہر"

مسافر:۔ "آپ کے ساتھ یہ کون ہیں؟"

پرتاپ جھنجھلا اُٹھا، بولا "تمھاری نگاہ میں کون ہو سکتی ہیں؟"

مسافر:۔ "بہن بھی ہو سکتی ہیں، بیوی بھی"

پرتاپ جھنجھلا کر بولا "ساتھ ہی تمھاری کھوپڑی بھی اُلٹی ہے"

مسافر:۔ "صاحب، کھوپڑی اُلٹی ہونے کے تو کوئی معنی نہیں، بہن اور بیوی کے دُکھی ہونے کا سبب ہے"۔

پرتاپ نے جواب نہیں دیا چپ ہو گیا۔

جس روز پرتاپ بمبئی پہونچا اُسی روز شام کو فوجی پاسپورٹ ملا۔ شام ہی کو جہاز سے اس کو باہر جانا ہے کنتی سے بولا "تم فضول میرے ساتھ آئیں، ایک دن بھی تو کمبخت نے یہاں ساتھ ساتھ نہیں رہنے دیا"۔

کنتی:۔ "کچھ ہوا اتنی دیر تو تمھارے ساتھ اور رہ لی، اب نہ جانے سُکھ کے دن کب ملیں گے"۔

(۳)

شام کو روانگی کے وقت کنتی بولی "کچھ کھا لو، آج میں تمھیں اور کھلا لوں"۔

دونوں ساتھ ساتھ دسترخوان پر بیٹھے لیکن کسی کے حلق سے نیچے ایک لقمہ بھی نہ اُترا۔ ہاتھ دھو دھو کر

منہ صاف کرکے دونوں اُٹھ گئے، کنتی جہاز تک پہنچانے گئی۔ جہاز کی روانگی کی گھنٹی بجی

پرتاپ: "اچھا تم اتر جاؤ اور آج ہی کی ٹرین سے گھر واپس جانا"

کنتی صرف اتنا کہہ پائی "دیکھو مجھے یاد رکھنا" اور جھک کر پرتاپ کے پیر چھوئے۔

پرتاپ: "تم میری شکتی ہو، تم ہمیشہ میرے ساتھ ہو"

کنتی جہاز سے اتر آئی اور کھڑی ہو کر اُسی طرف دیکھتی رہی جدھر جہاز جا رہا تھا۔ اپنی آنکھوں پر اُسے غصہ آرہا تھا یہ کمبخت اُسے دیکھنے بھی تو نہیں دے رہی ہیں، تا حدِ نظر جہاز کو دیکھتی رہی جب آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تو اسی جگہ سر پکڑ کر بھولی بھٹکی سی بیٹھ گئی۔ یکایک گاڑی یاد آئی وقت دیکھا۔ فوراً بھاگی ہوئی اسٹیشن آئی، دوسرے دن اپنے گھر پہونچ گئی۔

جس دن سے گھر آئی نہ کہیں آنا نہ جانا، نہ راگ نہ رنگ، جو کچھ ہوتا روکھا سوکھا کھاتی اور پرتاپ کی تصویر پر مالا چڑھاتی اور اسی کی پوجا کرتی ہے۔

پرتاپ کی چٹھی پہونچنے کی آئی، اس چٹھی کو سینے سے لگا کر کنتی گھنٹوں روتی رہی، بہت روئی شاید اس قدر پرتاپ کے سامنے نہ رو پائی تھی، اُس وقت خوف تھا اور پھر اُنھیں رخصت کرنا تھا، اب چاہے جتنا رولے کوئی ہٹنے والا نہیں اور نہ کوئی کام ہے۔ خادمہ نے آکر آواز دی "چل کر کھانا کھا لیجئے"۔ ڈرتے ڈرتے خادمہ نے یہ بھی دریافت کیا "کیا سرکار کی چٹھی آج آئی ہے، سرکار؟"

کنتی: "ہاں"

خادمہ: "سرکار اچھی طرح پہونچ گئے؟"

کنتی: "ہاں!"

خادمہ: "پھر سرکار آپ رو کیوں رہی ہیں؟ بھگوان چاہیں گے تو سرکار پھر اچھی طرح واپس آئیں گے"

کنتی: "مہری! آنا جانا تو بھگوان کے ہاتھ ہے، اپنی طبیعت نہیں مانتی، میں چاہتی تھوڑے ہی ہوں کہ روؤں مجھے تو ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ ہمت مجھ سے گھبرا رہی ہے، آنکھوں کو مجھ سے دشمنی ہو گئی ہے۔

خادمہ: "سرکار! گھبرانا نہیں چاہیئے، بھگوان چاہیں گے تو سرکار اس سے بھی بڑے حاکم ہو کر آئیں گے"

کنتی اس اچھے دن کا جیسے خواب سا دیکھنے لگی، خادمہ اُٹھ کر باہر چلی گئی۔

(۴)

اس طرح تین مہینے کے دن کنتی نے کسی طرح تمام کئے، چوتھے مہینے کپتان کی موت کی خبر ملی۔

اس کے دوسرے روز ایک فوج کے افسر کا خط پہونچا جس میں پرتاپ کی بہادری کے کارنامے درج تھے۔ ایک

پرتاپ کے انعام کا تمغہ اور دس ہزار روپیہ کے نوٹ بھی تھے۔ صاحب ضلع مجسٹریٹ خود یہ انعام دینے آئے

پرتاپ کی موت کی خبر سُنتے ہی کنتی کے سر پہ فرض کا بوجھ آپڑا، آخر اس کا فرض کیا تھا؟ خود بخود بڑبڑانے لگی،

"تم نے تین وعدے کئے تھے، تینوں کو پُورا کیا، تم بہادر ہو، اب میرا فرض کیا ہوتا ہے؟ میرا بھی تو کچھ فرض ہے، ہاں جس کو تم نے اچھا سمجھا یا اپنایا، اب وہی راستہ میرے لئے بھی سب سے عمدہ ہے۔

(۵)

صبح کے وقت ضلع مجسٹریٹ آیا دس ہزار روپیئے اور تمغہ لیکر۔ کنتی بولی "اس تکلیف کے لئے آپ کا بہت بہت شکریہ"

ضلع مجسٹریٹ:۔ "تمھارے شوہر نے ہماری فوج کو فاتح بنایا ہے، اس سلسلہ میں سرکار بہادر نے دس ہزار روپیہ اور یہ تمغہ انعام دیا ہے، آپ اسے قبول کیجئے، آپ کو بھی زندگی بھر پنشن ملتی رہیگی۔"

کنتی:۔ "صاحب! میرے سوامی کو تو اسی وقت انعام مل گیا جس وقت اُن کی فوج فتحیاب ہوئی۔ نام کا تمغہ بھی اُسی وقت مل گیا، اب یہ سب کیا ہے؟

ضلع مجسٹریٹ:۔ "سرکار بہادر نے آپ کے شوہر سے خوش ہو کر یہ انعام آپ کے لئے بھیجا ہے۔"

کنتی:۔ "سرکار! جس سرزمین پر انھوں نے جنم لیا تھا اُسی پر اُسے خیرات کر دیجئے، اور جو پنشن آئے وہ وہیں کے غریبوں میں تقسیم کر دی جائے، یہی میری آرزو ہے آپ سے۔"

صاحب مجسٹریٹ کے ہاتھ سے تمغہ لیکر بولی "یہ میری چیز ہے، اسی کے لئے میں نے اتنا بڑا ایثار کیا ہے، ایک آرزو میری آپ سے اور ہے۔ میری جائداد کی کل آمدنی آپ ان غریبوں کو بانٹتے رہیں۔ اس کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیکر غریبوں کی مدد کرتے رہیں، مَیں نے جو کچھ اپنے پتی دیو سے مانگا تھا وہ سب کچھ مل گیا، اور یہی میرے لئے بنیادی چیز ہے۔"

لوگوں نے کنتی کو محبت میں پاگل سمجھا

وہ گھر سے نکل گئی اور یہی الفاظ ہر وقت اُس کی زبان پر تھے:۔

"پریم کا پنتھ کٹھن ہے پیاری"

(مترجمہ بیخود غازیپوری)

تصحیح "زمانہ" بابت مئی ۱۹۶۲ء کے صفحہ ۲۵۴ پر "جذبات منور" کے عنوان سے منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی کی جو غزل شائع ہوئی ہے اسکے ساتویں شعر کا پہلا مصرعہ غلط شائع ہوگیا ہے "تو نے تعزیر جو کی ہے تو یہ میری مرضی" کے بجائے صحیح مصرعہ یہ ہے "تو نے تعزیر جو کی ہے تو یہ تیری مرضی" ناظرین درست فرمالیں۔ (ا۔ ز)

تنقید کتب

شمیم عشرتؔ

بزرگوں کا احترام تو ایک عام جذبہ ہے مگر سید حسن امام صاحب ایڈیٹر ندیمؔ گیا نے جس محبت و حسن عقیدت کے ساتھ اپنے استاد حضرت عشرتؔ گیاوی مرحوم کا مجموعۂ کلام شائع کیا ہے وہ آپ ہی اپنی نظیر ہے۔ تقریباً چوتھائی صدی تک وہ اس قابل قدر مجموعے کو اپنے سینے سے لگائے رہے اشاعت کی فکر میں منہمک رہے مگر آپ کے حسب منشا انتظام نہ ہو سکا۔ آخر آپ کی دلی عقیدت کے سامنے تمام مشکلات حل ہو گئیں۔ اور اب شمیم عشرتؔ کے نام سے سید احمد علی صاحب عشرتؔ مرحوم رئیس گیا کا خوبصورت دیوان ہمارے سامنے ہے۔ اس کی اعلیٰ کتابت نفیس طباعت اور عمدہ دبیز کاغذ سید حسن امام صاحب کی ادبی اُولوالعزمیوں کا ایک دلخوش کن نمونہ ہے۔

حضرت عشرتؔ مغفور ایک کہنہ مشق اور پُرگو شاعر تھے، جو شعر کہتے نہایت مضبوط کہتے تھے، اور پچھلے دور کی اُردو شاعری کی تمام خوبیاں آپ کے کلام میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ بندش چست ترکیبیں درست، زبان صاف، تخیل عمدہ۔ آپ کی شاعری کا رنگ لکھنؤ اسکول سے ملتا جلتا ہے اور آپ کی غزلیں زیادہ تر اسی قسم کی ہیں۔ لکھنؤ کے مشہور و مستند گلدستوں میں (جیسے پیام یار، پیام عاشق وغیرہ) میں شائع ہوا کرتی تھیں ادھر اُدھر سے دو چار شعر نمونۃً پیش کئے جا سکتے ہیں:-

کوچۂ زلفِ پریزاد سے کیا آتی ہے
تجھ میں بُو مشک کی اے بادِ صبا آتی ہے

پلکیوں کا پئے تعظیم لبوں پر ہے ہجوم
یاد گر آپ کی ہنگامِ فنا آتی ہے

فروغِ حسن، عروجِ شباب دیکھے کون
یہ دوپہر کا چڑھا آفتاب دیکھے کون

فراقِ یار و غمِ روزگار و فکرِ نجات
ہیں ایک جان پہ کیا کیا عذاب دیکھے کون

یا کو قبول خشتِ سرِ رہگذر کی چوٹ
سودا ئے سر کو بھائی ترے سنگِ در کی چوٹ

ناکام کچھ سُننے جو لبِ نامہ بر سے حرف
پتھر سے بھی زیادہ لگی اس خبر کی چوٹ

کہاں سے آتے ہو، اُترا ہے چہرہ، خیر تو ہے
جبیں پہ ہے عرقِ انفعال، کیا باعث؟

اسی شعر کے ساتھ یہ مشہور شعر بھی ملاحظہ ہو:-

نہ ہم سمجھے نہ آئے تم کہیں سے
پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے

عشرتؔ مرحوم نے فارسی زبان میں بھی شعر کہے ہیں مگر اس میں بھی ان کا وہی رنگ ہے جو اُردو کلام کا ہے۔ نمونہ کے لئے ایک غزل کے دو شعر ملاحظہ ہوں:-

---

(۱) مجموعۂ کلام سید احمد علی عشرتؔ مرحوم رئیس گیا۔ مرتبہ سید حسن امام ایڈیٹر "ندیم" گیا۔

بدل داغِ فراقِ مہ جبین است — بسر سودائے زلفِ عنبرین است
الٰہی بلبلِ دل را نگہدار — کہ صیاد نگاہش درکمین است

شروع میں فاضل مرتب نے حضرت عشرت کے سوانح حیات بھی لکھے ہیں اور فوٹو بھی دیا ہے، حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ قدیم تہذیب کی زندہ مثال تھے اور انکسار اُنکا طبعی جوہر تھا تعلّی نام کو نہ تھی۔ اور شہرت پسندی سے متنفر تھے حضرت عشرت نے ساٹھ سال کی عمر پاکر ۱۵۔ دسمبر ۱۹۱۸ء کو انتقال فرمایا۔ گویا یہ کلام نصف صدی پہلے کے زمانہ کا ہے۔ چنانچہ اُسی زمانہ کے ماحول کو پیشِ نظر رکھکر اس کلام کو ملاحظہ کرنا چاہیئے۔ "شمیم عشرت" نام سے تاریخ اشاعت دیوان ۱۳۶۰ھ نکلتی ہے۔ اس کی ضخامت ۲۸۳ صفحات ہے۔ استاد کے ساتھ سید حسن امام کے حسن ارادت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ یہ انمول مجموعہ عام فروخت کے لئے شائع نہیں کیا گیا ہے اور شائقین ادب کی قدر دانی ہی اس کی قیمت ہے۔

شیخ و برہمن[1]

ڈاکٹر اعظم اُردو افسانہ نگاروں کی حیثیت سے کسی خاص تعارف کے محتاج نہیں، اُن کا حلقۂ تحریر بھی بہت وسیع رہا ہے ہندوستان کا شاید ہی کوئی قابلِ ذکر رسالہ ایسا ہو جس میں ڈاکٹر اعظم کریوی کے افسانے شائع نہ ہوئے ہوں۔ خود "زمانہ" میں بھی اُن کے اکثر افسانے شائع ہوکر مقبول ہو چکے ہیں۔

اس میں کیا شک ہے کہ ہندوستان کی روح دیہات ہی میں پائی جاتی ہے شہر کے دولتمند اور صاحب ثروت لوگ اس ملک کے صحیح نمائندہ نہیں۔ اصلی نمائندے وہ ہیں جنھیں دوسرے ملکوں والے بلکہ خود ہندوستان کے شہری بھی بہت کم جانتے ہیں منشی پریم چند آنجہانی نے دیہاتی زندگی کے متعلق افسانے لکھے اور خوب لکھے۔ اُن کی پیروی کچھ صاحبوں نے کی لیکن انہوں نے بہت جلد ہی وہ شاہراہ چھوڑ دی کیونکہ یہ اُن کے بس کی بات نہ تھی، بعضوں نے دو چار سال نبھایا لیکن بعد میں ظاہر ہے کہ بعض دیہاتوں سے متعلق افسانے لکھتے رہے۔ حالانکہ وہ محض نقل تھی۔ دیہات کی زندگیوں کی ترجمانی سے انھیں دور کا بھی تعلق نہ تھا۔

البتہ ڈاکٹر اعظم نے اس راہ کو اختیار کیا، اس پر قائم رہے اور آپ کامیابی کے ساتھ نبھاتے جا رہے ہیں۔ اُن کی کہانیوں میں دیہات کی سسکتی بلکتی زندگیاں، وہی بھدے قہقہے، وہی بے تکلف مسکراہٹیں، تصنع سے عاری عادتیں ملتی ہیں۔ وہی معمولی درجے کے خیالات جو غریب اور اَن پڑھ دیہاتیوں کے دماغ میں پرورش پا سکتے ہیں ہر جگہ آشکار ہوتے ہیں، اور اسلئے ہم ڈاکٹر اعظم کی کہانیاں پڑھتے وقت خود کو دیہات کے جاہل اور گنوار لوگوں کے ہجوم میں گھرا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ یہ جاہل اور گنوار بڑے سچے لوگ ہوتے ہیں اور شرافت اور محبت اُن کی فطرت میں داخل ہے۔ میلے کپڑوں کے نیچے ان کے دل صاف اور آئینہ جیسے شفاف ہیں ساری باتیں ہمکو ڈاکٹر اعظم کی کہانیوں میں جن کا ایک دلچسپ اور خوبصورت مجموعہ "شیخ و برہمن" کے نام سے دانش محل لکھنؤ نے شائع کیا ہے خوب نظر آتی ہیں۔ سب قصے اپنی اپنی جگہ دلکش ہیں۔ ناظرین انھیں پڑھیں اور دیہات کی سماجی زندگی کا مطالعہ کریں۔ موجودہ گرانی کے زمانے میں دو روپیے قیمت زائد نہیں کہی جا سکتی ہے۔

---

[1] ملنے کا پتہ۔ کتاب خانہ دانش محل۔ امین الدولہ پارک لکھنؤ

رفتارِ زمانہ

۸۔اگست کو بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے جو ریزولیوشن پاس کیا اُس کا لُب لباب یہ ہے کہ برطانیہ ہندوستان میں اپنی حکومت اور اختیارات سے دست کش ہو کر ملک کی کامل آزادی کا مطالبہ پورا کر دے تاکہ آزاد ہندوستان پوری قوت اور جوش کے ساتھ اپنی حفاظت کا انتظام کر سکے، اور حملہ آوروں کی زد سے بچنے اُن کو شکست دینے اور جمہوریت کا بول بالا رکھنے میں برطانیہ۔ روس۔ امریکہ اور چین کا ہاتھ بٹا سکے اور اُن کی کمک پر تیار ہو جائے۔ ہندوستان میں فوراً عارضی طور پر ایسی خودمختار قومی حکومت قائم کی جائے جس میں ملک کی سب پارٹیاں شامل ہوں نیز حکومت برطانیہ اور دوسرے ساتھی ملکوں سے ایسا عہد و پیمان کرے جس سے ہندوستان پر اُن کی امداد اور جرمنی اور جاپان کے خلاف جنگ کرنا عائد ہو۔ بعد ازاں یہ عارضی حکومت سب پارٹیوں کے مشورے اور رضامندی سے کانسٹیٹیوئنٹ اسمبلی کے ذریعہ ہندوستان کا نیا آئین حکومت تجویز کرے جس کی صورت ایسے فیڈریشن کی ہو جس میں تمام شامل ہونیوالے صوبے خودمختار ہوں اور مرکزی حکومت اور صوبوں کے اختیارات کے علیحدہ علیحدہ طے ہو جانے کے بعد بقیہ اختیارات جو کچھ بھی ہوں مرکزی حکومت کے بجائے خودمختار صوبوں کے اختیار میں ہوں۔ ریزولیوشن میں یہ بھی صاف صاف کہدیا گیا ہے کہ ہندوستان کی کامل آزادی کے مطالبہ سے یہ مراد نہیں ہے کہ برطانوی یا امریکی فوجیں جو اس وقت ہندوستان میں موجود ہیں وہ ہٹالی جائیں۔ کانگریس نے اس ریزولیوشن میں اس بات کا بھی اعلان کیا ہے کہ کانگریس حکومت کی خودمختاری یا تمام قوت و اختیارات صرف اپنے لئے حاصل کرنا نہیں چاہتی بلکہ وہ اس میں سب کو شامل رکھنا چاہتی ہے۔

ریزولیوشن کے آخر میں یہ کہا گیا ہے کہ اگر ہندوستان کی کامل آزادی کا مطالبہ منظور نہ کیا جائیگا تو کانگریس مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں وسیع پیمانہ پر سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دے گی۔

مولانا ابوالکلام آزاد صدر کانگریس نے اس ریزولیوشن کی توضیح کرتے ہوئے یہ بتایا کہ کانگریس کے مطالبۂ آزادی کے یہ معنی پہنانا کہ ہم ملک میں کسی قسم کی حکومت برقرار نہیں رکھنا چاہتے یا بدامنی پھیلانا چاہتے ہیں ایک صریح بہتان ہے۔ در اصل ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کا طرز حکومت بدل جائے اور حکومت کے تمام اختیارات برطانیہ کے بجائے ہندوستان کے ہاتھ میں آ جائیں۔ مولانا آزاد، پنڈت جواہرلال نہرو اور مہاتما گاندھی نے اس ریزولیوشن کے متعلق کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ کانگریس ملک کے مطالبۂ آزادی کے متعلق امریکہ۔ روس اور چین سے اپیل کریگی اور مہاتما جی خود حضور وائسرائے سے گفت و شنید کریں گے، لیکن اگر اس میں کامیابی نہ ہوئی تو پھر سول نافرمانی کی جنگ چھیڑی جائیگی۔

یہ ریزولیوشن ۸۔اگست کی شام کو کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں منظور ہوا، اور ۹۔اگست کی صبح ۵ بجے مہاتما گاندھی مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہرلال نہرو، سردار پٹیل اور دوسرے کانگریس کے لیڈران اور تقریباً دسو ممبران کمیٹی گرفتار کرلئے گئے، اور کانگریس اور اسکی تمام کمیٹیاں غیر قانونی مجلسیں قرار دیدی گئیں، اور مختلف صوبوں میں کانگریس کے ممبران سیکڑوں کی تعداد میں گرفتار کرلئے گئے۔ ان گرفتاریوں پر بمبئی اور تمام بڑے شہروں میں پہلے تو غم و غصہ کے اظہار میں جلوس وغیرہ کی صورت میں مظاہرے کئے گئے، جب پولیس نے انکی روک تھام کرنا چاہی تو بلووں اور فساد کی نوبت آئی۔ اس وقت صحیح صحیح اور مفصل حالات

معلوم کرنا تو ممکن نہیں لیکن جو خبریں اخبارات میں شائع ہوتی ہیں یا سرکاری اعلانوں میں بیان کی جاتی ہیں اُن سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ ملک بھر میں سخت ہنگامہ اور شورش برپا ہے۔ اور کم و بیش سبھی صوبوں کی حالت ابتر ہے اور گو اب شورش اور ہنگامہ شہروں میں کم ہو گیا ہے لیکن قصبوں اور دیہات کی حالت ابھی تک قابلِ اطمینان نہیں ہوئی ہے۔ ایک طرف سے پولیس کی چوکیوں، ڈاکخانوں، ریلوے اسٹیشنوں اور سرکاری عمارتوں پر حملے کئے جا رہے ہیں، ریل کی پٹریاں اور تار کے کھمبے اُکھاڑے جا رہے ہیں، دوسری طرف سے لاٹھیاں اور گولیاں برسائی جا رہی ہیں۔ سرکار کا مالی نقصان اور رعیت کا جانوں کا نقصان ہو رہا ہے۔ کہیں کہیں پولیس افسروں کی جانیں بھی ضائع ہوئی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ آگ اب پھیلنے سے رُکی جا رہی ہے بلکہ بجھتی جاتی ہے لیکن ابھی تک فسادوں اور ہنگاموں کی روزانہ ہی خبریں شائع ہو رہی ہیں۔ غرض ملک کی حالت سخت انتشار کی ہے۔ ہمارا ملک ہمیشہ سے صلح و آشتی اور میانہ روی کیلئے مشہور رہا ہے ہم آئینی جد و جہد کے حامی رہے ہیں اور ہمارا عقیدہ ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ سیاسی گتھیوں کے سلجھانے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ باہمی گفت و شنید اور مشورے و مصالحت سے کام لیا جائے ہم انسانی مجبوریوں اور اپنی کمزوریوں کو مدنظر رکھتے ہوئے سول نافرمانی یا ستیہ گرہ کو ملک کیلئے نقصان دہ سمجھتے ہیں اور اسکی حمایت نہیں کر سکتے۔ عوام غم و غصہ کے جوش میں آپے سے باہر ہو کر جہاں جہاں فساد و ہنگامہ یا خون خرابہ پر اُتر آئے ہیں ہم اسکو نہ صرف قابلِ تعزیر سمجھتے ہیں بلکہ ہمکو یقین ہے کہ جو لوگ ایسا کر رہے ہیں وہ کانگریس سے ہمدردی کرنیکے بجائے اُسکی بدنامی کا باعث ہو رہے ہیں ان حرکتوں سے مہاتما گاندھی کو بیحد دُکھ پہونچنے کا اندیشہ ہے کیونکہ یہ سب جو کچھ ہو رہا ہے انکے اہنسا کے بنیادی اصول کے صریحاً خلاف ہے۔ نہ صرف یہی بلکہ ان فسادوں اور خون خرابہ سے بجائے اسکے کہ ہم سرکار کو اپنے مقاصد کی منظوری پر مجبور کر سکیں اسکا اندیشہ زیادہ ہے کہ ہم اپنی ہی قوم اور لوگوں کو زیادہ نقصان پہونچائیں جسکا پورا کرنا آسان نہ ہو۔ خصوصاً اس وقت ابتری و بدامنی پھیلنے سے اس بات کا پورا خوف ہے کہ اگر ہندوستان پر جاپان کا حملہ ہو گیا تو سرکار اور رعیت دونوں کیلئے اسکا مقابلہ کرنا دشوار ہو جائیگا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہم برطانیہ سے اپنی آزادی حاصل کرنیکے بجائے جاپان کی غلامی کا طوق اپنے گلے میں ڈال لیں۔ اس لئے ہم اپنے قومی بھائیوں سے اس بات کی اپیل کرینگے کہ وہ اس بیان پر توجہ دیں جو شریمان مالوی جی نے اخباروں میں شائع کرایا ہے ہمارا فرض ہے کہ ہم قوم کے سرتاج کی لاج رکھیں اور مہاتما گاندھی کے دل پر کوئی ایسی چوٹ نہ لگنے دیں جس سے پھر ہمیں اُنکے درشن ہی غیر ممکن ہو جا[ئیں]

جس دن کانگریس کمیٹی نے بمبئی میں کامل آزادی کے مطالبہ کا ریزولیوشن پاس کیا اُسی روز سرکارِ ہند نے اسکے جواب میں ایک مفصل بیان شائع کیا جسمیں کانگریس کے خلاف بہت کچھ کہا گیا ہے مگر اس پر بحث کرنا بے سود ہوگا۔ مختصراً گورنمنٹ کا جواب یہ ہے کہ موجودہ جنگ کے ختم ہونے پر ہندوستان کو جسمیں صرف کانگریس بلکہ تمام پارٹیاں شامل ہونگی اسبات کا موقع دیا جائیگا کہ وہ اپنے حسبِ منشا خود مختار حکومت کا نیا آئین حکومت تجویز کرے۔ دوسرے الفاظ میں اسکے معنی یہ سمجھنا چاہیئے کہ جنگ کے بعد ہندوستان کو خود مختاری حاصل ہو جائیگی اور وہ آزاد ہو جائیگا۔ ظاہرا بات معقول ہے۔ اگر ہم پچاس برس سے ملکی خود مختاری اور آزادی کا انتظار کرتے رہے تو دو چار برس اور بھی انتظار کر لینا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اگر اتنی ہی بات ہوتی تو گورنمنٹ کا رویہ قابلِ الزام نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن گتھی یہ پڑ گئی ہے کہ گورنمنٹ برطانیہ بعد از جنگ کی رٹ تو برابر تین سال سے لگائے ہوئے ہے لیکن کانگریس یا دوسرے ہندوستانی قوم پرست جو کچھ کہتے یا سمجھاتے ہیں اُسکے سُننے یا سمجھنے سے انکار کرتی ہے یا اَن سُنا کر کے ٹال دیتی ہے۔ اس وقت محض ہندوستان کی خود مختاری یا آزادی کا سوال نہیں ہے بلکہ سوال یہ ہے کہ ہندوستان کو جاپان یا جرمنی کے حملہ سے کس طرح محفوظ رکھا جائے اور جمہوریت کا بول بالا رکھنے کیلئے ہندوستان کس طرح دل و جان سے چین و روس، امریکہ اور برطانیہ کا ہاتھ بٹائے۔ نہ صرف کانگریس بلکہ ہندو سبھا، لبرل فیڈریشن، نان پارٹی کانفرنس، کسان سبھا، ٹریڈ یونین کانگریس، مختلف ہندوستانی چیمبر آف کامرس اور سبھی ہندوستانی نیشنلسٹ فریق اور گروہ اس پر متفق الرائے ہیں کہ اگر جنگ میں ہندوستان کی پوری امداد و دلی ہمدردی کی ضرورت ہے تو وہ اسی طرح ممکن ہو سکتی ہے کہ ہندوستانی

رعیت کو اس بات کا یقین ہو جائے کہ وہ اپنے ملک کی حفاظت اور جمہوریت اور آزادی کی حمایت میں اپنا خون بہائیں گے۔ اور وہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ حکومت پر انکو قابو اور اختیار ہو۔ حکومت اُنکی ہو اور جنگ کے جیتنے کیلئے جو طرزِ عمل وہ ضروری اور مناسب سمجھتے ہیں اُسکا عملدرآمد کرسکیں، یہ بدگمانی اُن کے دل سے ہٹ جائے کہ وہ محض برطانیہ کے ہاتھوں میں کٹ پتلیوں کی طرح ناچ رہے ہیں۔

کانگریس کا مطالبۂ کامل آزادی اس وقت فوراً پورا کیا جا سکتا ہے کہ نہیں یا اسکا پورا کرنا مناسب اور ممکن بھی ہے اس پر ہم یہاں بحث نہیں کرینگے۔ سردست ہم یہ مانے لیتے ہیں کہ کانگریس کا یہ مطالبہ انتہا پسندی کا جوش ظاہر کرتا ہے، ہم یہ بھی ماننے کو تیار ہیں کہ اس وقت سول نافرمانی کی تحریک کا چھیڑنا ناعاقبت اندیشی کی بات اور انتہائی مایوسی کا مشورہ ہے، مگر سوال یہ ہے کہ اس وقت فوراً ہندوستان میں خود مختار قومی حکومت قائم کرنے میں کیا قباحت ہے؟ اور گورنمنٹ کا رویہ اس بارے میں کیا ہے۔ مطالبہ یہ ہے کہ گورنر جنرل کی کونسل میں تمام تر ہندوستانی ممبر ہوں۔ فائننس۔ ہوم۔ ڈیفنس کے محکمے بھی ہندوستانیوں کے اختیار میں ہوں۔ وائسرائے اپنی وزارت یعنی کونسل کی رائے کے پابند ہوں وزیر ہند کو مداخلت بیجا کا کوئی اختیار نہ ہو۔ وائسرائے کی کونسل میں سب پارٹیوں کے ممبر شامل ہوں، کتنے ممبر کس کس پارٹی کے ہونگے اسکا تصفیہ کانگریس مسلم لیگ۔ ہندو سبھا باہمی سمجھوتہ سے کر سکتی ہیں۔ برطانیہ کو اس امر کا اطمینان دلانے کیلئے کہ جنگ کی کوشش اور امداد میں کوئی خلل نہیں پڑیگا یہ بات طے شدہ سمجھی جائے کہ فوج کے اختیارات اور جنگی حکمت عملی کمانڈر انچیف اور برطانیہ کی جنگی وزارت کے قابو و اختیار میں ہونگے انمیں کوئی مداخلت نہ کیجائیگی۔ اسی طرح مختلف صوبوں میں بھی تمام پارٹیوں کی خود مختار اور مشترکہ حکومتیں قائم ہونگی۔"

یہ وہ مطالبہ ہے جو آج تین برس سے تمام ملک کی جانب سے کیا جا رہا ہے۔ نان پارٹی کانفرنس نے بھی یہ مطالبہ پیش کیا تھا جسمیں ایسے ایسے معززین شامل تھے جیسے سر تیج بہادر سپرو، سر این۔ این۔ سرکار۔ سر جگدیش پرشاد (جو ۱۹۴۲ء تک گورنمنٹ ہند کے ممبر رہ چکے ہیں) مسٹر ایم۔ آر۔ جیکر (جو حال ہی میں پریوی کونسلر تھے) لبرل فیڈریشن نے بھی اس مطالبہ کی تائید کی اور ہندو سبھا بھی قومی خود مختار حکومت کی حامی ہے۔ مسلم لیگ کا رویہ پاکستان اور مسلمانوں کے حصہ رسدی کے متعلق جو کچھ بھی ہو عارضی قومی خود مختار حکومت کے خلاف اُس نے بھی کچھ نہیں کہا۔ بلکہ اسکی حمایت ہی کی ہے۔ غرض کوئی فرقہ، جماعت یا پارٹی اس وقت اس وقت ملک میں ایسی نہیں ہے جو اصرار کے ساتھ قومی خود مختار حکومت کا مطالبہ نہ کر رہی ہو۔ لیکن ہماری سرکار اسکو سُنا آن سُنا کر رہی ہے۔

اس وقت کامل آزادی کے متعلق کانگریس کا مطالبۂ انتہا پسندی اور ناقابل عمل سمجھا جائے، مگر چند ہی مہینہ ہوئے جب کرپس صاحب گفت و شنید کرنے ہندوستان آئے تھے تو کانگریس نے اسی مطالبہ پر زور دیا تھا جو اور پارٹیاں اور کانفرنسیں تجویز کر رہی تھیں اور کانگریس اس بات پر رضامند ہوگئی تھی کہ ہندوستان میں دوران جنگ کے لئے عارضی قومی خود مختار حکومت قائم کر دیجائے اور آئندہ آئین حکومت کے تصفیہ کو جنگ کے بعد کیلئے چھوڑ دیا جائے۔ لیکن برطانوی گورنمنٹ اس پر رضامند نہ ہوئی اور صاف صاف کہدیا گیا کہ چاہے ملک کی سب ہی پارٹیاں اور سب فریق ایک رائے اور ایک آواز ہو جائیں لیکن فوج اور ڈیفنس کے محکمے پر ہندوستانیوں کو اختیار نہیں دیا جا سکتا۔ اس اعلان کے بعد ہندوستان کے مطالبۂ خود مختاری کا اس قدر بڑھ جانا کہ کانگریس اور مسلم لیگ ایک دوسرے سے دست بگریباں ہیں کہاں تک حق بجانب سمجھا جا سکتا ہے۔ کانگریس کا مطالبۂ انتہا پسندی کی بُری مثال ہو۔ سول نافرمانی کی تحریک کی دھمکی حکومت کیلئے ناقابل برداشت ہو مگر جو مطالبہ اعتدال پسند فریقوں اور ملک کے تجربہ کار اور ذمہ دار خیر خواہان سلطنت کی جانب سے کیا جا رہا ہے اُسکو کیوں ٹھکرایا جاتا ہے؟ اس کا جواب کیوں نہیں دیا جاتا؟ اور ہم سے یہ توقع کیجاتی ہے کہ ہم یقین کریں کہ حکومت تو نہایت نیک نیتی کے ساتھ اپنا قابو و اختیارات چھوڑنے کیلئے تیار ہے مگر یہ کمبخت کانگریس والے ہی خود مختاری اور آزادی کی راہ میں روڑے اٹکائے چلے جاتے ہیں اور کوئی تصفیہ نہیں ہونے دیتے۔ ستم ظریفی دیکھئے کہ حکومت ہند نے اپنے آخری اعلان میں صاف صاف کہدیا ہے کہ اگر کانگریس والے راہ میں روڑے نہ

اٹکاتے رہتے تو ہندوستان کو حکومت خود اختیاری کبھی کی مل گئی ہوتی !!

خیر یہ تو پرانی رام کہانی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس وقت جو ملک میں انتشار اور خطرے کی صورت پیدا ہو رہی ہے۔ گورنمنٹ اس کے متعلق کیا سوچتی اور کیا کرنا چاہتی ہے۔ ہم اس رائے سے بالکل متفق ہیں کہ ملک میں امن و اماں قائم رکھنا گورنمنٹ کا پہلا فرض ہے اور اگر بدامنی پھیل رہی ہے تو حکومت کے لئے بہرحال اس کا تدارک لازمی ہے۔ اگر آج خود ہماری قومی حکومت ہوتی اور اس کو بلوے فساد اور بدامنی کا سامنا ہوتا تو وہ بھی اسکے دبانے کی پوری کوشش کرتی اور ملک میں امن و امان قائم کرنا اپنا پہلا فرض سمجھتی۔ اس سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ اختلاف جہاں ہے وہ یہ ہے کہ صرف امن و اماں قائم کرنا ہی حکومت کا فرض نہیں ہے بلکہ ان الجھی ہوئی گتھی کا سلجھانا بھی جسکی یہ تشویشناک ہنگامہ علامتیں ہیں، سرکار کا عین فرض ہے۔ اس کے متعلق گورنمنٹ کیا کرنا چاہتی ہے؟ یہ عقدہ نہیں کھلتا۔ سر اسٹیفورڈ کرپس کی تجاویز جن کو وہ حکومت برطانیہ کی جانب سے لیکر ہندوستان آئے تھے اور جنکو تمام قوم اور ملک نے متفق الرائے ہو کر رد کر دیا۔ برطانوی تدبر کا آخری فیصلہ تھیں۔ ہم اس کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ یہ رٹ لگائے جانا کہ ہندوستان کو خود مختاری اور آزادی صرف جنگ کے بعد ہی مل سکتی ہے اس کے سوائے اور کوئی معنی نہیں رکھتا ہے کہ تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود۔ اگر برطانوی سیاسی تدبر و حکمت کا خزانہ بالکل خالی نہیں ہو گیا ہے اور برطانوی اراکین سلطنت میں سیاسی گتھیوں کے سلجھانے کی کچھ بھی صلاحیت ابھی باقی ہے تو حکومت کو فوراً ہی کچھ نہ کچھ کرنا پڑیگا۔ یہ صرف ہماری ہی رائے نہیں بلکہ خود انگریزی قوم کے اہل الرائے اور اہل قلم اس پر زور دے رہے ہیں۔ میٹر پولیٹن آف انڈیا، ڈین صاحب کنٹربری، برطانیہ کے مشہور اخبار مانچسٹر گارجین اور نیوز کرانیکل وغیرہ سب ہی متفق الرائے ہیں کہ برطانوی حکومت کو آگے قدم بڑھانا چاہیئے۔ ہندوستان سے آشتی اور صلح کا رویہ اختیار کرنا چاہیئے۔ یہاں تک کہ اخبار لندن ٹائمس نے بھی لکھا ہے کہ محض تشدد کی پالیسی سے کام نہیں چلیگا۔ کرپس مشن کی تجاویز کا پھر پیش کر دینا آگے قدم بڑھانے کے مترادف نہیں ہو سکتا۔ خواہ کانگریس کا مطالبہ کامل آزادی فوراً قابل عمل قرار دیا جائے لیکن عارضی قومی خود مختار حکومت کے فوری قیام سے گریز نہیں کیا جا سکتا۔ بظاہر برطانوی حکومت اسکے لئے تیار نہیں معلوم ہوتی اور صرف تشدد کی پالیسی ہی کو کافی سمجھتی ہے۔ اس ناعاقبت اندیشانہ رویہ سے ان خدا کے بندوں کو کون باز رکھ سکتا ہے؟ کیا ہندوستان درحقیقت اسکی ہمت کرینگے؟ ان کا مرتبہ ایسا ہے اور یہ حق انھیں حاصل بھی ہے۔ دیکھئے!

ہمکو روز بتایا جاتا ہے اور ہمارا ذاتی تجربہ بھی یہی ہے کہ برلن اور ٹوکیو کے ریڈیو والے بلا تکان جھوٹا پروپیگنڈا کرنے اور بے بنیاد خبریں پھیلاتے رہتے ہیں لیکن دیکھئے انسانی فطرت بھی کیا طرفہ تماشا ہے کہ جب ہمیں مشکلوں کا سامنا ہوتا ہے اور الجھنیں کسیطرح دور نہیں ہوتیں تو ہم خود غرضی میں وہی سب حرکتیں کرنے لگتے ہیں جنکو دوسروں میں عیب سمجھتے ہیں۔ برطانیہ کے بعض اراکین سلطنت اور انکے ایجنٹ امریکہ میں اسوقت یہ پروپیگنڈا کر رہے ہیں کہ ہندوستانی خصوصاً کانگریس والے ملک میں بدامنی اور ابتری پھیلانا چاہتے ہیں اور جرمنی اور جاپان کو اپنی مدد کیلئے ہندوستان میں بلانا چاہتے ہیں حالانکہ ہندوستان میں ہر کو سیاسیات کو جانتا ہے اور حکومت ہند کو بھی بخوبی معلوم ہے کہ ہندوستانی بالعموم اور انڈین نیشنل کانگریس بالخصوص جرمنی اور جاپان کے بالکل خلاف اور امریکہ، روس، چین اور برطانیہ کے موافق ہیں۔ اسکا اعلان بھی ہندوستان کے ہر فریق ہر پارٹی اور بالخصوص نیشنل کانگریس کی جانب سے بارہا بانگ دہل اعلان کیا جا چکا ہے لیکن اپنی موجودہ مشکلات کو آسان کرنے کیلئے برطانیہ والے اہل امریکہ کو اس پروپیگنڈا سے ہندوستان اور ہندوستانیوں سے بدظن کرانا چاہتے ہیں ہم اس پروپیگنڈا کے خلاف اپنی آواز احتجاج بلند کرتے ہیں اور بلا تکلف کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان یا نیشنل کانگریس کے خلاف یہ الزام صریح بہتان یا ایسا جھوٹ ہے جسکو ہم دروغ مصلحت آمیز بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس سے شر کا اندیشہ ہے لیکن سر اسٹیفورڈ کرپس کی سی نامور اور ذی مرتبہ ہستی بھی اپنی جادو بیانی اور سحر کاریوں سے اس جھوٹ کو سچ نہ بنا سکیں گے۔ اور اگر وہ امریکہ کو ہندوستان کے خلاف بدظن کرنے میں کامیاب بھی ہو گئے تو انکو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اس قسم کا پروپیگنڈا مجروح ہندوستان کے زخموں پر نمک پاشی کے برابر ہے۔ برطانوی حکومت کے خلاف اسوقت ہندوستان میں جو بے اعتباری و بدگمانی پھیلی ہوئی ہے اس سے حکومت وقت کو بچنا چاہیئے اب بھی سب باتوں کے باوجود ہندوستانیوں کے دلوں میں برطانوی کیرکٹر اور اسکی برگزیدہ ہستیوں کا وقار باقی ہے اور اسی کے بھروسے پر آئندہ سمجھو



سے آجتک میں نے بہت کچھ سیکھا اور سمجھا ہے۔ اس نظم کے بعض لفظ اور بعض مصرعے بدلنا مناسب معلوم ہوتا ہے لیکن میں اسے اُسی طرح پسند کرتا ہوں جیسے یہ اپنی پہلی شکل میں تھی۔

دوسری نظم بھی بظاہر رومانی ہے، بعض اوقات تو میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ رومان کی ایک ہلکی سی چاشنی نظم کے اثر میں اضافہ کرتی ہے۔ اس کا موضوع رومانی نہیں ہے بلکہ اس کی تحریک میں رومان شامل ہوکر کچھ غائب سا ہوگیا۔ یہ نظم مئی ۱۹۴۲ء کی ہے اور ظاہر ہے کہ تقریباً ایسے ہی زمانے میں کہی جاسکتی تھی جب جاپانی فوجی شہنشاہیت کا خطرہ چین سے بڑھکر یورپ کے ملاکا پر پھیل گیا اور ایک سیاہ گاڑھے دھوئیں کی طرح ہندوستان پر بھی پھیلتا جا رہا ہے۔ جرمنی اور جاپان صرف اسی لئے دنیا پر عرصۂ حیات تنگ کردینا چاہتے ہیں کہ انھوں نے جانوں سے کھیلنے کا کافی سامان فراہم کرلیا ہے۔ قوموں کی آزادیاں ختم ہو رہی ہیں اور زندگی کرب اور بےچینی کی منزلوں سے دیوانہ وار گذر رہی ہے، ایسے میں محبت کا ذکر کچھ بےوقت کی چیز معلوم ہوتا ہے۔ شاعر کا خیال ہے کہ انسانوں کی مجموعی طاقت اس جرمن اور جاپانی خطرے سے مقابلہ کرنے میں صرف ہونی چاہئیے ورنہ انسانیت اندھیر اور ظلم کے ایک ایسے گڑھے میں گرا دی جائیگی جہاں سے نکلنا مشکل ہوگا۔ یہ ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں کیونکہ انکی وجہ سے دوسری ترقی پسند تحریکوں کو کچھ دنوں کے لئے پس پشت ڈالنا پڑا ہے۔ محبت کو ملتوی کرنے کا سوال نہیں ہے بلکہ برداشت کرنے اور اُس کے لئے پہلے ایک بہتر اور سازگار فضا پیدا کرنے کا سوال ہے۔ اس نظم کی بحر دماغ کی تھکن اور تذبذب کا پتہ دیتی ہے، جو یقیناً موجودہ حالات کی وجہ سے شاعر کے دماغ میں پیدا ہوگیا ہے۔ اب آپ دونوں نظمیں ملاحظہ فرمائیں:-



"نہ جا!"

تیرے چھٹنے کا سماں اس وقت ہے پیشِ نظر
دیکھ کر وہ خوفِ رسوائی سے ہر سو دیکھکر
میرا دامن تھام کر، آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر
دیکھنا اور مسکرا کر تیرا وہ کہنا "نہ جا"

مسکراتی جارہی ہے، چشم بھی نمناک ہے
اُف مری صبحِ مسرت کا بھی دامن چاک ہے
التجا کی یہ ادا بھی کس قدر سفاک ہے
اشک بھر کے سر جھکا کر تیرا وہ کہنا "نہ جا"

وہ کشاکش میں مرا گھبرا کے رو دینا کبھی
اپنی ہستی کو ترے جلووں میں کھو دینا کبھی

باتوں باتوں میں ترا نشتر چبھو دینا کبھی
سر مرے شانے پہ رکھ کر تیرا وہ کہنا "نہ جا"

ایک آویزش سی تھی اقرار اور انکار میں
محو تھا کچھ دیر تک تو میں انھیں افکار میں
ناگہاں تیری صدا گونجی در و دیوار میں
چھا گیا ہستی پہ میری تیرا وہ کہنا "نہ جا"

میری کشتی عزائم آ گئی گرداب میں
لہر اٹھی تیری محبت کی دلِ بیتاب میں
تھا عجب ہنگامہ وہ بھی زندگی کے باب میں
روٹھنا اور پھیر کر منھ تیرا وہ کہنا "نہ جا"

میری کچھ مجبوریاں رکنے سے مانع ہو گئیں
جاگ کر ساری تمنائیں یکایک سو گئیں
عالمِ اسباب کی تاریکیوں میں کھو گئیں
سن کے بھی میں کچھ نہ بولا تیرا وہ کہنا "نہ جا"

شوقِ دنیا نے ترے پہلو سے بہکایا مجھے
سبز باغ اک دولت و ثروت کا دکھلایا مجھے
تیرے دردِ عشق کو ادبار بتلایا مجھے
کچھ اثر آخر نہ لایا تیرا وہ کہنا "نہ جا"

اپنے ہی ہاتھوں سے اپنا خونِ دل کرتا ہوا
تجھ کو مضطر چھوڑ کر میں ناسزا رخصت ہوا
آج تک کانوں میں ہے لیکن وہی شیریں صدا
دور جانے پر بھی مڑ کر تیرا وہ کہنا "نہ جا"

سب تجھے اتنی محبت میں کبھی سمجھا نہ تھا
اب سے پہلے میرا جذبِ آرزو سچا نہ تھا
دیکھتا ہوں وہ کہ جو پہلے کبھی دیکھا نہ تھا

وہ محبت کی نظر اور تیرا وہ کہنا "نہ جا"

تیرا اظہارِ محبت وقتِ رخصت بار بار
ہے مرے عہدِ محبت کی وہ زرّیں یادگار
جس پہ کرتا ہوں سوا تیرے میں ہر اک شے نثار
یاد اب تک آ رہا ہے تیرا وہ کہنا "نہ جا"



۲

مَیں نے بھی محبت کی ہے مگر.....

میں نے بھی محبت کی ہے مگر، اس وقت نہ اس کا ذکر کرو
وہ تنہا میرا غم ہے اسے تنہا مجھکو ہی اُٹھانے دو
جس درد سے ہم سب مضطر ہیں آؤ کچھ اس کا ذکر کریں
سر جوڑ کے بیٹھیں کچھ سوچیں، اس سے بچنے کی فکر کریں
یہ کیسی بھیانک تاریکی ہر سمت سے گھیرے لیتی ہے،
یہ کیسی ہوا ہے جہازوں کو جو درسِ تباہی دیتی ہے
تاریک دھوئیں کی بارش میں دم گھُٹتا ہے انسانوں کا
جائیں بھی کدھر ہر رستے پر پہرہ ہے یہاں طوفانوں کا
شہروں کی خموشی آبادی میں کیوں ہلچل ہے بیزاری ہے
کیوں رنگ اُڑے ہیں چہروں کے کیوں وحشت سب پر طاری ہے؟
یہ کیسے درندے رقص کناں ہیں ہول سا چھایا جاتا ہے
یہ کون بہیمیت کے سُروں میں بھیانک گانے گاتا ہے
یہ کیسے خون کے دھبّے ہیں جو ناچ رہے ہیں فضاؤں میں
یہ کیسے خونی باجوں کی آواز لیسی ہے ہواؤں میں
یہ کیسی درد کی ٹیسیں ہیں، جو ہر دل کو تڑپاتی ہیں
بارود کی بُو میں اُلجھی ہوئی کیوں گرم ہوائیں آتی ہیں
بچوں پہ یتیمی آتی ہے ماؤں پہ رنڈاپا آتا ہے

کیوں بادِ سحر کا ہر جھونکا پیغامِ جدائی لاتا ہے

یہ سب کچھ دیکھ کے اپنا غم بھی ستایدؔ ذہن میں آئے گا
ہونٹوں سے آہیں نکلیں گی، دم سینے میں گھبرائے گا
کڑکی تھی جنوں کی جو بجلی پھر سر پہ کڑک ہی جائے گی
جو دل میں دبا کر رکھی تھی وہ آگ بھڑک ہی جائے گی
جو باہم گزری ہیں راتیں وہ راتیں یاد آئیں گی مجھے
جو اب تک لذت دیتی ہیں وہ باتیں یاد آئیں گی مجھے
جن میں غم کھو جاتا تھا وہ سپنے مجھ پر چھائیں گے
جو وصل کی رات میں برستے تھے ساون کے وہ بادل آئیں گے
بکھری ہوئی تانیں نغموں کی کانوں میں مرے بھر جائیں گی
ہر بندھن توڑ کے پھر مجھ کو اس دنیا میں پہونچائیں گی
میں تھوڑی دیر تڑپ لوں گا، غم سہہ لوں گا، خوں رو لوں گا
اک بوجھ سا دل پر ہوگا مرے کچھ دیر نہ ہنس کر بولوں گا
لیکن جب اور بڑے دُکھ میں دُنیا کو کھویا پاؤں گا
مَیں اپنے غم کے اندھیرے سے فوراً باہر آ جاؤں گا
یہ درد سے پگھلا دِل میرا ہر سانچے میں ڈھل جائے گا
جو صرف اپنے کام آتا ہے اوروں کے بھی کام آئے گا
یوں دیکھ کے نوعِ انساں کو پستی کی اندھیری منزل میں
طوفان بداماں اُٹھی ہے اِک موجِ جنوں میرے دل میں
احساس عمل میں بدلے گا جلد ایسا وقت بھی آئے گا
یہ آتشِ غم بجھ جائے گی یہ دورِ ستم مٹ جائے گا
جب امن و اماں کے دل ہونگے، جب عیش و مسرت کی راتیں
اُس وقت سناؤں گا اکثر میں عشق و محبت کی باتیں

(بہ اجازت ڈائرکٹر صاحب آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ)

طوفان!

(حضرت فیاض گوالیاری، بی۔ اے)

طوفان کا یہ زور کہ اللہ تری شان!　　"سرمایہ" بھی حیران ہے "محنت" بھی پریشان
ہر سمت تباہی کے ہلاکت کے ہیں سامان　　جاتا ہے کچلتا ہوا انسان کو انسان

طوفان ہے، طوفان ہے، طوفان ہے، طوفان!

یوں ظلم کرے چین پہ جاپان غضب ہے!　　اس طرح مٹے خطۂ یونان غضب ہے!
حرص و ہوس و آز کا طوفان غضب ہے!　　انساں کی غلامی میں ہو انسان غضب ہے!

طوفان ہے، طوفان ہے، طوفان ہے، طوفان!

منڈلاتی ہوئی پھرتی ہیں وہ موت کی چیلیں　　جو تیل کے چشموں کے لئے خون ہی پی لیں
انسان کے سینے پہ ہیں تہذیب کی کیلیں　　پُرامن سمندر بھی بنے آگ کی جھیلیں

طوفان ہے، طوفان ہے، طوفان ہے، طوفان!

"فولاد کے پتلے" جو جہاں گرد ہوئے آہ!　　پسپا سرِ میدانِ وغا مرد ہوئے آہ!
ایران کے نغماتِ وطن سرد ہوئے آہ!　　پیرس کے جوانوں کے بھی منہ زرد ہوئے آہ!

طوفان ہے، طوفان ہے، طوفان ہے، طوفان!

جس گھر کی حفاظت کے لئے جائیں سپاہی　　دشمن سے بچانے کو کریں اس کی تباہی!
یہ جنگ کے آئین، بدل جائیں الٰہی!　　شہری کے لئے قہر ہے یہ شہر پناہی

طوفان ہے، طوفان ہے، طوفان ہے، طوفان!

غربت میں وطن والوں کے دن بسر ہوئے ہیں　　بے گھر جو ہوئے جینے سے جی سیر ہوئے ہیں
دم بھر میں قیامت کے الٹ پھیر ہوئے ہیں　　آباد مکاں راکھ کا اک ڈھیر ہوئے ہیں

طوفان ہے، طوفان ہے، طوفان ہے، طوفان!

ہیں بیخ کنِ امن و سکوں تند ہوائیں!　　بڑھتی ہوئی آتی ہیں حوادث کی گھٹائیں!
آفت پہ اب آفت ہے، بلاؤں پہ بلائیں!　　اے کاش کہ ہم اب بھی ذرا ہوش میں آئیں!

طوفان ہے، طوفان ہے، طوفان ہے، طوفان!

اِک ناؤ میں ہیں عزمِ سفر ایک ہے اپنا　　ساحل کے لئے ذوقِ نظر ایک ہے اپنا
جو گھر ہے مصیبت میں وہ گھر ایک ہے اپنا　　طوفان کی لہروں میں گذر ایک ہے اپنا
طوفان ہے، طوفان ہے، طوفان ہے، طوفان!

زخمِ معاشرت

(از مسٹر مظفر حسن مظفر فاروقی)

گزرا نظر سے آج وہ اِک منظرِ مہیب　　دولت کی بھینٹ پر تھی جوانیِ بدنصیب
پیرِ کہن کے دام میں اِک گلعذار تھی　　نورِ سحر سے ظلمتِ شب ہمکنار تھی
دولت کی بیڑیاں تھیں جوانی کے پاؤں میں　　تاروں کا عکس جیسے ہو بادل کی چھاؤں میں
نااہل کی عبا پہ مہکتا گلاب تھا　　اِک بوالہوس کے ہاتھ میں جامِ شراب تھا
سائے میں خشک گھاس کے سبزہ اُگا ہو　　کانٹوں کی چھاؤں میں تھا گلِ تر کھلا ہو
بالینِ قبر لالۂ صحرا کھلا ہوا　　یا لاش کے گلے میں تھا موتی پڑا ہو
قطرہ کے بس میں نوح کے طوفاں کا جوش تھا　　اِک سنگریزہ گویا گلستاں بدوش تھا
دودِ سیہ میں سرخیِ آتش دبی ہوئی　　خورشید کی کرن تھی کُہر میں چھپی ہوئی
ابرِ سیہ تھا سایہ فگن آفتاب پر　　یا گہن پڑ رہا تھا رخِ ماہتاب پر
ڈوبے ہوئے کراہ میں تارِ رباب تھے　　قطرے لہو کے شاملِ جامِ شراب تھے
اُمید محوِ خواب تھی پہلوئے یاس میں　　پیوند تھا کفن کا عروسی لباس میں
اِک ناتواں کی جان پہ چھُریاں تھیں تیز تیز　　سوسائٹی کے ظلم پہ آنکھیں ہیں اشک ریز
رفتار پر زمانہ کے فطرت کی ہے نظر　　پیمانۂ گناہ چھلکنے کی ہے کسر

آنے کو انقلاب نظامِ کہن میں ہے
لگنے کو آگ جلد سماجی کفن میں ہے

مانی جائسی

(از سید اعظم حسین ایڈیٹر "سرفراز" لکھنؤ)

سید کلب احمد صاحب مانی جائسی کے ابتدائی کلام کا مجموعہ "نقوشِ مانی" کے نام سے شائع ہو چکا ہے، جسے میں نے پڑھا۔ اس کے علاوہ آپ کے تازہ افکار کی ایک معتدبہ تعداد بھی میری نظر سے گزری۔ میرے نزدیک آپ کا تازہ کلام گزشتہ کلام سے بھی زیادہ کامیاب ہے۔ بہر حال اس وقت مجموعی طور پر آپ کے کلام کا اجمالی ذکر مدِ نظر ہے۔

آپ کا کلام پڑھنے سے حسب ذیل خصوصیات نمایاں ہوتی ہیں:-

(۱) انسانی درد، (۲) خودداری، (۳) اولوالعزمی، (۴) حرّیت پسندی، (۵) حب وطن، (۶) انسانی کمزوریوں کا اعتراف اور اُس کی تنقید، (۷) رفعتِ خیال کے ساتھ تغزّل۔

دراصل انسانیت کا درد ہی انسان میں تمام اچھائیوں کا سرچشمہ ہے، اور یہ درد مانی کے یہاں پُورے طور پر پایا جاتا ہے، ان کے دل میں غمِ روزگار کے لئے گنجائش نہیں۔ درد انسانیت کی تنہا حکمرانی ہے۔ شاعر کا دل عام دلوں کی سطح سے بلند ہوتا ہے اور وہ انسانیت کے درد میں نوع انسانی کی خدمت میں اتنا محو ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کے اس استعجاب کو بھی نہیں سمجھتا اور اس پر خود حیرت کر کے آگے بڑھ جاتا ہے۔ فرماتے ہیں:-

کیا ہے کہ مجھے دیکھ کے کہتا ہے زمانہ
کچھ اور ہے اس کو غمِ دنیا تو نہیں ہے

انسان کی زندگی دراصل ایک ٹریجڈی ہے، ہر نفس ایک کشمکش بیم و رجا ہے اور آخرکار ایک لامعلوم منزل کا جبری سفر، ہر مفکّر اور ذی احساس کو یہ صورتِ حال کھٹکتی ہے۔ لیکن اگر تمام انسان اور خاص کر وہ مفکّرین جو ملک و قوم کے رہنما ہیں اِس احساسِ ناکامی سے شکست خوردہ ہو کر بیٹھ رہیں تو پھر نوع انسانی آگے نہیں بڑھ سکتی بلکہ ایک اجتماعی خودکشی اس کا نتیجہ ہو جائے گی، اسی لئے دانا و باخبر افراد نوع انسانی کو برابر اُمید کا پیغام دیتے اور ہمت و عمل کا نمونہ پیش کرتے رہتے ہیں، چنانچہ مانی بھی فرماتے ہیں:-

تجسس ہو تو مل جاتا ہے سب کچھ دارِ امکاں میں
کوئی لمحہ خوشی کا آؤ ڈھونڈھیں عمرِ انساں میں

دیکھیئے کس حکیمانہ انداز میں ایک تلخ حقیقت کا اظہار کر دیا گیا اور پھر اُمید کی روشنی بھی باقی رکھی گئی۔

انسانیت پر مانی کی شیفتگی دیکھنا ہو تو یہ شعر پڑھیئے:-

سنا ہے جب سے نام انسانیت کا، جستجو میں ہوں وہ دنیا کس طرف کو ہے جہاں پاجاؤں انساں کو

عام انسانوں کی حالت پر جو انسانیت کے جوہروں کے زیادہ قدر داں نہیں کتنا اچھا طنز بھی ہے!

انسانیت محبت ہی محبت ہے، اور قید زمان و مکاں سے بالاتر ہے، فرماتے ہیں :-

محبت جس جگہ چاہے حریم ناز بن جائے حرم میں، دیر میں، رستے میں، گھر میں، آنکھ میں، دل میں

اب مانی کے نظریۂ خود داری کو دیکھئے، آپ کی رائے ہے کہ انسان اگر اپنے مقصد پر بے تحاشہ اور مضطربانہ ٹوٹ پڑے تو پھر خواہ اُسے بظاہر اس کا مقصد حاصل ہو جائے لیکن باطناً اس کی اخلاقی موت ہو جائے گی۔ اس لئے کہ اس کی کم ظرفی اور اس کا چھچھورا پن ثابت ہو جائے گا :-

دُور دُور اپنا سفینہ رکھتے ہیں ساحل سے ہم ہیں بخوبی آشنا رازِ حیاتِ دل سے ہم

اگر دل کی زندگی منظور ہے تو انسان کو چاہیئے کہ وہ ذرا اپنے کو لئے دیئے رہے اور اپنے مطلب و غرض کے لئے اپنے کو ذلیل و خوار نہ کرے۔ اس شعر کا مطلب اس اخلاقی درس کے علاوہ ایک نفسیاتی حقیقت سے بھی وابستہ ہے انسان کے لئے سعی حصولِ کار میں جو ہنگامۂ حیات اور کیف و نشاط زندگی ہے وہ تکمیلِ کار کی بے عملی کے سوا کیا رہ گیا۔ اس لئے لطف اسی میں ہے کہ سفینہ ساحل سے دُور ہی دُور رکھا جائے۔

ایک دوسرے شعر میں فرماتے ہیں کہ اگرچہ میری زندگی ناکام ہے لیکن میں اس زندگی سے اتنی لذت حاصل کر رہا ہوں اور اس پر اتنا خوش و خرم ہوں کہ کوئی سمجھ نہیں سکتا کہ میں در اصل ایک ناکامیاب انسان ہوں۔ اس خیال کو کس منطقی انداز اور کس شاعرانہ لطافت کے ساتھ بیان کیا ہے، ملاحظہ ہو:-

کوئی کیا سمجھے کہ میری زندگی ناکام ہے خوئے غم ہے غم میں لذت، لذتوں میں زندگی

یہاں خوئے غم سے خوئے غم نوعِ انسانی مراد ہے۔

خودداری کا زور ملاحظہ ہو :-

نہ سنا گل نے تو کیا شورِ عنادل نہ رہا؟ اعتنا کا کبھی محتاجِ غمِ دل نہ رہا

اب مانی کی اولوالعزمی دیکھئے، ہر انسان کے دل میں مُدعا ہونا چاہیئے، اگر کسی دل میں مدعا نہیں تو ایسے دل کے ہونے سے بہتر ہے کہ اس کی جگہ سینے میں آگ بھری ہو، کچھ تو زندگی کی حرارت پائی جائے :-

دلِ محروم مدعا نہ رہے آگ سینے میں ہو گوارا ہے

انسان کو ہمت سے کام لینا چاہیئے دنیا کی ہر مُہم سر ہو کر رہتی ہے۔ فرماتے ہیں :-

آج اگر اک بات ہے دشوار کل مشکل نہیں آرزو کو در پئے مقصود رہنا چاہیئے

ایک اور شعر میں کہتے ہیں :-

حامیِ ہمتِ مردانہ ہے تقدیر کہ دیکھ　　　آدمی بن کے رہا وہ جو فرشتا نہ ہوا

وہ مخلوق جو فرشتہ نہ ہوئی اپنی ہمت کی وجہ سے آدمی بن گئی جو کہ اشرف المخلوقات ہے۔

اولو العزمی کی تکمیل قربانی سے ہوتی ہے۔ انسان کا اعلیٰ مقصد اُسی وقت بہ احسن وجوہ حاصل ہوتا ہے جب وہ اس کے لئے اپنی جان کی بازی لگا دیتا ہے۔ کس ولولہ انگیز طریقے سے اس مطلب کو اس شعر میں ادا فرماتے ہیں۔

پھر کبھی دیکھیئے گا آپ حسنِ بہارِ آرزو　　　شوخیِ رنگ، ہے ابھی تشنۂ خونِ زندگی

زندگی جہد مسلسل کا نام ہے اور اسی جد و جہد سے زندگی میں لطف بھی ہے ورنہ پھر زندگی کچھ بھی نہیں کہتے ہیں

جہد ہے رازِ بقا، سعی ہے تصدیقِ حیات　　　زندگی کیا جو کوئی مطلبِ مشکل نہ رہا

"تصدیقِ حیات" پر خاص طور سے نظر فرمائیے، کیا ہی اچھی بات کہی ہے۔

عام طور پر لوگ موت کو غموں کے ہجوم میں دیکھتے ہیں دراصل یہ زندگی نام ہے، غموں کے دور سے گزر جانے کا، جہاں آلام و افکار ختم ہوتے ہیں وہاں سے موت شروع ہوتی ہے۔ اس مفہوم کو یوں نظم فرماتے ہیں کہ :-

موت کو عہدِ غم میں ڈھونڈتے ہو　　　موت بھی کیا حیات ہے فانی!

درسِ ہمت کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو:-

درسِ ہمت ہے تجھے رہروِ الفت کیلئے　　　کانٹے پانا تو مرا برہنہ پا ہو جانا

آرام طلبی کے رُجحانات کی مذمت اور جوشِ ہمت کی فراوانی دیکھنا ہو تو یہ شعر پڑھیئے:-

آرزوِ راحتِ ساحل ہے، اے دل! ڈوب مر　　　موج کیا ساحل نہیں گرداب کیا ساحل نہیں؟

یہ ہے عزم و ارادہ کی برکت کہ موج و گرداب ساحل بن جاتے ہیں، البتہ نامرد و بزدل انسان کے لئے نہیں بلکہ اس کے لئے جو اپنے بگڑے ہوئے تیوروں کے ساتھ یہ کہہ سکے کہ:-

کھیلتا ہوں ابھی طوفانِ بلا سے ورنہ　　　جس جگہ ناؤ ڈبو دوں وہی ساحل ہو جائے

جناب فانی کا نظریہ یہ ہے کہ زندگی کو اس وقت تک حالاتِ دنیا کے مطابق بنایا جا سکتا ہے، جب تک حق کا خون نہ ہو جہاں سے حق پر حرف آتا ہوا اور باطل کی حمایت ہوتی ہو وہاں سے دنیا کو قطعاً ٹھکرا دینا چاہیئے

حضرتِ فانی اگر حق پر نہ آنچ آئے تو پھر　　　زندگانی تابعِ حالاتِ دنیا کیجئے

غلامی میں خواہ کتنی ہی دولت و راحت ملے اُس افلاس و عسرت کی زندگی سے بدتر ہے جو آزادی کی فضا میں سانس لیتی ہو، فرماتے ہیں:-

قفسِ زر نہ چاہیئے یا رب　　　میرا تنکوں کا آشیانہ رہے

قید میں صرف رو پیٹ کر بیٹھ رہنے اور قسمت پر صابر و شاکر ہو رہنے کے برعکس ہمارا شاعر یہ بتا دینا چاہتا ہے کہ "رنجِ قید" رفتہ رفتہ بڑھکر "ہمتِ پرواز" بن جائے گا اور پھر اس وقت اس قید کی کوئی بساط نہ رہ جائے گی۔ قیدی اپنے کو صیاد کے پنجۂ غضب سے چھڑا کر ایک بار پھر آزاد و بامراد ہو جائے گا۔ قید میں رہتے ہوئے دیوانۂ حریت اپنے ظالم صیاد کو یہ وارننگ دیتا ہے کہ:۔

قفس کیا چیز ہے صیاد، ڈر اُس وقتِ نازک سے
کہ رنجِ قید بڑھ کر ہمتِ پرواز بن جائے!

قیدی کو بہلانے کے لئے قید خانہ کی آرائش کی جاتی ہے اور اُس آرائش میں ایسے نقشے بھی آویزاں کئے جاتے ہیں جو دوسرے آزاد مقامات کے ہیں۔ ان کو دیکھکر قیدی کے دل پر چھُری چل جاتی ہے اُس کا زخم ہرا ہونے لگتا ہے اور وہ بے اختیار اپنے حکمران سے کہتا ہے کہ:۔

مسلّم حجرۂ زنداں کی آرائش مگر مانیؔ
ہٹا دے نقشۂ آزادی و سیرِ بیاباں کو

مغلوب و محکوم ہندوستان کی روح اپنے غیر ملکی آقاؤں سے یہ احتجاج کر رہی ہے جو ہندوستان کو غلام رکھے ہوئے ہیں، لیکن ہندوستان کے اندر جمہوریت و خود مختاری کے قصے سنایا کرتے ہیں۔ حریت پسندی ہی سے وطن پرستی کا ڈانڈا ملا ہوا ہے۔ جناب مانیؔ کے مندرجہ بالا اشعار سے بھی اُن کے جذبۂ وطن پرستی کا پتہ لگتا ہے۔ اب چند خاص شعر اور سُن لیجئے۔

اس جنگ میں اُن ہوا بازوں اور مشینی فوجوں کے تو بڑے کارنامے بیان کئے جاتے ہیں جو لوگوں کے گھروں کو آگ لگاتے اور تباہ کرتے پھرتے ہیں، لیکن اُن بستیوں اور مکانوں کی روئداد تباہی بہت کم سنی اور سُنائی جاتی ہے جو آئے دن اس لامحدود سفاکی کی زد میں آتے رہتے ہیں اور کوئی پوچھنے والا نہیں ہے کہ اُن پر کیا گزر گئی۔ مانیؔ کیا خوب فرماتے ہیں:۔

تمام برق کی تابندگی کا چرچا ہے
کبھی یہ لوگ ذرا ذکرِ آشیاں تو کریں

کس قدر محسوس کر کے یہ شعر کہا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ بلا کا اثر موجود ہے۔ اس شعر کو دردِ انسانیت کی سُرخی کے ماتحت بھی پیش کیا جا سکتا ہے، اس لئے کہ اس میں وطنی اور بین الاقوامی دونوں طرح کے احساسات موجود ہیں۔

وطن کی محبت انسان کے خمیر میں ہے، وہ اسے کسی حالت میں بھی ترک نہیں کر سکتا خواہ اُس پر چاروں طرف سے ظلم و تشدد کی یلغار ہو رہی ہو:۔

غمِ برق و صیاد و گلچیں مسلّم
مگر کیا کروں، آشیاں، آشیاں ہے

مانی جائسی نے اپنے اشعار میں جا بجا نفسیاتِ انسانی کا خوب تجزیہ کیا ہے، ایک شعر میں وہ اس حکیمانہ حقیقت

کو واضح کرتے ہیں کہ انسان دراصل خود غرض ہے، ایک انسان دوسرے سے جو روابط دوستی قائم کرتا ہے وہ کسی ذاتی منفعت پر مبنی ہوتے ہیں۔ دنیا ایک دوسرے کے ایسے ہی خود غرضانہ تعاون پر قائم ہے۔ اس فلسفیانہ خیال اور انسانی فطرت کے راز کو آپ ان دلپذیر الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں کہ:۔

جس کو کہتا ہے دفا بے کسیِ مانی ہے
کس کا ہو کر رہے آخر، جو تمھارا بھی نہ ہو؟

بعض باشندگانِ وطن میں باہم رقابت بھی ہوتی ہے اور وہ بدخواہی کی آخری نوبت تک پہونچ جاتی ہے، اس انسانی کمزوری پر آپ نے ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:۔

میری غربت سے نہیں اہلِ وطن خوش کہ ابھی
برق ٹوٹی نہیں اُجڑے ہوئے کاشانے پر

کاشانہ تو اُجڑ چکا لیکن ابھی وہ بالکل جل کر خاکستر ہونا باقی ہے۔ اتنی نشانی بھی چشمِ اعدا میں کھٹک رہی ہے، یہ ہے انسانی فطرت کا تاریک پہلو جسے شاعر نے پوری بیباکی سے طشت از بام کر دیا۔

بہت سے آدمیوں میں جذبۂ کمتری ہوتا ہے اور وہ اس کی وجہ سے دوسروں سے مرعوب ہو کر اُن کے سامنے سرِ نیاز جھکا دیتے ہیں، اس مذموم عادت کی مذمت مختلف شاعرانہ عنوانات سے جناب مانی نے کی ہے۔ کہیں فرماتے ہیں

سجدہ معلوم نہیں کس نے کیا ہے پیدا
اوجِ درگاہ نے یا ذوقِ جبیں سائی نے

کہیں اور صاف کرتے ہیں:۔

نہ آستاں کوئی شے ہے نہ کوئی چیز جبیں
یہ صورتیں ہیں تقاضائے جبہ سائی کی

ایک شخص چند دروں پر ایک ایک مرتبہ کوئی حاجت لیکر جائے تو خیر وہ حاجت پوری کی جا سکتی ہے لیکن بار بار کی التجا انسان کو بالکل بے وقعت کر دیتی ہے، اس کی بات میں نہ وزن رہتا ہے اور نہ اُس کی التجا درخورِ اعتنا رہ جاتی ہے۔ اس حقیقت کا اظہار کس پُرتاثیر انداز میں کیا گیا ہے۔

رد ہو گیا سجدہ مری فرسودہ جبیں کا
اے دربدری تو نے تو رکھا نہ کہیں کا

اس دنیا میں بعض آدمی انتہائی دولت مند و ذی اقتدار ہیں تو بعض بالکل مفلس و محتاج، دونوں کی حیثیتیں اس قدر مختلف ہیں کہ درحقیقت دونوں ایک دوسرے کی حالت کا احساس تک نہیں کر سکتے۔ اس کو کس خوبصورتی سے جناب مانی نے اس شعر میں بیان کیا ہے:۔

کیا جانو تم ہمیں، تمھیں ہم کیا سمجھ سکیں
نا آشنا ملال سے تم ہو، خوشی سے ہم

انسانوں کے اندر اس تفریق کی تلخی ہر سچے شاعر کے کام و دہن کو محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ خدائے سخن میر فرماتے ہیں:۔

کیا جانیں وہ مرغانِ گرفتارِ قفس کو
جن تک کہ بصد ناز نسیمِ سحر آئے

دورِ حاضر کے بزرگ ترین غزل گو جناب آرزو لکھنوی اپنے مخصوص انداز میں فرماتے ہیں:-

مجھے رہنے کو وہ ملا ہے گھر، کہ جو آفتوں کی ہے رہ گزر

تمھیں خاکساروں کی کیا خبر، کبھی نیچے اُترے ہو بام سے؟

سوسائٹی کا نظامِ کہنہ تبدیل ہو تو یہ تفرقہ مٹے، موجودہ حالات میں تو ہمارے شاعروں کو نوعِ انسانی کے اس سانحۂ عظیم پر ماتم کرنے کے سوائے کوئی چارہ نہیں۔

یہ بھی انسانی فطرت ہے کہ وہ تشدد کا علاج تشدد ہی سے کرنا چاہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتک عمل و ردِ عمل کے طور پر تشدد کا لامتناہی سلسلہ جاری ہے۔ مانی کے نزدیک غم کا غم سے علاج کرنا کسی طرح مناسب نہیں ہے، وہ انسان کی اس جنگجویانہ فطرت کے خلاف "ریمارک" کرتے ہیں:-

کس قدر غربدہ جو فطرتِ انسانی ہے   چاہتی ہے کہ کرے غم کا مداوا غم سے

اب ذرا مانی کا لطفِ تغزل بھی ملاحظہ فرمائیے، یہ دیکھیے کہ تغزل میں بھی کیسے عالی اور دلکش مضامین قلمبند کیے ہیں:-

جوشِ قربانی و شوقِ شہادت کن دلآویز الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، ملاحظہ ہو:-

عمرِ ابد کی آرزو، دل میں مچل کے رہ گئی   میان سے اُن کی تیغِ ناز، آہ نکل کے رہ گئی

محبت کا پاکیزہ معیار اور استعارہ کی پُر اثر لطافت دیکھیے:-

آج لبریز مری عمر کا پیمانہ ہوا   ساغرِ بادۂ جاناں چھلک آئے مانی

محبت کی وہ باتیں جو دبی زبان میں ہوتی رہتی ہیں، اشاروں اشاروں میں جو گلے شکوے ہو جاتے ہیں اُن کے مزوں کا کیا کہنا، فرماتے ہیں:-

تمھاری وہ نظر جو اک تقاضائے تمنا تھی   تمھیں اب یاد کیوں ہوگی، ہم اکثر یاد کرتے ہیں

"تمھیں اب یاد کیوں ہوگی" کا طنز خاص طور پر مزا دے رہا ہے۔

مشاہدہ کا حسنِ امتیاز اور فطری شاعری کی تڑپ دیکھنا ہو تو یہ شعر پڑھیے:-

ادائیں اُن کی سب قاتل نہیں، ایسی بھی دیکھی ہیں   کہ پیدا روح میں بالیدگی ہو، تازگی دل میں

مانی نے نظمیں بھی بکثرت کہی ہیں اور اُن میں سے متعدد بہت اچھی ہیں، لیکن اس وقت اُن کی غزلوں کے اشعار سے سروکار تھا جو مجھے بہت زیادہ پسند ہیں۔

مانی صاحب ایک سن رسیدہ شاعر ہیں، اُن کی غزلیں قدیم طرزِ شاعری کے اثر سے پاک نہیں ہیں چنانچہ کہیں کہیں اشعار میں "ذم و الپسیں" "میت و جنازہ" "تربت و لحد" کی تخئیل بھی موجود ہے۔ لیکن ان فرسودہ عناصر کو نظر انداز کرنے کے بعد بھی مانی کے یہاں کافی اچھے شعر ملتے ہیں۔

کرشن اشٹمی

(از فیاض الدین احمد خاں فیاض گوالیاری، بی۔ اے)

اس سال جنم اشٹمی کے دن خداوند ابر وباد نے میرے دل میں یہ بات ڈالی کہ میں اپنے لمحاتِ فرصت شری کرشن کی بارگاہ میں ہدیۂ عقیدت پیش کرنے کیلئے وقف کردوں۔ عرصے کی دلی تمنا اور موسم کے لطیف اثرات محرک ہوئے جس کا نتیجہ ذیل کی نظم ہے۔ میرے اعتقاد میں شری کرشن کے نام نامی سے ایک طرف وطن عزیز کی ساری رنگ و رنگینی وابستہ ہے۔ جس کے بغیر ہندوستان کی دنیا ایک سازِ بے صدا، ایک جسدِ بے روح رہ جاتی ہے۔ اُن کے پریم کا راگ گھر گھر میں نغمۂ زندگی بنا ہوا ہے اور اُن کا افسانہ کروڑوں بار دُہرائے جانے پر بھی دلکش و دلنشین ہے۔ تو دوسری طرف اُن کا فلسفۂ کرم دنیائے عمل کی جان ہے۔ وہ بیک وقت عشق کے بھی دیوتا ہیں اور عمل کے بھی اور یہی دو چیزیں میری نظر میں روحِ رواں کائنات ہیں۔"

(فیاض)

(۱)

برکھا یہ پھر نکھار ہے لے جانِ برشگال
کشتِ حیات پہ ہے پھر احسانِ برشگال
نازاں ہو پھر نہ کیوں یہ عنوانِ برشگال
تیرے بغیر ہیچ ہے سامانِ برشگال

رت ہے سیاہ مست اندھیری گھر آئی ہے
ہر ذرۂ جہاں پہ جوانی سی چھائی ہے

ہر دل میں تیری یاد ہے دورانِ برشگال
تو جانِ برشگال ہے اے جانِ برشگال

(۲)

کیفِ سحر، لطافتِ شب ہے تری عطا
مستانہ رنگِ طاعتِ رب ہے تری عطا
رقص و سرود و علم و ادب ہے تری عطا
اس اُجڑے گھر میں جو بھی ہے اب ہے تری عطا

دنیا کو تو نے رہنے کے قابل بنا دیا
جس ذرہ پہ نگاہ پڑی دل بنا دیا

ہر دل میں تیری یاد ہے دورانِ برشگال
تو جانِ برشگال ہے اے جانِ برشگال

(۳)

دوڑا نہ دے رگوں میں جو بستی تری لہو
اک خشک فلسفہ تھی یہ دنیائے رنگ و بو
قائم ہے تجھ سے ہستیِ کشتیِ آرزو
تجھ کو اگر خدا نہ کہیں ناخدا ہے تو

بنسی بھی ہے، عمل کی بھی مضراب ہات میں
گیتا کے گیت گونجتے ہیں کائنات میں
ہے نغمہ باریوں میں تری شان برشگال
جاں بخش کائنات ہے تو جان برشگال

(۴)

یہ باجرہ کی جوار کی اُٹھتی جوانیاں
رنگِ شفق کے سایہ میں دھانوں کی سایاں
مکا دُھن بنی ہوئی، پُروائی نغمہ خواں
برکھا کی چھاگلوں سے یہ سارنگ کا سماں
بارش کا سیلِ آب، ہر اک سو رواں دواں
اُودی گھٹا کے کان میں سونے کی بجلیاں
پھر اشٹمی سجی ہے تری پیشوائی کو
پھر انتظارِ جلوہ ہے ساری خدائی کو
پھر شیام بن کے آ سرِ ایوانِ برشگال
اے جانِ ہند۔ جانِ چمن جانِ برشگال

جذباتِ خمار

حضرت خمار بارہ بنکوی

اب اتنی رہ و رسم ہے زندگی سے
کہ جیسے ملے اجنبی اجنبی سے
منھ اک اک کا تکتا ہوں میں بیکسی سے
سہارا نہ ٹوٹے کسی کا کسی سے
جدا ہو کے مجھ سے کوئی جا رہا ہے
گلے مل رہی ہے اجل زندگی سے
وہ سجدے جو ہوں تابعِ ہوشِ زاہد
بہت دور ہیں مرکزِ بندگی سے
وہ رنگیں دہن، وہ تراوش سخن کی
مہک نکلے گویا شگفتہ کلی سے
سکوں تیرے قدموں سے لپٹا رہیگا
گزر جا حدودِ ملال و خوشی سے
محبت کا اک دور ہوتا ہے وہ بھی
کہ آتا ہے منھ کو کلیجہ ہنسی سے
وہ تیری جدائی کے دن توبہ توبہ
کہ راتیں بھی شرما گئیں تیرگی سے
خمار اب بھی جینے کو میں جی رہا ہوں
مگر کچھ تعلق نہیں زندگی سے

کرشن کنھیا

(از جناب اقبال ماہر الہ آبادی)

دنیائے دل تھی جس سے آباد وہ کنھیاّ
قید جہاں سے جو تھا آزاد وہ کنھیاّ
کرتا تھا سب کو ہنس کر جو شاد وہ کنھیاّ
اب وہ ہنسی کہاں ہے
وہ نغمہ گر کدھر ہے وہ بانسری کہاں ہے

اِک لے سے اس نے دل کو بیتاب کر دیا تھا
دل کی ہر آرزو کو بے خواب کر دیا تھا
گوکل کی سرزمیں کو شاداب کر دیا تھا
وہ تازگی کہاں ہے
وہ نغمہ گر کدھر ہے، وہ بانسری کہاں ہے

کیف و سرور سے ہم آغوش کرنے والی
الفت کی مے پلا کر مدہوش کرنے والی
بیخود بنانے والی، بیہوش کرنے والی
وہ نغمگی کہاں ہے
وہ نغمہ گر کدھر ہے، وہ بانسری کہاں ہے

تھا دم قدم سے اس کے قائم نظامِ الفت
متھرا نواسیوں کو ملتا تھا جامِ الفت
اُس کی ادا ادا تھی گویا پیامِ الفت
وہ دلبری کہاں ہے
وہ نغمہ گر کدھر ہے، وہ بانسری کہاں ہے

اپنی مثال خود تھی متھرا کی راجدھانی
سب گوپیوں کے دل پر تھی اُس کی حکمرانی
وہ دورِ عدل گستر وہ عہدِ کامرانی
وہ قیصری کہاں ہے
وہ نغمہ گر کدھر ہے، وہ بانسری کہاں ہے

جسمانی تعلیم

(مسٹر بشیر علی صدیقی بدایونی، ایم۔ اے۔ بی ٹی علیگ)

تعلیم کے جدید اصول اگر ایک طرف بچہ کی دماغی و ذہنی قوتوں کے ارتقا پر زور دیتے ہیں تو دوسری طرف اس کی جسمانی حالت کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ بچہ کی صحت کا اس کی تعلیم پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ یہ بات روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ اچھی صحت کے بغیر انسان دنیا کی بہت سی خوشیوں سے محروم ہو جاتا ہے۔

تنگدستی اگر نہ ہو غالب   تندرستی ہزار نعمت ہے

ان تمام باتوں کے باوجود اگر آپ ہماری درسگاہوں کا معائنہ کریں تو وہاں آپ کو زندگی کے بہت کم آثار نظر آئیں گے۔ درحقیقت بعض مدرسوں کے دیکھنے کے بعد یہ کہنا مشکل ہو گا کہ ان کو مدرسہ کہا جائے یا شفاخانہ۔ ہر بیماری کے دو چار مریض آپ کو مدرسہ میں نظر آ جائیں گے جس قوم اور ملک کے بچوں کی یہ حالت ہو اس کے نوجوانوں اور بوڑھوں کی صحت کے متعلق اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ آخر ہماری تعلیمی درسگاہوں میں ایسی کونسی کمی ہے جو بچوں کو ان کے فطری حق سے محروم رکھتی ہے، دو چار سال اسکول میں تعلیم پانے کے بعد بچہ کو کھیل کود سے کیوں نفرت ہو جاتی ہے؟ اکثر لڑکے یہ معلوم کر کے کہ آج شام کو اسکول میں کھیل نہیں ہو گا بہت خوش ہوتے ہیں، آخر یہ کیوں؟ ان سوالات کا جواب دینا کوئی مشکل بات نہیں، وہی طریقۂ تعلیم کی خرابی اور استادوں کی عدم توجہی۔ کمزور بچے کی پشت پر کتابوں کا ایسا پشتارہ لاد دیا جاتا ہے جو بہت جلد اس کی کمر کو جھکا دیتا ہے، اور پھر وہ دنیا میں کسی کام کے قابل نہیں رہتا۔ اسکول کے ماحول اور اسکول سے باہر کی زندگی کے ماحول میں زمین و آسمان کا فرق ہو جاتا ہے۔ اور بچہ اپنے آپ کو دنیا میں ایک اجنبی کی حیثیت سے پاتا ہے۔ اس کشمکش میں وہ کھیل کود سے بھی دست بردار ہو جاتا ہے۔ اور اس کی ساری توجہ کسی طرح کتابیں رٹ رٹا کر امتحان میں کامیابی حاصل کرنے پر محدود ہو جاتی ہے۔ اسکولوں کے طبی معائنہ کی رپورٹ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بہت سے لڑکوں کو گھر پر اچھی غذا بھی نہیں ملتی، اور وہ بیشتر مندرجۂ ذیل امراض میں سے کسی نہ کسی کا شکار ہو جاتے ہیں:

(۱) نگاہ کی کمزوری۔ (۲) پائریا اور دانتوں کے امراض۔ (۳) کوبڑ کا نکلنا۔ (۴) سینہ کا کشادہ نہ ہونا۔

ہمارے طلبا کے والدین و دیگر سرپرستوں کی ذہنیت ملاحظہ ہو۔ میرے خیال میں ہندوستان میں کوئی نئی تعلیمی اسکیم اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک ان حضرات کی ذہنیت تبدیل نہ ہو۔ ان کی ذہنیت تبدیل کرنا

اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ ہمارے بچوں کے سرپرست حضرات اُن کے لئے پرائیویٹ ٹیوشن کا تو انتظام کر دینگے لیکن اُن کی غذا، کھیل کود، اور تفریحی چیزوں کے متعلق کوئی معقول انتظام نہیں کرتے۔ دراصل وہ ان تمام چیزوں کو غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ مجھے اکثر اس قسم کے حضرات سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے جو ٹیوشن پر تو ایک معقول رقم خرچ کر سکتے ہیں، لیکن ان چیزوں کا تصور تک نہیں کر سکتے۔ میں نے اچھی غذا اور جسمانی ورزش کے فوائد بتلا کر ایک صاحب کو اُن کے صاحبزادے کی کمزوریاں بتلائیں، تو ارشاد ہوا "اچھا تو آپ اس کی جماعت کو پڑھاتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ آپ ٹیوشن کے خیال سے عمداً اسے امتحانات میں فیل کر دیا کرتے ہیں، فرمائیے آپ کتنے روپے ماہوار لیں گے"۔ اس قسم کے حضرات سے کسی بات کی اُمید رکھنا بیکار ہے۔ اگر موقعہ مل جائے تو یہ غریب اُستاد کو کسی نہ کسی معاملہ میں پھنسوا دیں۔ لہٰذا اُستاد جو کچھ بھی کرتا ہے، وہ مدرسہ کی چہار دیواری کے اندر کرتا ہے۔ ایک نیا آسمان اور نئی زمین ان معصوم فرشتوں کے لئے بناتا ہے۔ مگر وہ استاد ہرگز یہ کام نہیں کر سکتے جو محض امتحان میں کامیاب کرانا اپنے پیشے کا نصب العین اور اپنی کامیابی کی انتہا سمجھتے ہیں۔ اُن کی مثال تو اُس وکیل کی سی ہے کہ اگر موکل مقدمہ میں کامیاب ہو گیا تو نیک نامی اور قابلیت میں شبہ نہیں، ورنہ ناکامیابی کی صورت میں بھی محنتانہ تو مل ہی جائے گا۔ پیشہ کے لحاظ سے اس قسم کے استادوں کی عرصہ ہوا موت ہو چکی۔ ان کے محض ڈھانچے باقی ہیں جو ہمیں چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اپنے اکتسابی علم کی یہ دکان لگاتے ہیں۔ محکمۂ تعلیم کا ایجنٹ یا کسی اسکول کا منیجر خریدار کی حیثیت سے اُن کے پاس آتا ہے، کافی مول تول کے بعد یہ اپنا مال فروخت کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں جب تک نباہ ہو سکا نباہ کیا اور اُس کے بعد دوسرے گاہک کی تلاش شروع کر دی۔ اسکول میں پہونچے تو ٹھوس کام کرنے والوں اور اس جال میں نئے پھنسنے والوں کے کندھوں پر اپنے اس تجربہ کا خواہ مخواہ بوجھ رکھ دیا (غرض اس طرح سے کولھو کے بیل کی طرح ایک مقررہ دائرہ کے چاروں طرف چکر لگاتے رہے اور ساری عمر ختم کر دی)۔ پس جسمانی تعلیم کا انتظام ان کے قابو سے باہر ہے۔

اب تصویر کا دوسرا رُخ ملاحظہ ہو، ایک نئے اُستاد جو ابھی ٹریننگ کالج سے آئے ہیں اور جسمانی تعلیم کے ریفریشر کورس (Refresher course) میں بھی شرکت کر چکے ہیں، بچوں کی اس اہم ضرورت کا اندازہ تو صحیح کرتے ہیں اور دل سے بھی چاہتے ہیں کہ اس سلسلہ میں بچوں کی امداد کریں، لیکن ہیں بالکل چھوئی موئی کے پھول، ذرا ہوا لگی اور یہ نیچے آر ہے، دوسرے انھیں کالج میں یہ اچھی طرح سمجھا دیا گیا تھا کہ ظاہری ٹیپ ٹاپ خوب کرنا، ٹھوس کام کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ خود مغالطہ میں رہنا اور دوسروں کو مغالطہ میں ڈالنے کی کوشش کرنا، اصول کے صحیح ہیں لیکن یہ کام کرنا نہیں چاہتے۔ اول الذکر کے اصول غلط تھے لیکن تھوڑی بہت محنت کے وہ عادی تھے۔ غرض کامیابی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان دونوں کا صحیح امتزاج پیدا کیا جائے۔

ہمارے مدرسوں میں جسمانی تعلیم کے ضمن میں ڈرل، لیزم، ڈنبیل، کھیل اور مختلف قسم کی دوڑیں کرائی جا
ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی اہمیت ہے۔ حال ہی میں سرکاری اسکولوں میں جمنازیم کا کام بھی شروع کرا دیا
اس کے لئے دو استادوں کو ایک اسکول میں خاص طور پر تربیت دیکر مقرر کیا گیا ہے، اسکول کے گھنٹوں م
ساتویں یا آٹھویں جماعت سے دسویں جماعت تک ایک گھنٹہ روزانہ یہ کام کرایا جاتا ہے۔ بعض اسکولوں
استادوں کی کمی کی وجہ سے ہفتہ میں تین یا چار گھنٹے جمنازیم کا کام کرایا جاتا ہے۔ دراصل یہ کام معمولی ڈر
یا کھیل سے مختلف ہے، اور اُن لڑکوں کے لئے جو شام کو کسی کھیل میں حصہ نہیں لیتے بہت ضروری ہے۔
اسے کھیل کا نعم البدل قرار نہیں دے سکتے۔ لیکن کھیل کے بعد افادیت کے لحاظ سے جس چیز کا دوسرا نم
آتا ہے وہ یقیناً جمنازیم ہے۔ ہربرٹ اسپنسر نے اپنی مشہور کتاب "فلسفہ تعلیم" میں ایک مکمل باب "جسمانی تعلیم"
کے لئے مخصوص کیا ہے، وہ جمنازیم کے کام کو زیادہ اہم نہیں سمجھتے اور اُسے غیر ضروری قرار دیتے ہیں۔ اُن کا
خیال ہے کہ بدن کے ہر ایک اُس عضو کو جو بغیر کسرت کے کھیل میں رہ جاتا ہے جمنازیم کے ذریعہ جنبش میں لا
جائے۔ اُن کے نزدیک جمنازیم کا کام کوئی انفرادی حیثیت نہیں رکھتا۔ لیکن ہمارے اسکولوں میں لازمی کھیل
کی کوئی اسکیم مکمل طور پر کامیاب نہیں ہوسکتی۔ اس لئے یہاں جمنازیم کا ہونا ضروری ہے۔ ابتدا میں طلبا کے
سرپرست خفیف چوٹ لگ جانے پر کافی شور مچائیں گے لیکن رفتہ رفتہ عادت پڑ جائیگی۔ میں نے لکھنؤ میں اپنی
ٹرننگ کے دوران میں متعلقہ اسکول کے چند طلبا کا وزن جمنازیم کا کام کرانے سے قبل لیا، اور پندرہ
پندرہ دن کے وقفہ سے۔ اکثریت اُن طلبا کی تھی جن کا وزن بتدریج بڑھ رہا تھا۔ لیکن میں نے اپنے طلبا
کو جمنازیم کے مختلف کرتب خود انتخاب کرنے کا موقعہ دیا تھا اور ہر ایک کے لئے جمنازیم کی کسرتیں کرنا لازمی
مثلاً اگر ایک لڑکا Wall Bar کی چند معمولی کسرتیں کرلیتا ہے اور Volting نہیں کرتا تو Volting
کے لئے اس کو مجبور کرنا نہیں چاہیئے۔ شروع میں شوق پیدا کرنے کی ضرورت ہے، اس کے بعد مشکل کسرتیں
کرنا بھی آجائیں گی۔ کبھی کبھی تبدیلی کے لئے آزاد کسرتیں (Free Exercises) بھی کرانا چاہئیں۔
اس سلسلہ میں چند دلچسپ کھیلوں کا اضافہ بھی مفید ثابت ہوگا۔

جسمانی تعلیم پر محکمہ تعلیم اور خود استادوں کو ابھی اور توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ جب سے یہ کام ڈرل ماسٹروں کی جگہ
ماسٹروں کے سپرد کیا گیا ہے اسمیں نمایاں تبدیلی ہوگئی ہے۔ ماسٹر علم النفس سے بھی تھوڑی بہت مدد لیتا ہے اور کام کو دلچسپ بنا
نارمل اسکولوں میں بھی جمنازیم کا کام ہونا چاہیئے۔ علاوہ ازیں جسمانی تعلیم کے سلسلہ میں لیکچروں کا انتظام کرنا چاہیئے اور ہر ایک لیل
استاد کو جو یہ کام کراتا ہے ہفتہ میں کم از کم ایک گھنٹہ اپنے طالبعلموں کو اسکے متعلق بتانا چاہیئے۔ فی الحال ہیڈ ماسٹر صاحبان کو
کو جسمانی تعلیم کا بھی امتحان ٹرینڈ ماسٹروں کی مدد سے کرائیں اور نمبر لڑکوں کے نتیجہ میں درج ہوں۔ ان نمبروں کو مجموعی نمبروں میں شامل نہیں کرنا
سالانہ انعامات کے موقعہ پر جو لڑکے زیادہ نمبر حاصل کریں انکو انعام دینا مفید ثابت ہوگا۔ اگر ماسٹر اور طلبا اس کام میں اشتراک کریں تو کامیابی

جوانی

بوڑھاپا

(سید حسن امام صاحب مدیر ماہنامہ ندیم)

جوانی

کیا جوانی کا بھی زمانہ تھا
یا تو افسوں تھا یا فسانہ تھا
دور دورہ تھا شادمانی کا
کامرانی کا ہر بہانہ تھا
دل میں کیا کیا اُمنگ ہوتی تھی
شوق جتنا تھا والہانہ تھا
رخِ سادہ نظر میں تھا پُرکار
...وق دل کا جو عاشقانہ تھا
...سن جو کچھ تھا وہ شباب میں تھا
...و جواں عمر تھا یگانہ تھا
...وستوں کا کوئی شمار نہ تھا
...نا اخلاص غائبانہ تھا
...تمنی تھی تو بس رقیبوں سے
...ہ غلط فہمی کا ٹھکانہ تھا؟
...تماد اپنی ذات پر جس سے
...نا دنیا کا کارخانہ تھا
...وانو! کبھی تھے ہم بھی جواں
...ق کو منع تازیانہ تھا

بوڑھاپا

کیا بوڑھاپے کا بھی زمانہ ہے
طاقت و ولولہ فسانہ ہے
اپنے اعضا پہ اعتماد نہیں
محترم بننا بھی بہانہ ہے
ہر گھڑی موت کا جو کھٹکا ہے
ذوق جینے کا والہانہ ہے
اب تو اللہ بس ہے باقی ہوس
یادِ اللہ عاشقانہ ہے
اب عزیزوں پہ بارِ خاطر ہوں
اب تو بیگانہ ہر یگانہ ہے
پوچھتا ہی نہیں کوئی معشوق
شاید اخلاص غائبانہ ہے!
موت بھی پوچھنے نہیں آتی
بیکسی تیرا کیا ٹھکانہ ہے؟
غم اُٹھاتا ہوں بس یہی کہہ کر
یہی دنیا کا کارخانہ ہے
کچھ عزیزو نہیں ہے حاصلِ عمر
سخت جانی بھی تازیانہ ہے

دو بھائی

ایک انگریزی قصہ

(از ڈی۔پی۔ بھٹناگر کستنہ)

اسکول ماسٹر کا نام ہارڈ تھا، اور اُس کے بھائی کا نام اینڈرسن بچپن ہی سے دونوں نے خلوص و محبت کے گہوارہ میں پرورش پائی تھی۔ دونوں نے ایک ساتھ تعلیم حاصل کی اور جب بالغ ہوئے تو دونوں ہی فوج میں نوکر ہو گئے۔ دونوں ہی ایک ساتھ اپنے ملک کی جنگ میں شامل ہوئے اور دادِ شجاعت دیکر عمدہ اور ممتاز عہدے حاصل کئے۔ جنگ ختم ہونے کے بعد جب دونوں بخیر و خوبی گھر واپس آئے تو گاؤں والوں نے فخر و عزت کے ساتھ اُن کا استقبال کیا۔ بوڑھے باپ نے سینے سے لگا کر دعائیں دیں۔

سایۂ پدری میں بے فکری سے بسر کرتے ہوئے زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ اُن کے والدِ بزرگوار نے جہانِ فانی کو خیرباد کہا۔ اور اُن دونوں بھائیوں کے لئے ایک بہت بڑی جائداد ترکہ میں چھوڑی۔ جب اس جائداد کی تقسیم کا سوال درپیش ہوا تو انھوں نے اس خیال سے کہ کہیں باہمی تعلقات و برادرانہ محبت میں رنجش و کشیدگی کی صورت نہ پیدا ہو جائے۔ اُنھوں نے یہ نئی ترکیب سوچی کہ اس تمام جائداد اور قیمتی اشیاء کو نیلام پر چڑھا دیا جائے اور جو چیز جس کو پسند آئے بولی بول کر اسے خرید لے۔

نیلام کا سلسلہ جاری تھا کہ تھوڑی دیر کے بعد ایک طلائی گھڑی کے نیلام کی باری آئی خوبصورت ہونے کی وجہ سے حاضرین کی نگاہیں اس پر جم گئیں۔ بولیاں بولی جانے لگیں اور ہر بولی پر گھڑی کی قیمت میں اضافہ ہونے لگا، ہارڈ اور اینڈرسن نے اس کی قیمت اس قدر بڑھا دی کہ اس سے زیادہ بڑھانے کی اور کسی کو ہمت ہی نہ پڑی۔ اب مقابلہ صرف دونوں بھائیوں کے درمیان رہ گیا۔ ہارڈ چاہتا تھا کہ اینڈرسن اس کے حق میں دست بردار ہو جائے، اور اینڈرسن کی خواہش تھی کہ اس کا بڑا بھائی اسے چھوٹا بھائی سمجھکر اسی کو گھڑی خرید لینے دے۔ لیکن دونوں میں سے کسی نے دوسرے کا خیال نہ کیا۔ بولی بدستور جاری رہی، بات بڑھتی گئی، طبیعتوں میں اشتعال پیدا ہونے لگا، ہر بولی میں گھڑی کی قیمت میں اضافہ ہو رہا تھا۔

"بیس ڈالر"

"تیس ڈالر"

"چالیس ڈالر"

"پچاس ڈالر" اس بولی کے بعد نیلام گھر میں ایک لمحہ کیلئے خاموشی چھاگئی، حاضرین خاموشی سے دونوں بھائیوں کی ضد کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ اینڈرس نے بارڈ کو شکست دینے کے لئے یکلخت "سو ڈالر" کہہ کر اس تماشہ کا فیصلہ کردیا، اور ایسا زبردست قہقہہ لگایا کہ تمام کمرہ گونج اٹھا۔ اس نے باواز بلند مجمع سے مخاطب ہوکر کہا "شاید اب گھڑی کا تماشا ختم ہوا اور اس کے ساتھ ہمارے برادرانہ تعلقات بھی ختم ہوئے" اتنا کہکر وہ جلدی سے نیلام گھر سے باہر چلا گیا۔ مجمع بھی اسکے پیچھے پیچھے چلا اور اس کے ساتھ اینڈرس بھی۔ بارڈ گھوڑے پر سوار ہوکر چلنے کو تیار تھا اینڈرس نے آواز دیکر کہا "بھیّا، سنو، میں اپنی شکست قبول کرتا ہوں، گھڑی تمھاری ہی رہی۔ شکریہ۔ اگر آج سے ہمارے برادرانہ تعلقات منقطع ہوگئے تو میں آئندہ کبھی تمھیں اپنی شکل نہ دکھاؤں گا۔"

"اطمینان رکھو، میری بھی کوئی غرض نہیں اٹکی۔ میں بھی تمھارے دروازہ پر جھانکنے نہ آؤنگا" بارڈ نے گھڑی کو جیب میں ڈالکر چلتے چلتے کہا اور گھوڑے کو ایڑ لگائی۔

اس واقعہ کے بہت عرصے بعد تک دونوں بھائیوں میں ملاقات نہ ہوئی۔ سال بھر گذر جانے پر اینڈرس نے اپنی شادی کی لیکن اپنے بھائی بارڈ کو اس تقریب میں مدعو نہ کیا۔ بارڈ نے بذات خود اسمیں شریک ہونا خلاف شان سمجھا۔

زمانے میں کسی کی ہمیشہ یکساں نہیں گذرتی، اینڈرس کی شادی کو ابھی ایک برس بھی نہ ہوا تھا کہ اسکی مسرت و شادمانی مصائب و آلام کا شکار ہونے لگیں۔ آئے دن کوئی نہ کوئی آفت ناگہانی نازل ہوتی رہتی مسلسل نقصانات کا تانتا بندھ گیا۔ ایک روز اچانک اسکی اچھی خاصی تندرست گائے لقمۂ اجل ہوگئی۔ دل پر پتھر رکھکر وہ یہ تمام نقصانات برداشت کرگیا لیکن جب موسم گرما کی ایک رات کو اچانک اُس کے کھلیان میں آگ لگ گئی اور اناج کا سارا ذخیرہ جل کر خاک سیاہ ہوگیا تو اُس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور اسکی کمر ہمت ٹوٹ گئی، اس نے اس آتشزدگی کا سبب معلوم کرنے کی ہرچند کوشش کی مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

اینڈرس کو اس نقصان کا اس قدر صدمہ ہوا کہ اس کا دنیا سے جی اُچٹ گیا، بے روزگاری نے غربت کی مہمان نوازی کی، باقی ماندہ اثاثہ بھی چند ہی روز میں ختم ہوگیا، بنا بنایا گھر بگڑ گیا۔

(۲)

آتشزدگی کے بعد ایک شام کو بارڈ اپنے بھائی اینڈرس کے مکان پر اس سے ملاقات کرنے آیا۔ اس وقت اینڈرس صحن میں ایک بوسیدہ چارپائی پر لیٹا ہوا اپنی پچھلی زندگی کے واقعات یاد کر رہا تھا۔ دل میں فکر و تردد کا بحر بیکراں موجزن تھا، چہرہ سے حزن و ملال ٹپک رہا تھا۔ وہ اس وقت تنہائی چاہتا تھا، بارڈ کی بے وقت آمد اُسے زہر معلوم ہوئی، یوں بھی اسکی صورت سے اُسے نفرت ہوگئی تھی۔ اُسکو دیکھتے ہی اُسکی آتش غضب بھڑک اٹھی، وہ چارپائی سے اُٹھ بیٹھا، باہر آیا اور کڑک کر بولا "اب میری بربادی کا تماشا دیکھنے آئے ہو، جاؤ، مجھے تم جیسے بھائی کی ضرورت نہیں۔"

اس قدر ناراض نہ ہو اینڈرس، میں اب بھی تمہارا بھائی ہوں کوئی دشمن نہیں، تمہاری مصیبت میری مصیبت ہے، اس وقت تمہارے غم میں شریک ہونے اور امکان بھر تمہاری مدد کرنے کے لئے ہی تمہارے پاس آیا ہوں"

مگر اینڈرس کو بارڈ کی اس تقریر میں اپنے توہین کی جھلک دکھائی دی، وہ جھلا کر بولا "مجھے فقیر سمجھ کر میری مدد کرنے آئے ہو، تم جو چاہتے ہو وہ ہوگیا، میری مدد کے بہانے میری غربت کا تماشا دیکھنے آئے ہو، تمہاری تمہیں کو مبارک رہے، اب خیریت اسی میں ہے کہ تم چلے جاؤ ورنہ ہم دونوں کے حق میں اچھا نہ ہوگا۔"

بارڈ نے اینڈرس کی اس ترش روئی کو نظر انداز کرتے ہوئے بڑی نرمی سے کہا "مگر میں تمہیں وہ گھڑی دینے آیا ہوں جو اصل بنائے مخاصمت ہے۔"

اس جملہ نے اینڈرس کی آتش غضب پر روغن کا کام کیا۔ وہ اور بھی زیادہ ترش ہو کر بولا "میں ایسی گھڑی پر تھوکتا ہوں، جاؤ اسے لے جاؤ، وہ تمہیں ہی مبارک ہو، جاؤ چلے جاؤ، یہاں تمہارا کوئی کام نہیں۔"

اب بارڈ کے پاس واپس جانے کے سوا اور چارہ ہی کیا تھا۔

جب بارڈ کو اینڈرس کی تنگ حالی اور مفلسی کا حال معلوم ہوا تو اسے بڑا رنج ہوا۔ اس نے بارہا بھائی سے اس سے ملنے کے موقعے تلاش کئے مگر کامیاب نہ ہوا۔ پوشیدہ طور پر مدد کرنے کی بھی اسے کوئی ترکیب نہ سوجھی، اسے یہ بھی خوف ہوا کہ شاید اینڈرس اسے قبول نہ کرے۔ ایک روز شام ہوتے ہی وہ خود اس کے مکان کی طرف گیا، اور لوگوں کی نظریں بچا کر اینڈرس کے مکان کے دروازے کے قریب چھپ کر کھڑا ہوگیا تھوڑی دیر بعد اینڈرس باہر آیا وہ کوٹھا کھولا جس میں اناج کا ذخیرہ اور گھاس اور لکڑیوں کا انبار لگا تھا۔ ضرورت کے مطابق وہاں سے لکڑیاں اٹھائیں اور پھر گھر میں واپس چلا گیا۔ اس وقت موقع تھا کہ بارڈ اینڈرس سے دوبدو گفتگو کر کے غلط فہمی دور کر دیتا مگر اس کی ہمت نہ پڑی۔ اینڈرس کے چلے جانے کے بعد بارڈ اس پوشیدہ جگہ سے نکلا، آہستہ سے اناج والا کوٹھا کھولا، کوئی لکڑی کا ٹکڑا جلا کر روشنی کی اور اس کھونٹی پر جس پر اینڈرس لالٹین لٹکا دیتا تھا، وہی طلائی گھڑی جو اس ناچاقی کی بنا تھی لٹکا دی۔ روشنی بجھائی، دھیرے دروازہ بند کیا اور باہر آکر دبے پاؤں اپنے مکان کا راستہ لیا۔ اگلے روز اس نے سنا کہ اینڈرس کے اناج کے کوٹھے میں آگ لگ گئی اور سب کچھ جلکر خاکستر ہوگیا۔

دفعتاً اسے شبہ ہوا کہ کہیں وہ خود ہی تو اس تباہی کا باعث نہیں ہوا، ممکن ہے کہ عجلت میں اس لکڑی کی کوئی چنگاری جو اس نے بغرض روشنی جلائی تھی اس انبار پر جا پڑی ہو اور اس نے آہستہ آہستہ سلگ کر برق خرمن

نا کام کیا ہو۔ یہ خیال آتے ہی اُسکی گردن خود بخود شرم و ندامت سے جُھک گئی۔ اُسکا ضمیر اُسے مطعون کرنے لگا۔
س حادثہ کا اس پر اس قدر اثر ہوا کہ کچھ دیر کے لئے تو وہ بدحواس سا ہو گیا۔ شام تک منھ ڈھانپے پڑا رہا۔ جب ذرا
ہوش آیا تو اُٹھکر گھر کے پرستش گاہ میں جا بیٹھا۔ اور درگاہ خداوندی میں اپنے قصور کا اقبال کر کے دست بستہ
معافی مانگنے لگا۔ ایسا کرنے سے اُسکا جی کچھ ہلکا ہوا۔ اُس نے تہیہ کر لیا کہ وہ شام کو اینڈرس کے پاس جا کر تمام
حقیقت بیان کر دے گا۔ اسی خیال کے زیر اثر وہ آفتاب غروب ہوتے ہی جائے وقوعہ پر پہونچا اور اپنی لٹکائی ہوئی
گھڑی تلاش کرنے لگا۔ مگر گھڑی کے بجائے اب اُسے راکھ کے ڈھیر میں سے سونے کا ایک ڈلا ملا۔ بارڈ اس رات کو
اینڈرس کے پاس اُس سونے کے ٹکڑے کو لیکر تمام واقعات بیان کرنے گیا تھا۔ مگر اُس کے بھائی نے اُسے کچھ
کہنے کا موقع ہی نہ دیا اور پھٹکار کر اپنے گھر سے بھگا دیا۔ اس طرح وہ راز جس کا انکشاف کرنے بارڈ اینڈرس
کے پاس گیا تھا، کھل نہ سکا اور وہ اس دفینہ کو لیکر اپنے گھر واپس آ گیا۔

دونوں بھائیوں کے کشیدہ تعلقات کی بنا پر اکثر گاؤں والے بارڈ ہی کو اس تباہی کا باعث سمجھتے تھے۔
اینڈرس بھی اُسے مجرم خیال کرنے لگا تھا۔ معاملہ عدالت تک پہونچا۔ گاؤں والوں نے بارڈ کے خلاف شہادتیں
دیں۔ مگر کوئی پختہ ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے عدالت نے بارڈ کے خلاف فیصلہ کرنے سے انکار کیا۔ عدالت کا کمرہ
آدمیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، تماشائیوں کا ہجوم تھا۔ عدالت نے اینڈرس سے سوال کیا کہ "آپ بھی اپنے
بھائی پر اس ارتکاب جرم کا محض شبہ ہے" یا اُس کی تائید میں وہ کوئی پختہ ثبوت پیش کر سکتا ہے؟ اس سوال پر عدالت
کے کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ دونوں بھائیوں کی نظریں ملیں، اینڈرس نے محسوس کیا کہ اُس کے بھائی کی پریشان
اور التجا آمیز نگاہیں اُس سے اپنے حق میں فیصلہ چاہتی ہیں۔ اُس نے بارڈ کی طرف سے نظریں پھیر کر عدالت کی
جانب مخاطب ہو کر بآواز بلند کہا "نہیں!"
فیصلہ بارڈ کے حق میں رہا، عدالت برخاست ہوئی۔

اس فیصلے کے بعد سے دونوں بھائیوں کے رویہ میں نمایاں تبدیلی ہونے لگی، بارڈ تنہائی پسند ہو گیا
اس کا وقت زیادہ تر عبادت و ریاضت میں صرف ہونے لگا۔
اینڈرس نے تسکین کی دوسری صورت نکالی، وہ شراب پینے لگا، رفتہ رفتہ اُس کی شراب خواری بڑھنے لگی۔
وہ گھنٹوں بے سُدھ پڑا رہتا، دنیا و ما فیہا سے بے خبر اُس کی حالت بد سے بدتر ہونے لگی۔ اچانک ایک
دن ایک نہایت شکستہ اور مفلوک الحال عورت بارڈ کے دروازے پر آئی اور اُس سے اپنے ہمراہ چلنے کی درخواست کی

ہارڈ اُسے پہچان گیا، وہ اُس کے چھوٹے بھائی اینڈرس کی بیوی تھی، ہارڈ اُس کے آنے کا سبب بھی سمجھ گیا اور فوراً اُس کے ہمراہ ہولیا۔ جب وہ دونوں اینڈرس کے مکان کے قریب پہونچے تو ہر سمت گہری تاریکی مسلط ہو چکی تھی۔ مکان کی کھڑکی سے ایک مدھم سی روشنی جو اس چراغ بے روغن کی روشنی کے مثل تھی جسکی صرف تتی ہی جل رہی ہو دکھائی دے رہی تھی۔ اسی روشنی کے سہارے دونوں مکان پر پہونچے، مکان اس وقت گورِ غریباں کا منظر پیش کر رہا تھا۔ در و دیوار سے بیکسی ٹپک رہی تھی۔ ہارڈ نے اندر داخل ہوکر دیکھا کہ اس کا بھائی زار و نزار ایک بوسیدہ چارپائی پر چیتھڑوں میں ملبوس پڑا ہے۔ چہرہ پر مُردنی چھائی ہوئی ہے، چاروں طرف عفونت آرہی ہے، بڑا ہیبت ناک اور حوصلہ شکن سماں تھا۔ ہارڈ اس نظارہ کی تاب نہ لاسکا۔ وہ بھائی کی چارپائی کے قریب بیٹھکر زار و قطار رونے لگا۔

آسمان ابر آلود تھا، رہ رہ کر بجلی چمک جاتی تھی، یکایک موسلا دھار پانی برسنے لگا، ایک بار پھر بجلی کوندی، بوندوں کا ہر ایک تار مجسم برق ہوکر جگمگا اُٹھا اور تمام مکان روشن ہوگیا۔ اینڈرس نے اس روشنی میں اپنے بھائی کی طرف نظر گھما کر دیکھا اُس کی آنکھوں سے اب بھی جھڑی لگی ہوئی تھی، تھوڑی دیر تک رو چکنے کے بعد جب بار کا دل ذرا ہلکا ہوا تو آہستہ آہستہ دونوں بھائیوں میں گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا، تمام پچھلے واقعات دُہرائے گئے، غلط فہمی دُور کرنے کے لئے ہارڈ نے وہ طلائی گھڑی جو اب ایک سونے کے ٹکڑے کی صورت میں تھی مزید ثبوت میں پیش کی۔ مگر اب یہ تمام باتیں بے سود تھیں۔

سینۂ ہاشمی میں جو زخم کاری لگ چکا تھا اُس کا اب نہ کوئی علاج تھا نہ درماں، جو نقصان ہوچکا تھا اُس کی تلافی ناممکن تھی، آئینے میں جو بال پڑگیا تھا وہ اب نکالا نہ جاسکتا تھا۔

بھائی کی زبان سے اپنی ہی داستان غم سنتے سنتے اینڈرس سوگیا، ہارڈ نے اپنے بھائی کے علاج اور تیمارداری میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ مگر جس چراغ کا تیل ہی ختم ہو چکا ہو وہ زیر دامن رکھکر بھی بجھنے سے نہیں بچایا جاسکتا۔ اینڈرس کی بیماری گھٹتی نظر نہ آئی، نقاہت روز بروز بڑھ رہی تھی اور زندگی کا کچھ بھروسہ باقی نہ رہا۔

ایک روز صبح کو اُس نے ہارڈ کو اپنے نزدیک بُلایا اور آنے والی موت کو نقاب زندگی میں چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے خفیف مسکراہٹ کے ساتھ کہا "بھیا آج میری طبیعت قدرے بہتر ہے، شاید میں جلد تندرست ہوجاؤں، اور پھر ہم دونوں اسی پیار و محبت سے رہیں گے جیسے ایام گذشتہ میں رہا کرتے تھے اور پھر زندگی بھر ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے۔"

لیکن افسوس، اینڈرس کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا، شام ہوتے ہی اس کا آفتاب زندگی بھی موت کی آغوش میں روپوش ہوگیا۔ ہارڈ نے اپنے مرحوم بھائی کی بیوہ اور بچے کی پرورش و نگہداشت کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی، اور اُن کی آرام و آسائش کا انتظام کردیا۔

رفتہ رفتہ تمام واقعات روشنی میں آگئے اور حقیقت آشکارا ہوگئی، وہی گاؤں والے جو کبھی بارڈ سے بدظن اور متنفر ہوگئے تھے اب اس کی عزت و وقعت کرنے لگے۔ اور اب اُس کے حسن سلوک اور حسن اخلاق کا چرچا عام ہوگیا۔ بارڈ نے اپنے مرحوم بھائی کی یادگار میں ایک رفاہ عام اسکول بھی قائم کردیا، گاؤں کے سبھی بچے اس میں تعلیم و تربیت حاصل کرنے لگے۔ خود بارڈ بھی اسکول میں بچوں کو محبت و نیکی کی تلقین کیا کرتا تھا۔ جب گاؤں کے بچے "گروجی، گروجی" کہہ کر اس کے گرد جمع ہو جاتے تو اُس کی آنکھیں خود بخود آسمان کی طرف اُٹھ جاتیں، شاید اپنے بھائی کا آشیرباد لینے کے لئے۔

علم الاقوام حصہ اول و دوم

یہ کتاب ڈاکٹر بیرن عمر رالف ایہرن فلس کی کتاب "ایتھنالوجی" (Ethnology) کا ترجمہ ہے جسے ڈاکٹر عابد حسین صاحب نے اردو کا لباس پہنایا ہے۔ اصل کتاب فاضل مصنف نے ہندوستان آکر مختلف قبائل اور قدیم مقامات کی سیر و سیاحت کرکے تصنیف کی تھی۔ ۱۹۳۹ء میں جب موجودہ جنگ چھڑی تو مصنف کو بھی غیر ملکی ہونے کی وجہ سے نظربند کرلیا گیا تھا مگر بعد میں چھوڑ دیا گیا۔ اس کتاب میں دنیا کے مختلف ملکوں کی قوموں کی تہذیب و تمدن اور رسم و رواج سے بحث کرکے یہ دکھایا گیا ہے کہ کون کون سی باتیں مختلف اور کون کون سی مشترک ہیں۔ اس کتاب میں شمالی و جنوبی امریکہ، افریقہ، ایشیا، ہندوستان، آسٹریلیا اور بحر ہند اور بحرالکاہل کے جزیروں کی قوموں کے طرز زندگی، عادات و خصائل اور رسم و رواج پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مضمون اگرچہ خشک ہے مگر پیرایۂ بیان دلچسپ ہے۔ کتاب میں جگہ جگہ تصویریں اور نقشے بھی دیدیئے گئے ہیں۔ غرض ڈاکٹر عابد حسین صاحب کی محنت قابل داد ہے، جنھوں نے ایسی ادق کتاب کا ایسا عمدہ اور سلیس ترجمہ کیا ہے۔ قیمت جلد اول سوا دو روپیہ اور جلد دوم ایک روپیہ دس آنے۔ یہ دونوں کتابیں انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی سے ملیں گی۔

جواہر العلوم

یہ کتاب دراصل علامہ طنطاوی جوہری مصری کی مشہور و معروف عربی کتاب کا ترجمہ ہے۔ جسے مولانا عبدالرحیم صاحب پروفیسر عربی اسلامیہ کالج پشاور نے بہت عمدگی سے اردو کا لباس پہنایا ہے۔ اس میں مکالمہ کے پیرایہ میں دنیا کے عجائبات کا ذکر کیا گیا ہے اور مذہبی رنگ سے تمام باتوں کی توضیح و تشریح کی گئی ہے۔ کئی فلسفیانہ مسئلے بھی دلچسپ اور آسان طریقہ سے حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور موضوع کی بحث میں آیات قرآنی سے کام لیا گیا ہے۔ جس طرح کسی زمانہ میں آریہ اُپدیشکوں کو ہر چیز کا ثبوت وید سے بہم پہونچانے کا شوق تھا، اسی طرح علامہ طنطاوی نے بھی ہر بات میں حدیث و قرآن سے استدلال کی کوشش کی ہے۔ بہرحال اس کتاب سے خدا کی شان و عظمت ظاہر ہوتی ہے جس سے کسی کو بھی انکار نہ ہونا چاہیئے۔ لکھائی چھپائی اچھی، کاغذ عمدہ، بڑی تقطیع کے ۲۲۰ صفحات ضخامت۔ قیمت دو روپیہ عام۔ ملنے کا پتہ: تاج کتب خانہ، یوسف بلڈنگ بمبئی ۳

تنقیدِ کتب

کلیاتِ بیخود موہانی مرحوم[۱]

علامہ سید محمد احمد بیخود موہانی ایم ۔ اے مرحوم چمن شاعری کے ایک گل سرسبد تھے۔ اُن کا مذاق شعرگوئی صاف ستھرا تھا وہ اُردو اور فارسی کی شاعری پر قریب قریب یکساں قدرت رکھتے تھے، غزل بھی کہتے تھے اور قصیدہ بھی اور جو کچھ کہتے تھے وہ اپنے اسلوب ادا و عنوان تخئیل کے لحاظ سے پاکیزہ شاعری کا دل پسند نمونہ ہوتا تھا۔ وہ مغربی رنگِ سخن اور اُس کے مذاق تخئیل و طرزِ ادا سے کافی واقفیت رکھتے تھے لیکن بااین ہمہ اُن کے ادبی ذائقہ کو اُردو اور فارسی کے باغوں کا پھل (یعنی غزل) ہی مرغوب رہا اور وہ زیادہ تر اسی میدان میں طبع آزمائی کرتے رہے۔

اگرچہ آجکل مغربی مذاق کی تقلید میں غزلیہ شاعری کے خوشرنگ اور نازک پھولوں میں نکتہ چینیوں کے کانٹے برابر چُبھوئے جا رہے ہیں، حد یہ ہے کہ بعض دلچسپ نقاد غزل کو ایک "نیم وحشی صنفِ ادب" سمجھے ہوئے ہیں مگر ہمیں یہاں اس قسم کے پُرلطف اعتراضوں سے بحث نہیں ہے۔ ہمیں تو یہاں تغزل کے ایک تازہ کارنامہ پر اجمالاً اظہارِ خیال کرنا ہے اس لیے اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ غزل کے اشعار اپنی جگہ پر مکمل چیزیں ہوتے ہیں۔ اُن عام متغزلین سے بحث نہیں جنھیں حقیقتاً صحیفۂ شاعری کی آستان بوسی تک کا شرف حاصل نہیں ہوا ہے۔ لیکن جو لوگ اس کے جام و مینا کی مستیوں میں زندگی کی کچھ سانسیں صرف کر چکے ہیں اُن کی غزل کے اشعار اپنی جگہ پر مکمل ہوتے ہیں اور اُن میں کبھی سادہ کبھی پیچیدہ "جذباتی و تخئیلی تجربے" نظر آتے ہیں اور اُن کے اشعار میں حسنِ معنی بھی ہوتا ہے اور حسنِ صورت بھی۔

بیخود مرحوم کی بیشتر غزلیہ شاعری بھی "نفسی و جذباتی زندگی" کی تفسیر ہوتی ہے یا پھر اُس کی تنقید۔

اک یوں چمن میں مہکے اک یوں قفس میں تڑپے — تو ہی خدائے گل ہے کیوں اے خدائے بلبل؟

گل و بلبل کے تذکرہ پر بدمزہ ہونے والے نقاد ذرا غور سے دیکھیں کہ ان (symbols) علامات کے ذریعہ ہماری موجودہ زندگی کی کتنی بلیغ تفسیر اور اُس پر کتنی حقیقت میں ڈوبی ہوئی تنقید کی گئی ہے۔ اور ایک پیچیدہ اقتصادی فلسفہ کتنے اچھے اور دلپذیر پیرایہ میں شعر کے قالب میں جلوہ گر کیا گیا ہے۔

لذت کبھی تھی اب تو مصیبت سی ہوگئی — مجھکو گناہ کرنے کی عادت سی ہوگئی

انسانی فطرت کا ایک یہ بھی رُخ ہے کہ جن چیزوں کو کبھی لذت سمجھکر اختیار کیا جاتا ہے وہ رفتہ رفتہ عادت میں داخل ہو جاتی ہیں اور پھر اُن کا ترک کرنا آسان نہیں رہتا۔ دُخترِ رز اسکی واضح مثال ہے، پہلے کیف و سُرور کی جان

۱؎ قیمت ۴؍ ملنے کا پتہ: سید محمد اختر حسین موہانی فارسی ہنڈی سکان نمبر ۵۵؍۹ بجاری ٹولہ، لکھنؤ

جھجھک کر اُسے منھ لگایا جاتا ہے۔ مگر تھوڑے ہی دنوں بعد یہ گناہ جزو عادت ہو جاتا ہے اور اب انسان اپنے کو اس پر مجبور پاتا ہے کہ جام و سبو کے سہارے زندگی بسر کرے اور مے و میخانہ ہی میں عمر کاٹ دے۔ فطرت کا یہ پہلو بہت عام ہے۔ جناب بیخود نے حیات انسانی کے اس رخ کی تفسیر شاعر کے لہجہ میں کی ہے:۔

کچھ حضرتِ واعظ کے بنائے نہیں بنتی
دنیا متاثر ہے زمانہ کی ہوا سے

اس شعر میں بھی بیخود مرحوم نے عام زندگی کی تفسیر کرتے ہوئے وہ پیرایہ اختیار کیا ہے جس سے باتوں ہی باتوں میں اُس کی تنقید بھی ہو جاتی ہے۔

عام قاعدہ ہے کہ دنیا میں جب کوئی نیا مذہبی و سیاسی یا اقتصادی رُجحان ماحول و دیگر محرکات کے دباؤ سے قبولیت حاصل کرتا ہے تو پھر اُسکی قباحتوں یا خرابیوں کی طرف کتنے ہی اشارے کئے جائیں مگر اُس کی کشش رُکتی نہیں۔ غول کے غول اُس کی طرف کھنچتے چلے آتے ہیں۔

اس سلسلہ میں اس واقعہ کی طرف بھی اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ عام معاشرتی زندگی میں بیخود مرحوم کی تیز و طرار فطرت شوخی کے نشتروں کی مالک بھی نظر آتی تھی چنانچہ کبھی کبھی ادبی نقد و انتقاد کی دنیا میں یہی نشتر دشنہ و خنجر کی صورت اختیار کر لیتے تھے لیکن اُن کی شاعری میں یہ فطری شوخی کہیں بھی بھٹکتی نظر نہیں آتی۔ یہ ضرور ہے کہ بیخود کوئی فرشتہ نہ تھے، اِسی دنیا کے گوشت پوست کے بنے ہوئے انسان تھے، جوانی کی تیز و تند دھار سے لڑتے ہوئے وہ کھولت کے ساحل پر (اگر اُسے ساحل کہا جا سکے) پہونچے تھے، پھر کوئی وجہ نہیں کہ شباب کے پُرشور جذبات کا اُنھیں تجربہ نہ ہوا ہو اور حرص و ہوس کی لہریں اُن کے دل میں بھی نہ اُٹھتی رہی ہوں۔ ایسی حالت میں اگر اُن کی فطری شوخی "انگیا اور جوبن" سے کھیلنے لگتی تو کچھ تعجب نہ ہوتا۔ تاہم اس معصیت کی عمر میں بھی اُنھوں نے جذبات کو تنہا نہیں چھوڑا بلکہ پاسبانِ عقل کو اُن کے سر پر مسلط رکھا۔ بات تو یہ ہے کہ اُنھوں نے عین جوانی ہی میں یہ سمجھ لیا تھا کہ دل میں پیدا ہونے والی تمام کیفیتوں کا منظرِ عام پر بے نقاب کرنا خوش مذاقی نہیں ہے۔ مصرعہ "مٹی کی بھی ملے تو رواہے شباب میں" جس خواہش کا اظہار کر رہا ہے وہ جوانی کی ایک فطری خواہش سہی تاہم "پس پردہ" ہی رکھنے کی چیز ہے۔ ان خواہشوں کا یوں سربازار اعلان ہونے کی بہت ہی بگڑی ہوئی ننگی تصویر ہے۔ جو ادب یا شاعری صحیح معنوں میں ترقی پسند ہے وہ ان بہیمانہ جذبات کا اظہار اس بیباکی کے ساتھ پسند نہیں کر سکتا۔ انسان بربریت اور بہیمیت کی حدوں سے بہت سی باتوں میں کہیں آگے نکل چکا ہے، اب اُسے پھر اُنھیں حدوں کی طرف ڈھکیلنا رجعت پسند ادیبوں ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ بیخود مرحوم نے جہاں تک ہمارے اُن کی شاعری پر نظر ڈالی ہے اس ادبی رجعت پسندی کا ارتکاب نہیں کیا ہے۔ اُنھوں نے ہمیشہ اس پر نظر رکھی کہ انسانی جذبات میں سے کون سے جذبے شعری نغمہ کے لئے مناسب ہیں۔ اسی لئے اُن کے تغزل کے متعلق بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ وہ جذبات اور عقل کی آمیزش کا نتیجہ ہے اور یہی اُنکی انفرادیت ہے جو عام متغزلین کی صف سے اُنھیں علیحدہ کرتی ہے۔

Progressive

اُن کی شاعری کی ایک خصوصیت اور بھی ہے جس کا تعلق اُن کے طرزِ بیان اور اسلوبِ ادا سے ہے۔ باوجودیکہ وہ مرزا غالب کے خمخانۂ شاعری کے بادہ نوش اور اُن کی تخئیل کی رفعتوں کے پرستار تھے تاہم اُنھوں نے اپنی شاعری میں وہ ترکیبی بدعتیں اختیار نہیں کیں جنھیں مرزا نے زبردستی برتا تھا۔ چنانچہ بیخود کے یہاں ٹکسالی محاورے ہیں، صاف ستھری ترکیبیں ہیں، اچھے تُلے لفظ ہیں، غرض اُنھوں نے اپنی شاعری کے نغمے انھیں بولوں میں ترتیب دیئے ہیں جو اُردو زبان کے خاصے کی چیزیں ہیں۔ ذیل میں بیخود مرحوم کے چند شعر درج کئے جاتے ہیں جن سے ان خصوصیات کا پتہ چل سکے گا۔

زینت پہ کائنات کی جانے لگی نظر   اب میں ترے خیال کے قابل نہیں رہا
درِ میخانہ کھلا جب نہ کھلی آنکھ اپنی   اب کھلی آنکھ تو در بند ہے میخانے کا
خبر ہے تجھکو نشیمن اُجاڑنے والے   مرا جہان ہی تنکوں کا آشیانہ تھا
یہ چھیڑ نکہتِ گل کی قفس نصیبوں سے   نظارۂ روشِ روزگار کرتا جا
یہ عالم تھا کبھی دل کا مرے جوشِ تخیل سے   جو نقشہ آنکھ میں پھرتا وہی پیراستہ ہوتا
سا لہو برسا بہت اب بھی زمین جور پیاسی ہے   کسی معصوم کا خوں لے گی دنیا اپنی گردن پر
دل پہ ہو یا ناخدا پر یا خدا پر اعتماد   بے خبر ہیں موج سے گرداب سے ساحل سے ہم
مٹتا نہیں قبول تو دنیا میں آئے کیوں   دھارے پہ آندھیوں کے نشیمن بنائے کیوں
صدقے تیرے کرم کے مجھے دار چاہیئے   یہ تو ارم ترا ہے مرا آشیاں کہاں
محشر بھی ایک منزلِ راہِ وجود ہے   بتلاؤں کیا رُکے گا مرا کارواں کہاں
بس کھُل گئی حقیقتِ نقاشیِ خیال   سب رنگ اپنے بھر دیئے تصویرِ یار میں
دل سی صراحیاں ہیں لہو سے بھری ہوئی   کیا ڈھونڈھتا ہے میکدۂ روزگار میں
دن رات آسماں سے برستی ہیں مستیاں   تو ڈھونڈھنے چلا ہے دلِ ہوشیار کو
کاہیکو یوں بسی کبھی بستی خیال کی   دُنیا اُجڑ بھی جائے تو ہم کو خبر نہ ہو
تڑپتی بجلیاں پھر خانہ بربادی کے درپے ہیں   قفس کی خیر یارب ہو چکی خیر آشیانے کی
کیا آستانِ غیر پہ جھک جائے سر مرا   وہ سر کہ تیرے سجدے کے قابل نہیں رہا

ہمکو اس بات کا دلی افسوس ہے کہ جناب مرحوم کی زندگی میں یہ خوش آب موتی دیوان کی لڑی میں نہ پروئے جا سکے اگر انکی نگرانی میں جمع و تالیف کا کام انجام کو پہونچتا تو کتابت و طباعت و انتخابِ اشعار کی بہت سی فروگذاشتیں اسمیں نہ ملتیں۔ چونکہ بیخود کے مرنے کے بعد یہ مجموعہ ترتیب دیا گیا ہے اسلئے ان فروگذاشتوں سے قطع نظر کرتے ہوئے بہرطور ہم اُن حضرات کا شکر ادا کرتے ہیں جنھوں نے کسی نہ کسی طرح شاعری کے اس متاعِ گرانمایہ کو صاحبانِ ذوق تک پہونچا دیا۔

سید اختر علی تلہری

نئے ادبی رُجحانات [1]

رجعت پسند روایت پرست اور مطلق حقیقتوں کا اعتقاد رکھنے والے شاعر، ادیب اور نقاد آج تک اپنی آواز بلند کرتے جا رہے ہیں لیکن علم کی روشنی نے بہت سے پردے اُٹھا دیے ہیں اور ادب کو بھی فلسفہ کی حکیمانہ نظر سے دیکھا جا رہا ہے۔ اس تغیر کی ابتدا تو آزاد اور حالی کے ہاتھوں ہوئی تھی لیکن وقت کے تقاضے سے اُن میں اتنا اضافہ ہو گیا ہے کہ حالی اور آزاد کے انداز تنقید میں بھی کم کشش رہ گئی ہے۔

ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے دور بیداری کے احساس کا نام ہے اور وہ احساس حالات کے بدلنے کی وجہ سے جتنا تند اور واضح ہوتا گیا ادب اور اس کے دوسرے متعلقات بھی اتنے ہی واضح ہوتے گئے۔ آہستہ آہستہ قدیم اور جدید کے درمیان ایک خلیج سی حائل ہو گئی۔ اس طرح دو گروہ انتہا پسند پیدا ہو گئے۔ ایک نے جدید ادبی کارناموں کی اہمیت ماننے سے انکار کر دیا اور دوسرے نے قدیم کے لئے یہ کہہ دیا کہ وہ قابل سوختنی ہے لیکن اسی کے ساتھ ایک گروہ ادب کو تاریخی نقطۂ نظر سے دیکھنے والوں کا بھی وجود پذیر ہوا۔ اور اُس نے جذبات سے الگ ہو کر ادب کو انسانی اعمال، افعال اور محسوسات کے ترجمان کے طور پر دیکھا، اس کا تجزیہ کیا اور اُسے وقت کے قانونوں کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی۔ اُس نے تنقید جدید کی عینک لگا کر قدیم ادب کا بھی جائزہ لیا اور دونوں کے فرق کی تاریخی حیثیت کو واضح کر دیا۔

جدید اُردو ادب اپنی ہمہ گیری کے لحاظ سے اتنا اہم ہے کہ اُس پر اس سے زیادہ لکھنے کی ضرورت ہے جتنا آج لکھا جا رہا ہے۔ اس وقت تک جتنی کتابیں اور جتنے مضامین اس موضوع پر ہمارے سامنے آئے ہیں وہ موجودہ ادب کی تخلیقی طاقتوں کا پورا جائزہ نہیں لے سکے ہیں۔ ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ کی انگریزی تصنیف [2] نہ صرف وقت کے لحاظ سے پُرانی چیز ہو گئی بلکہ اپنے تجزیہ میں بھی ناقص ہے۔ ڈاکٹر عبد اللطیف کی انگریزی کتاب [3] اُس معاشرتی اور سماجی پیچیدگی کو بے نقاب نہیں کرتی جس کے بغیر ادب کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ پھر وہ کتاب بھی اب پُرانی ہو گئی۔ عبد القادر سروری کی "جدید اُردو شاعری" ایک طرف تو صرف شاعری کا تذکرہ کرتی ہے دوسری بات ادبی تغیرات کو گہری نظر سے نہ دیکھنے کا پتہ دیتی ہے۔ علی حسنین زیبا کا رسالہ "جدید اُردو ادب" بہت مختصر اور سطحی ہے۔ کلیم الدین احمد نے "اُردو شاعری پر ایک نظر" میں اگرچہ قدیم اُردو ادب کے نمایندوں کو بھی لے لیا ہے لیکن درحقیقت اُس میں جدید اُردو شاعری پر زیادہ بحث ہے۔ پروفیسر کلیم الدین کے یہاں شاعر کی ذات اور اُسکی شاعری تمام سماجی اور تاریخی پس منظر سے الگ کوئی چیز معلوم ہوتی ہے اور نکتہ چینی کی نگاہ نقاد کی نگاہ پر غلبہ پا گئی ہے۔ ڈاکٹر عبد اللہ کا رسالہ "جنگ عظیم کے بعد اُردو ادب" بہت مختصر ہے۔ جدید ادبی رُجحانات پر مضامین بھی کثرت سے شائع ہو رہے ہیں اور بعض صحیح نقطۂ نظر کا پتہ دیتے ہیں لیکن زیادہ تر یا تو شرح میں قصائد کا فرض انجام دیتے ہیں یا انسانی زندگی کے تمام انفرادی اور سماجی مرکبات کو ایک میں سمو کر ادب کے اس سے رشتہ پر نگاہ نہیں ڈالتے اور اس طرح جو نتیجہ وہ نکالتے ہیں وہ کمزور ہوتا ہے۔

---

[1] از سید اعجاز حسین لکچرر الہ آباد یونیورسٹی مجلد مع گرد پوش۔ قیمت تین روپیہ۔ مصنف سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

[2] Characteristics and Tendencies of Modern Urdu Poetry.

[3] The Influence of English Literature on Urdu Language and Literature

اس طرح گویا جدید اُردو ادب کا اور اُن رجحانات کا ذکر برابر ہو رہا ہے جو قدیم ادب سے اُسے ممتاز کرتے ہیں۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی پروفیسر سید اعجاز حسین صاحب الہ آباد یونیورسٹی کی جدید تصنیف "نئے ادبی رجحانات" بھی ہے۔ یہ ۲۰۰ صفحوں میں اُن نئے رجحانات کا مطالعہ ہے جو ادب کے مختلف اصناف کے عروج و زوال کے سلسلہ میں کام کر رہے تھے۔ مصنف نے بہت ہی اچھا کیا کہ نثر کو بھی اپنے مطالعہ میں شامل کر لیا۔ یہ عجب اتفاق ہے کہ اردو کے نقاد جب لکھنے بیٹھتے ہیں تو انھیں شاعری کی دیوی اپنی جانب کھینچ لے جاتی ہے اور نثر کی اُس حیرت خیز ترقی کی طرف نگاہ نہیں جاتی جو غدر کے بعد سے اُردو ادب کی سب سے اہم تبدیلی ہے۔ پروفیسر صاحب نے نظم و نثر کے الگ الگ حصے کر دیئے ہیں اور تمہید کے طور پر دونوں کی ابتدا میں قدیم ادب کا بھی سرسری سا جائزہ لے لیا ہے اس طرح ایک ہی جگہ پر قدیم و جدید ایک دوسرے کے مقابل میں آکر اپنا سرمایہ پیش کر دیتے ہیں۔ تاریخی اور معاشی اسباب منظر تیار ادب کے ہر تغیر کی تہ میں کام کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے اُس سے ہر جگہ پر مخصوص سلیقہ سے کام لیا گیا ہے۔

آزاد کی طرح اعجاز صاحب کے یہاں بھی اکثر طرز تحریر کی رنگینی مطلب اور مقصد پر حاوی ہو گئی ہے اور آزاد بیچارے اسی وجہ سے بدنام ہو گئے کہ اُنھوں نے تنقید و تاریخ کو بھی افسانہ کا رنگ دیدیا۔ آزاد کی تنقید نگاری میں یہ بات سب سے اہم تھی کہ وہ کسی پر اس طرح اعتراض نہ کریں کہ اُس کا یا اُس کے معتقدین کا دل دُکھ جائے۔ یہ بات چاہے تنقید کے لئے مفید نہ ہو لیکن آزاد کی انسانیت کا ضرور پتہ دیتی ہے۔ اسی بات کا مظاہرہ پروفیسر اعجاز صاحب کی تصنیف میں بھی ہوتا ہے کہ موصوف نے اعتراض کیا بھی ہے تو اس نرمی سے کہ عقلمندوں کے لئے اشارے کا کام دے اور نشتر لگانے کی ضرورت پیش نہ آئے۔

بالکل نئے لکھنے والے جو مستقبل کی تاریخ میں جگہ پائیں گے آج بھی ہمت افزائی، توجہ اور رہبری کے مستحق ہیں۔ اعجاز حسین صاحب نے بڑی فراخ دلی سے اُن کی محنتوں اور کاوشوں کا خیر مقدم کیا ہے اور اُن کی اُن سماجی ذمہ داریوں کا احساس کیا ہے جو ہندوستان کی موجودہ حالت اُن پر عائد کرتی ہے۔ مختلف تحریکات کے مظاہر کا ادب میں تلاش کرنا اور اُن کے لئے مثالوں کا نکال لینا اتنا آسان کام نہیں جتنا بادی النظر میں دکھائی دیتا ہے لیکن مصنف نے اس پر جی کھول کر وقت صرف کیا ہے۔

نہ صرف ادبی تنقید سے دلچسپی رکھنے والے بلکہ ادب کا عام ذوق رکھنے والے بھی اس کتاب میں بہت کچھ پائیں گے۔

(ا۔ ح)

"محشرِ خیال"

(از قلم مولوی محمد یحییٰ، تنہا بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی)

سجاد علی صاحب انصاری مرحوم بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی کے مضامین اور اشعار کا یہ مجموعہ باضافہ (دیباچہ) نہایت آب و تاب کے ساتھ قرول باغ دہلی سے دوبارہ شائع ہوا ہے۔

سجاد علی مرحوم کا مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا کہ خود اُن کے مضمون "حقیقت عریاں" کے الفاظ میں "احتیاط اسکی مقتضی (ہوئی) کہ اسے کسی دوسری دنیا میں بھیجدیا جائے" تاکہ (اُس) کی حوصلہ مندیاں وقار خداوندی کی طرف متوجہ نہ ہو سکیں" یہ ضعیف البنیان انسان اپنے خیالات کی رو میں کہاں سے کہاں بہہ جاتا ہے ع "ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال"

کچھ بھی ہو آسکر وائلڈ کی تحریرات نے سجاد علی مرحوم کو اپنی سحر طرازیوں سے مسخر کر لیا اور انھوں نے اپنے مضامین میں وہ شگوفہ کاری کی ہے کہ اردو نثر میں اسکی نظیر نہیں مل سکتی۔ مختصر الفاظ میں وسیع معانی پنہاں ہیں اور ایک ایک لفظ انکی مرصع کاری پر شاہد عادل ہے مثلاً

"فرشتے کی انتہا یہ ہے کہ شیطان ہو جائے"۔ "ایک حقیقت جب پلٹتی ہے دوسری حقیقت ہو جاتی ہے" "ارتقاء انسانی کی آخری منزل عورت ہے"۔ "یعنی انبساطِ شباب۔ کا ایک مجسمہ جسکی ہر کشش اپنے دامن میں کائنات کیلئے ہزاروں برکتیں رکھتی ہے۔"

"سنجیدہ فلسفہ چاہتا ہے کہ ہر واقعہ اور انسان کا ہر خیال عالم طلسم سے نکل کر واقعیت کی خشک فضا میں آجائے۔ اگر یہ ممکن ہوتا تو خدا کی اس جلوہ گاہ میں زندگی کا ایک ایک لمحہ ناقابل برداشت ہو جاتا۔ محبت کی لطیف حماقتیں اور حسن کا لطیف تر تلوّن انھیں دو توں قوتوں نے زندگی کی مشکلات کو حل کر دیا ہے۔ ورنہ اس عجیب دنیا میں اگر صحیح معنوں میں دو ایک طلسم شکن فلسفی پیدا ہو جائیں تو انسان کی بے بسی تو مسلّمہ ہے خود فرشتوں کو بھی دنیا میں آنا ناگوار ہو۔"

"مروجہ تصوف نے مذاقِ سلیم کو یہاں تک برباد کیا ہے کہ خیالات کے ساتھ الفاظ بھی انتہائی غلط فہمی پیدا کر سکتے ہیں۔ مجاز و حقیقت صرف ایک دامِ فریب ہے جسے تصوف کی معصوم خیالی نے تیار کیا تھا، پیشہ ور صوفیوں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔"

یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ سجاد علی مرحوم کے خیالات زیادہ تر صحیح یا متوازن ہیں لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو کچھ کہا گیا ہے زور دار الفاظ میں کہا گیا ہے۔ انھوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے خیالات کی خوب نمائندگی کی ہے اور قدامت کی مخالفت کو محض اس بنا پر کہ قدیم ہے اپنا شعار بنا لیا ہے۔ سجاد علی مرحوم نے رعنائی خیال کے ماتحت کفر و الحاد کی رنگینی سے بھی لطف اندوز ہونے میں دریغ نہیں کیا ہے اور اپنے لئے ایک نئی دنیا بنالی جہاں

"فقیہوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں　　کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں"

سجاد صاحب کے فلسفہ مذہب سے قطع نظر آپکے بیش بہا خیالات دیگر عنوانات پر قابل غور ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

"حقیقی عورت ایک ناقابل فہم معمہ ہے، وہ کبھی اپنی نسوانیت کو منکشف نہیں کرتی، اسکا ہر انداز اسکے حقائق کو پوشیدہ رکھتا ہے، وہ ایک طلسم ہے جسے اسکا ظاہر اور پُر طلسم بنا دیتا ہے جس راز کو وہ دراصل افشا کرنا چاہتی ہے اسکو بظاہر پوشیدہ رکھتی ہے اور جس حقیقت کو وہ ہمیشہ پوشیدہ رکھنا چاہتی ہے اسکو کبھی کبھی افشا کر دینے میں بھی اسے تامّل نہیں ہوتا۔ غرض کہ اسکا باطن وہ نہیں ہوتا جو پوشیدہ رہتا ہے اور نہ ظاہر وہ ہے جو افشا ہوتا رہتا ہے۔ اس طلسم سے اسکا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ مرد اسکی فطرت کو نہ سمجھ سکے کسی چیز سے متاثر رہنے کیلئے یہ ضروری ہے کہ انسان اس سے پورے طور پر باخبر نہ ہونے پائے۔ عورت یہ راز جانتی ہے اس لئے وہ اپنی ہستی کو کبھی کھلنے نہیں دیتی۔"

بیوی "بعض ناعاقبت اندیش بیوی میں بھی غیر معمولی حسن چاہتے ہیں۔ یہ نہیں سمجھتے کہ حسن اس وقت تک حسن رہتا ہے جب تک وہ ایک لطیف معمہ ہے۔ بیوی کی زندگی واقعات کی کشمکش میں اس طرح الجھتی ہے کہ حسن کی افسانویت قطعاً فنا ہو جاتی ہے۔ اسلئے یہ تمنا کہ بیوی حسین ہو در حقیقت حسن کی توہین ہے۔ ...... حسین بیوی محض محبوب بنکر رہنا چاہتی ہے، وہ زندگی کی کشمکش میں ناز و ادا

شرکت نہیں کر سکتی۔ اُس کے حسن کی رنگینیاں فرائضِ زوجیت کی قباحتوں سے بغاوت کرتی ہیں۔ یہ صورت ہر حیثیت سے خطرناک ہے۔"

"جھوٹ" "ایک لطیف جھوٹ حسنِ خیال اور لطافتِ اظہار پیدا کر دیتا ہے لیکن وہ جھوٹ کبھی لطیف نہیں ہو سکتا ہے جو ضرورتاً بولا جائے۔ راست گوئی گفتگو کو دلآویز نہیں بنا سکتی اسلئے کہ ہر اخلاقی فرض، دلفریبیوں کا دشمن ہوتا ہے۔ دروغ گوئی اس لئے اور بھی دلفریب ہوتی ہے کہ سچ کی طرح اسے واقعیت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

"دعا" "سعیِ ناکام، دعائے مقبول سے برگزیدہ تر ہے۔ کوشش ناکامی میں عظمتِ انسانی مضمر ہے لیکن دعا انسانیت کا اعلانِ شکست ہے، جس کے ذریعے سے انسانی مجبوریوں کا راز ان فرشتوں پر بھی منکشف ہو جاتا ہے جو کسی طرح اس انکشاف کے اہل نہیں۔ دستِ بدعا ہونا کارکنانِ قضا و قدر کے سامنے اپنی بے بسی اور ناچارگی کا اعتراف کرنا ہے۔"

"محبت" "محبت نام ہے چند احمقانہ اعتبار اور چند طفلانہ بے اعتباریوں کا"

یہ طویل اقتباسات اُن ناظرین کو ہرگز ناگوار نہ گزریں گے جنھوں نے اس کتاب کو نہیں دیکھا اور جن کے لئے واقعی یہ تبصرہ لکھا گیا ہے۔ بہر حال آپ اس کے خیالات سے خوش ہوں یا ناخوش، متفق ہوں یا مخالف لیکن آپ یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہونگے کہ اندازِ بیان میں وہ دلکشی اور اسلوبِ نگارش میں وہ رعنائی ہے کہ یہ چند مضامین کا مجموعہ اپنے مصنف کا نام عرصہ تک فراموش نہ ہونے دیگا۔

مرزا غالب مرحوم نے اُردو لٹریچر میں سب سے پہلے جدت طرازی کی، وہی ایک ساز تھا جو سب کے کانوں میں گونج رہا ہے۔ سرسید نے بھی مختلف پیرایۂ بیان اختیار کئے۔ آزاد۔ نذیر احمد۔ حالی۔ شبلی۔ شرر اور سرشار نے بھی۔ اور ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری اور مہدی حسن افادی الاقتصادی، چکبست اور سجاد حیدر نے بھی۔ لیکن سجاد علی انصاری جہاں کثرتِ الفاظ اور رعنائی خیال کے لئے مرزا غالب مرحوم کا منت کش اور ڈاکٹر عبدالرحمن کا متبع ہے وہاں اُس کا طرزِ تحریر اور جدتِ خیال منفرد بھی ہے۔ مختصر اور جامع فقرات دونوں کے یہاں بکثرت ہیں۔ دونوں کے یہاں وہی شان اور آن ہے، رکاکت دونوں کے یہاں مفقود ہے۔ البتہ شدت و غلو موجود ہے۔ عبدالرحمن اور سجاد علی دونوں ماں جائے بھائی معلوم ہوتے ہیں۔ فرق صرف وہی ہے جو حقیقی بھائیوں میں ہوتا ہے۔ بگر دونوں ابوالکلام آزاد کے "الہلال" سے ممتاز ہیں۔

سجاد علی مرحوم کے اسلوبِ بیان میں یہ خرابی بھی ہے کہ یہ صرف مضامین نگاری کے کام آ سکتا ہے، کتابیں اس طرز میں تصنیف و تالیف نہیں کی جا سکتیں یا یہ طریقہ کتابوں کے لئے موزوں نہیں ہے۔ کتاب نویسی کے لئے حالی، شبلی اور شرر ہی کے انداز کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ دیگر اصحاب جو طرز نو کے مالک ہیں اپنی شرر فشانی سے آنکھوں کو خیرہ ضرور کر دیتے ہیں لیکن یہ سب جانتے ہیں کہ چراغ کی جگہ کا ہٹ رہی رستہ چلنے والوں کیلئے نشانِ راہ کی طرف ہدایت کر سکتی ہے۔

سجاد علی مرحوم کے دماغ جدت طراز سے کچھ اشعار نے بھی تراوش کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر مرحوم اور زندہ رہتے تو شاعری میں بھی ایک خاص درجہ حاصل کر لیتے، فرماتے ہیں:۔

ہر پھول سے تراوشِ خونِ بہار ہے　　اے حسرتِ نگاہ! فضائے چمن سے دُور
تم کھو گئے تو مجھکو ملی منزلِ حیات　　میں انتہائے یاس میں بھی کامیاب ہوں
دل ٹوٹتے ہی رازِ محبت بھی کھل گیا　　اللہ رے بے ثباتیِ پیمانِ آرزو
بہارِ حسن کو بیگانہ وار دیکھا تھا　　نگہ نے چھیڑ دیا مسئلہ محبت کا

تعلیم اور دیہات سُدھار

اصلی ہندوستان دیہات میں رہتا ہے، اس لئے کسی کو ہندوستان کی حالت درست کرنا منظور ہو تو وہ ہندوستان کے دیہات کی طرف توجہ کرے بہت سے پُرجوش کارکن دیہات کی حالت درست کرنے میں مصروف عمل ہیں لیکن یہ لوگ زیادہ تر شہروں اور قصبوں کے رہنے والے ہیں دیہات سے مستقل تعلق نہیں رکھتے۔ اسی لئے ان کی کوششیں بہت کم کامیاب ہوتی ہیں اور مستقل و دیرپا اثرات پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ تبلیغ کرنیوالے خود دیہات کے مستقل باشندے ہوں، اور انھیں دیہاتیوں کے معاملات اور مشکلات کا ذاتی علم ہو تاکہ وہ ہر وقت دیہات میں رہیں اور اپنے قول و فعل کی خوبیوں سے دیہاتیوں کے دلوں میں گھر کرلیں۔ اس مسئلہ پر مسٹر آئی۔ ڈبلیو۔ موما ایم۔ اے بی پرنسپل دو کیشنل ٹریننگ اسکول انگلیسور (ممبئی) نے یہ کتاب انگریزی زبان میں لکھی ہے جسے مسٹر اے۔ عزیز فاروق ایم۔ اے اسلامیہ کالج پشاور نے اُردو کا لباس پہنایا ہے۔ اس کتاب میں گرام سدھار کے معاملہ پر نہایت عمدگی سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے، اور ایسے اصول بیان کئے ہیں جن پر عمل کرنے سے یقیناً کامیابی حاصل ہوگی۔ لکھائی چھپائی۔ کاغذ سب عمدہ۔ انگریزی جلد، گرد پوش مصور، ضخامت ۲۰۰ صفحات۔ ملنے کا پتہ: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس بمبئی

"غذائیات"

یہ دہلی کے مشہور طبی رسالہ "ہمدرد صحت" کا ایک خاص نمبر ہے جس میں غذا کے متعلق کوئی بات نہیں چھوڑی گئی ہے، اور فنی، و معاشرتی دونوں طرح سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ مثلاً غذا کا مقصد، غذا کی قسمیں، مختلف ملکوں کی غذائیں، اور اُن کے کھانے کے طریقے پروٹین، حیاتین، نمکیات، ترکاریاں، جڑیں، دالیں، حیوانی غذائیں، مشروب غذائیں، غذا کے ہضم ہونے کے طریقے اور اوقات، غذاؤں کے ذریعے علاج کے طریقے، مشاہیر عالم کی مرغوب غذائیں، شاہان مغلیہ کی غذائیں، موجودہ ڈکٹیٹروں کی غذائیں، وغیرہ وغیرہ بعض موضوعات خشک، اور غیر دلچسپ ہیں جن کی تلافی کے لئے بارھواں باب رکھدیا گیا ہے جس میں غذاؤں کے متعلق نظمیں، لطیفے اور فسانے ہیں۔ غرض اس نمبر کی ترتیب میں ہر قسم کے مذاق کا خیال رکھا گیا ہے۔ اگر اس نمبر کو غذاؤں کی انسائیکلوپیڈیا کہا جائے تو بالکل بجا ہوگا۔ لکھائی چھپائی، کاغذ سب عمدہ ضخامت ۱۰۰ صفحات قیمت صرف آٹھ آنہ۔ ملنے کا پتہ:۔ دفتر رسالہ ہمدرد صحت دہلی

نوٹ

ہم کو افسوس ہے کہ اڈیٹر صاحب کی شدید علالت کی وجہ سے اس ماہ "رفتار زمانہ" ہدیۂ ناظرین نہیں ہوسکا ہے۔

(ادارہ)

حسین جوگن

(نواب محمود علی خاں عرف آغا علی خاں رئیس الہ آباد)

گلستن نواز دلوی، بربط بجا رہی ہے
ہر پھول رقص میں ہے، ہر شاخ گا رہی ہے
مستی بھری ہوائیں پھولوں پہ چھا رہی ہیں
برسات کی گھٹائیں، موتی لنڈھا رہی ہیں
کرتا ہے فیضِ موسم گلکاریاں چمن میں
پودے پھپھک رہے ہیں گلشن کی انجمن میں
ہر پھول کھل رہا ہے، ہر شے چمک رہی ہے
شاخوں کی پتی پتی گویا دمک رہی ہے
مستِ الست کوئل تانیں سُنا رہی ہیں
شاخیں نئی چمن کی لہرا بجا رہی ہیں
برسات کی ہوائیں یوں گنگنا رہی ہیں
گویا ربابِ جنت حوریں بجا رہی ہیں
ہوش و حواس اور خرد کو اپنے ہر شخص کھو رہا ہے
گلشن کا ذرہ ذرہ بدمست ہو رہا ہے

(۲)

اتنے میں ایک جوگن اس انجمن میں آئی
رعنائیوں کی دُنیا گویا چمن میں آئی
یہ کون ہے بتا دے، اے آسماں خدارا
کس حُسن کی فضا کا ٹوٹا ہوا ستارا
مستانہ انکھڑیوں میں رقصاں ہے زندگانی
اُبھرے ہوئے ہیں بازو، بھرپور ہے جوانی
قدسی فریب جلوہ، کافر ادا جوانی
ایسی حسیں کہ جس پر صدقے ہو زندگانی
ایمان و دل سے بڑھکر کیونکر اُسے نہ چاہیں
بیچین کر رہی ہیں جادو بھری نگاہیں
پاکیزہ نقشِ فطرت۔ بے عیب نوجوانی
ہر سانس پاک و طاہر، معصوم زندگانی
چینِ جبیں سے ظاہر فرقت کی اِک نشانی
کہتی ہے ہر ادا سے الفت کی اِک کہانی

(۳)

جب سے چمن میں آئی سوامی کی جستجو میں
ہلچل سی اِک پڑی ہے دنیائے رنگ و بو میں
رہ رہ کے اشکِ خونیں آتے ہیں چشمِ نم میں
رو رو کے رنگ بھرتی ہے کائناتِ غم میں
آنکھوں کے سُرخ ڈورے نشتر چبھو رہے ہیں
آنسو کے قطرے خوں کو ارماں کئے ڈبو رہے ہیں
آئینہ رنج و غم کا الفت دکھا رہی ہے
ماضی کو یاد کر کے آنسو بہا رہی ہے
اس زندگی کو کیونکر اپنی کرے وہ راضی
آنکھوں میں پھر رہا ہے الفت کا دورِ ماضی

ارماں کے خوں سے ہستی رنگین ہو گئی ہے
ساری فضائے اُلفت غمگین ہو گئی ہے

تصویریں عشق و غم کی آنکھوں میں پھر رہی ہیں
حسرت بھری نگاہیں سوامی کو ڈھونڈھتی ہیں

میں نے کہا ادب سے اے درسِ آدمیت
رعنائیوں کی دنیا اے شاعری کی جنت

قدرت کی خواہشوں کی رنگیں ترین صنعت
اے آسمانِ عشرت کی معصوم حور طلعت

موسم ہے فصلِ گل کا، پھولا ہوا چمن ہے
لیکن ترے الم سے افسردہ انجمن ہے

آنسو بہا رہا ہے ہر پھول زندگی پر
اِک اوس سی پڑی ہے گلشن کی تازگی پہ

قدرت سے پا کے ایسی پاکیزہ زندگانی
برباد کر رہی ہے اُٹھتی ہوئی جوانی

سُن تو حیا کی دیوی، یہ کون گا رہا ہے
دنیائے عشق و الفت کو وجد آ رہا ہے

بربط پہ سازِ الفت کوئی بجا رہا ہے
کس درد سے غموں کا نغمہ سنا رہا ہے

۴

برقِ جمال چمکی ہونٹوں کی خامشی پر
اِک ٹھیس سی لگی پھر الفت کی زندگی پر

بولی کہ کیا بتاؤں کیا شئے فدا ہوئی ہے
دل کی ہر اک مسرت مجھ سے خفا ہوئی ہے

اک شمعِ سوزشِ غم فرقت کی جل رہی ہے
دل کی ہر ایک رگ میں اک آگ سی لگی ہے

جس میں تھا دردِ الفت وہ اب چتا بنا ہے
اِک اِک لہو کا قطرہ گویا کہ جل رہا ہے

ٹھنڈی ہوا بھی مجھ پر بجلی گرا رہی ہے
ہر سانس پہ دھواں رہا ہے، ہر آنکھ کہا رہی ہے

رگ رگ میں سانِ الفت نشتر چبھو رہا ہے
دریائے غم میں کوئی دل کو ڈبو رہا ہے

۵

کہتے ہی کہتے دل میں اک درد اُس کے اُٹھا
سر کو اُٹھایا، کانپی، پھولوں کی سمت دیکھا

پھر مسکرا کے اُس نے اک بانسری اُٹھائی
کانپی فضا چمن کی، ہر شاخ تھرتھرائی

رُخ پر حیا کی سُرخی، سینے میں اِک تلاطم
آنکھوں میں سُرخ ڈورے، ہونٹوں پہ اک تبسم

مستی چھلک رہی تھی آنکھوں سے کمسنی کی
نغمے اُبل رہے تھے پردے سے بانسری کی

پھر بانسری کو رکھ کر پھولوں کی سمت دوڑی
پھیلا کے ہاتھ دونوں گردن جھکا کے بولی

بابا نے کس خطا پہ روٹھے ہو مجھ سے سوامی
برباد کر رہے ہو کیوں میری زندگانی

میری زندگی کو برباد کرنے والے
دنیائے معرفت کو ناشاد کرنے والے

محمود ایسی کتنی الفت کی داستاں ہیں
بھارت کے ہر چمن میں صدہا کہانیاں ہیں

مُسافر کی منزل

(از حضرت فیاض گوالیاری، بی۔ اے)

مسافر تری راہ بیحد کٹھن ہے! کہ پُرپیچ وادی ہے اور ختم دن ہے!
نہ پاؤں میں طاقت، نہ ہمت کا سِن ہے مگر عزم تیرا وہی مرد و عن ہے!
مسافر — ! مبارک ترا عزمِ منزل!

ترے راستے میں مصائب اڑے ہیں، حوادث تری راہ روکے کھڑے ہیں،
قدم کیا۔ زباں پر بھی چھالے پڑے ہیں، گر پھر بھی تیرے ارادے بڑے ہیں!
مسافر — ! مبارک ترا عزمِ منزل!

تری راہ میں سب نے ڈالی ہے اُلجھن ہیں اپنے بھی بیری، پرائے بھی دشمن،
ہزاروں ہی کانٹے ہیں، اِک تیرا دامن! مگر تجھ کو منزل کے ہوناہیں درشن!
مسافر — ! مبارک ترا عزمِ منزل!

ہے پُرخار وادی میں تو پا پیادہ! طویل اور تاریک ہے تیرا جادہ!
یہ عزمِ سفر اور یہ سامان سادہ! خدا راس ہی لائے تیرا ارادہ!
مسافر — ! مُبارک ترا عزمِ منزل!

نہ ہمدم، نہ ساتھی، نہ زادِ سفر ہے! اگر ہمنوا ہے تو دردِ جگر ہے!
تری تشنگی، تیرا جامِ سحر ہے، ترا ہم سفر، تیرا ذوقِ نظر ہے!
مُسافر — ! مبارک ترا عزمِ منزل!

وطن تیرا آخر وہی تو وطن ہے، جہاں موت سے کھیلنے کا چلن ہے،
مصیبت جہاں خون میں غوطہ زن ہے، جواں جس کی ہر داستانِ کہن ہے
مُسافر — ! مبارک ترا عزمِ منزل!

ہنسی آج تیری اُڑا لے زمانہ مگر گائے گا کل ترا ہی ترانہ،
فسانوں میں ہوگا ترا ہی فسانہ غریبی میں یہ ہمتِ خسروانہ!

مسافر ـــــ مبارک ترا عزم منزل!

ذرا دے تو آواز اہلِ وطن کو
جگا دے ذرا لالہ و نسترن کو،
چمن والے بھولے نہیں ہیں چمن کو
بدل دیں ابھی باغباں کے چلن کو

مسافر ـــــ مبارک ترا عزم منزل!

یہ مانا نہ بھی ہو یہ جسم اور یہ دل،
نہ ہو آج بالفرض مقصود حاصل،
چمک کر رہے گا مگر عزمِ کامل
قدم تیرے خود آ کے چومے گی منزل!

مسافر ـــــ مبارک ترا عزم منزل!

وقت کا ترانہ

پنڈت سروپ کشن افسر

سُنا نہ مجھ کو حکایات اپنے ماضی کی!
لکھی ہیں ایک زمانے نے اِس کی تفسیریں
اُلٹ اُلٹ کے دکھانے کی کیا ضرورت ہے،
مَیں مانتا ہوں حسیں ہیں بہت یہ تصویریں!
اب اِن کی یاد میں رونے سے تجھ کو کیا حاصل؟
کہ اِس طرح تو بدلتی نہیں ہیں تقدیریں!!
وہ، جن کی ہر رگِ غیرت میں برق پنہاں تھی،
تری طرح سے نہ کرتے تھے محض تقریریں!
مَنو نے قوم کو تیری دیا تھا درسِ خودی
عمل نہیں ہے تو کس کام کی ہیں تحریریں!
خبر بھی ہے کہ زمانے کی چال اب کیا ہے؟
سمجھ فضا کو! ذرا دیکھ تو وہ شمشیریں!!
بدل چکا ہے زمانہ، روش بدل اپنی!!
ہے وقت کا یہ ترانہ "روش بدل اپنی!!"

شاعری غیر حقیقی نہیں ہے

(از فراق گورکھپوری)

شاعری، حقیقی، زندگی، اخلاق، یہ چاروں الفاظ اتنے جاندار ہیں کہ ان میں ہر ایک کی جتنی بھی اور جیسی بھی شرح کی جائے وہ ناکافی ثابت ہوتی ہے۔ یہ چاروں چیزیں ہمیں شدید طور پر متاثر کرتی ہیں، ہم ان سے انتہائی طور پر مانوس ہوتے ہوئے بھی ان میں تہ در تہ رمز و کنایات پاتے ہیں۔ یہی مانوسیت اور رمزیت ان چاروں چیزوں کو اتنی اہم اور اتنی پُر مغز بنا دیتی ہیں۔

آج کی بات چیت میں ہمیں ان لفظوں کا استعمال بہت سوچ سمجھ کر کرنا ہے۔ شاعری، زندگی، اخلاق اور حقیقت، بسا اوقات ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے نظر آتے ہیں، اور بسا اوقات ایک دوسرے سے الگ بلکہ ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں کہ شاعری جھوٹی ہے یا زندگی، اور اخلاق جھوٹے ہیں۔ مجھے اپنا ایک شعر یاد آتا ہے، اس میں شاعری کا لفظ نہیں آیا ہے لیکن محبت کا لفظ آیا ہے لیکن سوال کچھ اسی قسم کا ہے:-

رہے ہونگے وہ سچے دنیا کے سچ سے محبت کے جھوٹ آزمائے تو ہوں گے

محبت کے جھوٹ دُنیا کے سچ سے زیادہ سچے ہیں۔

اب شاعری کو لیجئے۔ میں ہندوستان کی شاعری کا ذکر کرنے کے پہلے مشہور انگریزی شاعر شیکسپیئر کے ڈراموں کا مختصر سا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ چھتیس ۳۶ ناٹکوں میں سے ایک معمولی ناٹک کو چھوڑ کر شیکسپیئر نے اپنے کسی ناٹک کا قصہ یا پلاٹ ایجاد نہیں کیا۔ وہ اپنے ناٹکوں کی بنیاد تاریخوں، سوانح عمریوں، ناولوں اور دوسرے کے لکھے ناٹکوں پر رکھتا تھا۔ لیکن اصل سے بھی زیادہ اصلیت ہمیں اس کے ناٹکوں میں ملتی ہے۔ اس کا صرف ایک ناٹک ہیملٹ لے لیجئے، ڈنمارک کا بادشاہ ہیملٹ کا باپ ہے ملکہ ہیملیٹ کی ماں ہے، بادشاہ کا بھائی ہیملیٹ کا چچا بادشاہ کو زہر دے کر مار ڈالتا ہے۔ اور خود تخت و تاج کا مالک بن جاتا ہے، اور ملکہ اُس کے فریب کے جال میں ہے اُس سے شادی کر لیتی ہے۔ ان تمام سازشوں کی حقیقت کوئی نہیں جانتا صرف شبہ ہی شبہ ہے۔ مقتول بادشاہ کی روح شہزادہ ہیملیٹ کو آگاہ کر دیتی ہے، بڑی بڑی مشکلوں سے اس کے متعلق شبہ یقین کی صورت میں بدل جاتا ہے۔ ہیملیٹ جو کچھ پاگل ہو جاتا ہے اور کچھ پاگل بن جاتا ہے

آخر کار اپنے قاتل اور غاصب چچا کو مار ڈالتا ہے، خود بھی زہر میں بجھی ہوئی تلوار کے زخم سے مر جاتا ہے، ملکہ بھی غلطی سے زہر کا وہ پیالہ پی لیتی ہے جو ہیملیٹ کے لئے اُس کے چچا نے تیار کرایا تھا اور یوں یہ قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ جہاں تک زندگی کا تعلق ہے ایسے واقعات ہوا کرتے ہیں، کچھ دیر کے لئے لوگوں میں سنسنی ہو جاتی ہے، کچھ دیر کے لئے نفرت، وحشت اور غم و غصہ کے جذبات اُبھر آتے ہیں، اور پھر ہم ایسے واقعات کو بھلا دیتے ہیں۔ لیکن شیکسپیئر نے اس ناخوشگوار واقعہ کو اس طرح پیش کیا ہے کہ اس میں غیر معمولی گہرائی، رموز و کنایات، انکشافات، استعجاب اور ایسی معنویت و دُور رسی آگئی ہے جو آسمان کے ستارون کو چھوتی ہوئی گذر جاتی ہے۔ اس واقعہ میں جتنی اصلیت و حقیقت تھی اُس سے کہیں زیادہ اصلیت و حقیقت شیکسپیئر کے اس ناٹک میں ملتی ہے۔ زندگی سے زیادہ زندگی کی تصویر اور زندگی کے نغمے یعنی شاعری حقیقت کی حامل نظر آتی ہے۔ ایسا کیوں اور کیسے ہوتا ہے اس کا جواب آگے آئیگا۔

اُردو شاعری میں عاشق و معشوق کا گہری نیند سو جانا بڑی خوش نصیبی سہی، لیکن نہ تو یہ اَن ہونی بات ہے اور نہ تو اکثر یا دیر تک اس بات کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ اب غالب کا یہ شعر سُنئیے:۔

نیند اُسی کی ہے، دماغ اُسکا ہے، راتیں اُسکی ہیں تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں

جس وقت اس شعر کی غیر محدود کیفیتوں میں شاعر ڈوبا ہوا تھا، فرض کیجئے اُسی وقت اُس کا محبوب جس سے اُس کی عمر بھر مفارقت رہی آجاتا اور کہتا کہ آؤ ہم تم سو رہیں تو میرا خیال ہے کہ اس شعر کے زیر اثر شاعر کو صدمہ ہوتا۔ اُس کا خواب ٹوٹ جاتا، اُس کی شاعرانہ بزم برہم ہو جاتی، یعنی واقعہ سے زیادہ واقعہ کا وجدانی و جمالیاتی تصور اصلیت و حقیقت کا حامل نظر آتا ہے۔ شاعری میں خارجی، مادی، جسمانی، واقعات شعوری اور روحانی حقیقتوں میں تحلیل ہو جاتے ہیں جسے انگریزی میں Sublimation کہتے ہیں، یعنی کسی واردات یا واقعہ کا نفس سے خفی میں آجانا۔ ایک جسمانی لذت، ایک جسمانی احساس کو شاعری شعور محض بنا دیتی ہے، اس طرح ہمیں واقعہ کی واقعیت کا خالص ادراک حاصل ہوا ہے۔ یہاں تک کہ ہم واقعہ سے بے نیاز ہو کر اس کی واقعیت کا احساس کرنے لگتے ہیں۔ یا یوں کہئیے کہ واقعات کو شاعری، عالم رؤیا، عالم خیال، عالم مثال یا عالم لاہوت میں لے جاتی ہے۔ وہاں پہونچکر ہر چیز کا گویا نیا جنم ہوتا ہے اور ہر چیز میں زیادہ اصلیت اور حقیقت آجاتی ہے جس کے مقابلہ میں دنیاوی زندگی سے وابستہ رہتی ہوئی وہی چیز محض ایک پرچھائیں معلوم ہوتی ہے بظاہر یہ باتیں ہمیں تصوف کے خطرناک مقامات پرلے جاتی ہوئی نظر آتی ہیں لیکن اُس عالم اور اس عالم میں فرق نہیں ہے۔ شاعری کا مقصد ہمیں دنیا اور دنیا کی زندگی اور اخلاق سے علیحدہ کرنا نہیں ہے بلکہ اُن کی ایسی جھلک دکھانا ہے جن میں زیادہ اصلیت و حقیقت نظر آئے بہ نسبت اُس حالت کے جب ہم دنیا

زندگی اور اخلاق پر غیر شاعرانہ اور ٹھوس طریقہ پر نظر ڈالتے ہیں۔ اب اُس سوال کا کہ شاعری میں زندگی اور اخلاق سے زیادہ زندگی کیوں محسوس ہوتی ہے، جواب مل گیا ہوگا۔ بات یہ ہے کہ شاعری زندگی اور اخلاق کی حقیقت سے ہمیں رُوشناس کرتی ہے اور زندگی اور اخلاق کے لئے بغیر شاعری کی مدد کے، بغیر شاعری کے بیدار کُن اثرات کے، خود اپنی حقیقت سے آگاہ ہونا محال ہے۔ مجنوں گورکھپوری کا یہ شعر سُن لیجئے:۔

یہ گمراہی یہ خود ناآگہی اچھی نہیں اے دل　　　کسی وادی میں کھو جا اور اپنی جستجو کرلے

اگر دل کی جگہ زندگی اور اخلاق کو رکھ لیجئے اور کسی وادی سے مراد شاعر کا تخیل لیجئے تو جو کچھ میں نے کہا ہے وہ کچھ کچھ واضح ہو جائے گا۔ ایک اور شعر سُنیئے جو کسی بہت قدیم شاعر کا ہے:۔

اللہ شب ہجر دوبارہ نہ دکھائے　　　پہروں تو مجھے یاد ترا نام نہ آیا

ہجر کی سراسیمگی، بے چینی اور بے بسی کی کتنی سچّی تصویر ہے۔ محبوب کے ہجر میں یہ حال ہوا کہ پہروں اُس محبوب کا نام ہی یاد نہ آیا جس کے لئے تڑپ رہے تھے۔ بظاہر تو پریشاں خیالی کا یہ عالم نہایت تکلیف دہ ہے لیکن جب شاعر اس شعر سے مکمل طور پر متاثر رہا ہوگا، جب اس شعر کا نغمہ اُس پر چھا گیا ہوگا اُس وقت خود محبوب کا آنا یا محبوب کا نام یاد آنا دونوں شاعر یا عاشق سے اس شعر کی حقیقت کو گویا چھین لیتے۔ اب یہ ہمارے آپ کے سوچنے کی چیز ہے کہ زیادہ حقیقت اور اصلیت اس شعر میں ہے، یا زندگی کے اس واقعہ میں ہوتی ہے کہ جب معشوق کا نام یاد آجاتا یا معشوق خود آجاتا۔ یوں تو دونوں حالتیں زندگی ہی کی حالتیں ہیں یعنی شب ہجر پہروں معشوق کا نام تک یاد نہ آنا یا صرف معشوق کی یاد آنا اور صرف معشوق کے نام کی رٹ لگانا لیکن شاعری کے حیات آور سحر انگیز اثر نے پہلی حالت یعنی نام نہ یاد آنے کی حالت میں زیادہ اصلیت بھر دی ہے امیر مینائی کہتے ہیں:۔

فنا کیسی بقا کیسی جب اُس کے آشنا ٹھہرے　　　کبھی اِس گھر میں آنکلے کبھی اُس گھر میں جا ٹھہرے

اسی قسم کا میرا شعر ہے:۔

ابد بھی اپنی پرچھائیں ازل بھی روشنی اپنی　　　محبت کو کمی کیا، موت اپنی زندگی اپنی

فنا ہو یا بقا، موت ہو یا زندگی اُن میں حقیقت یا اصلیت وجدان سے پیدا ہوتی ہے۔

اب اخلاق کو لیجئے، ہماری اردو شاعری میں ناصح، زاہد، شیخ، اِن سب کے رسمی اخلاق کے پُرزے اُڑائے گئے ہیں۔ گناہ کی عظمت کا اعتراف کیا گیا ہے، ایسا کہنا محض سطحی بات نہ ہو گی بلکہ غلط بات ہو گی کہ ایسی شاعری مخربِ اخلاق ہے، ایسی شاعری خشک، مردہ، بیجان رسمی اخلاق کی تنقید ہے، اور بادہ و ساغر کے پردہ میں ایسی شاعری حقیقی زندگی اور حقیقی اخلاق کی قوتوں کو بیدار کرتی ہے اور انسانیت کے ارتقا

میں مدد دیتی ہے۔

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو　　دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک　　میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ　　دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

بات یہ ہے کہ جسے رسمی اخلاق کہا جاتا ہے وہ زیادہ تر نقالی رہی ہے اور فطری جذبات کے ساتھ زبردستی رہی ہے، ہر مجرم اور گناہگار اپنے وقت کے رسمی اخلاق کا عملی نقاد ہوتا ہے، گناہ و ثواب کے مفہوم زمانہ کے ساتھ اور ملک و ماحول کے لحاظ سے بدلتے رہے ہیں۔ کسی نے کہا کہ اخلاق ایک جغرافیائی تصور ہے جو کام ایک زمانہ اور ملک میں بہتر سمجھا جاتا ہے وہ دوسرے زمانہ اور ملک میں بدتر سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے شعراء نے رسمی اخلاق کا مضحکہ اڑا کر حقیقی اخلاق کو زندہ کیا ہے۔ وہ اخلاق جس میں زیادہ سوجھ بوجھ ہوتی ہے جو انسانی فطرت اور انسانی نفسیات سے ہم آہنگ ہے، جو مختلف طبیعتوں اور مزاجوں کا جائزہ لینے کے بعد مرتب کیا جائے۔ لیکن یہ بھی نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ عام طور پر زندگی میں ہم جسے خوش اخلاقی سمجھتے رہے ہیں شاعری نے اس سے ہمیشہ انکار ہی کیا۔ خلوص، معصومیت، نیک نیتی، شجاعت، ایثار، قناعت بے نیازی، حمیت جرأت، اعتدال، میانہ روی و سلامت روی، صلح کل، انصاف، رحم، حلم و بُردباری، وسعتِ نظر و عمل، یعنی وہ تمام اوصاف جو انسانیت کے زیور ہیں، اُن سب کو ہماری شاعری نے چمکایا اور اُجاگر کیا ہے۔

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر　　نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر　　کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

حسد سے دل اگر افسردہ ہے، گرم تماشا ہو　　کہ چشم تنگ شاید کثرت نظارہ سے وا ہو

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں　　تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

شکست و فتح نصیبوں سے ہے پر اے میر　　مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں　　تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

زمانہ لاکھ گم ہو جائے آپ اپنے اندھیرے میں　　کوئی صاحب نظر اپنی طرف سے بدگماں کیوں ہو

حیات ہو کہ اجل سب سے کام لے غافل　　کہ مختصر بھی ہے کارِ جہاں دراز بھی ہے

ایسے اشعار جنھیں ہم معارفِ علت کہہ سکتے ہیں، ہزاروں کی تعداد میں ہماری شاعری کو مالا مال کر رہے ہیں۔ ہماری شاعری میں صرف دھینگا مشتی، رندی و سرمستی کا بازار نہیں گرم ہے، مگر یہاں بھی اخلاقیات کو محض میکانیکی (Mechanical) یا رسمی چیز ہونے سے بچایا گیا ہے۔ عمل میں جب تک اخلیت و معنویت پیدا نہ ہو

جب تک عمل کے تصور میں آفاقیت و بے پایانی نہ آئے عمل بہت سطحی اور محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ عمل سے زیادہ عمل کی شاعرانہ معنویت میں اصلیت و حقیقت ہوتی ہے۔ چونکہ ہماری عملی و اخلاقی زندگی محض ایک دستورالعمل یا بندھی ٹکی چیز ہو کر رہ جاتی ہے اس لئے ہم اُسے اخلاقی شاعری اور رندانہ شاعری دونوں کے مقابلے میں غیر حقیقی قرار دے سکتے ہیں۔ اخلاق کا مسئلہ بہت نازک ہے۔

آئے نہ نظر لکیر ایسی نیکی و بدی کے درمیاں ہے

جو زہر ہلاہل ہے امرت بھی وہی لیکن معلوم نہیں تجھکو انداز ہیں پینے کے

لیکن زندگی ہو یا اخلاق شاعری کو وقت کی اُن طاقتوں کا ساتھ دینا چاہیئے جو خیر و برکت کی طاقتیں ہیں، جو خلاقانہ اور ترقی پذیر ہیں۔ بیسویں صدی کے آغاز تک اُردو کی بہترین شاعری نے زندگی اور اخلاق کے جن پہلوؤں کا انکشاف کیا تھا، جن نظریوں کی حمایت کی تھی وہ بیسویں صدی کے بعد سے بدلنے لگے، زندگی نے کروٹ بدلی اور ملک بیدار ہوا۔ اب انفرادی نظریوں کی تردید شروع ہوئی۔ اجتماعی زندگی کی اہمیت کا نیا احساس ہوا، حالی، چکبست، اکبر اور اقبال نے اپنی شاعری میں جو تنقید حیات و تنقید اخلاق پیش کی وہ نئی حقیقتوں، نئی اصلیتوں کی حامل تھی، اقبال کی تنقید سب سے زیادہ اہم اور گہری تھی اور وقت کے دل کو چیرتی چلی جاتی تھی۔ وہ وقت کے دباؤ سے تھرتھرا رہی تھی، لیکن عام طور پر ملک اِن شاعروں کا ہم خیال رہا۔ صرف اقبال اور بسا اوقات اکبر زندگی اور اخلاق کے وہ نظریئے پیش کرتے تھے جو مقبول نظریوں سے کبھی ہم آہنگ ہوتے اور کبھی ٹکرا جاتے۔ کبھی تعمیری ہوتے کبھی تخریبی ہوتے۔ اس زمانے کی غزلیہ یا عشقیہ شاعری بھی حسن و عشق کی نئی تنقیدیں، نئے نظریئے پیش کرتی ہے۔ عزیز لکھنوی، شاد عظیم آبادی حسرت۔ یگانہ۔ اصغر۔ فانی۔ جگر سب کی شاعری زندگی اور اخلاق کی ہزاروں باتوں کو جھٹلاتی اور سیکڑوں باتوں میں نئی جان ڈالتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اِن سب کی شاعری نئی صدی کے آغاز سے اُس کی پہلی چوتھائی کی زندگی اور اخلاق سے زیادہ حقیقی اور زیادہ اہم ہے۔ مثالوں کے لئے وقت نہیں ہے لیکن امیر اور داغ کی موت کے بعد ہماری عشقیہ شاعری کا پُرانا دَور ختم ہوا اور نیا دَور شروع ہو گیا۔ محض زبان اور بیان کے لحاظ سے نہیں بلکہ ذہنی طور پر بھی۔ اس طرح نیکی اور اخلاق کے نظریئے انفرادی شرافت کے معیار سے گزر کر قوم پرستی اور وطن پرستی کے خیالات اور جذبات کے نظریئے بن گئے۔ یہ جذبات ہماری قومی زندگی اور قومی اخلاق کے عناصر و محرک تھے لیکن اُن کی جیتی جاگتی ہنستی، بولتی، چلتی، پھرتی تصویریں اُس وقت کی شاعری میں ملتی ہیں۔ جو یقیناً اُس وقت کی زندگی و اخلاق سے زیادہ اصلیت و حقیقت رکھتی ہیں۔

اس کے بعد روس کا انقلاب اپنے عالمگیر اثرات دکھانے لگا۔ دنیا نے آدمیت کے نئے نظام، ایک

نئے کلچر، نئی تہذیب کے آثار دنیا میں نمودار ہوتے ہیں۔ جوش ملیح آبادی اور اُن کے بعد کے نوجوان شعرا جیسے فیض احمد فیض، مجاز، علی سردار جعفری، ماوراء کے مصنف اور دوسرے شعرا نے نئی زندگی اور نئے اخلاق اور نئی عشقیہ شاعری کے نغمے چھیڑے جس نئی زندگی، جس نئے اخلاق، جس نئے حسن اخلاق کی جھلکیاں اُنھوں نے دکھائیں، اُن کے عناصر ہماری قومی زندگی اور قومی اخلاق میں پیدا ہو چلے تھے۔ ملک کی کئی اہم تحریکیں اور تنظیمیں اُن عناصر کی حامل تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ چونکہ دنیا اور ہندوستان ایک نئے موڑ سے گذر رہے تھے، تمام دنیا میں ایک بحرانی وقفہ آگیا تھا جس کا نتیجہ موجودہ عالمگیر جنگ ہے اس لیے دنیا اور ہندوستان میں کئی متصادم قوتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ ایک طبقہ ملوکیت اور سرمایہ داری کی زندگی و اخلاق کی نمایندگی کر رہا ہے، دوسرا طبقہ اشتراکی و انقلابی زندگی و اخلاق کی نمایندگی کرتا ہے، تیسرا انسانیت کے اس دوراہے کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ کوئی مذہب میں پناہ لے رہا ہے کوئی احیائے قدامت میں، کوئی رجعت پسندی میں اور کوئی دُبدھے میں۔ جوش اور اُن کے بعد کے شعرا جس نئی زندگی اور نئے اخلاق کی نمایندگی اپنی شاعری کے ذریعہ سے کر رہے ہیں وہ بحیثیت مجموعی اشتراکی و انقلابی ہے۔ لیکن وہ انقلاب روس سے متاثر ہوتے ہوئے بھی ہندوستان اور ایشیا کے کلچر اور تاریخی حقائق کے خلاف نہیں ہے۔ اخلاقیات اور زندگی کے متعلق جس بغاوت کے یہ علم بردار ہیں اُس بغاوت کو اُنھوں نے اپنی شاعری میں اتنا زندہ بنا دیا ہے کہ جہاں اُن کی شاعری کے مقابلہ میں قدیم اخلاقیات اور قدیم زندگی بالکل غیر حقیقی معلوم ہوتے ہیں، وہاں نئے اخلاقیات اور نئی زندگی بھی اس شاعری سے الگ کم از کم ہمارے شعور و وجدان کے لئے اتنی زندہ اور حقیقی چیزیں نہیں معلوم ہوتے جتنی نئی شاعری کے نغمے۔ کسی نے کہا ہے کہ آرٹ اخلاق سے زیادہ اخلاق ہوتا ہے، زندگی سے زیادہ زندہ ہوتا ہے، اور یہ بھی کسی کا قول ہے کہ شاعری ایک طلوعِ صبح کا نغمہ ہے، وہ صبح یا وہ کل جو کبھی نہیں آتی اور شاید اسی لئے یہ کل آج کے مقابلہ میں زیادہ حقیقت و اصلیت رکھتی ہے۔[1]

[1] باجازت ڈائرکٹر صاحب آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن لکھنؤ۔

ہاں مجھے کوئی غم نہیں!

پنڈت آنند نراین مُلّا۔ ایم۔ اے، ایل ایل۔بی)

بات بھی کہہ کے کھوؤں کیوں، جب کوئی آسرا نہیں
ہاں، مجھے کوئی غم نہیں، ہاں مجھے کچھ گِلہ نہیں
عشق بغیر زیست ہے، جینے میں کچھ مزا نہیں
نغمہ ہے اور رس نہیں، اشک ہیں اور ضیا نہیں
تم وہی، میں وہی، مگر دل میں وہ ولولہ نہیں
آتشِ تیز عشق میں، شعلۂ دیرپا نہیں
چھیڑ کے دل کو دیکھ لو، نغمۂ جاں سُنائے گا
سازِ مرا خموش ہے، یہ ابھی بے صدا نہیں
دوستی دوستی نہیں، جاں کو نہیں جو جاں سے ربط
ملنے کو مل گئے مگر پردۂ دل اُٹھا نہیں
توڑ کے دل کی ہر امید پوچھ رہے ہیں چپ ہو کیوں
اور وہ ہنس کے اس طرح جیسے کہ کچھ ہُوا نہیں
سُونی پڑی ہے بزمِ دل، تیرہ و تار ہے نظر
کب سے سرائے شوق میں کوئی دِیا جلا نہیں
ہو گئی ہونے والی بات، جانے بھی دو، اثر نہ لو
تم بھی وہی کے ہو وہی، مَیں کوئی دوسرا نہیں
گل نہیں بوئے گل سہی، سوئے قفس بھی ہاں کبھی
باغ کی فصلِ گل یہ کیا، کوئی بھی حق مرا نہیں
ننگ ہے ذوقِ عشق کو جادۂ قیس و کوہکن
ڈھونڈھ رہا ہوں راہ وہ جس میں نقوشِ پا نہیں
ہو چکی التجا تمام بن چکے اشک خوں سفید
مُلّاؔ انھیں گرا بھی دو، اِن میں کچھ اب رہا نہیں

شہرِ آرزو

(حضرت سرشار کسمنڈوی)

ہر راہ میں گرمِ جستجو ہوں
ہر گام پہ شہرِ آرزو ہوں

تکمیلِ حیاتِ آرزو ہوں
مٹنے پہ بھی عطرِ رنگ و بو ہوں

مضبوط نظر کی آرزو ہوں
جلووں کی طرح شگفتہ خو ہوں

ہر لحظہ حریفِ رنگ و بو ہوں
ہر وقت کسی کے روبرو ہوں

دلچسپ ہے کیا رہِ محبت
ہر ذرّہ سے محوِ گفتگو ہوں

موسم کی طرح بدلنے والے
میں بھی تو شریکِ رنگ و بو ہوں

کیا فائدہ طولِ زندگی سے
دانستہ حریفِ آرزو ہوں

بجلی سی اُتر رہی ہے دل میں
شاید میں اُنھیں کے روبرو ہوں

ایسی ہی ہوائیں چل رہی ہیں
گلشن میں بھی نغمہ در گلو ہوں

وہ دُور سمجھ رہے ہیں مجھ کو
حالانکہ مَیں اُن کے روبرو ہوں

ہر زخمِ جگر یہ کہہ رہا ہے
میں حاصلِ عمرِ آرزو ہوں

پیہم یہ صدائیں آ رہی ہیں
ہر شے میں ہوں اور رو بہ رو ہوں

ڈھلتا ہوا زندگی کا سایہ
دھندلا سا نشانِ آرزو ہوں

نظروں کا فریب اللہ اللہ
جیسے مَیں اُنھیں کے روبرو ہوں

میرا بھی کبھی سلام لیتے
مدّت سے ہلاکِ گفتگو ہوں

خالی نہیں مجھ سے بیٹھا جاتا
ساغر ہوں کہیں، کہیں سبو ہوں

جلوے بھی تڑپ رہے ہیں دل بھی
میں کون ہوں، کس کے روبرو ہوں

آؤ تمھیں لے چلوں وہاں تک
جس جا میں خرابِ رنگ و بو ہوں

سرشار یہ فخر ہے مجھی کو
جو کچھ بھی ہوں اُن کے روبرو ہوں

بلیک ہول کے بعد کے بعض واقعات

(از مسٹر ارشاد فاطمی بی۔اے، آنرز)

رسالہ زمانہ کی پچھلی جلدوں میں بلیک ہول کے واقعہ پر کافی روشنی ڈال چکا ہوں، اب میں چاہتا ہوں کہ بلیک ہول کے بعد کے چند اہم واقعوں پر روشنی ڈالوں جو اب تک منظرِ عام پر نہیں آئے ہیں۔ اول تو میرن بن میر جعفر کی وہ نمک حرامی ہے جو اُس نے نواب سراج الدولہ اور اُن کی مستورات کے ساتھ کی تھی۔ جب سراج الدولہ قتل ہو گیا تو میرن نے علی وردی خاں کے کل خاندان کو لوٹنا اور غارت کرنا شروع کیا۔ آمنہ بیگم مادرِ سراج الدولہ اور خواہر سراج الدولہ کو بھی گرفتار کر کے پٹنہ عظیم آباد کی مشہور عمارت چہل ستون میں (جو مدرسہ سیف خاں کی پشت پر تھی) قید کر لیا۔ چندے ان معصوم بی بیوں کو یوں ہی بے آب و دانہ رکھا۔ جب حاجی پور جانے لگا تو حکم دیا کہ ان کو ناؤ پر سوار کر کے غرقِ آب کر دیا جائے۔ ملاحوں نے ایک ٹوٹی ہوئی کشتی پر سوار کر دیا۔ جب کشتی بیچ گنگا میں پہونچی تو ان بیگناہوں کو معلوم ہوا کہ وہ غرقِ آب کرنے کے لئے لائی گئی ہیں۔ ان غریبوں نے اس وقت ملاحوں سے کچھ مہلت مانگی، نماز پڑھی اور بددعائیں دینے لگیں "خداوندا! ہم غریب کچھ نہیں چاہتے۔ بس تو مالک ہے، مگر میرن نے جیسی نمک حرامی کی ہے اگر تو غریبوں کا بدلہ لینے والا ہے تو آج ہی شب کو اس پر کڑکتی بجلی گرا۔"

ادھر تو دونوں ماں بیٹی زیرِ آب شکم کی نیند سو رہی تھیں اُدھر میرن حاجی پور میں محفلِ عیش و طرب میں بیٹھا ہوا تھا اطراف سے طوائفیں سلام کرنے آئی تھیں، گرمی کی شدت تھی، بادل کا کہیں نام نہ تھا، یکایک ایک ابر کا ٹکڑا نمودار ہوا اور بجلی کڑکنے لگی، خیمے والے سہم گئے، میرن اُٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا "ڈرو نہیں، یہ میرے لئے ہے۔" خیمے سے کچھ دور گیا ہوگا کہ بجلی گری اور دم کے دم میں ساری محفلِ طرب ماتم کدہ بن گئی۔ مصنف سیر المتاخرین نے میرن کی موت کا واقعہ درج کیا ہے مگر یہ روایت ہے کہ جو راقم کے خاندان میں سینہ بہ سینہ چلی آتی ہے۔

ادھر تو مادر و خواہر سراج الدولہ کا یہ حشر ہوا اُدھر لطف النساء بیگم جسے نواب نے اپنی بی بی کی حیثیت سے رکھا تھا اپنی مغل پورہ عظیم آباد والی فرودگاہ میں پناہ گزین ہو گئی، دیگر خاندان تباہ حال ہو گیا۔ میرن کی لاش حاجی پور سے مرشد آباد لائی گئی اور وہیں ایک مقبرے میں دفن کر دی گئی۔ منی بیگم تا عمر اس کے حال کا مرثیہ پڑھتی رہی۔ اس لطف النساء کی دو بہنیں اور تھیں، بڑی منی بیگم یعنی زوجۂ میر جعفر جو بعد کو وارن ہسٹنگز کے ایام حکومت میں مشہور ہوئی، دوسری فیضی جو اپنی خوبصورتی میں اپنی ہمعصر خواتین میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ یہ تینوں بہنیں نواب سراج الدولہ

اور نواب کے بھائی اکرام الدولہ کی شادی میں آگرہ سے بُلوائی گئی تھیں۔ یعنی سراج الدولہ کے حکم سے زندہ دیوار میں چُنوا دی گئی، لطف النسا اُس کی بیگم ہوئی اور مُنّی بیگم کے ہاتھ حکومت بنگالہ کی باگ ڈور سپرد ہوئی۔ مُنّی بیگم کے متعلق نواب عبدالعلی فیض کلکتہ کا ایک مضمون کسی اُردو ماہنامے میں میری نظر سے گذرا ہے، افسوس کہ وہ پرچہ گُم ہو گیا۔

اِدھر تو یہ عالم تھا اور اُدھر جو معاہدہ کمپنی اور میر جعفر کے درمیان ہوا اُس کے متعلق ایک دوسرے فرشتے کی زبان سے سُنئیے جو ۲۔ مئی ۱۸۱۰ء میں لندن میں چھپا، یہ کتابی صورت میں ہے جس میں اُن نوشتوں اور معاہدوں کا ترجمہ ہے جو نواب ناظم بنگال اور انگریزوں کے درمیان ۱۷۵۷ء لغایۃ ۱۸۱۰ء ہوئے۔ مؤلف اورم کی تاریخ ہندوستان (Ormes History of Indostan Vol II P. 161) سے پہلے صلحنامے کی نقل پیش کرتے ہوئے صفحہ ۴ میں تحریر کرتا ہے:

'On the accession of Meer Jafer Ali khan. Concluded the Treaty with the new Nawab, of which the following is a acknowledged. To be a True Copy, The original was suppos:ed to have been subsequntity distroyed by Colonel Clive for his own protection."

اب اس معاہدہ کی چند شرائط پر بھی غور کیا جائے جو سراج الدولہ کی تباہ حالی کے بعد میر جعفر اور کمپنی کے درمیان ہوا تھا۔ معاہدہ کی تیسری شرط کے مطابق فرانسیسیوں کی تمام فیکٹریاں جو بنگال، بہار اور اُڑیسہ میں تھیں انگریزوں کے حوالے کردی گئیں۔ چوتھی شرط کے مطابق جو نقصانات انگریزوں کو محاصرۂ کلکتہ کے دوران میں اُٹھانا پڑے تھے اُن کا تاوان میر جعفر نے ایک کرور روپیہ کی صورت میں ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ شرط نمبر ۴ کے مطابق مزید سات لاکھ روپیہ دینے کا وعدہ کیا گیا اور کہا گیا:۔

For the effects plundcod from the Armenian inhabitants of Calcutta, I will give sum of Seven lacks of Rupees. The distribution of the Sums alloted to the English, Gentoo, Moor, and other Inhabitants. of Calcutta, shall be left To Admiral Watson, Colonel Clive, Roger Dvaker, William Watts ... ... to be disposed of by them To Whom they think proper."

ان روپوں کا کیا حشر ہوا، ادا کیے گئے یا نہیں، میں اِن پر چنداں روشنی ڈالنا نہیں چاہتا ہوں۔ صرف اتنا تحریر کرنا کافی ہوگا کہ مسندِ بنگال پر کمپنی کے نوکروں نے ایک کٹھ پُتلا بٹھا دیا اور بظاہر نواب کے سر پر احسان رکھا مگر درپردہ مسندِ بنگال کو لُوٹنے کی فکر میں مشغول ہو گئے۔ میر جعفر کی موجودگی سے اپنی جیب گرم کر

کا بھی موقع مل گیا۔ اس انتخاب میں کامیابی ہوئی یا نہیں یا کمپنی نے پھر کوئی آئندہ اندیشہ محسوس کیا اسی نوشتے کی زبان سے سنیئے

Meer Jafer was unable to meet the exacting demand of the Companay's servants, a Conspiracy was formed against him."

(یعنی چونکہ میر جعفر ملازمین کمپنی کے سخت مطالبات کو پورا نہ کر سکا اس لئے اُس کے خلاف سازش کی گئی)

میر جعفر کے زوال کے بعد مسند بنگالہ میر قاسم کو ملی۔ مگر اس بار انتخاب بد سے بدتر ہوا، میر قاسم کے لئے کمپنی کے محض ایجنٹ کی طرح حکومت کرنا محال تھا سب سے پہلے وہ صوبائی بندوبست میں مشغول ہوا اور ملک کی مالی حالت کو درست کرنا چاہا، کیونکہ حکومت کا دارومدار خزانہ پر تھا جو خالی پڑا تھا۔ جب صیغۂ مال میں ریفارم شروع کیا اور چُنگی کا مسئلہ درپیش ہوا تو ایسٹ انڈیا کمپنی اس کو برداشت نہ کر سکی نتیجہ ظاہر تھا۔ جو باتیں جنگ ۱۷۶۵ء میں ہوئیں تاریخ اُن کی شاہد ہے۔ میر قاسم کو بنگال چھوڑنا پڑا اور آخر کار دلّی میں پیوند خاک ہو گیا، شاہ عالم نے اپنے پاس سے تجہیز و تکفین کرائی۔

میر قاسم کی شکست اور میر جعفر کی دوبارہ حکومت کی بدولت انگریزوں کی چال کامیاب رہی۔ اِس وقت تک کمپنی پس پردہ کارروائیاں کر رہی تھی اب کھلے بندوں میدانِ عمل میں آ گئی۔

پژمردگی

(از حسن یحییٰ عندلیب ایم۔اے۔ایل۔بی)

یہ کون سامنے ہے ذرا دیکھ ہمنشیں! تصویرِ نامرادی و تن خستہ و حزیں
مرغِ خیال آرزو بے بال و پر لیئے دورِ نشاط حلقۂ بیرونِ در لیئے
دل تنگ و خستۂ سحر و شامِ روزگار قسمت کا صید، کشتۂ آلامِ روزگار
پنہاں نظر میں پرسشِ تیغ دو دم لیئے رُخ پر ہوائیاں سی اُڑی، چشم نم لیئے
سینہ میں سانس فرطِ الم سے رُکی ہوئی ناکامیوں سے چشمِ ندامت جھکی ہوئی
آلودہ گردِ پائے بیاباں نورد بھی افسانۂ حکایتِ غم، رنگ زرد بھی
محجوب و مضمحل سے، مٹے سے نقوش پا گویا سفر ہے مدِ نظر بے خروشِ پا
حیران، سر بخاک، سراسیمہ، بدحواس غرقابِ سیلِ حسرت و پامالِ حزن و یاس
پژمردگی بہار پہ، چہرہ سُتا ہوا پُر داغ سینہ، رشکِ چمن، دل بُجھا ہوا
دیکھ اے نگاہِ دیدۂ خود بیں بغور دیکھ! انسان پر یہ گردشِ دوراں کے جور دیکھ

ظلمت کا نام نور جو تابندگی ہے یہ
آبِ حیات زہر اگر زندگی ہے یہ

بلبل اور پروانہ

(منشی جگدیش سہائے سکسینہ، بی اے، ایل ایل۔ بی۔ وکیل شاہجہانپور)

کل بلبلِ نالاں سے کہا مَیں نے چمن میں — غمّاز ہے خامی کا تری نالۂ جاں سوز
زخموں کا ترے گرچہ مداوا نہیں ممکن — بیجا ہے مگر شکوۂ پیکانِ جگر دوز
فریاد و فغاں شیوۂ اربابِ ہوس ہے — اے مرغِ چمن عشق ز پروانہ بیاموز
وہ اُف نہیں کرتا ہے کبھی آگ میں گر کے — تو فصلِ بہاری میں بھی نالاں ہے شب روز
بلبل نے کہا، آپ کا فرمانا بجا ہے — شعلے کا ہے محتاج پتنگے کا مگر سوز
کہنے کو وہ عاشق ہے مگر اُسکی محبت — مفقود ہے جب شمع نہیں انجمن افروز

خاموش ہوئی شمع تو الفت سے حذر ہے
مجھکو گلِ پژمردہ خزاں میں گلِ تر ہے

غزل

(منشی جگدیش سہائے سکسینہ بی اے ایل ایل بی۔ وکیل شاہجہانپور)

چمن کی دورنگی سے گھبرا رہا ہوں — قفس کی طرف خود اڑا جا رہا ہوں
کبھی دل گرفتہ ہوں مانندِ غنچہ — کبھی صورتِ گل کھلا جا رہا ہوں
خدا دستگیری کرے نا اُمیدی — تمنا کی رَو میں بہا جا رہا ہوں
ابھی تو گرفتارِ رنج و الم ہوں — کہ فقدانِ راحت سے گھبرا رہا ہوں
محبت کی مدہوشیاں بڑھ رہی ہیں — سمجھتا ہوں اب ہوش میں آ رہا ہوں

خدا دم تو لے لوں سرائے جہاں میں
اجل! مَیں بہت دُور سے آ رہا ہوں

میر کا بہترین رنگِ تغزل اور عنصرِ غم

دیبی پرشاد سری واستو

اُردو شاعری گلزارِ فارسی کی ہمیشہ خوشہ چیں رہی، جس طرح فارسی میں معدودے چند شعراء کو چھوڑ کر ...ز شعراء کے تخئیل و جذبات محض مصنوعی اور سطحی ہیں، بالکل اُسی طرح اُردو شاعری کی بھی اُس وقت وہی ...الت تھی، جب اُفقِ شاعری کے تمام ستارے اپنی اپنی عارضی روشنی دکھا کر ماند ہو چلے تھے۔ ایک نیرِ اعظم ...لوع ہوا، جس کی شعاعِ نور پاش سے تمام فضا روشن ہو گئی۔ اُردو شاعری کے سر سے یہ داغ کہ وہ محض سطحی ...و مصنوعی جذبات کا آئینہ ہے دُور ہو گیا۔ اور جس طرح ایک دل شکستہ ماں کی گریہ و زاری سے جس کے آغوش ...بت سے اُس کا پیارا بیٹا ہمیشہ کے لئے علحدہ ہو گیا ہے، سُننے والے بیتاب ہو جاتے ہیں، اُسی طرح میر ...ے حقیقی نالۂ و فغاں نے ہر دردمند کے دل میں ایک آگ لگا دی۔ اُن کا تغزل اُن کے اندرونی خیالات ...ی ترجمانی کرتا ہے۔ اُن کا سوز و گداز ہر شخص کے لئے بیتاب و بیقرار ماں کے اشکِ خونیں ہیں، جب وہ ...وتے ہیں اُن کی ہر آہ کے ساتھ ایک دُھواں نکلتا ہے جو سُننے والوں کے دلوں کے ساتھ وہی کام کرتا ہے ...مریض کے پھوڑے کے ساتھ حکیم کا نشتر۔ وہ خود روتے ہیں اور دوسروں کو بھی رُلاتے ہیں، اور جب روتے ...وتے آنکھیں سفید اور چہرہ پژمردہ ہو جاتا ہے تو پاس بیٹھنے والے اُنھیں خاموش کرنے کی کوشش کرتے ...ں، وہ خود سیلابِ غم کو آنکھوں کے راستہ نکال چکے ہیں اس لئے اب آنسوؤں کو روکنا چاہتے ہیں مگر آنسو نہیں ...کتے۔ وہ سسکیاں لیتے ہیں، آنسو روکتے ہیں مگر ناکامیاب رہتے ہیں۔ آخر کار دیکھنے والے پریشان ہو کر ...لا کر کہتے ہیں "آخر کسی کا کہنا بھی مانا کرو، ضد کی بھی حد ہوتی ہے"۔ مگر اُن بیچاروں کو کیا معلوم۔ میر سے

تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو . . . رونا ہے کچھ ہنسی نہیں ہے

صبح کا سُہانا وقت، آفتاب کی ہلکی ہلکی کرنیں، اور درختوں کے سبز پتے، اُن پر شبنم کے تاباں قطرے ہزاروں ...ر شخص نے دیکھے ہونگے، مگر اِن قطروں کی تابش، ان کا حُسن، اُن کا رنگ، اُن کی کشش، سبک پا نسیم، ...ی کی سُرخی، ہزاروں رہگذروں میں سے صرف ایک کو انتخاب کرتی ہیں۔ ورڈس ورتھ یہ سماں دیکھ کر بیتاب ...جاتا ہے اُس کا دل بے قرار و محوِ حیرت ہو جاتا ہے، اور اسی محویت میں گھنٹوں گذر جاتے ہیں مگر اُسے خبر ...ہیں ہوتی۔ اور جب خبر بھی ہوتی ہے تو دیکھنے والے دیکھتے ہیں۔ اُس کے ہاتھ میں ایک نوٹ بک ہے۔

ایک پنسل، اُس کی نظریں شبنم کے چمکدار قطروں پر اور اُس کی انگلیاں نوٹ بک کے صفحات پر حرکت کر رہی ہیں۔ کون نہیں جانتا آنسوؤں کا پیہم سلسلہ ایک دم نہیں ٹوٹ جاتا۔ آنسوؤں کا آنا کم ہوتا ہے پھر اُس کے بعد سسکیاں باقی رہتی ہیں۔ پھر صرف آنکھیں نم رہ جاتی ہیں۔ پھر ان سب کے بعد ایک ترِ چہرہ رہ جاتا ہے جو اشک شوئی کی آخری منزل ہے۔ یہ سب روزمرّہ کے گذرنے والے واقعات ہیں مگر میر کی زبان سے جب نکلتا ہے ؎

تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو　　　رونا ہے کچھ ہنسی نہیں ہے

تو لوگ اپنے دلوں پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں۔ منھ سے آہ کرتے ہیں اور خاموش رہتے ہیں۔ ایک کا عالم ہوتا ہے۔ ہر شخص ہوش سے بیگانہ عالم محویت میں ہوتا ہے۔ انھیں جذبات سے متاثر ہو کر ہیں کہ میر کے بہتر نشتروں میں سے سب سے تیز نشتر یہی ہے جس نے دل کو برما دیا۔ اس میں اضطراب و بیقراری پیدا کر دی۔ یہ ہوتے ہوئے بھی شعر عام فہم ہے۔ دنیا کے لوگوں کے نزدیک کوئی اہم فلسفیانہ مضمون بھی ادا نہیں کرتا۔ یہی وہ خوبی ہے جس نے اُن کا نام میر ہونے کے باوجود گنجفۂ سخن کی بازی میں اُنھیں آفتاب کی طرح چمکایا۔

اگر میر سے کوئی اُن کی ہر وقت کی گریہ وزاری کی وجہ پوچھتا ہے تو وہ حیران ہو کر اس کا منھ دیکھتے ہیں، اُن کی آنکھوں میں رحم کی التجا ہوتی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس کا جواب دینے سے قاصر مگر عالمِ خلوت میں جب غور کرتے ہیں کہ آخر یہ اضطراب، یہ نالہ وزاری، یہ پریشانی و بیقراری کیوں۔ میر ؎

کوفت سے جان لب پہ آئی ہے　　　ہم نے کیا چوٹ دل پہ کھائی ہے

کہیں یہ عشق کے تو کرشمے نہیں ہیں، جس سے اُن کا دماغ پریشان اور دل بے قرار ہے۔ لیکن پھر خود ہی کہ ہیں ہم کو تو طورِ عشق اور اندازِ محبت سے کسی سے بھی واقفیت نہیں۔ نہ یہ معلوم کہ عشاق کی حالت ہجر میں یا سوزشِ عشق میں کیسی رہتی ہے۔ اُن پر کیا گذرتی ہے، اُن کی کیا حالت ہوتی ہے۔ لیکن ان سب کے ہوئے اتنا ضرور ہے کہ میرا دل بھی ہر وقت پریشان رہتا ہے۔ ان واقعات کو جب ایک شعر کے پیرایہ میں کرتے ہیں تو ایک سکتہ کا عالم ہوتا ہے ؎

ہم طورِ عشق سے تو واقف نہیں ہیں لیکن　　　سینے میں جیسے دل کو کوئی ملا کرے ہے

دیکھنے والے دیکھتے ہیں کہ اظہارِ اضطراب کے ساتھ ساتھ کس قدر سادگی ہے، کوئی اُلجھاؤ نہیں دقت نہیں، سادہ عام فہم ہونے کے علاوہ کس قدر دلگداز ہے۔ مولانا حالی کے لفظوں میں ایسے ہی شعر شاعری میں داخل ہیں۔ اور علامہ شبلی کے مقولے کے مطابق ایسے اشعار بلیغ ترین اور فصیح ترین ہیں۔ باو

سادگی کے کتنے بڑے سوال کا جواب ہے جب کوئی پوچھتا ہے عشق میں عشاق کی کیا حالت ہوتی ہے، اُن کے دماغ پر کیسی کیفیت طاری رہتی ہے، وہ اُس وقت کیسا محسوس کرتے ہیں، اُن کے حواس خمسہ کا کیا حال ہوتا ہے۔ میر ان سب کا جواب دیتا ہے بھائی ؎

ہم طورِ عشق سے تو واقف نہیں ہیں لیکن　　سینے میں جیسے دل کو کوئی مَلا کرے ہے

سودا نے بھی اس کا جواب دیا ہے ؎

عشق سے تو نہیں ہوں میں واقف　　دل کو شعلہ سا کچھ لپٹتا ہے

اور ہیں نگاہیں دیکھ سکتی ہیں "دل کو شعلہ سا کچھ لپٹتا ہے" اور "سینے میں جیسے دل کو کوئی ملا کرے ہے" میں کیا فرق ہے۔ "دل کو کوئی ملا کرے ہے" میں سادگی ہے، معصوم بچّے کی طرح اظہارِ درد کس معصومانہ انداز میں ہے۔ جو درد کی سچی تصویر ہے۔ دل پر تیر اثر لگتا ہے، بچّہ جانتا نہیں ہے مگر اتنا ضرور محسوس کرتا ہے کہ دل کو کوئی ملتا ہے۔ کیا وہ یہ بھی جانتا ہے ع

"دل کو شعلہ سا کچھ لپٹتا ہے"

ایک شعر فصاحت کی عام تعریف کے مطابق فصیح، دوسرا بلاغت کی عام تعریف کے مطابق بلیغ۔ مگر علامہ شبلی کے قول کے مطابق ایک بلیغ و فصیح، دوسرا اظہار قوت تمثیل و تشبیہ، یہی فرق ہے جس نے حضرت میر کو حضرت دبیر سے ممتاز کر دیا ہے۔ زمانہ میں ہر طرح کے لوگ موجود ہیں، مگر شکستہ دل، حزیں طبیعت کی دنیائے یاس اور بھی مایوس کُن ہو جاتی ہے، جب وہ دیکھتا ہے کہ ہر شخص نے دنیا میں کچھ نہ کچھ ضرور حاصل کر لیا، لیکن ایسے بھی ہیں جو دنیا میں رہے مگر اُس سے جلب منفعت کی اُمید اُن کے لئے محض خیال رہی۔ ایک شیریں خواب۔ میر بھی ایسے ہی لوگوں میں ہیں جن کے اُفقِ یاس پر کبھی کوئی درخشاں ستارہ نمودار نہیں ہوا۔ جن کے باغِ تمنا میں کبھی شیریں ثمر نہیں لگا، لیکن وہ اس کا گلہ دوسروں سے نہیں کرتے، اپنا یاس و غم اپنے ہی سے کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔

ایک محروم چلے میر ہمیں دنیا سے　　ورنہ عالم کو زمانہ نے دیا کیا کیا کچھ

ایک وہ شخص جو حد درجہ نااُمید، فلک زدہ اور مایوس ہے، کبھی نہیں دیکھتا کہ دنیا میں اُس سے بھی زیادہ کوئی بُری حالت میں ہے۔ اُس سے بھی زیادہ کسی کے داغِ دل گہرے ہیں، اُس سے بھی زیادہ کوئی حیران و پریشان ہے۔ اسی خیال سے وہ کہتا ہے ع

"ایک محروم چلے میر ہمیں دنیا سے"

یاس کوئی محروم نہیں، صرف ایک محروم وہی ہے" میرے ساتھ دنیا نے کچھ بھلائی نہ کی، کبھی کوئی اُمید افزا

کام نہ کیا" ورنہ عالم کو زمانہ نے دیا کیا کیا کچھ" یہی مضمون سودا نے ادا کیا ہے، مگر دیکھنے والے پہچان
دیکھیں ایک کا نشتر تیز ایک کا خنجر کند ہے

سودا جہاں میں آکے کوئی کچھ نہ لے گیا		جاتا ہوں ایک میں دل پر آرزو لیے

مولوی محمد حسین صاحب آزاد نے آبحیات میں سودا و میر کے چند قریب المعنی اشعار اخذ کئے ہیں
جن سے میر کی دنیائے یاس اور بہترین رنگ تغزل کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے ے

انوری کا ایک مشہور قطعہ ہے ے

ہر بلائے کز آسماں آید		گرچہ بر دیگرے قضا باشد

بر زمیں نارسیدہ می پرسد		خانۂ انوری کجا باشد

میر صاحب نے اس مضمون کو ایک شعر میں یوں ادا کیا ہے ے

جب کوندتی ہے بجلی تب جانب گلستاں		رکھتی ہے چھیڑ میرے خاشاک آشیاں سے

جانب گلستاں سے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ میرا آشیانہ باغ کے درمیان نہیں ہے کہ میں بہار کا تماشہ دل کھول کر دیکھ سکوں اور باغ کی سیر سے جی بھر کر حظ اٹھا سکوں۔ بلکہ میرا آشیانہ باغ کے ایک کنارے پر ہے۔ تاہم جب بجلی کوندتی ہے اُسی طرف کوندتی ہے اگر بجلی میرے آشیانہ پر گر کر اُسکو پھونک ڈالے تو پروا نہیں اِس حالت میں بھی ایک طرح سے بے فکری ہو جائیگی۔ مگر بجلی ایسا نہیں کرتی۔ وہ ہر دم یہ ظاہر کرتی ہے کہ میرے آشیانہ پر گویا اب گری اب گری مگر گرتی نہیں۔ وہ تو میرے آشیانہ کے حقیر اور ناچیز تنکوں سے چھیڑ کیا کرتی ہے اور اس چھیڑ سے اُس کا مطلب یہ ہے کہ میرے دل پر خوف کا جذبہ پے در پے طاری ہوتا رہے۔ اور کسی وقت بھی میرے دل کو یکسوئی حاصل نہ ہو۔ میر نے پیش آنے والے واقعات کی ہولناک تصویر کھینچی ہے۔ جس سے دل پر خاص اثر ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے انوری نے ظرافت کا پیرایہ اختیار کیا ہے۔ فضا ے

بر زمیں نارسیدہ می پرسد		خانۂ انوری کجا باشد

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنے والی مصیبت کا کوئی اثر اس کے دل پر نہیں ہے، سوز و گداز پیدا کرنا میر صاحب کے سوز و گداز کی ایک فلسفیانہ وجہ یہ ہے کہ بعض لوگ فطرۃً شگفتہ مزاج، ہنس مکھ اور خندہ جبیں ہوتے ہیں اس لئے ان کو دنیا میں مسرت ہی مسرت نظر آتی ہے۔ فارسی شعراء میں حافظ اور خیام اسی قسم کے لوگوں میں شامل تھے۔ لیکن بعض لوگ فطرۃً ازل ہی سے درد مند دل لیکر آتے ہیں اور اُن کو ہر جگہ مصیبت ہی مصیبت نظر آتی ہے، میر صاحب اسی قسم کے لوگوں میں تھے چنانچہ کہتے

ر نہ درد مندی سے یہ راہ تم چلے ورنہ — قدم قدم پہ تھی یاں جائے نالہ و فریاد

یہی وجہ ہے کہ ان کی کوئی غزل سوز و گداز سے خالی نہیں ۔ اُن کے دیوان کے ہر صفحہ میں اس قسم کے اشعار نکل سکتے ہیں، یہاں تک کہ بعض غزلیں اول سے آخر تک اسی رنگ میں شرابور ہیں ۔ مثلاً غزلیات جن کے مطلع اِس طور ہیں :۔

کیا پوچھتے ہو عاشق راتوں کو کیا کرے ہے — گاہے بُکا کرے ہے گاہے دُعا کرے ہے

ممکن نہیں آرام دے بیتابی جگر کی — جب تک نہ پلک پر کوئی ٹکڑا نظر آوے

مت صبح و شام تو پئے ایذائے میر ہو — ایسا نہ ہو کہ کام ہی اُس کا اخیر ہو

میر صاحب کا کلام اور اثر | انگریزی کے شاعرِ اعظم شیلے کا کہنا ہے کہ ہمارے سب سے عمدہ اشعار وہ ہیں جو سراپا درد و محن ہوں ۔ اسی واسطے میر کے وہ اشعار جو درد و غم میں شرابور ہیں دل پر نشتر کا کام کرتے ہیں۔ عنصرِ درد و غم کے علاوہ میر صاحب کی زبان شُستہ و صاف ، بیان ایسا کرتے ہیں جیسے باتیں کرتے ہیں دل کے خیالات کو جو سب کی طبیعتوں کے مطابق ہیں محاورہ کا رنگ دیکر باتوں باتوں میں ادا کر دیتے ہیں، مثلاً ؎

تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو — رونا ہے کچھ ہنسی نہیں ہے

دم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا — دم کے جانے کا نہایت غم رہا

زبان میں خدا نے ایسی تاثیر دی ہے کہ یہی باتیں دل سوز و دلگداز بن جاتی ہیں ۔ اکثر جگہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ گویا فطرت کی تصویر کھینچ رہے ہیں ۔ یہی سبب ہے کہ دل پر بھی زیادہ اثر ہوتا ہے۔ میر صاحب کو شگفتگی، بہار، عیش و نشاط یا کامیابی وصال کا لطف کبھی نصیب نہ ہوا، وہی مصیبت اور قسمت کا غم جو ساتھ لائے تھے اُس کا دُکھڑا سناتے چلے گئے ۔ عاشقانہ خیال بھی ناکامی حسرت و مایوسی ہجر و غم کے لباس میں خرچ ہوئے جو آج تک دلوں میں اثر اور سینوں میں درد پیدا کرتے ہیں مصنف آبحیات نے ایک روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ اُستاد مرحوم میر صاحب کے پاس گئے، نکلتے جاڑے تھے ، بہار کی آمد تھی ۔ دیکھا کہ میر صاحب ٹہل رہے ہیں، چہرہ پر افسردگی کا عالم ہے اور رہ رہ کر یہ مصرعہ پڑھتے ہیں ع "اب کے بھی دن بہار کے یوں ہی گذر گئے" یہ سلام کر کے بیٹھ گئے ۔ تھوڑی دیر بعد اُٹھے اور سلام کر کے چلے آئے ، میر صاحب کو خبر بھی نہ ہوئی ۔ خدا جانے دوسرے مصرعہ کی فکر میں تھے یا اس مصرعہ کی کیفیت میں۔

میر کے کلام میں اگرچہ ایسے اشعار بھی موجود ہیں جن میں وزن و قافیہ غیر موزوں ہیں لیکن شاعر

ردیف و قافیہ، بحر و وزن کی پابندیاں صرف پابندیاں ہیں، اصلی نکتہ جو دلفریب ہوتا ہے وہ ایک بتر ہے اور جس طرح معشوق کے حُسن میں وہ چیز جو عاشق کے دل میں عشق پیدا کرتی ہے، بیان نہیں ہوسکتی اسی طرح شاعر کے کلام میں جو قوت دوسرے کے دل پر اثر ڈالتی ہے اور اُس کے دل میں ایک قسم کا جنون و مستی پیدا کرتی ہے حیطہ بیان سے باہر ہے۔ حافظ ؎

لطیفہ ایست نہانی کہ عشق ازو خیزد — کہ نام آں نہ لبِ لعل و خطِ زنگاری است
جمالِ شخص نہ چشم ست زلف و عارض و خال — ہزار نکتہ دریں کار و بار دلداری است

میر صاحب کے کلام میں یہ قوت بدرجۂ اتم موجود ہے کہ وہ اپنے غمگین، رنج دہ، مایوس جذبات تخیلات تصورات کو ایک ایسا روشن، درخشندہ اور واضح جامہ پہناتے ہیں کہ تصویر کا ایک ایک خط و خال سامنے آجاتا ہے۔ اور جب کوئی اُن کو پڑھتا ہے تو گھنٹوں سر دُھنتا ہے، کسی کی نظریں کسی خوبی پر پڑتی ہیں، کسی کی کسی پر، مگر حقیقت یہ ہے:۔

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست — بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

پس یہ مقولہ کہ "میر صاحب کے بہترین اشعار دردناک و غم انگیز ہیں" شیلے کے قول کے مطابق کہ "ہمارے بہترین اشعار وہ ہیں جو سراپا درد و محن ہیں" ٹھیک اور درست ہے۔

ضدوں کا مجموعہ

ضدوں کا مجموعہ ہے یہ دنیا، عجب یہاں کا معاملہ ہے
نگاہِ غائر سے دیکھیئے تو فنا بقا ہے بقا فنا ہے
کبھی ہیں نیکی میں شر کے پہلو، کبھی بدی میں ہے خیر و خوبی
کوئی بگڑ کر سنور رہا ہے، کوئی سنور کر بگڑ گیا ہے
کہیں شعاعیں ہیں اتنی مدھم، نگاہ گم ہو کے رہ گئی ہے
کہیں چکا چوند کا یہ عالم، نظر کا رشتہ سلگ رہا ہے
کہیں مرض عین تندرستی، کہیں ہے صحت مرض میں داخل
کہیں مجاز میں گتھیاں ہیں، کہیں سیاہی گرہ کشا ہے

جوش ملیح آبادی

تالاب*

(حضرت شائق بریلوی، بی۔اے)

ایک صف میں ہیں کنارِ آب یوں کچھ نونہال
ڈبڈبائی آنکھ پر گویا ہے پلکوں کی قطار
اس طرح شاخوں سے شاخوں کا ہوا ہے اتصال
وقتِ رخصت مجھ سے وہ جیسے ہوئے تھے ہم کنار

سبزۂ تو یوں خمیدہ ہو گیا ہے آس پاس
گویا ابرو ہیں کسی کمسن کے بل کھائے ہوئے
اس طرح پانی میں پھیلی ہے شکن آلود گھاس
جیسے وقتِ غسل گیسو اُن کے لہرائے ہوئے

یہ ہوائے تیز رو، موجیں یہ سطحِ آب پر
میری چشمِ شوق سے جیسے کوئی چینِ جبیں
پتیوں کے درمیاں، پانی میں ہیں گلہائے تر
سیر کو نکلے ہیں گویا کشتیوں میں نازنیں

آم کے اونچے درختوں میں چھپا تالاب ہے
یا حسیں فطرت کا شائق ایک دلکش باب ہے

بڑا آدمی

(حضرت یکساں اکبرآبادی)

وہ شجاعت اور جوانمردی کا جوہر اس میں ہے
ہو زمانہ بھر خلاف اُسکے تو ڈر سکتا نہیں

کر کے عزمِ مستقل ہو جائے گر مصروفِ کار
کونسا ہے کام ایسا جو وہ کر سکتا نہیں

زندگی اسکی نہیں ہے صرف تا قیدِ حیات
لُطف تو یہ ہے کہ وہ مر کر بھی مر سکتا نہیں

* یہ نظم بریلی کے اُس تالاب کو دیکھکر لکھی گئی ہے جو آبادی سے کچھ دُور پیڑوں کے درمیان واقع ہے اور حسین کی شکل آنکھ کی طرح ہے۔

ملاپ

(از ڈاکٹر اعظم کُریوی)

اوجھنی کے تعلقہ دار کنور رام پال سنگھ جب تک زندہ رہے، اپنے پیادے بدھو خاں کو اپنی ناک کا بال سمجھتے رہے۔ چار روپئے کے پیادہ کی بساط ہی کیا، لیکن کنور صاحب بدھو خاں کی اتنی قدر کرتے تھے، کہ ان کے مختار عام لالہ چمن لال کو بھی رشک ہوتا تھا۔ کنور صاحب بدھو خاں کا نام نہ لیتے تھے، وہ ہمیشہ اُن کو خاں صاحب کہکر پکارتے تھے اور یہ اسی قدر دانی کا نتیجہ تھا کہ خاں صاحب بھی کنور صاحب پر جان دیتے تھے۔ ان کے پسینہ پر اپنا خون بہانے کو تیار رہتے تھے۔ کنور صاحب جہاں بھی جاتے خاں صاحب کو اپنے ساتھ رکھتے۔ کئی مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ کنور صاحب کے دشمنوں نے انھیں گھیر لیا لیکن خاں صاحب کی بہادری سے ان پر کوئی آنچ نہ آنے پائی۔ لاٹھی چلانے میں خانصاحب اپنا جواب نہ رکھتے تھے، بڑے بڑے پہلوان ان کا لوہا مانتے تھے۔ کنور صاحب اکثر اپنے دوستوں سے فخریہ کہا کرتے تھے کہ "میں خاں صاحب کو اپنے بھائی کے برابر سمجھتا ہوں" جب کنور صاحب کا آخیر وقت آیا تو انھوں نے اپنے اکلوتے لڑکے کنور پرتاپ سنگھ کا ہاتھ خانصاحب کے ہاتھ میں دے کر کہا "خاں صاحب! اب چلنے کی تیاری ہے، پرتاپ کو میں تمھیں سونپے جاتا ہوں، اس کو اپنا لڑکا سمجھنا، ابھی یہ کمسن ہے ناتجربہ کار اور دنیا کے نشیب و فراز سے ناواقف ہے، میرے بعد اس پر کوئی آنچ آئی تو میری آتما کو دکھ ہوگا" فرطِ حمیت سے خاں صاحب کا گلا بھر آیا، انھوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ چھوٹے کنور کو اللہ پاک اپنے امن و امان میں رکھے، میں تو اُن کا ادنیٰ خادم ہوں۔ اگر میری جان بھی ان کے کسی کام آئے تو مجھے کوئی عذر نہ ہوگا"

(۲)

کنور صاحب بیکنٹھ سدھارے۔ ان کی کریا کرم سے فراغت پاکر کنور پرتاپ سنگھ نے اپنے علاقہ کا کام سنبھالا۔ کنور رام پال سنگھ بیس بگیھ زمین خانصاحب کے نام وصیّت کر گئے تھے۔ اس کے کاغذات کنور پرتاپ سنگھ نے بڑی خوشی سے خاں صاحب کو دیدئے۔ لالہ چمن لال کو جب پتہ چلا کہ کنور صاحب ان کے نام کچھ زمین نہیں لکھ گئے ہیں تو اُن کے سینہ پر سانپ لوٹ گیا۔ دنیا کا عجب دستور ہے یہاں کوئی کسی کو خوش نہیں دیکھ سکتا۔ خانصاحب کو بیس بگیھ زمین کیوں ملی اور میں اس سے کیوں محروم رہا

یہ سوال لالہ جی بار بار اپنے دل سے کرتے لیکن کوئی تسلی بخش جواب نہ ملتا۔ اپنے عیب سے خود کوئی واقف نہیں ہوتا۔ لالہ جی بھی اس نقص سے خالی نہ تھے۔ انھوں نے اپنے دل میں ارادہ کر لیا کہ جس طرح بھی ہو خاں صاحب کو نیچا دکھانا چاہیئے۔ جب تک خانصاحب نوکری سے برطرف نہ کئے جائیں گے مجھے عروج حاصل نہ ہوگا۔" خاں صاحب سے لالہ جی کنور رام دیال سنگھ کے زمانے ہی سے جلتے تھے لیکن اُن کا کچھ بس نہ چلتا تھا۔ کنور صاحب کے مرتے ہی لالہ چمن لال پھر خاں صاحب کو زک پہونچانے کی فکر میں لگ گئے۔

خاں صاحب سوائے حویلی کی دربانی کے اور کوئی کام نہ کرتے تھے۔ دن بھر ڈیوڑھی پر حاضر رہتے اگر کنور صاحب کہیں جاتے تو خاں صاحب اپنے کندھے پر لاٹھی رکھے اُن کے پیچھے پیچھے چلا کرتے۔ لالہ جی کو خانصاحب کے خلاف کوئی بات کہنے کا موقع ہی نہ ملتا۔ ایک دن خاں صاحب کو اتفاق سے بخار آ گیا اور وہ دو دن تک ڈیوڑھی پر نہ آ سکے، لالہ جی کو شکایت کرنے کا موقع مل گیا، اُنھوں نے کنور صاحب سے کہا "آجکل تحصیل وصول کے دن ہیں کام بہت ہے، اگر سرکار اجازت دیں تو میں خانصاحب کو اسامیوں سے دین وصول کرنے کے لئے علاقے پر بھیجدوں۔ ڈیوڑھی پر کام ہی کیا ہے، دن بھر خاں صاحب مکھیاں ہی تو مارا کرتے ہیں"

کنور صاحب:- دین وصولنے کے لئے تمھارے پاس چار پیادے ہیں، اِن کے علاوہ گاؤں پر کارندے بھی ہیں، کیا اُن سے یہ کام نہیں ہو سکتا۔

لالہ جی: حضور آجکل کام کی بہت زیادتی ہے۔ اگر خاں صاحب کو بھی اس موقع پر گاؤں بھیجدیا جائے تو بہت اچھا ہوگا۔

کنور صاحب: پتاجی کے زمانے میں کیسے کام چلتا تھا؟

لالہ جی اس کا کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکے، اور اپنا سا منھ لیکر رہ گئے۔ کنور صاحب کو بھی خانصاحب کا اتنا خیال ہے، لالہ جی کو اس کا سان و گمان بھی نہ تھا۔ بدطینت انسان اپنی ہار کبھی نہیں مانتا، لالہ جی اپنی ذلیل حرکتوں سے کئی مرتبہ شرمندہ ہو چکے تھے لیکن اس کا انہیں کچھ احساس ہی نہ تھا، وہ تو جلتا گھر اٹھے ان کے برخلاف خانصاحب نے لالہ جی کا کبھی بُرا نہ چاہا تھا وہ ان کے ہمیشہ خیر خواہ رہے۔ جب لالہ جی ہر طرح سے ہار گئے تو اُنھوں نے مذہبی رنگ اختیار کیا۔

(۳)

اس زمانے میں شدھی اور تبلیغ کی تحریک کا بڑا زور تھا کسی شہر میں سنگھٹن تو کسی شہر میں تنظیم کے جلسے ہو رہے تھے۔ اوجھینی کے قریب ایک گاؤں مبارکپور ہے وہاں کے زمیندار لالہ شیام لال کی کوشش سے ایک چار

کی جو عیسائی ہوگیا تھا شدھی ہوئی۔ اب تک تو شہر ہی میں شدھی کے جلسے ہو رہے تھے لیکن اس موقع پر مبارکپور گاؤں میں بھی ایک عالی شان جلسہ ہوا جس میں شہر سے پرچارک بلائے گئے۔ کنور رام پال سنگھ اور لالہ شیام لال میں پٹی داری تھی انھوں نے جیتے جی کبھی لالہ جی کو منھ نہ لگایا تھا۔ لیکن ان کے مرنے کے بعد لالہ جی نے آہستہ آہستہ کنور پرتاپ سنگھ سے اپنا میل جول بڑھایا۔ اس جلسہ کی صدارت کے لئے انھوں نے کنور صاحب سے استدعا کی، اصل میں اس تجویز کے محرک کنور صاحب کے مختار عام منشی چمن لال تھے۔ کنور صاحب ان جھگڑوں میں پڑنے کے لئے تیار نہ تھے، مگر آخر میں انھیں مجبوراً کرسی صدارت کو رونق بخشنی پڑی۔ ان کی شرکت سے جلسہ کی رونق بڑھ گئی۔ پرجوش مقرروں نے خوب دھواں دھار تقریریں کیں، ایک پرچارک نے جوش میں آکر کہہ دیا کہ "بھائیو، مسلمان بادشاہوں نے ہندوؤں کو بہت نقصان پہونچایا ہے، تبلیغ کے جلسوں میں ہندوؤں کو گالیاں دی جاتی ہیں، وہ سب ہندوؤں کو مسلمان بنانے کی فکر میں ہیں، ہم کب تک چپ چاپ بیٹھے تماشہ دیکھتے رہیں گے، مسلمان ہمارے جانی دشمن ہیں۔" جلسہ میں زیادہ تر ان پڑھ اجڈ دیہاتی شامل تھے، وہ عرصہ سے مسلمانوں سے میل رکھتے چلے آئے تھے، آپس میں برادرانہ تعلقات تھے۔ اس سے پہلے انھیں کسی نے بتایا ہی نہ تھا کہ مسلمان ملکش ہیں۔ پنڈت جی کے وکھیان سنکر جوش غضب سے دیہاتیوں کا خون ان کی رگوں میں دوڑنے لگا۔ پرچارکوں نے دیہاتیوں کے جو تیور بگڑے دیکھے تو ایک پرچارک نے فوراً اٹھکر تجویز پیش کردی "تبلیغ سے بچنے کا بس یہی ایک اپائے (طریقہ) ہے کہ مسلمانوں کا بائیکاٹ کیا جائے۔" کنور پرتاپ سنگھ تعلیم یافتہ تھے وہ اچھی طرح سمجھ گئے کہ اس تجویز کا کیا نتیجہ ہوگا، ان کے علاقہ میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی، مسلمانوں نے ان کے خاندان کی ہمیشہ خدمت کی تھی۔ وہ اس تجویز کی مخالفت کرنے کے لئے کھڑے ہونے والے ہی تھے کہ لالہ چمن لال نے اٹھکر تائید کردی اور "جے! جے!" کے نعروں میں یہ تجویز پاس ہوگئی۔ دوسری ضروری تجویز لالہ شیام لال نے مسلمانوں کی شدھی کے لئے چندہ جمع کرنے کی پیش کی جو باتفاق پاس ہوگئی۔ حالانکہ غریب دیہاتیوں نے دو دو چار چار آنے کرکے چندہ دیا۔ لالہ شیام لال کی طرف سے سو روپیے اور لالہ چمن لال کی طرف سے پچاس روپیے کی رقمیں پیش کی گئیں۔ کنور صاحب کو بھی مجبوراً یا اخلاقاً دو سو روپیے اس کار خیر میں دینے پڑے اور جلسہ "ہندو دھرم کی جے" کے نعروں میں ختم ہوا۔

(۴)

اس جلسہ نے آوجھی اور مبارکپور کا کیا ذکر آس پاس کے تمام گاؤں میں ہلچل مچادی۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کا بائیکاٹ کرنا شروع کردیا۔ اس پر مسلمان اسامیوں نے کنور صاحب سے فریاد کی، لیکن

لالہ چمن لال کی حکمت عملی سے کوئی شنوائی نہ ہوئی، وہاں سے مایوس ہو کر مسلمان بدھو خاں صاحب کے مکان پر پہونچے۔ خاں صاحب نے کہا گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے تم سب اطمینان رکھو، میں موقع پاکر کنور صاحب کو سمجھا دوں گا۔ یہ سب چمن لال کی شرارت ہے ورنہ کنور صاحب تو ان جھگڑوں سے دُور بھاگتے ہیں، میں کنور صاحب کو آہستہ آہستہ راہ پر لے آؤں گا۔ مگر شرط یہ ہے کہ تم لوگوں کی طرف سے کوئی شرارت نہ ہو۔"

میرا بخش ایک نوجوان اکھڑ جلاہا تھا، وہ بول اُٹھا "خاں صاحب! تم ہمیں تو سمجھاتے ہو کہ کوئی شرارت نہ کر بیٹھنا مگر ہندوؤں کو کچھ نہیں کہتے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم غریب ہیں اور وہ امیر ہیں۔ ہندو ہمارے ساتھ آجکل بھنگیوں کا سا سلوک کر رہے ہیں لیکن کوئی ہماری فریاد نہیں سنتا۔"

خاں صاحب بولے "کہہ تو رہا ہوں کہ کنور صاحب کو سمجھا دوں گا۔" یہ سُنکر سب کو اطمینان ہو گیا اور وہ منتشر ہو گئے۔

لالہ چمن لال کے جاسوسوں نے اس کی خبر خوب نمک مرچ لگا کر کنور صاحب کے کانوں تک پہونچائی اور اُن کو یقین دلا دیا کہ خانصاحب مسلمانوں کو ورغلا رہے ہیں۔ یہ سُنکر کنور صاحب کو بڑا افسوس ہوا۔ کسی کی طرف سے ذرا سی بدگمانی ہو جائے پھر اُس کا اعتبار نہیں رہتا۔ چنانچہ اُسی دن سے کنور صاحب کو خانصاحب کی طرف سے بدگمانی پیدا ہو گئی۔ اُنھوں نے خانصاحب سے بغیر کچھ دریافت کئے لالہ چمن لال کو حکم دیدیا کہ "خاں صاحب کو ڈیوڑھی سے ہٹا کر علاقہ پر بھیجدو، میں ایسے خطرناک آدمی کو اب اپنی ڈیوڑھی پر رکھنا پسند نہیں کرتا، اگر اس کی قدیم خدمات کا خیال نہ ہوتا تو میں اُسے برخاست کر دیتا پھر بھی اب وہ مجھے زیادہ دن تک بیوقوف نہیں بنا سکتا۔ اب اگر اس کی کوئی شکایت سُنی گئی تو میں ملازمت سے برطرف کر دونگا۔"

"اندھا کیا چاہے دو آنکھیں" لالہ جی کی تو دلی مراد بر آئی۔ اُنھوں نے خانصاحب کو بُلا کر کنور صاحب کا حکم سُنا دیا۔ خانصاحب سناٹے میں آ گئے۔ وہ پندرہ بیس سال سے ڈیوڑھی پر کام کرتے آئے تھے یکبارگی بلا کسی خطا و قصور کے جو وہ ہٹائے گئے تو اُنھوں نے سمجھ لیا کہ ضرور کچھ دال میں کالا ہے۔ اُنھوں نے کنور صاحب سے ملنا چاہا لیکن کنور صاحب نے کہلا دیا "ملنے کی فرصت نہیں ہے۔"

کنور صاحب کا ایک گاؤں بیر اگی پورا وجھنی سے دس بارہ میل پر تھا۔ خانصاحب وہیں بھیج دیئے گئے ان کے جاتے ہی لالہ جی کے لئے میدان صاف ہو گیا۔ لالہ جی کے اشارہ سے مسلمان آسامیوں پر ظلم و ستم ہونے لگا۔ بیگار اور بیدخلی کی نالشوں سے اُن کو پریشان کیا جانے لگا۔ یہ رنگ دیکھکر مبارکپور کے ایک مُلّا مولوی ظہیر الدین نے کنور صاحب کے مسلمان اسامیوں کو بھڑکانا اور بھلانا شروع کر دیا۔ مولوی صاحب

مسلمانوں کے لیڈر نیے۔ ان کے مشورہ سے مسلمانوں نے بھی ہندوؤں کو موقع ملنے پر پریشان کرنا شروع کردیا۔ تبلیغ کے بھی جلسے ہونے لگے۔ اس سے کنور صاحب کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اُن سے اور مولوی ظہیرالدین سے بہت دنوں کی چلی ہوئی تھی۔ اُنھوں نے جوشِ انتقام میں ایک نومسلم کے گھر میں آگ لگوادی مسلمانوں نے مقدمہ چلایا لیکن وہ کنور صاحب کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے۔ کنور صاحب نے مقدمہ میں اپنا روپیہ پانی کی طرح بہادیا۔ جب اُنھوں نے سُنا کہ مسلمانوں نے بھی ہندوؤں کا بائیکاٹ کرنا شروع کردیا ہے تو انھوں نے اپنے کارندے کو اشارہ کردیا کہ مسلمان آسامیوں سے مار مار کر کام لو۔ اس کے جواب میں مولوی ظہیرالدین نے بھی اپنے ہندو آسامیوں کو خوب تنگ کرنا شروع کردیا۔ تمام علاقہ کا نظام درہم برہم ہوگیا۔ آمدنی کم ہونے لگی۔ لالہ چمن لال نے موقع پاکر رشوت کا بازار گرم کیا۔ غرضیکہ کنور صاحب اور مولوی ظہیرالدین کی لاگ ڈانٹ میں ہندو اور مسلمان آسامیوں کا ناک میں دم آگیا، اور حقیقت میں "دونوں کی ضد نے خاک میں اُن کو ملادیا"

ایک دن لالہ چمن لال نے کنور صاحب سے شکایت کی کہ "حضور! یہ سب شرارت بدھو خاں کی ہے میں نے اس کا اچھی طرح سے پتہ چلا لیا ہے، وہ ہمیں ملکر مارنا چاہتا ہے"

کنور صاحب:۔ "ہاں مجھے بھی اب اس کا یقین آگیا، مجھے کیا معلوم تھا کہ میرے گھر کی روٹیوں پر پلا ہوا نمک حرام ہوجائے گا۔ پتاجی کا خیال نہ ہوتا تو میں اس کو جیل بھجوادیتا۔ پھر بھی اب میں اس نمک حرام کو اپنے یہاں نہیں رکھ سکتا۔ اسے برخاست کردو۔"

لالہ چمن لال کی باچھیں کھل گئیں، کہنے لگے "حضور! یہ نمک حرام اسی لائق تھا، اب دیکھئے گا ساری خاں صاحبی نکل جائیگی"

(۵)

ناکردہ گناہ خاں صاحب برخاست ہوئے تو اُنھیں بڑا صدمہ ہوا۔ اس وجہ سے نہیں کہ اُن کی ملازمت گئی، بلکہ اس وجہ سے کہ کنور صاحب خفا ہوگئے۔ اوجھنی آکر اُنھوں نے کنور صاحب سے ملنے کی بہت کوشش کی "تاکہ وہ کنور صاحب کو اصلیت سے آگاہ کریں اور بتائیں کہ علاقہ میں کیا اندھیر مچا ہے لیکن "کون سُنتا ہے فغانِ درویش" کنور صاحب نے ملنے سے انکار کردیا اور کہلا دیا کہ "میں ایسے نمک حرام سے ملنا پسند نہیں کرتا"۔ خاں صاحب کو خلاف توقع اپنے مالک سے "نمک حرام" کا خطاب ملا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ گھر واپس ہوئے تو اُن کے نوجوان لڑکے پیرو نے کہا "دیکھا بابا! کنور صاحب کا سلوک، خدا جانے آپ اُن سے کیوں دبتے ہیں، میں تو ہرگز اُن کی گالی سُن نہیں سکتا۔ میں کنور صاحب سے اس کا بدلہ ضرور لوں گا"

خانصاحب نے پیرو کو ڈانٹ کر کہا "خبردار! پھر کبھی ایسی گستاخی نہ کرنا ورنہ جان سے مار ڈالوں گا۔
تو کنور صاحب ہی کی روٹی کھا کر اتنا بڑا ہوا ہے، اس میں کنور صاحب کی کوئی خطا نہیں، یہ سب چمن لال کی شرارت ہے، اُس نے کنور صاحب کو بہکا دیا ہے، وہ ہمارے مالک ہیں ہم اُن کے احسان سے کبھی سر نہیں اُٹھا سکتے۔ ہمیں تو اُن کے پسینہ پر اپنا خون بہانا چاہیئے"۔

پیرو چُپ ہو گیا، اُس نے دل میں سوچا کہ بابا سٹھیا گئے ہیں، اُن کی مَت ماری گئی ہے، اُن سے کچھ کہنا ہی فضول ہے"۔

اوجھنی میں گائے اور باجہ کا کبھی کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوا تھا، کنور رام پال سنگھ کے زمانہ میں ہندو مسلمان ایک دوسرے کے رنج وغم، ہنسی اور خوشی میں شریک ہوتے تھے۔ اول تو غریب مسلمان گائے کی قربانی ہی نہ کرتے تھے، اور اگر کسی گاؤں میں قربانی ہوتی بھی تھی تو رہ گذر کے بجائے مکان کے اندر قربانی ہوتی تاکہ ہندو بھائیوں کی دل شکنی نہ ہو۔ ہندوؤں کو بھی مسلمانوں کا اتنا خیال تھا کہ جب کبھی وہ کسی مسجد کے سامنے نکلتے تو باجہ ہرگز نہ بجاتے۔ لیکن اب تو معاملہ ہی دگرگوں تھا، علاقہ میں گائے کی قربانی کی ممانعت کر دی گئی جو مسلمانوں کو سخت ناگوار ہوا۔ مولوی ظہیر الدین کے فتوے سے "سمندِ ناز کو اک اور تازیانہ ہوا" سب مسلمان کٹنے مرنے پر تیار ہو گئے۔ اوجھنی سے کچھ دُور پر میر الطاف حسین تعلقدار کا علاقہ تھا، اُن سے کنور صاحب کی خاندانی عداوت تھی۔ ایک مرتبہ کنور رام پال سنگھ کے زمانہ میں اُن سے فوجداری بھی ہو چکی تھی، لیکن تب مسلمانوں نے کنور صاحب کا ساتھ دیا تھا جس سے میر صاحب کو شکستِ فاش ہوئی تھی۔ میر صاحب نے جب دیکھا کہ کنور صاحب کے علاقہ میں ہندو مسلم فساد ہو رہا ہے، تو انھوں نے کنور صاحب سے اپنا انتقام لینے کے لئے مسلمانوں کو مدد دینے کا وعدہ کر لیا۔ بقرعید کے دن مولوی ظہیر الدین کے مکان پر سیکڑوں مسلمان جمع ہو گئے، کیونکہ انھیں کے مکان پر گائے کی قربانی کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ یہ خبر سُنتے ہی ہندوؤں نے بھی "گہار" بُلایا۔ کنور پرتاب سنگھ "گہار" کے "اگوا" بنے۔ انھوں نے اعلان کر دیا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے لیکن مسلمانوں کو گائے کی قربانی نہ کرنے دو، جس وقت وہ گائے کی قربانی کرنے چلیں تم سب دھاوا بول دو۔ دوسری طرف میر الطاف حسین تعلقدار مسلمانوں کی پیٹھ ٹھونک رہے تھے کہ بھائیو! اگر آج تم ہندوؤں سے دب گئے پھر تمھارا یہاں رہنا دشوار ہو جائیگا۔ گائے کی قربانی کرنے میں اگر ہم مارے گئے تو شہید اور زندہ رہے تو غازی کہلائیں گے۔ قریب تھا کہ دونوں فریق آپس میں ٹکرا جائیں کہ یکبارگی بدلو خاں لپکتے ہوئے آئے دونوں جماعتوں کے درمیان کھڑے ہو گئے۔ اس وقت خاں صاحب مسلمانوں کے کسی مشورے میں

شریک نہ تھے، بلکہ وہ اُلٹا مسلمانوں کو سمجھاتے تھے کہ صبر کرو۔ خلاف اُمید خاں صاحب کو دیکھکر مولوی ظہیرالدین نے کہا "خدا کا شکر ہے کہ آپ کو مسلمانوں پر رحم تو آیا، وہاں دُور کھڑے ہونے کی کیا ضرورت ہے، یہاں آجایئے۔"

اُدھر جب چمن لال نے خاں صاحب کو دیکھا تو کنور صاحب سے کہا "دیکھی سرکار نے بدھو خاں کی نمک حرامی! اب تک چھپ کر کام کرتا، ضبط نہ ہوا تو آخر حضور کے مقابلہ میں آ ہی گیا۔ بدمعاش کہیں کا!"

کنور صاحب: "لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ مولوی ظہیرالدین کے دروازے پر کیوں نہیں گیا، ہم دونوں کے درمیان کیوں کھڑا ہے۔"

لالہ جی: "اس میں بھی اُس کی کوئی چالاکی ہوگی، بڑا بنا ہوا ہے۔"

کنور صاحب: "اچھا ذرا خاموش تو رہو سنو تو سہی کہ وہ مولوی صاحب سے کیا کہتا ہے۔"

خاں صاحب نے مولوی ظہیرالدین سے مخاطب ہو کر کہا "مولوی صاحب! میں آپ کے گروہ میں شامل ہونے نہیں آیا، میں تو صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ خدا کے لئے ہمارے گاؤں پر رحم کیجئے، غریب مسلمانوں پر کرم کیجئے، کسی کا دل دُکھانے سے کیا فائدہ، جو کچھ آپ کرنے جا رہے ہیں اس کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔"

مولوی صاحب نے قہقہہ مار کر کہا "آہا ہا، آپ ہمیں سمجھانے آئے ہیں، اور ہاں آپ نہ سمجھائیں گے تو پھر اور کون سمجھائے گا۔ نمک کا کچھ تو خیال چاہیئے۔ اجی خاں صاحب اُس وقت آپ کہاں تھے جب کنور صاحب نے مسلمانوں کے گھروں میں آگ لگوائی، اِن کے کارندوں نے غریب مسلمانوں کو مارا پیٹا، اور ہندوؤں نے ہمارا بائیکاٹ کیا۔ آپ کو اچھی طرح سے معلوم ہے کہ ہم کوئی نئی بات نہیں کر رہے، قربانی کرنا ہمارا مذہبی فرض ہے، دنیا کی کوئی طاقت ہمیں اس فرض سے نہیں روک سکتی۔"

خاں صاحب: "لیکن یہ ضروری نہیں کہ گائے ہی کی قربانی کی جائے، ہندو ہمارے وطنی بھائی ہیں، اُن کے جذبات کا احترام کرنا بھی ہمارا مذہبی فرض ہے۔"

مولوی صاحب: "لیکن ہم ہندوؤں سے ڈر کر یا اُن کے دباؤ سے ایسا نہیں کر سکتے۔ کنور رام پال سنگھ کے زمانہ میں گائے کی قربانی کی کوئی مخالفت نہ تھی وہ مسلمانوں کے دوست تھے، اسی وجہ سے ہم نے بھی اُن کا دل نہیں دکھایا، لیکن اب ضد کی بات ہے تو ہم گائے کی قربانی ڈنکے کی چوٹ کرینگے دیکھیں ہمیں کون روکتا ہے۔" باطل سے دبنے والے اے آسمان نہیں ہم"۔ لیکن خاں صاحب آپ کو ان باتوں سے کیا مطلب، آپ سے کچھ کہنا ہی فضول ہے، آپ تو جس کا کھائیں گے اُسکا گائیں گے

خاں صاحب باتیں کرتے کرتے آہستہ آہستہ اسی مقام پر پہونچ گئے جہاں گائے بندھی ہوئی تھی۔
اِدھر کنور پرتاب سنگھ چنتا ساگر میں غوطے کھا رہے تھے۔ ان کو کبھی تو مسلمانوں پر غصہ آتا اور کبھی رحم، مولوی صاحب کی تقریر نے انھیں کشمکش و پیچ میں ڈال دیا، وہ سوچنے لگے "مولوی صاحب سچ تو کہتے ہیں، یہ وہی مسلمان ہیں جو پتاجی کے زمانے میں ہم پر جان تک دینے کو ہر وقت تیار رہتے تھے، لیکن اب تو یہ عالم ہوگیا ہے کہ ہمارے آسامی ہمارے ہی خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہوا، بس اب سمجھ گیا، یہ سب چمن لال کی لگائی ہوئی آگ ہے۔ افسوس میں نے اُس کے کہنے میں آکر حقیقت میں مسلمانوں کو دشمن بنا لیا، اور خانصاحب ایسے وفادار اور شریف پیادہ کو صرف اس جرم میں کہ وہ مسلمان ہے برخاست کر دیا۔"
ایک دفعہ انسان کا دل صفائی پر مائل ہو جائے پھر اُس کا ضمیر اُسے راہ راست پر لے ہی آتا ہے، کنور صاحب کے دل کی بھی یہی حالت ہوئی۔ جب تک اُن کے دل میں مسلمانوں کی جانب سے غبارِ کدورت بھرا تھا مسلمانوں کے ہنر بھی اُن کی نگاہ میں عیب معلوم ہوتے تھے۔ اُن کی ہر حرکت سے شرارت کا احتمال ہوتا تھا، لیکن جب کنور صاحب کے شیشۂ دل سے غبارِ کدورت دُور ہوا تو اُن کو مسلمان بے ضرر اور خیر خواہ نظر آنے لگے۔ اب اُن کو دوست اور دشمن میں فرق معلوم ہونے لگا۔ کنور صاحب نے فوجداری کے نتائج پر غور کیا تو عالم خیال میں ان کی آنکھوں کے سامنے سیکڑوں ہندوؤں اور مسلمانوں کی خون میں لت پت لاشیں اور سیکڑوں بیوائیں اور یتیم بچے پریشان حال ماتم کرتے دکھائی دیے۔
کنور صاحب کا بہجوم جذبات سے کلیجہ پھٹنے لگا۔ ٹھیک اُسی وقت لالہ چمن لال نے یہ کہکر "حضور! تیار ہو جائیے، اب مسلمان قربانی کرنے جا رہے ہیں" کنور صاحب کے خیالات کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ وہ گویا سوتے سے چونک اُٹھے، اُنھوں نے دیکھا کہ بدھو خاں صاحب گائے کے گلے میں باہیں ڈالے کھڑے ہیں، اور چلا چلا کر کہہ رہے ہیں" بھائیو! ہاتھ جوڑتا ہوں، گائے کی قربانی نہ کرو، میں اس کے بجائے اس بکرے دینے کو تیار ہوں، بھائیو! خدا کے لئے رسول کے لئے اپنی ضد سے باز آجاؤ۔ میرا راہ گائے کی قربانی کرکے تم کسی کا دل کیوں دکھانا چاہتے ہو۔ اگر تم میری بات نہیں مانتے تو قربانی سے پہلے مجھے مار ڈالو۔ میری قربانی سے شاید تمھارا کلیجہ ٹھنڈا ہو جائے۔"
کنور صاحب کے بھی کانوں میں خاں صاحب کی آواز پہونچی، اُنھوں نے چمن لال سے کہا:۔
"بھاگ جاؤ اب تم سب لوگ یہاں سے فوراً چلے جاؤ مجھے اب تمھاری بالکل ضرورت نہیں ہے، میں اب مسلمانوں سے ہرگز ہرگز لڑائی مول نہ لوں گا۔" یہ کہتے ہوئے کنور صاحب اپنے گھار سے نکل کر مولوی ظہیر الدین

کی طرف بڑھے۔ کنور صاحب کے پیادوں نے اُن کا ساتھ دینا چاہا لیکن کنور صاحب نے اُنھیں منع کر
مولوی ظہیر الدین، میر الطاف حسین اور تمام مسلمانوں نے کنور صاحب کو اپنی طرف تنہا آتے دیکھا تو
حیرت سے ایک دوسرے کا منھ تکنے لگے کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ کنور صاحب نے آگے بڑھکر بلند
آواز سے کہا "بھائیو! معاف کرنا میں غلطی پر تھا آپ شوق سے قربانی کیجئے، آپ کے مذہبی فرائض
میں مداخلت کرنے کا مجھے کوئی حق نہیں۔" اتنا کہکر کنور صاحب نے خاں صاحب سے کہا "ادھر اپنا
خاں صاحب! میں آپ سے شرمندہ ہوں، اپنی غلطی پر نادم ہوں۔ پرماتما نے آج میری آنکھیں کھولدیں
مجھے کھوٹے کھرے نیک اور بد کی پہچان ہوگئی۔ آج سے آپ میرے پیادہ نہیں بلکہ اب میں آپ کو اپنے
پتا جی کے جگہ پر سمجھتا ہوں۔ آپ نے مجھے کیا چھوڑا کہ میرے تمام علاقہ نے مجھ سے منھ موڑ لیا۔ پتا جی نے
آپ کو جو وصیت کی تھی اُس کو نباہیئے اور میری سرپرستی کیجئے۔"

خاں صاحب نے دوڑ کر کنور صاحب کو اپنے گلے سے لگا لیا اور روتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر کہا۔
"کنور صاحب! ہاتھ جوڑتا ہوں، آپ اپنا دل چھوٹا نہ کیجئے، ہمارے آپ مالک اور ہم آپکے ادنیٰ غلام"
اس مؤثر سین کو دیکھکر تمام مسلمان بے تاب ہوگئے، مولوی صاحب کا دل بھر آیا اُنھوں نے کنور
سے کہا "جب آپ ہماری قربانی میں کوئی مداخلت نہیں کرنا چاہتے تو ہم بھی بڑی خوشی سے اعلان کرتے ہیں
کہ اب ہم گائے کی قربانی نہ کریں گے آپ اس گائے کو بخوشی اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں۔"

مسلمانوں کے اس ایثار، رواداری اور ہمدردی کو دیکھکر ہندوؤں کی آنکھیں کھل گئیں، سب
دل صاف ہوگئے۔ میر الطاف حسین نے کنور صاحب سے گلے ملتے ہوئے کہا "بڑا مزا اُس ملاپ میں
جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر" کنور صاحب نے مسکرا کر کہا "بھئی ہماری آپ کی جنگ ہی کب ہوئی۔"
چمن لال نے خانصاحب سے بغلگیر ہو کر کہا "خاں صاحب خدا کے لئے میری خطا معاف کر دیجئے
وجہ سے آپ کو بہت تکلیف ہوئی۔" خاں صاحب نے لالہ جی کو گلے سے لگا کر جواب دیا "میں تو
کو اپنا بھائی سمجھتا ہوں۔" اس پریم ملاپ کو دیکھکر سب یکبارگی چلّا اُٹھے
"ہندو مسلمان کی جے!"



تعزیت

(جنابِ سحرؔ ہتگامی کے انتقالِ پُر ملال پر)

(از منشی تلوک چند محرومؔ، بی۔ اے)

کھائی دلِ حزیں نے مرے ایک اور چوٹ — آئی ہے آج ایسی خبر "ہتھ گرام" سے
مشہورِ ہند تھے جو سخنور جنابِ سحرؔ — رونق تھی بزمِ شعر کی جن کے کلام سے
احباب و اقربا سے تعلق کو توڑ کر — وہ چل دیئے ہیں دہر کے فانی مقام سے
شائق[1] ہے دل فگار کہ یکسر بدل گئی — صبحِ اُمید تیرگیِ غم کی شام سے
واقف ہے اُس جگر کی مصیبت سے دل مرا — جو کٹ چکا ہو تیغِ فراقِ دوام سے
یارائے گفتگو مگر اس باب میں نہیں — تسکینِ دل ہو کیا سخنِ ناتمام سے
بے بس بشر ہے آہ مشیّت کے سامنے — ہے کس کو زور قدرتِ حق کے نظام سے

محرومؔ سب کے واسطے ہے جرعۂ فنا
پینا ہے ہم کو بھی اسی دیرینہ جام سے

---

[1] کیلاش ورما شائقؔ خلفِ مرحوم

گُل و مُل

یہ کتاب سید علی عباس صاحب عبّاس بی۔ اے، ایل ایل بی ایڈوکیٹ سہارنپور کے فارسی و اُردو کلام کا مجموعہ ہے۔ تمام کلام شوکت الفاظ و صنائع و بدائع شعری سے معمور ہے۔ قدیم و جدید دونوں قسم کی شاعریوں کا لطف حاصل ہوتا ہے۔ تخیل بلند اور ترکیبیں دلپسند ہیں۔ اکثر غالب اور کہیں کہیں ناسخ کے تتبع کی جھلک نظر آتی ہے۔ مثلاً

دوائے فکر آزادی خیالِ زلفِ پیچاں تھا — اسیرِ دامِ غربت کا تخیل پا بجولاں تھا

حسب دستور اس کے شروع میں بھی مسٹر ہدایت حسنی ایم۔ اے سکریٹری انجمن ترقی اَدب دہلی کا ایک فاضلانہ "مطالعہ" ہے۔ جس میں شاعر کے حالات زندگی پر روشنی ڈالنے کے علاوہ ان کے کلام پر بھی تنقید کی گئی ہے لکھائی چھپائی۔ کاغذ سب عمدہ۔ مجم چھوٹی تقطیع کے ۲۰۰ صفحات۔ قیمت سوا روپیہ ۱ؔ۴؍ ملنے کا پتہ۔ انجمن ترقی اَدب دہلی

شانِ خدا

مولانا عبیدالرحمٰن صاحب عاقل رحمانی نے یہ کتاب ایسے لوگوں کی تردید بلکہ رہنمائی کے لئے لکھی ہے جو خدا کے وجود کے قائل نہیں ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اسمیں اکثر پرانے اور نئے فلسفیوں کے اقوال سے استدلال کیا ہے۔ اسلوب بیان خالص "مولویانہ" ہے اور ایسے ایسے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جو صرف مولوی ہی سمجھ سکتے ہیں۔ مثلاً قابل اعجاب، معلومات، مذوقات۔ منتاعِ تحول، تضامن، مفواعل متنابعہ۔ غلبان۔ تفاعل۔ امتصاص۔ قوتِ عیوی عام۔ اقتصاد جازم۔ تعاکس۔ تعاقر وغیرہ۔

فاضل مصنف لفظ "کان" جسے فارسی میں گوش کہتے ہیں مؤنث استعمال کرتے ہیں اور لکھتے ہیں "دیکھنے کیلئے آنکھیں، سننے کے لئے کانیں" حالانکہ یہاں صرف کان کافی تھا بعض جگہ جمع فاعل کیلئے واحد فعل استعمال کیا گیا ہے۔ صفحہ ۸۲ پر لکھا ہے کہ "حقائق معقولہ ہر انسان کی سمجھ میں اُسی وقت آتا ہے" حالانکہ حقائق کے لئے فعل بھی جمع ہونا چاہیئے۔ بہرحال کتاب تحقیق و تحسین سے لکھی گئی ہے۔ لکھائی چھپائی بھی اچھی ہے۔ قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ کتابستان، پوسٹ بکس نمبر ۳۱۶۴ بمبئی نمبر ۲

محمد رسول اللہ

مشہور انگریز فلاسفر ٹامس کارلائل کی کتاب "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" کا چوتھا باب محمد صاحب سے متعلق ہے۔ مولانا عبیدالرحمٰن عاقل رحمانی نے اسی باب کا اُردو زبان میں ترجمہ کیا ہے، جسے کتابستان بمبئی نے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں حالات عرب قبل از اسلام، حجر اسود اور کعبہ، چاہ زمزم، محمد صاحب کی ولادت، تربیت، بعثت اور نبوت پر مختصراً روشنی ڈالی گئی ہے اور اسلام و ارکان اسلام پر بحث کرتے ہوئے محمد صاحب کو ایک اولوالعزم پیغمبر ثابت کیا ہے اور بعض الزامات جو مخالفین کی طرف سے ان پر لگائے گئے ہیں ان کی تردید کی گئی ہے۔ ترجمہ بہت اچھا اور کتاب پڑھنے کے لائق ہے۔ لکھائی چھپائی کاغذ سب اچھے چھوٹی تقطیع کے ۴۲ صفحات ضخامت۔ قیمت آٹھ آنے ۸؍ ملنے کا پتہ:۔ کتابستان پوسٹ بکس نمبر ۳۱۶۴ بمبئی ۲

میر محمد مومن

یہ کتاب جنوبی ہند کی سلطنت قطب شاہیہ کے پیشوا سلطان محمد قلی قطب شاہ کے وزیر اعظم میر محمد مومن" کے حالات زندگی ان کے اصلاحی کاموں اور سیاسی کارناموں کا ایک عمدہ مرقع ہے جو سید محی الدین قادری زور صاحب نے مرتب کیا ہے۔ میر محمد مومن صاحب ایران سے دکن آئے تھے۔ چنانچہ دکن میں آکر انھوں نے شیعہ مذہب کی اشاعت میں زبردست حصہ لیا اور بہت سی نفیس و خوشنما عمارتیں بنوائیں بلکہ شہر حیدرآباد کی بنیاد بھی انھیں نے ڈالی تھی اور دائرہ میر محمد مومن" کے بھی وہی بانی ہیں۔ حیدرآباد کی مشہور و معروف عمارت "چار مینار" انھیں نے تعمیر کی تھی۔ میر موصوف ایک متقی و پرہیزگار بزرگ صاحب باطن صوفی، باعمل عالم اور زبردست مدبر تھے۔ ان کے حالات زندگی جو اس کتاب میں درج ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اگر انسان عزم راسخ اور عمل پیہم رکھے تو وہ کن مدارج تک پہونچ سکتا ہے۔ کتاب بہت دلچسپ ہے۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ بھی عمدہ ہے ضخامت ۱۱۳ صفحات۔ قیمت ؏۱۔ سب رس کتاب گھر، خیریت آباد، حیدرآباد دکن سے مل سکتی ہے۔

کشمش نانی

یہ چھوٹے بچوں کی دلچسپی کے لئے پُر لطف کہانیوں کا ایک سبق آموز مجموعہ ہے جنھیں مولانا شجاع احمد قائد حیدرآبادی نے "کشمش نانی" کی زبان سے بیان کرایا ہے۔ تمام کہانیاں دلچسپ اور سبق آموز ہیں۔ ننھے اقبال کی کہانی خاص طور پر پُر اثر اور رقت انگیز ہے۔ بہرحال جس قسم کی کتاب سنسکرت میں "کتھا سرت ساگر" اور انگریزی میں حکیم ایسپ کی حکایتیں ہیں اسی قسم کی سبق آموز کہانیاں اس مجموعہ میں بھی ہیں۔ اس کی زبان بھی بہت سلیس اور عام فہم ہے، کہیں کہیں غلط محاورے بھی استعمال ہو گئے ہیں مثلاً ایک جگہ لکھا ہے کہ "نانی ٹھٹھہ مار کر ہنسیں" حالانکہ ٹھٹھہ نہیں مارا جاتا بلکہ قہقہہ مارا جاتا ہے، ٹھٹھہ کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ایک جگہ "غصہ کو دابا" لکھا ہے، مگر غصہ دابا نہیں جاتا بلکہ "دبایا" جاتا ہے۔ یا ضبط کیا جاتا ہے۔ بہرحال چھوٹے بچوں کیلئے یہ کتاب بہت مناسب ہے۔ لکھائی چھپائی مناسب۔ قیمت ۸؍ ملنے کا پتہ: سب رس کتاب گھر خیریت آباد حیدرآباد دکن۔

ادارہ کی خبریں

آہ منشی اقبال ورما سحر ہتگامی

ناظرین زمانہ کو اس خبر سے نہایت رنج و افسوس ہوگا کہ اردو اور ہندی کے مشہور شاعر و ادیب منشی اقبال ورما سحر ہتگامی ۲۰ ستمبر ۱۹۴۲ء کو اپنے وطن ہتگام ضلع فتحپور میں بیکنٹھ باش ہو گئے۔ مرحوم نہ صرف ایک قادر الکلام شاعر بلکہ ایک اچھے نثر نگار بھی تھے۔ ۱۹۰۹ء میں آپ نے سنسکرت کے زندہ جاوید شاعر کالیداس کے مشہور و معروف ناٹک "شکنتلا" کا "مثنوی سحر" کے نام سے ترجمہ کیا تھا جس نے قبول عام کا درجہ حاصل کیا۔ مرحوم کی توجہ غزلوں کی طرف کم تھی، آپ کی نظمیں برابر رسالہ زمانہ کانپور اور دیگر رسالوں میں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ آپ نے منشی پریم چند آنجہانی کے چند ہندی ناولوں کو بھی اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ ۱۹۲۰ء سے آپ نے ہندی زبان میں لکھنا شروع کیا۔ عمر خیام کی پانچسو رباعیوں کا شگفتہ ہندی میں منظوم ترجمہ کیا جن کو انڈین پریس الہ آباد نے ۱۹۳۶ء میں بڑی آب و تاب سے مصور شائع کیا۔ اس سے کئی سال قبل آپ شیخ سعدی کی "کریما" کا بھی ہندی میں منظوم ترجمہ کر چکے تھے جو پرکاش پستکالیہ کانپور کی طرف سے شائع ہوا تھا۔ ان کے علاوہ آپ کے مضامین نظم و نثر ملک کے مشہور اردو اور ہندی رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔ مرحوم کے انتقال سے اردو اور ہندی ادب کو جو نقصان پہونچا ہے اس کی تھوڑی بہت تلافی اسی صورت سے ہو سکتی ہے کہ ہم اُن کی نادر مطبوعات کو زیادہ سے زیادہ اشاعت کا موقع دیں۔

ادارۂ زمانہ مرحوم کے پسماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

زمانہ

جلد ۷۹ — نومبر و دسمبر ۱۹۴۲ء — نمبر ۵ و ۶

نظیر اکبر آبادی اور ہندی کا عروض

(از مسٹر سلیم جعفر)

اس مصورِ مظاہرِ دنیائے فانی و مفسرِ کیفیاتِ نفسِ انسانی کے سر پر قبولِ عام نے شہرتِ دوام کا تاج رکھا لیکن شاید یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اس شاعرِ شیریں مقال کی زمزمہ سنجیاں گروہِ عوام سے گزر کر آویزۂ گوشِ خواص کبھی نہیں ہوئیں۔ تذکروں میں اس باکمال کا ذکر شاذ و نادر ہی آیا ہے، اور مشاہیر کی صف میں اسے جگہ دینے میں بالعموم بخل سے کام لیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اُس زمانہ میں پیدا ہوا جب حقیقت نگاری اور فطرت پرستی کی داد دینے والوں کا قحط تھا۔ آسمان سے تارے اُتارنے پر فخر کیا جاتا تھا۔ فارسیّت غالب تھی تشبیہ و استعارہ کی پیچیدگیوں سے مرتبۂ کمال کا اندازہ لگایا جاتا تھا، اور زبان کے چٹخارے پر جان دی جاتی تھی۔ موجودہ صدی کے ابتدائی ربع میں پروفیسر عبد الغفور شہباز مرحوم نے سعی کی کہ وہ پبلک سے اس یکہ تازِ میدانِ سخن وری کو اس کا حق دلا کر اُسے اُس سیریر بلند پر متمکن کر دیں جہاں دیگر مشاہیر جلوہ افروز ہیں، لیکن یہ سعی اتنی ہی مشکور ہوئی جتنی کہ پروفیسر محمد حسین صاحب آزاد کی کوششیں ذوق مرحوم کی مقبولیت کا دائرہ وسیع کرنے میں ہوئی تھیں۔ پروفیسر شہباز نے "زندگانی بے نظیر" لکھی اور بڑی کوشش سے "کلیات" شائع کیا۔ لیکن یہ جگر کاوی نظیر کو اس درجہ سے بلند نہ لے جاسکی جو اسے پہلے حاصل تھا[1]

---

[1] ڈاکٹر گراہم بیلی اپنی تصنیف "تاریخ اردو" میں فرماتے ہیں کہ "رجحانات بدل جانے کی وجہ سے اب نظیر اعلیٰ شاعروں میں شمار کئے اور ہم مرتبۂ سودا سمجھے جاتے ہیں"
میرے نزدیک ابھی تک یہ خیال عام نہیں ہے۔

ابھی اشارۃً کہا جا چکا ہے کہ نظیر کے کماحقہٗ اعترافِ کمال کا مانع اُس کی بغاوت ہے۔ اس نے فرضی عشق کے غیر حقیقی آلام و مصائب کا بیان اپنی زندگی کا مقصد نہیں قرار دیا۔ وہ کسی فرضی محبوب کے عشق میں گرفتار نہیں ہوا۔ اُس کی آہ و فغاں کے دھوئیں سے آسمان پر بادل نہیں چھائے، اُس کے سینہ میں خواہ مخواہ ایک آگ نے بھڑک کر تن بدن نہیں پھونکا، اس نے تارے گن گن کر راتیں نہیں کاٹیں سوزِ دروں سے اس کے لب پر تبخالہ نہیں پڑا۔ اس نے عالمِ نزع میں بسترِ مرگ پر لیٹ کر کسی مسیحا کا انتظار نہیں کیا، قضا اُس کے بستر کے گرد ساری رات پھر کر نامراد واپس نہیں ہوئی، فرضی موت کے بعد وہ ٹھوکر سے پھر زندہ نہیں ہوا، وہ اس دنیائے مکر و فریب میں داخل ہوا۔ اس کے مکروہات سے پریشان ہو کر نکل گیا اور بہت ہی جلد اُس عالم میں داخل ہو گیا جہاں کا ذرہ ذرہ حقیقت کا آئینہ دار تھا۔ یہ خیالی وہمی دنیا نہ تھی، اس میں جیتی جاگتی تصویریں تھیں، اس کے مناظر و مظاہر کی بنیاد مادی تھی اور اس لئے وہ احساسات کی دسترس سے باہر نہ تھے۔ یہاں برسات کی بہاریں، جاڑوں کی سختیاں اور بسنت کی دل آویزیاں تھیں، بے فکرے ہولی کھیلتے تھے۔ شب برات پر پٹاخے چھوڑے جاتے تھے، زندہ دل جمنا جی میں تیرتے اور میلوں ٹھیلوں میں جاتے تھے، بچوں بوڑھوں کے لئے ہر طرح کا سامانِ تفریح موجود تھا، بلبلیں لڑائی جاتی تھیں اور ریچھ نچائے جاتے تھے، پھیری والے گلیوں میں تل کے لڈو بیچتے پھرتے تھے۔ غرض یہ ایک دنیا تھی جو آثارِ زندگی سے بھرپور تھی۔ مگر یہ نہ سمجھئے کہ اس کے بسنے والوں کی آنکھوں پر مادہ کے کرشموں نے پردۂ غفلت ڈال دیا تھا انھیں خدا کا خیال ہی نہ آتا تھا، نہیں، اُنھیں اس کی بے ثباتی کا احساس تھا، وہ جانتے تھے کہ وہ اس میں ایک "بنجارہ" "ایک ہنس" کی حیثیت رکھتے تھے۔ انھیں بخوبی علم تھا کہ جہاں نقارہ بجتے ہیں وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں، اُنھیں یقین تھا کہ امارت و افلاس کا چولی دامن کا ساتھ ہے، اُنھیں صاف صاف نظر آتا تھا کہ وہ کلجگ میں پیدا ہوئے ہیں اور اُس کے اثروں سے نہیں بچ سکتے۔ اُن کے دلوں پر یہ حقیقت پر تو فگن تھی کہ اس عالمِ فانی کی ہر شے فانی ہے اور انھیں بھی ایک دن موت سے دوچار ہونا ہے۔ ان نیرنگیوں نے اس باغی کا دل موہ لیا اور اس نے دل کش و مؤثر نغموں میں اپنے ہم عصروں کو ادھر متوجہ کیا۔

باغی تو تھا ہی اُس نے اپنے نغموں کو مروجہ راگوں اور سُروں ہی میں نہیں سُنایا بلکہ دلیرانہ پابندیوں کی زنجیریں توڑ ڈالیں۔ اس نے کسی کے ناک بھوں چڑھانے کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ ستائش و صلہ سے بے نیاز ہو کر اپنے راگوں کو جن بولوں میں مناسب سمجھا ترتیب دیا۔ ایسے سرکش، ایسے متمرد کو کون سراہتا۔ وہ زمانہ کے خلاف چلا، زمانہ نے بھی اُس سے آنکھ پھیر لی۔ مگر شاباش اُس کے دل گُردے کو، ہمت نہ ہاری۔ اُس نے اپنے عالی ہمت بلند حوصلہ ہونے کا ثبوت اپنی شاعری کی حدود میں بعض ہندوؤں کے معنوتوں کو داخل

کر کے ہی نہیں دیا بلکہ عربی عروض کے میدان سے نکال کر ہندی کے عروض کی وادیوں میں جا پہونچا۔ ہندوؤں کے متعقدات نظم کرنے چلا تو اکثر ہندی کے عروض سے کام لیا۔

چونکہ اکثر ہندی کی بحریں اُردو کی بحروں سے ملتی جلتی ہیں، مثلاً ہندی کی بحر ودھاتا (विधाता) اُردو کی بحر ہزج مثمن سالم سے ملتی جلتی ہے ع "نہ چھوڑا ساتھ لچھمن نے برادر ہو تو ایسا ہو۔" اس لئے خیال ہو سکتا ہے کہ یہ رائے غلط ہے، مگر "مہادیو کا بیاہ" کی ساری تمہید اور ہر قطعہ کے بعد نظیر نے ایک ایک دوہا بھی لکھا ہے جس کا عروض بے شک وشبہ ہندی ہے، پھر وہ بے تکلفی اور قدرت کے ساتھ ہندی کے لفظ لکھتا ہے، دیکھئے "درگا جی کے درشن" میں ہندی کے لفظ کس خوبی سے استعمال کئے ہیں:۔

جو نیمی ہیں وا مورت کے وہ اُن کی بات سُدھارن ہے　　سُکھ چین جو واسے مانگت ہیں وہ اُن کی چنتا ہارن ہے
ہر گیانی وا کی سُرتن ہے ہر دھیانی سادھ ادھارن ہے　　جو سیوک ہیں وا مورت کے وہ اُن کی کاج سنوارن ہے

پرسند بہت مَن ہوتے ہیں یہ ریت رچی ہے ہر شن کی
تعریف کہوں میں کیا کیا کچھ اب درگا جی کے درشن کی

زبان کی شیرینی قابل داد ہے، تصرف بھی کچھ کم مستحق داد نہیں، کیسے اچھے اچھے اسم فاعل ترکیبی (समास) بنائے ہیں، بات سُدھارن (बात सुधारिणी) چنتا ہارن (चिन्ता हारिणी)، کاج سنوارن (काज संवारिणी) اس سے یہ صریح نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ ہندی سے بخوبی واقف تھا اور اُس کے کلام میں ہندی کے عروض کا داخل ہونا بعید از قیاس نہیں۔

ہندی کا عروض اکثر اُن مسدسوں میں برتا ہے جن میں خیالات کی ریل پیل ہے، اور جوش کا دریا بہہ رہا ہے، اِن نظموں کا عروض ہندی ہے:۔

مت سویّا
मत्त सवैया

ہے ریت جنم کی یوں ہوتی جس گھر میں بالا ہوتا ہے۔ (جنم کنہیا جی)
تعریف کروں میں کیا کیا اُس مُرلی دھر بجیا کی۔ (لہو و لعب کنہیا جی)
میں کیا کیا وصف کہوں یارو اُس شام برن اوتاری کی۔ (ہر کی تعریف)

جہاں میں جس وقت کشن جی کی اوستا سُدھ بُدھ کی یاد آئی۔ (شادی کنہیا جی) یشودا यशोदा
دنیا کے شہروں میں میاں جس جس جگہ بازار ہیں۔ (بیان سکشن نرسی اوتار) ہر گیتکا हरि गीतिका
دیکھا ہے جب سے میں نے تیرا جمال بھیروں (تعریف بھیروں کی) دگپال दिगपाल

یہ کہا جا سکتا ہے کہ محض ہندی اور اُردو کی بحروں کی مشابہت سے یہ استدلال کرنا کہ نظیر نے ہندی کا عروض مدنظر رکھ کر کہی ہیں، صحیح نہیں۔ یہ درست ہے، لیکن اس کے اور ثبوت بھی ہیں۔ جس طرح بحر مستزاد کو

مثمن سالم ہشت رکنی شانزدہ رکنی بھی آتی ہے. اسی طرح مَتّ سَوَیّا (मत सवैया) کا ماخذ پَدپادا کُلَکْ (पदपादा कुलक) ہے. پدپادا کُلک کے دو مصرع ملا کر مَتّ سَوَیّا کا ایک مصرع بنتا ہے مگر پدپادا کُلک کی شرطیں برقرار رہتی ہیں. اس کے ہر مصرع میں سولہ ماترائیں بقیود ذیل آنی چاہیئں، خواہ وہ حروف مفرد (ایک حرف مفرد کی علامت ۔ا۔) سے حاصل ہوں. خواہ مرکب اور مفرد حروف کے مجموعہ سے (ایک حرف مرکب کی علامت ۔۶۔)

(۱) پہلا جزو دو ماتراؤں (۱۱ یا ۶) کا ہو، خواہ وہ دو مفرد حرفوں یا ایک مرکب حرف سے پیدا ہوئی ہوں.
(۲) اگر پہلے جزو کے بعد ایک تین ماتراؤں (۱۱۱ یا ۱۶ یا ۶۱) کا جزو آجائے تو پھر فوراً ہی ویسا ہی ایک اور جزو لانا پڑتا ہے یعنی اُس صورت میں اُس کے آدھے مصرعہ کی ترتیب یوں ہوتی ہے (۲+۳+۳)

بحر متدارک مخبون کا وزن یہ ہے فَعِلُن چار بار. اور بحر متدارک مقطوع کا وزن فِعْلُن چار بار. بحر متدارک مخبون و مقطوع کا وزن فاعلن فعل دو بار ہے. یعنی مخبون اور مقطوع کو ملانے سے فِعْلن فَعِلُن وغیرہ نہیں پیدا ہوتے. عربی عروض کے مطابق کنھیا جی کے جنم کے پہلے شعر کی تقطیع یہ ہوتی ہے.

ہے ریت | جنم | کی یوں | ہوتی | جس گھر | میں با | لا ہو | تا ہے
فِعْلُن | فَعِلُن | فِعْلُن | فِعْلُن | فِعْلُن | فِعْلُن | فِعْلُن | فِعْلُن

اُس منڈل میں | ہر من | بھیتر | سکھ چین دو با | لا ہو | تا ہے
فِعْلُن | فِعْلُن | فِعْلُن | فِعْلُن | فَعِلُن | فِعْلُن | فِعْلُن | فِعْلُن

اور ہندی کے عروض کے مطابق یہ:-

है रीति जनम की यों होती, जिस घर में बाला होता है ।
उस मण्डल में हर मन भीतर, सुख चैन दुबाला होता है ॥

اور مثالیں بھی پیش کی جاتی ہیں:-

اک روز جو اپنے بھج بل پر وہ کنس بہت مغرور ہوا — اور ہنس کر بولا دنیا میں ہے دوجا کون بلی مجھ سا (کنھیا جی کا جنم)
گڑھ کوٹ بڑے گر پربت سے اور فوج سپہ کا دنگل تھا — گج ہستی اونچے جھول زری انباری ہودے کنجل تھا (مہادیو جی کا بیاہ)

इक रोज़ जु अपने भुज बल पर, वह कंस बहुत मग़रूर हुवा ।
और हंस कर बोला दुन्या में, है दूजा कौन बली मुझ सा ॥
गढ़ कोट बड़े गिरि पर्बत से, और फ़ौज सिपह का दंगल था ।
गज हस्ती ऊंचे झूल ज़री अम्बारी हौदे कुञ्जल था ॥

عروض عربی کی شرطیں پوری نہیں ہوتیں اور ہندی کے عروض کی ہوتی ہیں۔ اور شاعر نے اِن ہندی کی ہے جیسا کہ تقطیع ظاہر کرتی ہے۔ اگر عربی عروض کی رو سے بحر متدارک مقطوع (فعْلن) بحر متدارک مخبون (فعِلن) لانا جائز بھی ہو تو بھی ان تطعوں کا ہندی کے عروض پر ہر طرح پورا اُترنا نظر کا ہندی میں دستگاہ کامل رکھنا اس خیال کی زیادہ تائید کرتا ہے کہ اس عندلیب چمنستان سخن ہندی کے عروض سے اکثر کام لیا ہے۔ "مہا دیوجی کا بیاہ" میں اس نے ابتدا ہی ہندی کے عروض کی ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اس نے اسے قصہ کے حصوں میں ترک کر دیا ہو۔

غزل

(حضرت آرزو لکھنوی)

وار آپ کے غصے کی ادا کیا ہوگی
ہر جفا میں ہے وہ لذّت کہ وفا کیا ہوگی

ہ ہے دل سی امانت، جو عذابِ جاں ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا یہ بلا کیا ہوگی

م دل چھیڑنے والے کو یہ معلوم نہیں
لطف بڑھ جائے گا تکلیف بھلا کیا ہوگی

ی اپنے لئے تجویز سزا بھی کر دوں
تم اگر بھولے بتا دو کہ خطا کیا ہوگی

نا اندازۂ تابِ نظر لے جلوۂ حسن
ہو کوئی چیز ضرورت سے سوا کیا ہوگی

ی بے سودِ ہوس لائقِ الزام نہیں
جرم خود ایک سزا ہے تو سزا کیا ہوگی

ڑنے میں وہ لذت کہ خدا لاکھ سکوں
بن گیا درد ہی سب کچھ تو دوا کیا ہوگی

ی ناکامِ تمنا میں تمنا کیسی
اور اگر ہوگی تو مرنے کے سوا کیا ہوگی

کے کچھ ہو گئے وہ اور یہی کہتے رہے ہم
اُن سے بد عہدیِ پیمانِ وفا کیا ہوگی

آرزو عشق گنہ ہے تو غمِ ہجر عذاب
اِک سزا یافتہ کو اور سزا کیا ہوگی

ڈوبتی ہوئی ناؤ کا مُسافر

(مسٹر افتخار احمد نجمی صدیقی، ایم۔ اے)

گھنگھور گھٹائیں چھانے لگیں، مستانہ ہوائیں آنے لگیں،
کشتی بھی چلی بل کھاتی ہوئی، موجیں بھی کمر لچکانے لگیں،

ملّاح نے گانے چھیڑ دیئے، دریا نے ترانے چھیڑ دیئے
کچھ دُھندلے زمانے یاد آئے، دل نے وہ فسانے چھیڑ دیئے

باغوں کے گھنے کنجوں میں کہیں، بیٹھی ہوئی کوئل گانے لگی
کانوں میں کسی بھولے بسرے نغمے کی صدا پھر آنے لگی

منجدھار میں پہونچی جب کشتی، مستی کا ختم یہ دَور ہوا
کچھ رنگ گھٹا کا اور ہوا، کچھ ڈھنگ ہَوا کا اور ہوا

لہروں کے چڑھتے ہیں تیور، سر پر یہ گرجتا بادل ہے
تکتی ہیں بھنور کی آنکھیں بھی، دریا کے ماتھے پر بل ہے

بپھری ہوئی دیوانی موجیں، کشتی سے سر ٹکراتی ہیں،
اُمڈے ہوئے دریا کی فوجیں، لڑنے کو چڑھتی آتی ہیں،

جھکڑ ہیں تُند ہواؤں کے، پانی کا تیز دڑیڑا ہے
ہچکولے ایسے ہیں گویا، اب پار ہمارا بیڑا ہے

ڈگمگ ڈگمگ جب ناؤ ہوئی، جو بیٹھے تھے سب ملنے لگے
آکاش پہ نظریں اُٹھنے لگیں، دل کانپ گئے، لب ملنے لگے

اُف، جانے کیا کیا دھیان آئے، آ آ کر دل کو روند گئے!
سو رنگ کے جلوے آنکھوں میں بجلی کی طرح سے کوند گئے!!

سو روپ میں دُنیا آتی ہے، سندر چھب یوں جھلکاتی ہے
یوں ہنس ہنس کر للچاتی ہے، اب گویا چھوٹی جاتی ہے

یہ عالم ہے جیسے کوئی پردیس مسافر جاتا ہو،
چلتے چلتے گھر کی جانب مُڑ مُڑ کے نظر دوڑاتا ہو،
وہ گاؤں وہ گھر منڈلانے لگے، وہ نیم کے سائے چھانے لگے
وہ یار آئے، اغیار آئے، اِک اِک کرکے سب آنے لگے
باغوں کی بہاریں آئی ہیں، کھیتوں کے نظارے آئے ہیں،
مجھ سے رخصت ہونے کیلئے گھر والے سارے آئے ہیں،
ہر آنکھ سے اشک چھلکتا ہے، نظروں سے موہ ٹپکتا ہے
حسرت سے گھر منھ تکتا ہے، دیوار و در کو سکتا ہے
بچے قدموں سے آ لپٹے، بھائی نے بازو تھام لیا،
امّاں نے گودی پھیلا دی، ابّا نے روکر نام لیا،
بہنوں نے سر پہ ڈال دیا، کس پیار سے آنچل کا سایہ
پھر بھی بڑھتا ہی جاتا ہے، اُف کالے بادل کا سایہ
اے باغو، گلزارو رخصت! گھر کے در و دیوارو رخصت!
اے محبوبو، یارو رخصت! پیارے رشتہ دارو رخصت!
جاتا ہے اُسے جو آیا ہے، کیا اپنا اور پرایا ہے
دنیا کی جھوٹی مایا ہے، سب چلتا پھرتا سایہ ہے
کچھ بھی نہ نشاں میں چھوڑ چلا، پر بھول نہ جانا یاد رہے!
وہ مرتے نہیں جن کی اُلفت اِک دل میں بھی آباد رہے!!
ملّاح کے چھکے چھوٹ گئے، ہاتھوں سے چپّو چھوڑ دیا،
موجوں کے تھپیڑوں نے آخر امیدوں کا منھ موڑ دیا!
جی دھک سے ہُوا، سر چکرایا، کشتی کچھ ایسی جھوم گئی،
آنکھوں میں اندھیرا سا چھایا، دُنیا کی دُنیا گھوم گئی،
عالم سمٹا سا جاتا ہے، تارے ڈوبے جاتے ہیں،
کشتی کیا غوطے کھانے لگی، یہ سارے ڈوبے جاتے ہیں،
نظروں سے اوجھل ہے دنیا، آنکھوں میں جلوہ کوئی نہیں

سارا جگ جیسے سُونا ہے، اِک مَیں ہوں اکیلا، کوئی نہیں،
مایوسی میں کچھ بن نہ پڑا، آنکھیں موندیں، سر تھام لیا،
بندھ بندھ کر ٹوٹ گئی آشا، جی جی کے مَرا، مَر مَر کے جیا،

وہ موت بھیانک مَوت جھپٹتی ہے سر پر منڈلاتی ہے،
وہ دانت نکالے پنجوں کو سینے میں چبھوئے جاتی ہے،
اے جگ کے ناؤ کھِوَیّا آ، اب پار لگا تو ہی تو ہی،
اَنْتَ اَنْتَ رَبّی رَبّی۔ مولا، مولا، تو ہی تو ہی۔

نِکلی تھی اِدھر ہونٹوں سے دعا، بکھرا بادل، نکھری دنیا،
طوفان گھٹا، دریا ٹھہرا، بوندوں کا تانتا ٹوٹ گیا،
بادل جو چھنٹے، پانی جو تھما، پھر ٹھنڈی ہوائیں آنے لگیں،
کشتی بھی چلی، بَل کھاتی ہوئی، مَوجیں بھی کمر لچکانے لگیں،

مَلّاح نے گانے چھیڑ دیئے، دریا نے ترانے چھیڑ دیئے
پھر دُھندلے زمانے یاد آئے، دل نے وہ فسانے چھیڑ دیئے
باغوں کے گھنیرے کنجوں میں دبکی ہوئی کوئل گانے لگی،
کانوں میں کسی بھولے بسرے نغمے کی صدا پھر آنے لگی،

جب ناؤ کنارے آ پہونچی، ہستی کا ختم یہ دَور ہوا
ہستی کا سفر ایسا ہی ہے، دریا کا سفر جس طور ہوا

پاکستان

(جناب منشی تلوک چند محروم)

تقسیمِ وطن کا مُدّعی ناداں ہے
تجویز بُری ہے، باعثِ نقصاں ہے
لازم ہے مادرِ وطن کی حُرمت
ہم پاک بنیں تو ہند پاکستاں ہے

ہو خطہ جو کوئی محشرستانِ جنوں
ارزاں جس میں ہو بے گناہوں کا خوں
وہ پاک نہ کہلائے گا اے اہلِ وطن
پاکستاں لاکھ بار میں اُس کو کہوں

کیا صنفِ غزل میں ادبی امکانات باقی نہیں؟

(از پنڈت آنند نراین مُلّا، لکھنؤ[1])

ادب کو زندگی کا عکس کہا جاتا ہے اور زندگی کی مثال ایک دریا سے دی جاتی ہے جو برابر بہتا چلا آرہا ہے۔ جس طرح کہ دریا کے بہاؤ پر زمین کے نشیب و فراز و فراخی، اور باد و باری کا اثر پڑتا ہے اُسی طرح انسانی زندگی کی رفتار بھی معاشرت اور تمدن سے برابر اثر پذیر ہوتی رہتی ہے۔ دریا کی رفتار چاہے ہلکی ہو یا تیز لیکن اس کا بہاؤ روکا نہیں جا سکتا۔ اور وہ برابر آگے کی طرف بڑھتا ہی چلا جاتا ہے، اسی طرح ہماری زندگی بھی نئے خیالات اور نئے رُجحانات کے ماتحت برابر تبدیل ہوتی جاتی ہے اور انسانی فطرت کا یہ تقاضا کسی طرح رد نہیں کیا جا سکتا۔ اگر سطحِ زمین ہموار ہے تو یہ بہاؤ نظر بھی نہیں آتا اور نہ یہ تبدیلیاں محسوس ہوتی ہیں۔ لیکن اگر بہاؤ میں کچھ رکاوٹیں پیدا ہو جاتی ہیں یا ڈالی جاتی ہیں تو دریا کا پانی یا تو کوئی اور راستہ نکال لیتا ہے یا وہ جمع ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس رکاوٹ کی سطح سے بلند ہو جاتا ہے، اور پھر وہ ایک طوفانی اور سیلابی انداز کے ساتھ اس رکاوٹ کو فاتحانہ طور پر پامال کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے، اور اس جوش و خروش، تندی و تیزی کے ساتھ بڑھتا ہے کہ وہ اکبارگی اپنے پُرانے غیر متحرک زمانہ کا پُورا پُورا انتقام لے لیتا ہے۔ ایسے وقت میں نہ کوئی کنارے باقی رہتے ہیں اور نہ کوئی حدود۔ انسانی زندگی میں بھی ایسا وقت کبھی کبھی آتا ہے، اس کو انقلاب کہتے ہیں، آج دنیا ایسے ہی ایک انقلابی دَور سے گذر رہی ہے۔

آج زندگی کے ہر صیغہ میں ایک انقلابی ذہنیت کارفرما نظر آرہی ہے، انقلابی ذہنیت کا تقاضا ہے کہ وہ پُرانے مسلّمات اور مفروضات کو بالکل ٹھکرا دے اور لوگوں کے عقیدوں کو تبدیل کر دے، چنانچہ دنیائے ادب میں بھی پُرانے بُت توڑے اور نئے بُت تراشے جا رہے ہیں۔ جن بتوں کے بارے میں حریمِ ادب سے نکال دینے کا فتویٰ جاری ہوا ہے ان میں سے ایک بدقسمت غزل بھی ہے۔ کیا ایوانِ ادب میں واقعی غزل کی گنجائش نہیں؟ کیا یہ واقعی مٹ جانے والی چیز ہے اور اس میں وہ دیرپا عناصر نہیں جو موجودہ دور میں اسے زندگی بخش سکیں۔ اس مضمون میں انھیں سوالات پر اپنی رائے کا اظہار کرونگا۔

یوں تو غیر ذمہ دارانہ طور پر آجکل ہر شخص غزل کے خلاف کچھ نہ کچھ کہتا ہے لیکن مجموعی طور پر یہ تمام اعتراضات تین عنوانات کے ماتحت تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ پہلا اعتراض غزل پر یہ ہے کہ یہ ایک نیم وحشی صنفِ ادب ہے، جو اس دورِ بربریت کی یادگار ہے جبکہ انسان ارتقار کی ابتدائی منزلیں طے کر رہا تھا، اور جس میں مہذب انسانی ذہن کے غور و فکر

[1] یہ مضمون آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن لکھنؤ سے براڈکاسٹ ہو چکا ہے، اور ڈائرکٹر صاحب کی عنایت [illegible]

کی تکمیل ممکن ہی نہیں۔ فنی اعتبار سے بھی اس کی صورت ناقص ہے کیونکہ غزل چند اشعار مفرد کے مجموعہ کا نام ہے جن میں آپس میں کوئی ربط نہیں ہوتا بلکہ جو کبھی کبھی بالکل متضاد ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ شعر مفرد کے چھوٹے سے پیمانے میں کسی پیچیدہ خیالی یا تخیلی تجربہ کے سمانے کی گنجائش نہیں۔ زیادہ سے زیادہ کسی جزوی مشاہدہ کی ترجمانی ممکن ہے۔ لیکن یہ مشاہدہ کب ہوا؟ کیسے ہوا؟ کیوں ہوا؟ اور اس مشاہدہ کا جذبات وخیالات سے تعلق کیا تھا؟ یہ سب باتیں ایک شعر مفرد میں بیان نہیں کی جاسکتیں۔ اس واسطے یہ ایک ناقص اور نامکمل سی چیز رہ جاتی ہے جس سے ترقی یافتہ ذہن کی آسودگی ممکن نہیں۔ جب ہم اس اعتراض پر غور کرتے ہیں تو ہمیں اس میں کوئی وزن معلوم نہیں ہوتا کیونکہ اس کی بنیاد ایسے مفروضات پر ہے جن میں سے کوئی بھی انسانی فطرت اور تجربہ کے اعتبار سے صحیح نہیں۔ پہلی بات جو فرض کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ موجودہ دور گذشتہ زمانہ کے مقابلہ میں زیادہ مہذب ہے۔ زیادہ مہذب تو وہی انسان کہا جاسکتا ہے جس کے دل میں نوع انسان سے زیادہ محبت اور ہمدردی ہو، اور جو انسانیت کے نصب العین سے قریب تر ہو۔ کیا موجودہ دور کے انسانوں کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان میں پچھلی صدی کے انسانوں کے مقابلہ میں اخوت، محبت اور رحمیت کچھ زیادہ ہے، اور کیا موجودہ جنگ عظیم اس کی دلیل ہے۔ ہمارے موجودہ مادی تمدن کا اصل نقص یہی ہے کہ اس نے عقل کے ساتھ ساتھ دل کی نشو ونما میں بھی کوتاہی کی ہے اور ہمارے احساسات اور جذبات کی ترتیب کا کوئی خیال نہیں کیا ہے۔ اس نے علم حاصل کیا لیکن بہتر انسان بنانے کی کوشش نہیں کی۔ ایسی صورت میں جبکہ ابھی ہم خود اسی منزل ارتقا میں ہیں بلکہ چند اعتبار سے کچھ پیچھے ہی ہٹ گئے ہیں تو ہمارا گذشتہ زمانہ والوں کو غیر مہذب یا نیم وحشی قرار دینا کسی قدر مضحکہ انگیز معلوم ہوتا ہے۔

دوسرا غلط کلیہ جو اعتراض میں پیش کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ کسی جذبہ کے شدید احساس کو خلوص اور صداقت کے ساتھ بیان کرنا شعر کو کامیاب بنانے کے لئے کافی نہیں۔ جب تک کہ اس کی غرض وغایت اور اس کے تجربہ کا پس منظر بھی شعر میں شامل نہ کیا جائے۔ معترضین غالباً اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ غزل کی دنیا اُن لوگوں کے لئے ہے جن کی ذہنیت بالغ ہو چکی ہے اور شاعر کا کام کم عمر بچوں کو ابتدائی سبق پڑھانا نہیں ہے۔ بلکہ اس کو ایسے لطیف نازک اور مختصر اشاروں سے کام لینا ہے جن کو سمجھنے کی قابلیت سامعین کے شعور میں موجود ہے۔ وہ جان بوجھکر جزئیات اور تفصیلات کو ترک کرتا ہے اور پھر بھی پڑھنے والوں کا ذہن ان تمام محذوفات کو تلاش کر لیتا ہے جن کی عدم صراحت شعر کو اور زیادہ مؤثر بنا دیتی ہے۔ ایسی صورت میں شعر مفرد کی تنگ دامانی کی شکایت کچھ غلط سی ہو جاتی ہے اور یہ حقیقت سے بعید بھی ہے کیونکہ اس میں

کوئی شک نہیں کہ ہمارے ادب کا بہترین ذخیرہ اشعار مفرد ہی میں ہے۔ دراصل شعر مفرد ہی ہمارا وہ شاہکار ہے جس کی نظیر مغربی ادب میں نہیں۔

تیسری غلط بات جس پر یہ اعتراض منتہی ہے وہ یہ ہے کہ بے ربط اور متضاد اشعار پڑھکر انسان کے دماغ میں پراگندگی پیدا ہوتی ہے اور اس کا ذوق تشنہ رہ جاتا ہے۔ یہ تو صحیح ہے کہ غزل کے اشعار اکثر بے ربط ہوتے ہیں اور کبھی متضاد بھی ہوتے ہیں، لیکن چونکہ وہ بجائے خود ایک مکمل نظم ہوتے ہیں لہذا ایک ترقی یافتہ ذہن ان میں کوئی ربط تلاش ہی نہیں کرتا، ہر شعر الگ الگ سامع کے ذوق کی تشنگی پورے طور پر بجھاتا چلا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر ہماری آنکھ ایک وقت میں مختلف مناظر دیکھکر محظوظ ہو سکتی ہے، اگر ہمارے کان ایک سلسلہ میں مختلف اور بے ربط نغموں سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں، اگر ہماری زبان یکے بعد دیگرے مختلف ذائقہ کے کھانوں سے لذت حاصل کر سکتی ہے، اگر ہماری زندگی خود مختلف اور متضاد خواہشات اور احساسات کا نام ہے، تو ہمارے دل و دماغ مختلف بے ربط اشعار سے جن میں باوجود بے ربطی کے ایک ہم آہنگی ہے کیوں پورے طور پر مسرور نہیں ہو سکتے؟ لہذا میری رائے میں جو لوگ غزل پر فنّی طور سے ناقص اور ایک نیم وحشی صنفِ ادب ہونے کا الزام لگاتے ہیں اُن کا یہ اعتراض حقیقت اور انصاف سے بعید ہے۔

چوتھا اعتراض غزل پر یہ کیا جاتا ہے کہ چونکہ زیادہ تر جذبات انسانی خصوصاً عشق و محبت ہی اس کا موضوع ہیں اور آج تک ہر شاعر برابر اسی کوچہ کی خاک چھانتا رہا ہے لہذا اب کسی شاعر کو یہاں کوئی نئی چیز ملنا ایک امر محال ہے۔ زمین غزل بنجر ہو چکی ہے اور اب اس میں کوئی نئی فصل پیدا کرنے کی صلاحیت باقی نہیں، گویا غزل ایک پھل ہے جس کا سارا رس نچوڑا جا چکا ہے اور اس میں اب صرف پھوک ہی پھوک رہ گیا ہے۔ یہ اعتراض بھی بالکل بے وقعت معلوم ہوتا ہے۔ انسانی جذبات کی گوناگوں نیرنگیوں کی لامحدود دنیا کو ایک ایسی چھوٹی سی چیز سے مشابہ کرنا جس کے تخلیقی امکانات محدود ہیں اعتراض کرنے والوں کی انسانی زندگی اور نفسیات سے حیرت انگیز ناواقفیت ظاہر کرتا ہے۔ نااہل غوطہ خور کی وجہ سے جو زیادہ تر صدف کے بجائے گھونگے کرا اُبھرتے ہیں یہ اعتراض کر دینا کہاں تک بجا ہے کہ سمندر کے موتی ختم ہو گئے۔ یہ صحیح ہے کہ ہر دور کے حقائق مختلف ہوتے ہیں لیکن انسانی فطرت کے بنیادی تقاضے نہ آج تک تبدیل ہوئے ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں۔ کیا ہمارے علم کی ترقی نے ہمارے دلوں کو دراصل اتنا مردہ اور ہمارے احساسات کو واقعی اتنا کند بنا دیا ہے کہ ہم میں اب عشق و محبت کی صلاحیت باقی نہیں؟ اور اگر یہ صلاحیت موجود ہے تو کیا اس بدلتی ہوئی دنیا میں ہمارے انفرادی تجربات میں کوئی نئی یا انوکھی بات پیدا نہیں ہوئی جس نے

ہمارے دل و دماغ میں ایک تلاطم خیزی کی ہو، جسے ہم نے حسین ترین الفاظ میں انتہائی خلوص کے ساتھ پیش کیا ہو؟ ایسا ضرور ہوا ہے اور ایسا ہمیشہ ہوتا رہیگا، اور اگر غزل ہمارے جذبات محبت کو پیش کرنے میں پہلے کامیاب ثابت ہوئی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ آج کامیاب ثابت نہ ہو۔

پانچواں اعتراض غزل پر یہ ہے کہ اس کا کوئی افادی پہلو نہیں، یہ محض سُریلے خواب اور نغمے سُناتی ہے ہمیں زندگی کی حقیقتوں سے دُور ایک مصنوعی دنیا میں لے جاتی ہے اور محض وقتی سکون بخشنے کے علاوہ ہمارے جذبات یا خیالات پر کوئی دیرپا اثر نہیں ڈالتی۔ اس کے علاوہ اس میں ہمارے دل و دماغ کے موجودہ ہیجان کی ترجمانی کی صلاحیت نہیں ہے۔ عشق و محبت کے علاوہ زندگی کی اور بھی اہم حقیقتیں ہیں لیکن سازِ غزل میں صرف یہی ایک تار لرزاں ہے اور باقی سب آوازیں خاموش ہیں۔ ہمارے انفرادی تجربات چاہے کتنے بھی نئے کیوں نہ ہوں اُن احساسات اور رجحانات کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں رکھتے جو مجموعی طور پر دنیا کا نظریہ تبدیل کر رہے ہیں اور ہماری زندگی کو ایک نئے سانچے میں ڈھال رہے ہیں۔ یہ بے وقت کی چیز ہے اور اسے ہماری موجودہ زندگی سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔ ایک حساس، غیرت مند اور خوددار دل یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ جس وقت جنگ چھڑی ہو وہ باغ میں بیٹھکر بانسری بجائے۔ ان خیالات کا اظہار اکثر شعرا نے خود بھی کیا ہے، مجازؔ کہتا ہے:۔

یہ جاکر کوئی بزمِ خوباں میں کہہ دو کہ اب درخورِ بزمِ خوباں نہیں میں
دھڑکتا ہے دل اب بھی راتوں کو لیکن وہ نوحہ گرِ دردِ ہجراں نہیں میں
قسم ہے مرے نطقِ شعلہ فشاں کی کہ شاعر تو ہوں اب غزلخواں نہیں میں

یا جاں نثار اخترؔ کہتا ہے:۔

یہ وقت نہیں ہے عاشقی کا۔ یہ دوَر نہیں ہے میکشی کا اُٹھا ہے سوال زندگی کا
شاعر ہمیں راستہ دکھائے

اس اعتراض کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ میرے نزدیک یہ اعتراض بڑی حد تک صحیح ہے لیکن معترض جس نتیجہ پر پہونچے ہیں وہ درست نہیں بلکہ محض اُن کی طبیعت کا رجحان ہے۔ میں اسے تسلیم کرتا ہوں کہ "قصۂ یوسف میں ایک بابِ زلیخا ہی نہیں"

لیکن میرے نزدیک یہ ایک ایسا باب ہے جو انسانی تاریخ کے کسی دور سے چاہے وہ کتنا ہی ہیجانی کیوں نہ ہو نہ کبھی نکالا جا سکا ہے اور نہ کبھی نکالا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس کی بنیادیں انسانی فطرت میں گڑی ہوئی ہیں کیا زندگی کی تلخ حقیقتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم زندگی کے لطیف خواب نہیں، لطیف

سے مجبور ہو کر نہیں بلکہ مصلحتِ وقت سمجھ کر آنکھیں پھیر لیں ؟ کیا جہدِ ہستی میں ہمارے ارادے اس قدر ناپائدار ہیں کہ اگر ہم نے کچھ لمحات کے لئے دنیا کی تلخیوں کو بھولنا چاہا تو ہمارا عزم ہمیشہ کے لئے کمزور ہو جائے گا ؟ زندگی کی سطح یونہی کیا کم سنگلاخ ہے اس لئے اگر اس کوہستانی سفر میں ہمیں سایہ مل جائے تو وہاں کچھ دیر بیٹھکر تازہ دم ہو لینے میں کیا حرج ہے ؟ کیا شاعر کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ دنیا کے دکھ درد کا دل پر اثر لینے کے باوجود ایک محبوب سے محبت کر سکے ؟ میں اس مصنوعی عشق کا ذکر نہیں کر رہا ہوں جس کی داستانیں ہمارے اکثر مشتاق غزل گو شاعر منہ پوپلا ہو جانے کے بعد بھی سُناتے ہیں (اس میں صنفِ غزل کا کوئی قصور نہیں) بلکہ میں اُن اشعار کا ذکر کر رہا ہوں جو ہمارے سچے غزل گو شعرا کے دلوں کے سوتے سے آب آبشار کی طرح پھوٹتے ہیں اور جن کو دل کی چیخ اور روح کا نغمہ کہا جا سکتا ہے، کیا ایک آبشار کو صرف اس لئے غیر افادی کہا جا سکتا ہے کہ اُس سے پیاسوں کی پیاس نہیں بجھتی ۔ کیا اُس کا نظارہ اور نغمہ انسانی روح کے لئے پیامِ مسرت نہیں ؟ میرے نزدیک افادیت کی یہ تعریف ضرورت سے زیادہ مادّی اور محدود ہے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ غزل کو اس بنا پر گردن زدنی قرار دینا انصاف سے بعید ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ غزل ہمارے موجودہ ادبی تقاضے پُورے نہیں کرتی ۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ہماری زندگی کی ترجمانی میں نظم کے مقابلہ میں اس کی کوئی حقیقت نہیں، لیکن آج بھی انسانی دل کا جائزہ لینے میں کوئی صنفِ سخن اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی یہ شاعر کے رجحان کی بات ہے ۔ اگر کارزارِ ہستی میں آپ حصہ لینا چاہتے ہیں تو آپ نظم کی تلوار اُٹھائیے، لیکن اگر آپ انسانی دل کی عمیق گہرائیوں تک پہونچنا چاہتے ہیں تو آپ کو شعرِ مفرد کے نشتر سے کام لینا ہی ہوگا ۔ میرے نزدیک دونوں اپنی اپنی جگہ پر ضروری ہیں اور ان میں سے کوئی دوسرے کی جگہ استعمال نہیں کیا جا سکتا ۔

کلامِ حسرت

عاشق وہی کامل ہے جو سوائے جہاں ہو — شاہد وہی احسن ہے جو بے نام و نشاں ہو
مقصود ہے پابندیِ آئینِ محبت — زنہار اگر ہم کو سر سود و زیاں ہو
ایذا طلبِ عشق ہیں بیتاب کہ دیکھیں — کب طفل سے وہ شوخِ جفاکار جواں ہو
بیمارِ غم آئے ہیں، شفا پائیں تو جائیں — کیا ورنہ ہمیں، تم جو مسیحائے جہاں ہو
عارف ہے جو نظارۂ حق دل کو ہو منظور — کافر ہے اگر شیفتۂ حسنِ بتاں ہو
تم دشمنِ عشاق بہرحال ہو، یعنی — آشوبِ نظر، فتنۂ دل، آفتِ جاں ہو

ہم کو تو بھی ملنا ہے وہیں خاک میں حسرت
معلوم نہیں منزلِ جانانہ کہاں ہو

گلِ نوخیز

(از حضرت جوہر بدایونی)

اے گلِ تر، اے سرورِ قلب روحِ بوستاں		اے شمیمِ مشک بُو، اے گوہرِ عنبر فشار
تیری رگ رگ میں ہیں حسن و عشق کے جلوے نہاں		حسن ہے تیرا نزاکت پہ تری بارِ گراں
تو مجسّم حسرتوں کی روئے پُر تنویر ہے
یا گدازِ دل کی جیتی جاگتی تصویر ہے

پہلے گلشن میں رہا کچھ پارسا تیرا شباب		پھر نسیمِ صبح نے کھینچا ترا کچھ کچھ نقاب
مہرِ تاباں نے تجھے دیکھا جو چشمِ نیم خواب		کر دیا آخر تجھے گلشن میں آشنا بے حجاب
اے کہ تو ناجنس سے حسرت طلب ہونے لگا
بلبلِ شوریدہ سر سے لب بہ لب ہونے لگا

آتے آتے چھڑ گئی گلشن میں دل کی داستاں		مطربانِ خستہ جاں کرنے لگے آہ و فغاں
منہ کبھی چوما، کبھی کی حسن سے اٹھکیلیاں		لے کے دلِ بلبل کا تجھ میں آ گئیں وہ شوخیاں
تو نگاہِ شوقِ نظارہ میں گھر کرنے لگا
دیکھنے والا چمن میں تیرا دم بھرنے لگا

دیکھ کر بلبل کو آتے غنچۂ صد چاک تک		شاخ لے کر جھک گئی تجھ کو بساطِ خاک تک
وسعتِ تو عشق کی دیکھی جو جذبِ پاک تک		جوشِ بیتابی میں پھر آئی لبِ بیباک تک
آفریں ہے شاخِ نازک تیری ہمت کے لئے
خار پیدا کر لئے تو نے حفاظت کے لئے

چھو ہی پائی تھی ذرا تجھ سے ابھی موجِ نسیم		بھر دیا دامن میں تو نے دل فزا عطرِ شمیم
آہ اے جنت نشاں، اے رحمتِ ربِّ کریم		شہرت افزائے جہاں ہے تیرا یہ فیضِ عمیم
تیری نکہت سے سرِ گلشن ملا تیرا سراغ
تیرے گھر کو لے اڑا اے گل ترے گھر کا چراغ

حسن کیا وہ، کوئی جس کا چاہنے والا نہ ہو		لطفِ ذوقِ دید کیا جب تک کوئی پردا

کیف شانِ دلبری کیا، جب حجاب آتا نہ ہو ‏ ‏ ‏ کیا مزہ اُس عشق میں، جس میں کوئی کانٹا نہ ہو
لطفِ حسن و عشق ہے جب، سوز بھی ہو ساز بھی
درد بھی دل میں ہو اور تیرِ نگاہِ ناز بھی

دل چکا بلبل کو جب بیتابیِ دل کا جواب ‏ ‏ ‏ حسن نے انگڑائی لی ڈھلنے لگا عہدِ شباب
بھر گیا حسنِ مے گلگوں سے جب جامِ شراب ‏ ‏ ‏ دم زدن میں ہو گیا برہم نظامِ ظرف ناب
گو زمیں پر نقشِ فریادی ہے تو حیرت نُما
پھر بھی ہر کروٹ ہے جو ہر منظر عبرت نُما

واردات

(ایم۔ اے۔ ایچ۔ ساجد امیٹھوی)

کون یہ مجھکو دیکھکر ناز سے مسکرا دیا ‏ ‏ ‏ برق سی اک چمک گئی روح کو جگمگا دیا
اُن کی نگاہِ ناز کی، اُف رہی یہ سحر کاریاں ‏ ‏ ‏ درد جو دل میں تھا کبھی اُسکو بھی دل بنا دیا
آپ کے انتظار میں، حالتِ اضطراب نے ‏ ‏ ‏ میری اجل کا کھینچ کر نقشہ مجھے دکھا دیا
میری نگاہِ شوق کا جذب تھا بزمِ ناز میں ‏ ‏ ‏ وہ بھی نہ تاب لا سکے، پردۂ رُخ اُٹھا دیا
دردِ غمِ فراق کی ہائے رہی بے قراریاں ‏ ‏ ‏ آپ تڑپ تڑپ اُٹھا، اُن کو رُلا رُلا دیا
دل کی لگی کو کیا کریں عشق بہانہ ساز تھا ‏ ‏ ‏ ہم نہ اُسے بھلا سکے جس نے ہمیں بھلا دیا
کس کی نگاہِ مست نے ساجدِ تشنہ کام کو
ہوش و حواس چھین کر ساغرِ غم پلا دیا

حالی کی شاعری کا پسِ منظر

(از مولوی مبشر علی صدیقی ایم۔ اے (علیگ) بدایونی)

حالی کی شاعری کا عمیق مطالعہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اُن کی شاعرانہ ذہنیت کو سمجھا اور اس ماحول کو مدنظر رکھا جائے جس میں حالی نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گزارا۔ اُن کی شاعری قدیم اُردو شاعری کے خلاف ایک بغاوت تھی۔ حالی کی شاعری کا پس منظر یہ ہے کہ وہ "لکیر کے فقیر" شعرا کا کلام دیکھکر ایک درد و کرب محسوس کرتے ہیں، اور اُسے شعر و قصائد کا ایک ناپاک دفتر قرار دیتے ہیں۔ حالی سے پہلے بیشتر اُردو شعرا کاکل و رخسار، گل و بلبل، ہجر و وصال کے پراگندہ مضامین کو عام طور پر اپنے اشعار میں باندھتے تھے، اور اسی کو شاعری کی معراج تصور کرتے تھے۔ شعر و شاعری میں کسی نئے راستہ کے نکلنے کی مطلق اُمید نہ تھی ایسی نازک حالت میں پانی پت میں ایک ایسا شخص پیدا ہوا جو بیک وقت شاعر بھی تھا، نثار بھی مصلح بھی تھا اور محب وطن بھی، وہ شاعری کی ایک نئی راہ پر گامزن ہوا اور اپنے شاعرانہ کمال کی آب و تاب سے معاصرین کی نگاہوں کو خیرہ کر دیا۔ حالی کے زمانے میں اُردو شاعری کا عام رنگ خود اُنھی کی زبانی سُنیئے:۔

سخن جو ہے یاں آج حصہ ہمارا نہیں قوم کو ظاہرا جس سے چارا
ہر اک کذب و بہتاں ہے جس میں گوارا مجسم ہو اُس کا اگر جھوٹ سارا

بنے ہند میں اس سے اِک اور ہمالا
ہمالہ سے ہو جس کی چوٹی دوبالا

طوائف کو ازبر ہیں دیوان اُن کے گو یّوں پہ بے حد ہیں احسان اُن کے
نکلتے ہیں تکیوں میں ارمان اُن کے ثنا خواں ہیں ابلیس و شیطان اُن کے

کہ عقلوں پہ پردے دیئے ڈال انھوں نے
ہمیں کر دیا فارغ البال انھوں نے

اس زبوں حالی کو دیکھکر حالی بہت متاثر ہوئے۔ اس کے علاوہ ایک اور چیز تھی جو حالی کی شاعری پہ کافی اثرانداز ہوئی۔ یہ غالب و شیفتہ کی ادبی صحبتیں تھیں۔ حالی کی ہمہ گیر طبیعت پر ان بزرگوں کی

صحبت کا بہت اثر پڑا۔ غالب جو اور لوگوں کو فکرِ شعر کا بہت کم مشورہ دیتے تھے حالی سے کہتے ہیں کہ "اگر تم شعر نہ کہوگے تو اپنی طبیعت پر ظلم کروگے"۔ حالی ان صحبتوں کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں "مرزا کے مشورے اور اصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہ ہوا، بلکہ جو کچھ فائدہ ہوا وہ نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا۔ وہ مبالغے کو ناپسند کرتے تھے اور حقایق وواقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی اور سچی باتوں کو محض حسنِ بیان سے دلفریب بنانا، اسے منتہائے کلام وشاعری سمجھتے تھے بازاری الفاظ ومحاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ وغالب دونوں متنفر تھے"۔ چنانچہ حالی کا قدیم کلام بھی اُن عیوب سے پاک ہے جو اردو شاعری کی بدنامی کا باعث ہوئے۔ لیکن زمانۂ جاہلیت اور مابعد کے عرب شعرا سے بھی حالی نے اپنے ادبی مذاق کی کافی تربیت کی، اور یہ بات آسانی سے نظرانداز نہیں کی جاسکتی۔ مولوی عبدالحق صاحب اس سلسلہ میں بالکل بجا فرماتے ہیں کہ "اُن کی قدیم شاعری بلاشبہ غالب وشیفتہ کے فیضِ صحبت کا نتیجہ ہے لیکن بعد کی شاعری میں شعرائے عرب کا روحانی اثر پایا جاتا ہے۔ جو اُن اساتذہ کے کلام کے مطالعہ سے نامعلوم طور پر ارثاً مولانا کو پہونچا"۔

شاعر اور انشا پرداز اپنے ماحول اور زمانہ کی صحیح پیداوار ہوتا ہے، بعض صورتوں میں اُس کے خیالات اپنے خیالات اور اُس کے جذبات اپنے جذبات نہیں ہوتے۔ بلکہ وہ ماحول کے تاثرات کی ترجمانی کرتا ہے، اور اِن خیالات کو شعر کا جامہ پہناکر ایک پیغام کی صورت میں دنیا کے سامنے لاتا ہے۔ حالی ایک پیغام گو شاعر ہیں، حالی کا زمانہ سلطنت دہلی کی زوال پذیر حالت کا عبرتناک مرقع ہے جب بُرے دن آتے ہیں تو بنی ہوئی بھی بگڑ جاتی ہے۔ افلاس، بیکاری، فضول خرچی، کاہلی وسستی اس دور کی ممتاز خصوصیات ہوتی ہیں۔ ان تمام اثرات نے حالی کے یہاں ایک عجیب قنوطیت اختیار کرلی، اور اُنھیں ہر جگہ یاس وحسرت ہی نظر آنے لگی۔ اس پر طرۂ امتیازی ملاحظہ ہو۔ ۱۸۵۷ء کا غدر گویا ہندوستان کے لئے ایک قہر خداوندی تھا، سیکڑوں گھرانے تباہ ہوگئے، ہزاروں آدمی خانماں برباد ہوگئے، دہلی اُجڑ گئی، قدیم چیزوں کا خاتمہ ہوگیا، حالی بھی خون کے آنسو بہاکر اس حرماں نصیبی پر ماتم کرتے ہیں۔

تذکرہ دہلیِ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ نہ سُنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

حالی کی اِس قنوطیت نے ایسی خطرناک شکل اختیار کرلی کہ وہ اپنے مسدس کا خاتمہ نہایت حسرت ویاس کے ساتھ کرتے ہیں۔

یہاں ہر ترقی کی غایت یہی ہے سرانجام ہر قوم وملت یہی ہے
سدا سے زمانے کی حالت یہی ہے طلسمِ جہاں کی حقیقت یہی ہے

بہت یاں ہوئے خشک چشمے اُبل کر
بہت باغ چھانٹے گئے پھول پھل کر

لیکن بعد کو سرسید کے مشورے سے وہ رجائیت کی طرف مائل ہونے لگے تھے، لہٰذا مسدس میں اُنھوں نے ایک ضمیمہ کا اور اضافہ کیا۔

بس اے نا اُمیدی نہ یوں دل بجھا تو — جھلک اے اُمید اپنی آخر دکھا تو
ذرا نا اُمیدوں کی ڈھارس بندھا تو — فسردہ دلوں کے دل آخر بڑھا تو
ترے دم سے مُردوں میں جانیں پڑی ہیں
جلی کھیتیاں تو نے سرسبز کی ہیں

حالی کی شاعری پر سب سے بڑا اور آخری اثر علی گڈھ تحریک کا ہوا، وہ سرسید کے بہت بڑے مدّاح تھے۔ مولوی عبدالحق صاحب اس سلسلہ میں رقمطراز ہیں "حالی کی جدید شاعری علی گڈھ کی تحریک کا نتیجہ ہے۔ سرسید احمد خاں مرحوم کی تحریک سے ملک میں ایک نئی تہذیب کا دَور دَورہ شروع ہوا جس نے مسلمانوں کی دماغی حالت میں ایک نئی روح پھونک دی۔ مغربی تعلیم نے خیالات میں ہلچل مچادی پُرانی چیزوں اور روایتوں کو لوگ مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ نئے خیالات نے نئی نئی راہیں سُجھائیں، ذوق و ادب کے اُصول کچھ کے کچھ ہوگئے۔ جدید سائنس نے ذہنی و باطنی جانب سے محسوسات کی جانب متوجہ کیا۔ نمائیشی، لفظی بندشوں اور بے معنی تکلف و تصنّع کی جگہ نیچرل اور سادہ طرزِ بیان آگیا۔ غرض جدید انقلاب نے دلوں میں نئے خیالات کے ساتھ نئی اُمنگیں پیدا کردی تھیں۔ اور نظر کے زاویے کو دوسری طرف پھیر دیا تھا۔ حالی نے اِن نئے خیالات کا راگ گایا اور عہدِ جدید کی سب سے اول نمایندگی کی، اور یہیں سے ہماری شاعری کا رُخ بدلتا ہے۔"

۱۸۷۴ء کا مشاعرہ جو لاہور میں منعقد ہوا تھا، اُردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیگا۔ یہ مشاعرہ پنجاب کے ڈائرکٹر تعلیمات کرنل ہالرائیڈ کی سرپرستی میں ہوا تھا۔ آزاد اس کے محرک تھے، یہ قرار پایا تھا کہ بجائے مصرعۂ طرح دینے کے اس مشاعرہ میں نظم کے لئے ایک عنوان مقرر کیا جائے اور شعرائے کرام کو دعوت دی جائے کہ وہ اس پر طبع آزمائی کریں۔ حالی اُن دنوں لاہور کے ایک بُک ڈپو میں ملازم تھے۔ انھوں نے بھی اس مشاعرے میں شرکت کی، چنانچہ اُن کی نظمیں 'برکھا رُت' 'نشاطِ اُمید' حبِ وطن'، اور مناظرہ رحم و انصاف'، اس مشاعرے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ جدید اُردو شاعری کا آغاز اِن نظموں سے ہوتا ہے۔ ۱۸۷۴ء کے اس مشاعرے کے لئے حالی ضروری تھے یا حالی کی شاعری کے لئے یہ مشاعرہ۔ اس کا مختصر اور صاف جو

یہ ہے کہ اس مشاعرے کے لئے حالی ضروری تھے، حالی کی شاعری کے لئے یہ مشاعرہ ضروری نہ تھا۔ حالی جیسے شاعر کی زمانہ کو اشد ضرورت تھی، اور اس نے حالی جیسے باکمال شاعر کی شاعرانہ قابلیت سے پورا فائدہ اٹھایا۔ انھوں نے ہمارے ادب میں ایک ایسا انقلاب پیدا کیا جہاں سے نئے ادب کا آغاز ہوتا ہے، اور اُن کا کلام گذشتہ شعر و شاعری کے خلاف ایک علمی بغاوت کے مترادف ہے۔

ہمارے ادب میں تنقید کے اصول حال ہی میں وضع ہوئے ہیں، اور وہ بھی بالکل ابتدائی حالت میں ہیں، انگریزی ادب کے اثرات کے ساتھ ساتھ تنقید کا مذاق بھی پیدا ہوتا جارہا ہے۔ نقد و تبصرے کے جو اصول حالی نے "مقدمۂ شعر و شاعری" میں وضع کئے ہیں وہ ہمیشہ شمعِ ہدایت کا کام دینگے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ تنقید کے سلسلے میں حالی کی یہ پہلی کوشش ہر طرح لائقِ ستایش و آفریں ہے۔ مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، اور غزل کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ غور کرنے کے قابل ہے، اور اسمیں ترمیم کی گنجایش ہے۔ اُردو ادب کے باب تنقید کی یہ پہلی منزل ہے، راستہ دشوار گذار ہے اور یہاں سوچ سمجھکر گامزن ہونے کی ضرورت ہے، حالی بحیثیت نقاد کے بھی اُردو ادب میں ایک ممتاز جگہ پر ہیں اور مقدمہ صحیح معنی میں اُردو تنقید کی پہلی کتاب ہے۔

حالی کی بیشتر نظموں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ کہنا پڑتا ہے کہ اُن سے مصلحانہ انداز مترشح ہوتا ہے دُنیا کے اکثر بڑے شاعر مُصلح ہوئے ہیں اور اِس سلسلہ میں ان کا مقابلہ سعدی سے کیا جاسکتا ہے۔ انکی نظمیں "مناجاتِ بیوہ" "مثنوی حقوقِ اولاد" اور "چُپ کی داد" اس سلسلہ میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

جہاں تک حبِّ وطن کا تعلق ہے حالی کا نظریہ یہ تھا کہ قوم کی خدمت قومیت کی سب سے بڑی پہچان ہے، وہ اُن کے اخلاق و تربیت پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں، وہ دوسروں کی خدمت، غریبوں کی مدد، عورتوں کی عزت اور وطن سے محبت کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اس سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ "حالی کا نظریہ حبِّ وطن کے متعلق اتنا بلند تھا کہ آجکل کے بہت سے محبِّ وطن حضرات کا خیال بھی وہاں تک نہیں پہونچ سکتا۔" اس سلسلہ میں اُن کی مشہور نظم "حبِّ وطن" ہماری رہنمائی کرسکتی ہے۔ حبِّ وطن کا بلند ترین تصور ان اشعار سے واضح ہوتا ہے:۔

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو　　اُٹھو اہلِ وطن کے دوست بنو
مرد ہو تو کسی کے کام آؤ　　ورنہ کھاؤ پیو چلے جاؤ
جاگنے والو! غافلوں کو جگاؤ　　تیرنے والو! ڈوبتوں کو تراؤ

اسمٰعیل پانی پتی، چکبست لکھنوی، سرور جہان آبادی اور ڈاکٹر اقبال کی حب الوطنی کے تصور سے حالی کا تصور مختلف ہے۔ جہاں تک علیگڈھ تحریک کا تعلق ہے یہ امر روز روشن کی طرح واضح ہے

کہ حالی نے اس تحریک کا صحیح راستہ اختیار کرنے کی خاطر خود سر سید کی مخالفت کرنے میں بھی دریغ نہ کیا وہ سر سید کے بہت بڑے مداح تھے، لیکن علیگڑھ تحریک انھیں جان سے زیادہ عزیز تھی "حیات جاوید" کا مطالعہ اس چیز کو اچھی طرح واضح کر دیتا ہے۔ انھوں نے کئی موقعوں پر اس کے لئے سر سید کی مخالفت کی حالی نے ادب کا نقطۂ نظر وسیع کیا۔ انھوں نے شاعری میں نئے راستے اختیار کئے اور اس کو عوام سے قریب لانے کی کوشش کی، حالی اور آزاد سے پہلے اردو ادب کا سرمایہ ایک مخصوص طبقہ کے لئے تھا۔ عوام اس سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے تھے۔ فارسی الفاظ و محاورات کی فراوانی تھی، مفہوم دور از کار تشبیہات اور استعارات میں گم ہو جاتا تھا۔ ناسخ اور ان کے شاگردوں کا اثر اتنا گہرا ہو چکا تھا کہ صاف اور سادہ اشعار کہنا گویا ایک بے معنی سی بات تھی۔ رعایتِ لفظی کا دور دورہ تھا، اور بغیر صنائع بدائع کے شاعر کے لئے ایک قدم چلنا ناگزیر تھا۔ علمی اور اخلاقی مضامین کی بہت کمی تھی اور وہی فرسودہ حسن و عشق کے پراگندہ افسانے شاعری کا موضوع تھے جنھیں اگلے ہوئے نوالوں کی طرح ہمارے شعرا رسمی طور پر نظم کیا کرتے تھے۔ ادب اور زندگی کا کوئی ساتھ نہ تھا۔ لیکن آزاد سوائے نظم کے (جو کہ کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی) پیرایۂ بیان کو سلیس اور عام فہم نہ بنا سکے۔ انھوں نے اپنی مشہور کتابوں مثلاً نیرنگ خیال، آبحیات، سخندان پارس، نگارستانِ فارس، میں ایک مخصوص اسلوب بیان اختیار کیا، جو انھیں کے ساتھ ختم ہو گیا۔ حالی نے ایسے الفاظ انتخاب کئے جو عام فہم، سہل اور رواں تھے، اور ہندی کے الفاظ سے خاص طور پر کام لیا۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر عابد حسین لکھتے ہیں "ہندی کے سہل اور نرم الفاظ جو اردو میں کھپ سکتے تھے، گھریلو محاورے جو بول چال میں رائج تھے مگر تحریر میں نہیں آتے تھے، حالی کے طفیل سے نظم و نثر میں چلنے لگے"۔ حالی کی تمام نظموں میں خصوصاً مسدس میں ایسے بہت سے الفاظ ملتے ہیں جو ان سے پہلے اردو شعرا نے استعمال نہیں کئے تھے۔ مسدس ہی سے تقریباً ایک درجن سے زیادہ الفاظ پیش کئے جا سکتے ہیں۔ حالی نے نظم و نثر دونوں میں انگریزی الفاظ فراوانی کے ساتھ استعمال کئے۔ اور نثر میں ایسے الفاظ کی تعداد نظم کی بہ نسبت زیادہ ہے، مثلاً ایجیٹیشن، ٹیکٹ، مارل، پوئٹری وغیرہ۔ ان کے مترادف الفاظ وہ آسانی کے ساتھ استعمال کر سکتے تھے، اور یہی چیز بعض ناقدین کی نگاہ میں کھٹکتی ہے۔

حالی نے اپنی نظم و نثر کی تصانیف کے ذریعہ ملک کا ادبی مذاق بالکل بدل دیا، شروع میں ان کی بہت مخالفت کی گئی۔ بعض حضرات نے ان کو شاعر تسلیم نہیں کیا، لیکن زمانہ نے دکھلا دیا کہ ان کے مخالفین کے نام تک لوگوں کو یاد نہیں، اور ان کی تصانیف کی اشاعت روز بروز زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ بقول ڈاکٹر عابد حسین "حالی بہت بڑے شاعر اور نقاد تھے اور کچھ اس سے بڑھ کر تھے، وہ اپنے زمانہ کے ادبی مجدد تھے جنھوں نے ملک کے بگڑے ہوئے مذاق کو سنبھالا اور سنوارا، اردو ادب کو پستی سے نکال کر بلندی کی راہ دکھلائی"۔

جذباتِ رونق

(از عبدالعظیم رونق جمشیدپور)

زمانہ تھا وہ بھی کیا زمانہ، وہ مجھ سے جب بدگماں نہیں تھا
زمیں یہ ہرگز زمیں نہیں تھی، یہ آسماں آسماں نہیں تھا

ہوئی جو رودادِ غم ہماری، صدا بصحرا تو کیا عجب ہے
دیارِ جاناں میں تھے تو لاکھوں، مگر کوئی ہمزباں نہیں تھا

جہانِ حسن و وفا میں یہ، انقلاب سامانیاں ہیں کیسی
دماغ فطرت مزاجِ الفت سے پہلے یوں سرگراں نہیں تھا

زمیں سے تا چرخ سوزِ الفت کی، آگ پھیلی ہوئی ہے ورنہ
یہ شمع شعلہ زباں نہیں تھی، یہ مہر آتش بجاں نہیں تھا

اگر سلامت ہے ذوقِ سجدہ، ہر ایک ذرّہ ہے رشکِ کعبہ
ملال کیا ہے اگر جبیں کو، تیرا نصیب آستاں نہیں تھا

ابھی بدستور دل کے پردوں میں رازِ الفت چھپا ہوا ہے
سمجھ چکا ہے جسے زمانہ، وہ میرا رازِ نہاں نہیں تھا

یہ چشمِ احول کی تنگ ظرفی ہے مانعِ دیدِ حسن رونق
وہ جلوہ فرما کہاں نہیں ہے، وہ جلوہ فرما کہاں نہیں تھا

مانسرور

(از منشی گرجا پرشاد ماتھر)

قدرت نے جھیل مانسرور کے مناظر کو جو دلکشی اور دل فریبی عطا کی ہے وہ لاثانی اور بے نظیر ہے اپنی قدامت، اپنے محلِ وقوع، اپنی خموش سنجیدگی اور اپنی متبرک حیثیت، ہر لحاظ سے مانسرور کا پایہ دنیا کی تمام جھیلوں میں سب سے بلند ہے۔ الموڑہ سے دو سو چالیس میل کے دشوار گذار لیکن دلچسپ اور خوشگوار پہاڑی راستوں کے نشیب و فراز اور مسافت کی صعوبتوں کے ساتھ ساتھ قدرت کی صناعیوں کا لطف اُٹھاتا ہوا جب ایک تھکا ماندہ مسافر اس بلّوری جھیل کے کنارے پہونچتا ہے تو اُس کی خوبصورتی سے ششدر ہو کر قدرت کی کاریگری پر از خود اپنا سر تسلیم خم کر دیتا ہے۔ کیلاش پربت کی بائیس ہزار فیٹ کی اُونچی برفستانی سفید چوٹیاں، جھیل کا شیریں اور شفاف پانی، اُس کی ساکت سطح کنارہ کی ہریالی، انوکھے پرندوں کی شکلیں، جھیل کے سفید اور شاندار ہنس سب چیزیں مل کر عجب سحر سازیاں کرتی ہیں۔ وہاں کا موسم الگ اپنی اٹھکیلیاں دکھاتا ہے۔ اگر ابھی گرمی ہے تو ایک منٹ بعد ٹھنڈی ہوا کے تُند جھونکے جھیل کے خاموش پانی میں تلاطم پیدا کر دیتے ہیں۔ ذرا دیر میں بجلی کی چمک کڑک اور بارش کا سامنا ہو جاتا ہے اور پھر ایک دم موسم صاف ہو کر ہر طرف نکھار سے وہی جگہ کچھ سے کچھ نظر آتی ہے۔ غروب آفتاب کے وقت کیلاش کا پورا سلسلہ دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح سُرخ ہو جاتا ہے، اور آناً فاناً یہ تمام چوٹیاں یکایک پھر سفید ہو جاتی ہیں۔ بعض وقت شام کو سورج کی ترچھی شعاعوں سے یہ سارا سلسلہ پھر شعلوں میں نظر آتا ہے جن میں سے دُھواں تک نکلتا ہوا معلوم ہوتا ہے، اور پھر یہ کل حصہ کالا سیاہ ہو کر کوئلہ کے تودوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ بعض وقت طلوعِ آفتاب کے وقت کیلاش کی برفستانی سپیدی، چمکیلے سنہرے رنگ میں تبدیل ہو جاتی ہے جیسے پگھلتا ہوا سونا سفید جھیل میں بہتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور بعض وقت یہ کل پہاڑ سپید برف سے ایسا ڈھک جاتا ہے کہ جھونپڑی اور ٹیلے خیمے تنبو سب نگاہ سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ زمین اور گڑھے ٹیلے اور جھاڑی کی کوئی پہچان نہیں رہتی۔ چاندنی رات کا منظر اور بھی دلکش ہوتا ہے

جب جغرافیہ داں لوگوں کو جنیوا کی جھیلوں کا پتہ بھی نہ تھا اُس سے صدیوں پیشتر مانسرور جھیل اپنی صد ہا خوبیوں کے باعث شہرۂ آفاق تھی۔ تواریخ کے پیشتر سے مانسرور جھیل ہندوؤں اور اہلِ تبت کے باشندوں کی متبرک جھیل ہے جس کی زیارت گناہوں کے دُھل جانے کا یقینی ذریعہ ہے۔ چودہ ہزار

۱۴۹۵۰ نوسو پچاس فیٹ یعنی نینی تال سے دُوگنی سے زیادہ اونچائی پر واقع ہے۔ گہرائی ۳۰۰ فیٹ اور رقبہ قریب قریب دو سو مربع میل ہے۔ اس کے کناروں پر بودھ مذہب کے لوگوں کی آٹھ متبرک مشہور و معروف خانقاہیں ہیں جن میں بُدھ مذہب کے مہنت اور بھنیتاں صدیوں سے عبادت کر کے نروان حاصل کرنے کی کوشش میں سرگرداں رہتے چلے آ رہے ہیں۔

جھیل کے مختلف اوصاف اُس کی خوبیوں اور قدرت کی صناعی کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے اُس کے کناروں پر پُورے ایک سال کے قیام کی ضرورت ہے۔

جس وقت یہ جھیل جم کر شفاف برف بنی ہوتی ہے اُسی وقت موسم عجیب خوشگوار اور پُرلطف کیفیت اختیار کر لیتا ہے۔ انواع و اقسام کی آوازوں اور گرجوں سے سارا خطّہ گونجتا رہتا ہے۔ خانقاہوں میں مہنت لوگ عابدانہ نعرے بلند کرتے ہیں دھوپ اور دیگر خوشبویات سے تمام ہوا معطر ہوتی ہے اور خانقاہوں میں نئے نئے جھنڈے لہراتے نظر آتے ہیں۔ ساری جھیل برف میں جمکر ایسی پختہ زمین بن جاتی ہے کہ دلیر پہاڑی لوگ اکثر اس کے اوپر چلتے نظر آتے ہیں لیکن اس میں شگاف اور دراریں رہ جاتی ہیں جن میں جگہ جگہ پانی کے اونچے فوارے چھوٹتے رہتے ہیں۔ رنگ برنگی خوبصورت مچھلیاں اور پانی کے چھوٹے چھوٹے پودے جم کر برف بن جاتے ہیں اور اوپر سے شیشے میں بند نظر آتے ہیں۔ جھیل کے اندر بعض بعض مقامات پر یقیناً گرم پانی کے چشمے بھی ہیں جن کی بدولت بہت سی مچھلیاں سطح برف کے نیچے اُچھلتی کودتی اور تیرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں

بہت سے مذہبی لوگ عموماً موسم سرما میں جھیل کے چاروں طرف پے کرما کرتے ہیں جس کی وجہ یہ بھی ہے کہ اس وقت جھیل میں گرنے والے تمام دریا جم چکتے ہیں اور برف پر بلا دقّت گشت لگایا جا سکتا ہے، گرمی اور برسات کے موسم میں گرد و نواح کے تمام چشمے اور دریا پانی سے لبالب ہوتے ہیں اس وجہ سے جھیل کے کنارے کنارے گشت لگانا دقت طلب ہوتا ہے۔

مئی اور جون کے مہینوں میں جس وقت ہندوستانی جاتری یا ہندوستانی سیّاح ان مقامات پر پہونچتے ہیں تو خانہ بدوش راہزنوں کے باعث یہ راستے قدرے مخدوش ہو جاتے ہیں" اس لئے مسافر بالعموم ٹولیوں میں جاتے ہیں اور الموڑہ سے چلکر انگریزی سرحد کے خاتمے پر ریوالور یا دیگر آتشیں ہتھیار کرایہ پر لیکر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ کمبل اور برف میں چلنے کے لئے اُونی جوتے بھی کرایہ پر دستیاب ہو جاتے ہیں اور مسافر انھیں جگہوں پر انگریزی سکّوں کو تبّت کے سکّوں میں تبدیل کرا لیتے ہیں۔ راستے میں پانی کی بھی دقّت رہتی ہے ٹھیرنے کے لئے جگہ بھی نہیں ملتی۔ مگر اب مسافرخانوں اور دھرم شالاؤں کا تعمیر کرانا زیرِ غور ہے

جھیل کے پگھل کر پھر پانی ہو جانے کا سماں اور بھی دلفریب ہوتا ہے جھیل میں یکایک خوبصورت سفید

راج ہنسوں کے جوڑے نازک ادا سے تیرتے نظر آتے ہیں۔ برف کا پگھل کر پانی بننے سے دس گیارہ دن پیشتر گرج اور دھاکوں کی ہیبت ناک آوازیں سنائی دیتی ہیں جو ہاتھیوں کی چنگھاڑ شیر اور چیتوں کی دھاڑ اور توپوں کے دغنے کی سی آوازیں ہوتی ہیں، ہر قسم کے باجے کی سُریلی آوازوں یا مختلف چرندوں اور پرندوں اور درندوں کی آوازوں میں شاید ہی کوئی آواز ایسی ہوگی جو سنائی نہ دیتی ہو۔ پہلے برف ٹوٹ کر شگاف پڑتے ہیں، پھر برف کے علیحدہ علیحدہ تودے بنتے ہیں، پھر برف کے ٹکڑے پانی بنکر خوبصورت شفاف جھیل بن جاتے ہیں اس وقت بھی وہاں کے لوگ اپنے مکانوں کی چھتوں پر وہی خوشیاں مناتے ہیں، دھوپ اور دیگر خوشبودار چیزیں جلاتے عبادت کرتے اور دیوتاؤں کے سامنے دست دعا بلند کرتے ہیں۔

مانسرودور کے قریب ہی تبت کے بعض خطّوں میں سونے کی کانیں بھی ہیں جن کے کھودنے میں دقیانوسی طریقے عمل میں لائے جاتے ہیں اس لئے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ سہاگا۔ سوڈا۔ ابرک۔ نمک۔ لوہا وغیرہ بہت سی قیمتی معدنیات بھی مانسرودور کے گردونواح میں موجود ہیں۔ مانسرودور کے گرم چشموں میں بعض بعض کا پانی کھولتا ہوا ہے۔ پہاڑوں میں گہرے گہرے غار اور گپھائیں ہیں جن میں بدھ مذہب کے مہنت اور رشی مُنی عبادت میں محو دنیا سے کوسوں دُور نظر آتے ہیں' وہ مقام بھی مانسرودور کے نزدیک ہی ہے جہاں راکھشش بھیاسر کو جلاکر خاک کیا گیا تھا۔ راکشستال بھی جہاں راون نے بیٹھکر تپشیا کی تھی یہاں سے کچھ دُور نہیں ہے۔

اِن خطّوں کے باشندے مضبوط اور جفاکش لیکن گندے اور دقیانوسی خیالات کے ہیں۔ البتہ لاما اور حاکم لوگ نہایت شائستہ اور مہذّب ہیں، آبادی نہایت کم اور بہت دُور دُور ہے، مکانات محض عارضی اور برائے نام ہیں۔ بعض گاؤں میں تو صرف دو یا تین ہی گھر ہیں۔ اِن لوگوں کا پیشہ بالعموم بھیڑیں اور یاک پالنا اور اُن کے اُون کی تجارت کرنا ہے۔ اِن لوگوں کی غذا گوشت دودھ دہی اور مکھن ہے۔ صبح اور شام کو اِن کی خاص غذا ایک عجیب چیز ہے جیسے ستّو گوشت جسے پانی میں اُبال کر تیار کرتے اور اس میں نمک ملاکر کھاتے ہیں۔ چین کی چائے کے ساتھ اسے بہت دیر تک پانی میں اُبلتے ہیں پھر نمک اور مکھن ملاکر بہت دیر تک پانی میں اُبالتے ہیں پھر نمک اور مکھن ملاکر بہت دیر تک بلوتے ہیں اور دن بھر میں اس کے پچاس پچاس پیالے تک پی جاتے ہیں۔

تبت سطح سمندر سے بارہ ہزار فیٹ کی اونچائی پر ہے۔ یہاں کے باشندوں کے رسم و رواج اُتنے ہی عجیب و غریب ہیں جتنی اُن کی آبادی کم ہے۔ آبادی بڑھانے کے یہ لوگ مطلق کوشاں نہیں ہیں ایک بھائی شادی کر لیتا ہے اُسی کی بیوی سب بھائیوں کی مشترکہ بیوی ہوتی ہے اور سب مل جُلکر نہایت

امن وامان سے رہتے ہیں۔ یہ لوگ جیب باہر نکال دیتے ہیں جس کے معنی سلام کے ہوتے ہیں۔ مہنت اور مہنتیوں میں شادی کرنا ممنوع ہے۔ تبت کے باشندوں میں خون بہانا گناہ عظیم ہے اس لئے یہ لوگ گوشت کے لئے کسی جانور کو ذبح نہیں کرتے بلکہ اُس کے منھ اور نتھنوں کو رسی سے باندھکر دم گھوٹ کر اُسے مار لیتے ہیں۔ صرف امیروں اور مہنتوں کی لاشیں جلائی جاتی ہیں، ورنہ مردہ کو یا تو کلہاڑی سے ٹکڑے ٹکڑے کر کے دریا میں پھینک دیتے ہیں اور یا گِدّھوں کو کھلا دیتے ہیں۔

یہاں کے باشندے سب بُدھ مذہب ہیں، مہنتوں اور پُجاریوں کا اتنا زور ہے کہ ہر کُنبہ کا ایک یا دو بچّہ دو تین سال کی عمر میں سنت یا مہنتی بنا دیا جاتا ہے، اور اس طور پر آبادی کا بڑا حصّہ مہنتوں کا ہی ہے یہ لوگ خانقاہوں میں رہتے ہیں جہاں بودھ مہاتما اور دوسرے دیوتاؤں کی مورتوں کی پرستش ہوتی ہے۔ اکثر جگہ اِن خانقاہوں کے ساتھ دھرم شالائیں بھی لگی ہوئی ہیں جن میں جاتریوں اور سیاحوں کے ٹھہرنے کا انتظام ہے۔ خانقاہیں ان کی تعلیم گاہ ہوتی ہیں جن میں مختلف علوم و فنون سکھائے جاتے ہیں اور جہاں نہایت بیش بہا قیمتی قدیم دستی اور چھپی ہوئی مختلف مضامین کی کتابوں کے نادر ذخیرے موجود ہیں۔ اِن خانقاہوں کے مصارف قیمتی اوقاف کے علاوہ امیر لوگوں کی سخاوت سے چلتے ہیں۔

اُونچے درجہ کے مہنت لاما کہلاتے ہیں اور یہ لوگ بالعموم وہی ہوتے ہیں جن کی تعلیم و تربیت اعلیٰ پیمانہ کی ہوتی ہے۔ تبت کے لوگ اپنے نئے سال کا دن بڑے کرّوفر سے مناتے ہیں اور اُن کی خانقاہوں میں آئے دن تقاریب ہوتی رہتی ہیں جن میں کھانا پینا ناچ رنگ بعض وقت ہفتہ بھر تک مسلسل جاری رہتا ہے جب کوئی مشہور آدمی اِن خانقاہوں میں آجاتا ہے تو مہنت لوگ باجے بجا کر اُس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

جاتری لوگ مانسروور کا پاک اور میٹھا پانی، یہاں کی رنگ برنگی بجری اور رنگ برنگے پتھر بطور تبرک اپنے ساتھ لے آتے ہیں۔ یہاں ایک قسم کی خوشبودار گھاس بھی ہوتی ہے جو دھوپ کا کام دیتی ہے اور ان خانقاہوں میں فروخت بھی ہوتی ہے جھیل کی مچھلیوں کو کوئی مارتا نہیں البتہ جب مری ہوئی مچھلیاں جھیل کے باہر تلاطم کے وقت جا گرتی ہیں تو اُنھیں خانقاہوں میں فروخت کر دیا جاتا ہے۔ یا گری پڑی اُٹھا کر جاتری لوگ خود اکٹھا کر لیتے ہیں۔

خطّۂ مانسروور سے تبت کی بھیڑوں کا ہزاروں من اون ہندوستان اور دوسرے ملکوں کو جاتا ہے اگر یہاں اُون کی پیداوار کی صحیح اور نئے طریقوں سے نگہداشت کی جائے تو سوئٹزرلینڈ کی طرح تبت بھی دنیا کے اعلیٰ اُون کی پیداوار کرنیوالے مقامات میں شامل ہو سکتا ہے۔

تبت میں خانہ بدوش ڈاکو ہر جگہ موجود ہیں۔ یہ بالعموم گڈریے ہیں جو اپنی بھیڑوں ٹٹوؤں یا گول

وغیرہ جانوروں کو لیئے اِدھر اُدھر گھومتے رہتے ہیں، اور ان میں سے اکثر تجارت یا یاترا کے لئے مئی اور اکتوبر کے درمیانی مہینوں میں مانسروور کیلاش کے خطوں میں پہونچ جاتے ہیں۔ چونکہ تبت میں ہتھیاروں کے متعلق کوئی روک ٹوک نہیں ہے اس لئے ان لوگوں کے پاس ہر قسم کی تلواریں، خنجر، بندوق، پستول اور ریوالور وغیرہ ہوتے ہیں اور کارتوس اور بارود کی بھی کوئی کمی نہیں ہوتی۔ مگر جب جاتریوں کی جماعت ہوتی ہے یا اکا دکا مسافر ہتھیار بند ہوتا ہے تو یہ چھیڑ چھاڑ نہیں کرتے مگر بعض اوقات چھاپہ مار کر پہاڑیوں میں بھاگ جاتے ہیں۔ تبت کی حکومت ان کی گرفتاری کا کوئی انتظام نہیں کرتی۔

تبت کی عنان حکومت دلائی لاما کے ہاتھ میں ہے جس کا دارالسلطنت لاسا ہے جس کی آبادی تقریباً بائیس ہزار ہے جس میں قریب قریب نصف مہنت ہیں۔ معمولی جرائم کی سزا میں مجرم کے ہاتھ رسّی سے اس سختی سے باندھ دیئے جاتے ہیں کہ ان میں خون چھلکنے لگتا ہے۔ ڈکیتی وغیرہ کی سزا میں کلائی تک ہاتھ کاٹ ڈالے جاتے ہیں، اور پھر کھولتے ہوئے تیل میں ڈبو دیئے جاتے ہیں۔ حکومت کے خلاف جرائم کی سزا میں دہکتے ہوئے لوہے کی گرم سلاخیں مجرم کے جبڑوں میں ٹھونس کر یا اُس کی آنکھیں نکلوا کر یا اونچی پہاڑی کی چوٹی سے ڈھکیل کر اُس کی جان لے لی جاتی ہے۔ سرکاری عہدوں سے عورتیں محروم نہیں رکھی جاتیں بعض جگہوں پر عورتیں وائسرائے اور گورنر تک ہیں۔ تبت میں جانے کے لئے ہندوستانی کو کسی پاسپورٹ کی ضرورت نہیں ہے اور وہاں ہندوستانی موجود بھی ہیں، مگر سلطنت برطانیہ سے ۱۹۰۴ء کے عہدنامہ کے مطابق کوئی انگریزی رعایا تبت کی سرزمین پر پٹا ہوا مکان بنا کر نہیں رہ سکتی۔

غرضکہ یہ سارا خطہ نہایت عجیب وغریب دلچسپ اور دلفریب ہے، یہاں شاعر اور مصور، طالب علم او مدبر، شکاری اور سوداگر، مورخ اور جغرافیہ داں، ہوا باز اور سپاہی، گرہست اور صوفی، عیا لدار اور تن تنہا رہبر اور سنیاسی، خدا پرست اور ناستک، بوڑھے اور جوان، مرد اور عورت ہر فرد بشر کی دلچسپی کا سامان پورا پورا مہیا ہے۔

پاکستان

تقسیمِ وطن چہ فتنۂ عریان است — ایں شیوۂ افتراق وشر سامان است
پاکستان است اندروں، دُور از تو — کیں رہ کہ میروی بہ ترکستان است

وید کے قومی گیت

(از جناب فضل اللہ بسمل، سلطانپور)

۳

جھرنے کے گیت آتے ہیں کانوں میں دمبدم — امواجِ مست مست بنیں رہزنِ الم
ایسا کچھ آج کر دے محبت کے زور میں — راحت کا نغمہ ہو، مرے دریا کے شور میں

۴

یہ بادلوں میں، برق کی شعلہ فشانیاں — یہ ریگ زارِ دشت کی آتش زمانیاں
آتش فشاں یہ کوہ، یہ دریا کا سیل و جوش — یہ آندھیوں کا ہوش رُبا، زور اور خروش
ایسی تمام قوت و طاقت تو دے ہمیں — ہم تا کہ ہڈیاں ترے دشمن کی توڑ دیں
سونے کی اس زمین پہ رکھیں نہ پھر قدم — اس طرح کر کے چھوڑیں گے ان کو ہلاک ہم

۵

رنگ ایک، نسل ایک ہو، یا ہو جُدا جُدا — مذہب بھی مختلف ہوں، کہ ہو سب کا ایک سا
ماں! ہم کو ایک رکھ، نہ جدا ہوں ہمارے دل — ہم مل کے ایک ساتھ عدو کو کریں خجل

۶

یہ ملک جس میں نغمۂ وَنے، رقص اور سرود — دیتا ہے زندگی کے چمن کو نیا وجود
یہ ملک جس میں جنگ کے شعلے بھڑک اُٹھے — آوازِ طبل سے، دلِ دشمن دھڑک اُٹھے
رہتے ہوئے حفاظتِ فوج و سپاہ میں — دشمن کے ہم نے کاٹے ہیں سر، رزم گاہ میں
یہ سرزمین، پائے عدو سے بچی رہے — آئے نہ اِس زمین پہ، سو کلفتیں سہے

۷

یہ سرزمیں، حسین رہے، دلستاں رہے — ننھا سا جو پرند بھی ہو نغمہ خواں رہے!
دستِ صبا گلوں کو دیئے جائے تھپکیاں — گاتے ہوئے ہمیشہ یہ چشمے رہیں رواں
بارش کی ہو کمی، نہ تو حد سے سوا رہے — سونے سے کھیت کھیت کا دامن بھرا رہے
یہ ملک ہو ہمارے لئے اِس قدر حسیں! — شرمائے جس کو دیکھ کے دنیا کی ہر زمیں!

ہندوستانی رُوح

(از سید محمد نواز الرضوی بٹالوی، بی۔ اے)

(منظر، جنت کا راستہ، ایک فرشتہ ایک رُوح سے دوچار ہوتا ہے۔)

فرشتہ :۔ کچھ مضمحل سے نظر آتے ہو، کیا باعث (سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے) یہاں سے جب گئے تھے تو دنیا کے بڑے مشتاق نظر آتے تھے، اب یہ ملال کے آثار کیسے؟ کیا نکیرین کے سوال و جواب کا اثر ہے،

رُوح :۔ وہ بھی تو بے اثر نہیں ہوا کرتے۔

فرشتہ :۔ تو اس اضمحلال کا سبب وہی سمجھا جائے؟

رُوح :۔ اس کے علاوہ اور بھی سبب ہیں۔

فرشتہ :۔ مگر اس جنتِ ارضی میں جانے کی تو تمھیں بڑی تمنا تھی، تم خود بارگاہِ آلہی میں ملتجی ہوئے تھے

رُوح :۔ جی، میرا ملتجی، ہونا ہی میرے لئے عارضہ بن گیا۔

فرشتہ :۔ کیا وہاں جاکر کچھ بیمار ہوگئے تھے؟

رُوح :۔ عالمِ بالا میں دنیاوی بیماریوں کا کیا ذکر۔

فرشتہ :۔ بجا ارشاد ہوا، یہاں جسمانی بیماریوں کا تذکرہ بیکار ہے۔ مگر جو روحانی بیماری عالمِ سفلی سے تم لیکر آئے ہو وہ صرف تمھیں پر نہیں بلکہ دیگر ساکنانِ عالمِ بالا پر بھی اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔

رُوح :۔ کیا بالکل اسی طرح جس طرح دنیا میں امراض متعدی پھیلتے ہیں۔ یا جیسے وہاں بدبو سے دماغ پریشان ہو جاتا ہے

فرشتہ :۔ سچ کہا، بالکل اسی طرح،

رُوح :۔ گویا اب میری موجودگی سے آپ کو تکلیف محسوس ہو رہی ہے۔

فرشتہ :۔ ضرور۔

رُوح :۔ تو یہ تکلیف آپ صرف میرے لئے برداشت کر رہے ہیں۔ وجہ؟ دنیا میں تو میں نے دیکھا تھا کہ کوئی کسی کے واسطے ایک سکنڈ کے لئے بھی کسی قسم کی تکلیف اُٹھانے کو تیار نہ ہوتا تھا۔

فرشتہ :۔ صرف میرے اور تمھارے بزرگوں کے تعلقات کی بنا پر ہے۔ اُن کی عظمت و احترام مجھے مدِّ نظر ہے۔

روح :- یعنی ؟

فرشتہ :- جب مجھے اُن کو اپنا مسجود بنانے کا اٹل حکم دیا گیا تھا

روح :- خیر یہ لمبی چوڑی باتیں جانے دیجئے، میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا، مجھے بارگاہِ قدس میں لے چلئے

فرشتہ :- اچھا، مگر جلدی کیا ہے، جنتِ ارضی سے آئے ہو، کچھ وہاں کی باتیں، کچھ وہاں کے واقعات ؟

روح :- روز موت کے فرشتے سے سنتے ہو، اور پھر یہ تجاہلِ عارفانہ !

فرشتہ :- اُس سے کیا سُنتے ہیں، آج انسانوں کی تعداد میں اتنی کمی ہوئی، اتنے بچے یتیم ہوئے، اتنی عورتیں بیوہ ہوئیں، فلاں فلاں بیماریاں فلاں خطۂ ارض پر اپنا بدترین اثر دکھلا رہی ہیں۔

روح :- تم اُس کی باتیں سُن کر خوش ہوتے ہو گے ؟

فرشتہ :- اُس ترش رُو کی کسی بات میں خوشی کہاں، اور پھر آج کل تو جنگ کے دوبارہ شروع ہونے کی وجہ سے اُسے دم لینے کی بھی فرصت نہیں، اور چہرہ جیسے پتھر کی مورت۔

روح :- اُس زندانِ ارضی کی کیفیت آپ کسی مسرور روح سے پوچھیں،

فرشتہ :- تو کیا تم مسرور نہیں ؟

روح :- بالکل نہیں،

فرشتہ :- تم نے خود کہا تھا کہ جنتِ روحانی میں بسر کرتے عرصہ گذر گیا ہے اور چاہا تھا کہ کسی ایسی جگہ بھیجیں جو اس سے ملتی جلتی ہو، اور تم بارگاہِ قدس کے احکام کے مطابق "جنت نشاں" میں بھیجے گئے تھے۔

روح :- درست، مگر ....

فرشتہ :- اب اس گر مگر کا کیا مطلب ؟

روح :- وہ "جنت نشاں" کسی زمانہ میں ہو گا، اب تو "جہنم نشان" ہے۔

فرشتہ :- خدا نہ کرے ایسا ہو،

روح :- ایسا ہی ہے،

فرشتہ :- بلا شک ؟

روح :- بلا شک !

فرشتہ :- ابھی برسوں کا ذکر ہے، میں علّیین میں گیا تھا، وہاں مولانا محمد علی اور حکیم اجمل خاں باتیں کر رہے تھے وہ بہت امید افزا حالات بتاتے تھے

روح:۔ اُن کے زمانے تک تھے، اب نہیں ہیں۔

فرشتہ:۔ وجہ؟

روح:۔ "بھائیوں میں بگاڑ ہو جن کے + ایسے لوگوں کو کیا سراہوں میں"

فرشتہ:۔ مگر کیا یہ بگڑنا ایسا نہیں جس کا انجام بنناہو،

روح:۔ نہیں!

فرشتہ:۔ کیا بد انجامی کا خوف ہے، روح:۔ ضرور!

فرشتہ:۔ مگر کیوں، کیا وہ ایک ہی آسمان کی بارش اور ایک ہی زمین کی پیداوار سے مستفید نہیں ہوتے؟

روح:۔ کیوں نہیں ہوتے!

فرشتہ:۔ کیا وہ وہاں کے دریاؤں کا مل کر ایک جان ہونا نہیں دیکھتے؟

روح:۔ دیکھتے ہیں!

فرشتہ:۔ کیا وہ ایک ہی آب و ہوا میں سانس نہیں لیتے؟

روح:۔ لیتے ہیں!

فرشتہ:۔ گویا وہ ایک ہی ماں کا دودھ پینے والے دو بھائی ہیں؟

روح:۔ بیشک!

فرشتہ:۔ اور بھائی بھائی کے درپے آزار ہے؟ روح:۔ نہیں، جان کا خواہاں ہے!

فرشتہ:۔ یہاں تو وہ خطۂ "جنت نشان" کے نام سے مشہور ہے، گویا اس کے گلزار، اس کے آبشار اور اس کی بہاریں سب یہاں کی سی ہیں، مگر تمھاری باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ "جہنم نشان" ہوگا

روح:۔ کچھ کچھ ایسا بھی ہے اور ویسا بھی۔ فرشتہ:۔ ویسا تو ہوا مگر ایسا کیسے؟

روح:۔ ایک ایک کے خون کا پیاسا، ایک ایک کی جان کا خواہاں!

فرشتہ:۔ یہ کیوں؟

روح:۔ جیسے یہاں ہر ایک روح اپنی نیک اعمالی کی بنا پر محتشم سمجھی جاتی ہے، وہاں ایسا نہیں۔

فرشتہ:۔ پھر وہاں کیا ہے؟

روح:۔ نیک ہونا تو وہاں ذلیل و خوار اور مردودِ خلائق ہونے کے مترادف ہے۔

فرشتہ:۔ تو پھر وہاں معیارِ عزت کیا ہے؟

روح:۔ سیم و زر ہے وہاں کا معیار، اِن دھاتوں کے گول گول ٹکڑے کاٹ لیتے ہیں، جس کے پاس

زیادہ ہوں وہی سب سے زیادہ معتبر اور معزز ہوتا ہے۔

فرشتہ:- باقی؟ روح:- اللہ اللہ خیر سلا

فرشتہ:- مجھے پھر مولانا محمد علی کا قول رہ رہ کر یاد آتا ہے، وہ تو حالات اُمید افزا بتاتے تھے، اور حکیم صاحب بھی خوش معلوم ہوتے تھے۔

روح:- اِن دنوں تو وہ اُمید افزا حالات اور خوشی کالعدم ہو چکی ہے۔

فرشتہ:- بالکل! روح:- قطعًا!

فرشتہ:- افسوس، صد افسوس (جاری رکھکر) تمھاری موت کیسے واقع ہوئی؟

روح:- داعیِ اجل نے دعوت دی، فرشتہ:- مادّی سبب بتاؤ۔

روح:- ضروریاتِ زندگی کا فقدان، فرشتہ:- اس اجمال کی تفصیل؟

روح:- ہوش سنبھالا تو حصولِ رزق کے لئے کسی جگہ خدمت حاصل کرنی پڑی، مگر اُس کا معاوضہ نہایت قلیل تھا۔ اِسی دوران میں مَیں نے زندگی کی بے چینیوں کو ذرا تسکین دینے کے لئے ایک رفیقہ حیات کی معیت حاصل کی، وہ تکلیف میں صبر کی لذت سے ناآشنا تھی، میری خدمات کا معاوضہ وہی رہا زندگی اجیرن ہو گئی، اکثر مَیں سمجھا کہ زندگی ہی میں مالکِ دوزخ کے حوالے کر دیا گیا۔ (روح کی آنکھیں پُرنم ہوتی ہیں) (فضا میں کاتبانِ اعمال اُڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اُن کی آواز......)

"سچ ہے، درست ہے، ٹھیک ہے"

روح:- میرے شجرِ حیات میں پھل آنے شروع ہوئے۔ ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔ پانچ۔ چھ۔ سات۔ آٹھ۔ نو (کاتبانِ اعمال کی آواز.....) "سچ ہے۔ درست ہے۔۔ ٹھیک ہے"

روح:- میری خدمات کا معاوضہ وہی رہا۔

فرشتہ:- افسوس، کاتبانِ اعمال، حق ہے، راست ہے"

فرشتہ:- تم بے چین رہتے ہوگے؟ روح:- بے انتہا!

فرشتہ:- پھر کیا ہوا؟ روح:- مَیں نے بُزرسی کو اپنا شعار بنالیا۔

فرشتہ:- کیسے؟

روح:- پہلے میوہ کا استعمال ترک کر دیا، پھر دُودھ کو خیرباد کہا۔

فرشتہ:- پھر؟

روح:- سر میں تیل ڈالنا ترک کیا، اور گوشت کھانا چھوڑا، تاکہ معصوم بچے تکلیف نہ اُٹھائیں۔ بھوک

سے جو مرض پیدا ہوتے ہیں اُن کا شکار نہ ہو سکیں۔

فرشتہ :۔ افسوس صد افسوس۔ (کاتبانِ اعمال کی آواز) "درست ہے، سب سچ ہے۔"

روح :۔ میرے چہرہ کی رنگت دن بدن زرد ہوتی جارہی تھی، میرا وزن آہستہ آہستہ کم ہو رہا تھا۔

فرشتہ :۔ پھر؟

روح :۔ سردیوں میں سرد لباس پہننے لگا، تاکہ بچوں کو گرم لباس مل سکے۔

روح :۔ آئینہ میں چہرہ دیکھنے سے مجھے کسی اجنبی کا چہرہ معلوم ہوتا تھا۔

فرشتہ :۔ رفیقۂ حیات کی معیت سے کچھ طبیعت کی بے چینی کو تسکین تو ہوئی ہوگی؟

روح :۔ وہ اُلٹا سوہانِ روح ثابت ہو رہی تھی۔

فرشتہ :۔ ایسا کیوں تھا؟

روح :۔ وہ زبان کی لذت اور آرایش و زیبائش کی میری زندگی سے زیادہ خواہشمند تھی، بچپن سے اُس کی تربیت ہی ایسی تھی۔

فرشتہ :۔ کیا وہ نسائیت کی حقیقی خوبیوں سے کوری تھی؟

روح :۔ قطعاً!

فرشتہ :۔ تم جیتے جی جہنم میں تھے، افسوس۔ (کاتبانِ اعمال) "درست ہے، یہ سب سچ ہے۔"

فرشتہ :۔ پھر؟

روح :۔ خدمات میں اپنی بساط سے بڑھکر ادا کرنے لگا۔

فرشتہ :۔ کچھ فائدہ ہوا؟ روح :۔ خاک! میری تمام خدمات کا معاوضہ وہی رہا

روح :۔ گوشت ترک کرنے کے بعد میں نے گھی سی گراں چیز کو بھی چھوڑا،

فرشتہ :۔ کیا گنگا کے میدانوں اور پنجاب کے سبزہ زاروں کے ہوتے ہوئے گھی وہاں نہیں ملتا؟

روح :۔ خالص کا فقدان ہے، نسخوں میں ڈالنے کو نہیں پا سکتے۔

(کاتبانِ اعمال) "سچ ہے، بالکل درست ہے"

فرشتہ :۔ ایک نعمتِ خداوندی سے محرومی!! افسوس ہے، (ٹھہر کر) پھر؟

روح :۔ ہوبہو، ایسی ہی ایک مصنوعی شے ملتی تھی، اصل نقل میں فرق نہ تھا، مگر تاثیر میں وہ زہر اور یہ آبِ حیات، میں نے اس کا استعمال شروع کیا۔

فرشتہ :۔ مرتا کیا نہ کرتا۔

روح :- میرے جسم کی حرارت بڑھنے لگی، مصیبت زدہ جسم مرض کی آگ میں جھُلسنا شروع ہوا۔ (ٹھہرکر)
میری خدمات کا معاوضہ وہی رہا۔

فرشتہ :- افسوس،

روح :- وہ مصیبتیں یاد کرکے میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ جسم میں کپکپی شروع ہوتی ہے۔ قصہ مختصر ایک خیراتی اسپتال کے مستند ڈاکٹر نے میرے مرض کا ہاتھ بٹایا اور میں آپ کے سامنے حاضر ہوا (بچوں کے رونے اور بیوہ کے بین اُس وقت سنائی دیتے ہیں، فضا میں ایک تبسم پیدا ہوتا ہے، آسمان سے ایک فرشتہ اُترتا دکھائی دیتا ہے۔ آسمانی فرشتہ پہلے فرشتہ سے کہتا ہے) بارگاہِ قدس کا حکم سنو" (سب خاموش ہو جاتے ہیں) اس روح نے دنیا میں سخت تکلیفیں اُٹھائی ہیں۔ برادرانِ وطن کی، اعزا کی، اپنے رازقانِ مجازی کی، یاد دلا کر اسے بے چین نہ کرو۔ یہ دنیاوی جہنم میں کافی رہ چکی ہے، اسے فوراً بہشت میں بھیج دو۔ (دو حوریں غیب سے نمودار ہوتی ہیں، اپنے بازوؤں کا جھولا بنا کر پروں کا سایہ کرکے روح کو جھُلاتی اور ہلاتی ہوئی لے جاتی ہیں۔ (حوروں کا گانا)

دُکھ درد کو دل سے بھلاؤ۔ آؤ آؤ
نعمت کے لئے، رحمت کے لئے، راحت کے لئے، دامن اپنا پھیلاؤ۔ آؤ۔ آؤ۔
سُبحان سے تم، ذی شان سے تم، رحمان سے تم، انعام اب اپنا پاؤ۔ آؤ۔ آؤ۔
تکلیفوں کو، تخویفوں کو، اب رضوی دل سے مٹاؤ۔ آؤ۔ آؤ۔

رُباعیات

(از پادری ایس۔ اے سنگھ شارق بارہ بنکی)

ہنستا ہے کہیں کوئی کسی کو غم ہے
دم بھر میں بدلتا ہے یہ وہ عالم ہے
اِس دہر دو رنگ کے ہیں نیرنگ یہی
شادی ہے اگر آج تو کل ماتم ہے

انساں نہ کہو اُس کو جو غمخوار نہیں
اوروں کا مصیبت میں مددگار نہیں
وہ نخلِ بریدہ ہے یہ شارق جس میں
کچھ بھی تو اُمیدِ گل و اثمار نہیں

ابو ابن ادہم اور فرشتہ

(ترجمہ از حضرت طالب)

خواب راحت سے جگا ابن ادہم جو ایک رات — رہے خدا سے یہ دعا اُس کا قبیلہ ہو کثیر
چاندنی رات تھی، ہر سُو تھا سکونِ کلّی — اُس کے کمرے میں ضیا پاش تھا یوں ماہِ منیر
چادرِ آب پہ جیسے کہ کنول ہوں پھولے — تختۂ خاک پہ یا جیسے برستا ہو شیر
ایک فرشتہ لئے بیٹھا تھا صحیفۂ زرّیں — جس میں کرتا تھا وہ کچھ راز کی باتیں تحریر
دیکھا اُس کو تو ابو ابن ادہم نے پوچھا — اُس صحیفہ میں یہ کیا کرتے ہیں حضرت تسطیر
سُن کے یہ بات فرشتے نے اُٹھایا سر کو — خندہ رُوئی سے جواباً ہوا گرمِ تقریر
اِس صحیفہ میں رقم کرتا ہوں اُن بندوں کے نام — جو دل و جان سے ہیں شیدائے خداوندِ قدیر
پوچھا اُس سے یہ ابو ابن ادہم نے کہ بتاؤ — "نام میرا بھی صحیفہ میں کہیں ہے تحریر"
"آپ کا نام نہیں اس میں" فرشتہ نے کہا — بولا بو ابن ادہم "خیر، یہ اپنی تقدیر
اُن کی فہرست میں ہاں نام مرا کردو رقم — نوعِ انساں سے وفا جن کی ہے فطرت کا خمیر"
نام لکھ کر وہ فرشتہ ہوا نظروں سے نہاں — دوسری رات جو آیا تھی مضاعف تنویر
تھے جو مخمورِ الست اُن کے دکھائے سب نام — سب کی پیشانی پہ "بو ابن ادہم" تھا تحریر

غزل

(از حضرت طالب)

ایکہ کردی بغلط یک نگہِ ناز بمن — بہرِ تصحیح غلط کن نگہے ناز بمن
بسکہ دارد سرِ مہر آں بتِ طناز بمن — میکند جور و ستم بیش ز اندازہ بمن
دست برگیر ز پیمانہ و پرکن قدحم — ساقیا بس نکند بادہ باندازہ بمن
با کہ بودی و چہ کردی و چہ آمد بسرت — نرگسِ چشمِ تو کل کرد عیاں راز بمن
مژدۂ فصلِ بہارم چہ دہی بادِ صبا — نیست از بندِ قفس رخصتِ پرواز بمن
بر ستمگریِ آں چشمِ فسوں ساز مناز — ور سخن دادہ خدا طاقتِ اعجاز بمن
رو بمستی بگذار ایں نفسی چند کہ ہست — از درِ دیرِ مغاں آمدہ آواز بمن
پا نہادم بر ہِ عشق و از جاں رفتم — کے خبر بود ز انجام بآغاز بمن
دید سرمستِ سخن حافظِ خوشگو چو مرا — داد طالب ز خمش بادۂ شیراز بمن

* یہ نظم Leigh Hunt کی مشہور نظم Abou Ben Adhem and the Angel کا ترجمہ ہے۔

ماتمِ ٹیگور

(منشی رگھوناتھ سہائے شاطر میرٹھی ایم۔اے، ایل۔ٹی)

حیف صد حیف وہ جہاں نہ رہا — "وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا"
سر پہ طاری ہیں ابرہائے سیاہ — نورِ خورشید ضو فشاں نہ رہا
ظلمتِ شب، ہوائے طوفاں خیز — اور سفینہ پہ بادباں نہ رہا
ایسا ٹوٹا وطن پہ غم کا پہاڑ — ہند میں کوئی شادماں نہ رہا
رو ہمالہ کہ دوسرا تجھ سا — ملک کا کوئی پاسباں نہ رہا
مادرِ ہند رو لے جی بھر کے — تیرا دلبند جانِ جاں نہ رہا
اے فنونِ لطیفہ رو لو تم — اب تمہارا وہ قدرداں نہ رہا
رودِ گنگا بہا لے جا آنسو — تیرے ساحل کا قدرداں نہ رہا
چھایا دنیا پہ ماتمِ ٹیگور — تھا جو پہلا وہ آسماں نہ رہا
پھول، پتّے، شجر ہیں سب خاموش — باغ میں مرغِ نغمہ خواں نہ رہا
سیلِ دریا ہے خود سراپا اشک — آج قدرت کا ہمزباں نہ رہا
شور و شیون میں ہیں زمین و زماں — آج محبوبِ انس و جاں نہ رہا
پھول پژمردہ، بلبلیں خاموش — باغ کا کوئی باغباں نہ رہا
بے سُری ہے ستار کی جھنکار — اب وہ سنگیت کا سماں نہ رہا
تیغِ دردِ وطن کا وہ مجروح — آج ٹیگورِ خستہ جاں نہ رہا
شاعرِ بے نظیر و جادو بیاں — نکتہ آموزِ نکتہ داں نہ رہا
مرتے دم تک تھا جس کے لب پر شعر — شعر کا اب وہ جسم و جاں نہ رہا
ہو گئی بزمِ شعر تیرہ و تار — شعلۂ شمعِ شاعراں نہ رہا
قافلہ کس طرح بڑھے آگے — "کوئی سالارِ کارواں نہ رہا"
کس پہ پروانے سر دھنیں اپنا — بجھ گئی شمع اور دھواں نہ رہا
اب کہاں جائیں سجدہ کرنے ہم — اپنا مخصوص آستاں نہ رہا

کون کھولے گا رازِ سربستہ — غیب کا کوئی رازداں نہ رہا
کس طرح فلسفہ کی ہو تفسیر — وہ حقیقت کا ترجماں نہ رہا
عقل و دانش کے گھر کا چشم و چراغ — علم کا بحرِ بے کراں نہ رہا
جس کے آگے تھی سرنگوں دنیا — آسمانوں کا آسماں نہ رہا
جس کی پیری میں بھی تھا رنگِ شباب — نوجوانوں کا نوجواں نہ رہا
جس کی عظمت کے تھے نمونے پہاڑ — کہستانوں کا کہستاں نہ رہا
اے اجل جس پہ دانت تھا تیرا — آہ! وہ چشمِ دوستاں نہ رہا
موت تیرا بگاڑا کیا ہم نے — جو ہمارا وہ مہرباں نہ رہا
مل گیا کیا تجھے بتا اے مرگ — ایک اگر پیرِ ناتواں نہ رہا
آج مرگھٹ کو لے چلے احباب — دوستداری کا اب زماں نہ رہا
کر دیا جسم بھی چتا نے نوز — اب کوئی خاک کا نشاں نہ رہا
اے فلک تاکتا ہے تو اب کیا — جل گیا میرا آشیاں نہ رہا
پتہ پتہ اجاڑ کر خوش ہے — اب تو کچھ باغ میں، خزاں! نہ رہا؟
بیٹھا قاتل کا آج پورا ہاتھ — روز کا خوفِ امتحاں نہ رہا
دل کو غم نے مٹایا، خوب ہوا، — ساتھ دل کے غمِ نہاں نہ رہا
پیسا گردوں نے لیسا آخر کار — نام کو نامِ استخواں نہ رہا

تیرے ماتم میں شاطرِ ناچیز
مٹ گیا ذرہ کا نشاں نہ رہا

غزل

(اکرام اللہ تنہا قریشی، ایاز وکیٹ گوالیار)

اس عالمِ آشنا کی نہیں ہے نظر کہاں — تجھ کو چھپائے دامنِ شام و سحر کہاں
ہر سنگِ رہگذر ہے ترا سنگِ در کہاں — پیدا ابھی ہوئی وہ جبین و نظر کہاں
وارفتۂ وفا کو ہے اتنی خبر کہاں — لوحِ جبیں کہاں ہے، ترا سنگِ در کہاں
روپوش تم تو جلوہ دکھاتے ہی ہو گئے — یہ تو بتاؤ جائیں خرابِ نظر کہاں
اُن کا ہی کچھ نشاں ہے نہ میرا ہی کچھ پتہ — گمراہیوں میں چھوڑ گیا راہبر کہاں
کہدو کہ گلستاں میں نہ آیا کرے بہار — اب خوں فشانیوں کے لئے ہے جگر کہاں
دردِ آشنا تنہا نہ ہوا کوئی چارہ ساز — دل میں چھپا ہوا تھا وہ تیرِ نظر کہاں

قدرت کا عجیب ترین مخلوق، انسان

(حضرت اقبال ورما سحر ہتگامی مرحوم)

کائنات میں بوالعجبی ہے، یہ بوالعجبی ہی اس کی ہستی اور کشش کا سبب ہے، کائنات کی ہر چیز ایک نجی وجود رکھتی ہے۔ یہی وجود جہاں چیزوں کو ایک دوسرے سے الگ کرتا ہوا اُن میں ایک افتراق آمیز بوالعجبی پیدا کرتا ہے وہاں ساتھ ہی ساتھ اُن میں ایک بوالعجبی والی کشش بھی۔ اس کشش کا حُسن و قبح سے کوئی لگاؤ نہیں، کم سے کم اُس نگاہ کے لئے جسے ہم عام نگاہ کہہ سکتے ہیں۔ ہاں خاص نگاہوں کو تو حُسن کا پہلو ضرور ہی نظر آتا ہے، وہ حُسن جو خالقِ کل کی بے مثال صنعت میں مضمر ہے۔ خیر، جاندار ہو یا بیجان، اس بوالعجبی اور کشش سے کوئی بھی مستثنیٰ نہیں۔ مگر ہر حالت میں اُسے محسوس کرنے والا تو جاندار ہی ہوا کرتا ہے، یہ اور بات ہے کہ کبھی کبھی کسی چیز کو برابر دیکھتے رہنے کی عادت سے اُس احساس میں کچھ خلل واقع ہو، مگر ویسی عادت نہ ہونے پر تو ویسا احساس ہو کر ہی رہتا ہے، خواہ وہ خوف و نفرت پیدا کرنے والے طریقے پر ہی کیوں نہ ہو۔ یہ طریقہ بھی تو کشش سے خالی نہیں ہے۔

ابھی تک تو ہم نے جو کچھ کہا ہے وہ ساری کائنات اور اُس کی سبھی چیزوں کے تعلق سے اور وہ بھی اس بوالعجبی کی ہمہ گیری دکھانے کے لئے۔ یوں تو اس مضمون کے عنوان کا خیال رکھتے ہوئے بیجان ہستیوں کا ذکر موضوع کے خلاف ہے۔ اب رہی جانداروں کی بات، تو اس میں بیشمار طبقے ہیں جیسا کہ غیر جانداروں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اب اگر ہم انسان کو تھوڑی دیر کے لئے الگ کر دیں تو یہ ضرور معلوم ہوگا کہ دنیا کے باقی طبقے بھی خود اپنے میں اپنا نجی فرق اور عجیب پن رکھتے ہوئے کچھ اتنی زیادہ یکسانیت بھی رکھتے ہیں کہ اکثر اُن کی پہچان میں دھوکا ہو جاتا ہے۔ اس دھوکے کا سب سے کم امکان اگر کہیں ہے تو صرف انسانوں میں، جو اعضا کی یکسانیت کے باوجود اپنی مختلف صورتوں سے اپنے فرق یا عجیب پن ہی کا زیادہ پتہ دیتے ہیں۔ اس طرح انسان نہ صرف کائنات کے دیگر طبقوں کے مقابلہ میں عجیب و غریب ہے بلکہ خود اپنے طبقہ میں بھی اُس خصوصیت کی ایک جیتی جاگتی نظیر بنا ہوا ہے۔ یہ اُس کے عجیب ترین مخلوق ہونے کا ایک موٹا سا ثبوت ہے۔

کل جانداروں کی بناوٹ ایک ہی قسم کے عناصر سے ہوئی ہے، سبھی میں جان ہے، سبھی زندگی اور موت میں ایک ہی قدرتی قانون کے تابع ہیں۔ سبھی کائنات کی تکمیل کے خیال سے اپنی اپنی جگہ اپنی اپنی

اہمیت رکھتے ہیں۔ اس طرح وہ سبھی آپس میں برابری کا دعویٰ بھی کر سکتے ہیں، پھر بھی دیکھنے میں تو یہی آتا ہے کہ انسان کے مقابلہ میں دیگر جانداروں کی برابری کا تو ذکر ہی کیا، وہ سبھی اس ایک کے پاسنگ بھی نہیں ٹھہرتے۔ یوں تو طاقت یا قد و قامت کے خیال سے انسان کوئی غیر معمولی جاندار نہیں، بلکہ وہ زیادہ تر معمولی جانداروں سے بھی کمتر و حقیر تر ہے۔ پھر بھی اس میں کوئی ایسی بات ضرور ہے جو اسے اس قابل بنا رہی ہے کہ وہ خود عجیب ترین کے ساتھ افضل ترین ہونے کا مجسم گواہ بنا ہوا ہے۔ اس کی اس آخری صفت میں اتنی زیادہ بوالعجبی ہے کہ جہاں انسانی زندگی سب سے زیادہ بیش قیمت سمجھی گئی ہے وہاں اس زندگی کا عملی اثر بھی کچھ ایسا ویسا نہیں ہے۔ اس میں اتنا بل اور پھیلاؤ ہے کہ پوری دنیا کا رخ بدل دینا، اسے من مانی ریت پر بنا کر دکھا دینا، انسان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اس کھیل میں انسان کی شخصیت اس قدر آشکارا ہو جاتی ہے کہ اور سبھی جاندار بالکل مخفی یا نہ ہونے کی شکل میں ہو جاتے ہیں اور ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ انسان ہی سب کچھ ہے اور ساری خدائی اسی تک محدود ہے! پھر جوں جوں وہ کھیل بڑھتا جاتا ہے دنیا زیادہ زیادہ تعجب آمیز بنتی جاتی ہے انسان خود ہی حیرت کا سامان مہیا کرتا اور خود ہی حیرت میں مبتلا ہوتا ہے۔ بشپ آف ونچسٹر کا قول ہے کہ "قدیم زمانہ کو دیکھتے ہوئے موجودہ زمانہ حیرت انگیز طور پر زیادہ دلچسپ اور خوفناک ہے۔" اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ قدرت کے قانون یا عمل میں کوئی جدت آگئی ہے، وہ تو سدا ہی جوں کا توں رہتا ہے، مگر انسانی کھیل کا نیاپن اس پر بھی اپنا رنگ چڑھاتا ہوا اور عجیب کو عجیب تر سا بناتا ہوا معلوم ہوتا ہے، خواہ وہ رنگ دلچسپ ہو یا خوفناک یا دونوں کا ملا جلا نمونہ۔

آخر بات کیا ہے؟ گیان انسانوں میں بھی ہوتا ہے اور دوسرے جانداروں میں بھی، فرق بھی ہے اور جانداروں کا گیان عمومیت کے ساتھ اور قانونِ قدرت کی پابندی کرانے کے لئے ہے، جیسے کہ انسانوں کا گیان خصوصی اور اس قانون کے ماننے یا نہ ماننے کی پابندی سے آزاد ہے۔ یہ خالق کل کا قصور کہا جا سکتا ہے، مگر ایسا کہنا درست نہیں، انسان میں برابر ترقی کرتے رہنے کا مادہ ہے جس کے لئے اسے قدرتاً زیادہ گیان کی ضرورت ہے، مگر گیان کی یہ زیادتی جہاں اس سے قانون قدرت کی سختی کے ساتھ پابندی کراتی ہوئی ترقی کے راستے میں بڑھا کر اسے انتہائی بلندی تک پہونچا سکتی ہے وہاں اسے شکست بھی ہوتی ہے کہ وہ اس قانون کے خلاف ورزی کرتا ہوا پستی کے غار میں جا گرے۔ بوالعجبی دونوں میں ہے، مگر پہلی حالت میں وہ انسانی حیات کا تدریجی اور لازمی نتیجہ ہونے کے سبب معمول کے مطابق ہی ہے اور دوسری میں اس کے برخلاف ہونے کے سبب معمولی سے بھی برخلاف ہے۔ یہ تو ظاہر

ہی ہے کہ انسانوں اور دیگر جانداروں میں کھانے پینے اور رہنے سہنے کی بہت سی باتوں میں بہت کچھ یکسانیت ہے۔ اس لئے جب انسان عام اور خاص گیان کی شمولیت سے کام لیتا ہوا قانونِ قدرت کا سختی کے ساتھ پابند ہوتا ہے تو جہاں وہ کتنے ہی اُموریں دوسرے جانداروں کی تقلید کرتا ہے وہاں خود بخود ترقی کرتا ہوا اُن سے بالاتر بھی ہو جاتا ہے بشہرۂ آفاق انگریز مصنف ٹامس کارلائل صاحب فرماتے ہیں "خود قدرت کی باطنی تحریک، کچھ ویسی تحریک جو جنگلی جانوروں کو اُن کی خوراک کی طرف مائل کرتی ہے، یہ بتلاتی ہے کہ ہمیں کیا کرنا اور کیا نہ کرنا چاہیئے ..... ساری قوتوں کے باہمی توازن اور عمل میں اپنا منصفانہ توازن قائم رکھنے سے کُل انسانی اور غیر انسانی ہستیوں کے متعلق ایک منصفانہ احساس کا ظہور ہوتا ہے اور اسی میں انسان کی برتری ہے مگر وہ تو یوں ہی خود کو برتر کہنے کا عادی ہے۔ ایسا کہنا عام رواج اور چلن کے مطابق خواہ سچ بھی ہو مگر واقعی وہاں ایسی گہری گراوٹ بھی موجود ہے کہ وہ ساری نام نہاد بلندی پستی ہی میں جذب ہو کر رہ جاتی ہے نتیجہ یہ کہ انسان دوسرے جانداروں کے مقابلہ میں افضل ترین ہونے کے بجائے اسفل ترین ہی ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ اس بات کو جانتا یا جان سکتا ہے، مگر اس کا اپنا پیدا کیا ہوا یا پشتہا پشت سے ترکہ میں پایا ہوا خیال اتنا زبردست ہے کہ خود اُونچا ہو کر بھی اُسے بالعموم نیچ ہی بنکر رہنے میں مزہ آتا ہے۔ اور جوں جوں مزہ آتا ہے وہ زیادہ زیادہ نیچ بنتا جاتا ہے۔ یہ بوالعجبی نہیں تو اور کیا ہے؟

تو معلوم ہوا کہ برتری یا بلندی کے لئے صرف گیان کی بلندی نہیں، بلکہ خیال اور عمل کی بلندی کا ہونا بھی ضروری ہے۔ دوسرے لفظوں میں بلندی یا پستی کا انحصار بھلائی یا بُرائی پر ہے۔ یہ دونو باتیں دیگر جانداروں میں بھی ملتی ہیں مگر بالکل قدرتی طریقہ پر، جس سے یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ وہ بالکل بے اثر ہیں البتہ اُن میں ایک تخلیقی عمومیت ضرور ہے۔ انسان کا گیان اس کو کہیں زیادہ زبردست بنا دیتا ہے اور ساتھ ہی اُس پر ذمہ داریوں کا بھی کافی بوجھ ڈالتا ہے۔ مگر اس ایک بات میں تو وہ اپنے گیان کی پروا نہ کرتا ہوا دیگر حیوانوں ہی کی تقلید کرنا پسند کرتا ہے اور بوجھ کو برداشت کرنے کے بجائے اُس سے ہلکا ہونے ہی کی برابر کوشش کرتا رہتا ہے۔ بوجھ کو اُٹھائے رہنا بھلا پسند ہی کس کو ہو سکتا ہے؟ اُسے یہ خیال نہیں آتا کہ آنکھ بند کر کے کسی کی تقلید کرنا اُس کا فطری خاصّہ نہیں اور ایسا کرنے میں اُس کی ہستی اور ذلت ہے۔ نتیجہ یہ کہ وہ اپنے میں انتہائی نیکی کی سکت رکھتے ہوئے بھی انتہائی بدی پر آمادہ رہتا ہے، انگریزی کی مشہور و معروف ناولسٹ میری کوریلی صاحبہ نے اپنے زسکا نامی ناول میں ایک جگہ لکھا ہے:-

"انسان! کُل برائیوں کا نچوڑ اور کُل بھلائیوں کا امکانی وجود! مگر بھلا طاقتور اور کام میں مصروف ہے، جبکہ دوسرا محض خواب ہے، جو دیکھتے ہی دیکھتے ہَوا ہو جاتا ہے۔" ہم ہمیشگی کے خیال سے کوریلی کی ان دونو

باتوں سے متفق نہیں۔ یقیناً انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ حالاتِ حاضرہ سے متاثر ہوکر ہی، ممکن ہے کہ کبھی اُنکی یہی باتیں بالکل اُلٹ کر کہی جاسکیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ انسان بھی اپنی بناوٹ میں ایک حیوان ہے مگر انسانی گیان حیوانی رغبتوں کو دبا بھی سکتا اور مٹا بھی سکتا ہے۔ بہرحال انسان حیوان بنکر جہان کو بُرا بھی بنا سکتا ہے اور انسان بنکر بھلا بھی۔ مگر آخری حالت میں اُس کی بوالعجبی میں بہت کچھ فطری خاصہ کی بات بھی آجاتی ہے

انسان کی موجودہ بوالعجبی وقتی ہلچل اور بے چینی پیدا کرنے والی بھی ہے۔ یوں تو قدرت میں ہر جگہ بے چینی ہے جس کے سبب میں جاندار اور بیجان دونوں شامل ہیں، مگر ساتھ ہی اُس بے چینی میں اتنا توازن بھی ضرور ہے کہ ماحول میں ظاہرا بے چینی کے آثار نہیں پائے جاتے۔ مختصر یہ کہ قدرت کے اضطراب میں بھی ایک سکون ہے، اس لئے کہ ویسا ہونا بالکل قدرتی امر ہے۔ اس لئے کہ وہ ایک ایسا معمول یا ایسا سادہ عمل ہے جو خود بخود سدا ہی ہوتا رہتا ہے، اس لئے کہ قدرت اپنی سکون پسندی ہی کو کھُلے طور پر دنیا کے سامنے رکھتی ہوئی اُسے ویسا ہی سبق بھی دینا چاہتی ہے۔ مگر انسان کے لئے قدرت سے کچھ سیکھنا تو درکنار وہ اُلٹا اُسے اضطراب کا سبق دینا چاہتا ہے، اور بالآخر اپنی اس مذموم کوشش میں ناکام رہکر ذلیل و رسوا اور خود مضطرب ہوتا ہے! دنیا کے پُرسکون ماحول میں اضطراب کی ہلچل صاف طور پر برابر دکھائی دینے لگتی ہے اور پھر وہی ہلچل خود ہر طرف پھیلتی ہوئی اس امر کا اعلان سا کرنے لگتی ہے کہ اب انسان ناکامیاب ہوکر راہِ راست پر آرہا ہے، وہ راہ ہے امن اور سکون پسندی کی، یہی خاصہ انسان میں ہے بھی، ورنہ وہ اضطراب انگیز کاموں کو کرتا ہوا بھی امن پسندی کا ڈھنڈھورا کیوں پیٹتا پھرتا؟ حقیقتاً انسان ہے ایک مجلسی جاندار، یہ جذبہ اور جانداروں میں بھی کم و بیش حالت میں کہیں کہیں پایا جاتا ہے۔ اب عجیب بات دیکھیئے، اور جاندار تو اپنے سبھاؤ کے موافق اپنے میں تھوڑا بہت سنگھٹن پیدا کرکے اپنے سماجی خاصہ کو نبھاتے بھی رہتے ہیں مگر انسان اپنے ہی طبقہ میں لوٹ کھسوٹ، مارکاٹ، چھوت چھات وغیرہ کے تماشے رچ کر اپنے اُس قدرتی خاصہ کی ہنسی ہی اُڑاتا رہتا ہے۔ اگرچہ اس کا ذمہ وارانہ فرض تو یہی چاہتا ہے کہ وہ اپنے اُسی خاصہ کے پُرسکون ماحول میں دوسرے جانداروں کو بھی بلاتامل داخل کرلے

مگر ایسا کب ہوگا؟ جب انسان اپنی انسانیت والے جذبے سے پورا کام لے گا۔ جب وہ انسانی گیان کو انتہائی حد تک پہونچا دے گا۔ جبکہ وہ اپنے گیان والی آنکھ سے نزدیک ہی نہیں بلکہ دُور دور تک دیکھنا سیکھے گا۔ جب وہ صرف مادّی ترقی کو کافی نہ سمجھکر روحانی ترقی کی جانب رجوع ہوگا، جب وہ دنیا سے عقبیٰ کا سبق لے گا۔ جب وہ خدائی سے خدا کا احساس کرسکے گا! اس کوشش کے دوران میں وہ یہ محسوس کریگا کہ جہاں اپنتک اُس کے حواس کی آسودگی ہوہی تھی جس کا پورا ہونا بالکل ناممکن ہے، وہاں

اب اُس کی روح کی آسودگی ہورہی ہے، اور اس احساس کے ساتھ کہ وہ کسی وقت پوری بھی ہوجائیگی اور جہاں وہ ابتک دُکھ کو سُکھ اور زوال کو کمال یا پستی کو بلندی سمجھے ہوئے تھا وہاں اب اُسے واقعی سُکھ مل رہا ہے اور وہ یقیناً بلندی اور کمال کی طرف جارہا ہے۔ جہاں وہ ابتک دنیا کو دنیا جانتا تھا، وہاں اب وہی دنیا جنت بن رہی ہے، جہاں وہ ابتک صرف انسان تھا وہاں اب دیوتا بن رہا ہے!

مگر ابھی تک تو اُس کا کسی ایسی کوشش سے لگاؤ بھی نہیں۔ وہ اہل ہوتے ہوئے بھی نااہل اور دانا ہوتے ہوئے بھی نادان بنا ہوا ہے! کوریلی صاحبہ اپنے اُسی ناول میں لکھتی ہیں: "کوئی بندر اپنے دُم کے سہارے درخت سے لٹکا ہوا ایسا مورکھ نہیں نظر آتا جیسا مورکھ پن کی مورت انسان! کیونکہ انسان کو علم حاصل کرنے اور اُسے ترقی دینے کے تمام ذرائع دیئے گئے ہیں۔ یہ عظیم کائنات اپنے لوک اور پرلوک والے روزانہ اسباق کے ساتھ ایک کھلی کتاب بنی ہوئی ہے۔ مگر جب نہ وہ اُسے پڑھتا اور نہ اُس پر دھیان دیتا ہے بلکہ اُس کے بنانے والے تک کو ماننے سے صاف انکار کرتا ہے تو پھر سنسار بھر میں اُس سا مورکھ دوسرا ہو ہی نہیں سکتا۔" علم اور اُس کی ترقی کے وسائل رکھتے ہوئے اپنی شخصیت کو نادانی کا مجسمہ بنا لینا، یہ انسان ہی جیسے عجیب ترین مخلوق کا کام ہے!

اُس نادانی کا ردّعمل ہو رہا ہے، دنیا بھر میں ہلچل مچی ہوئی ہے۔ اس کے مٹانے کی تدبیریں سوچی جا رہی ہیں مگر نادانی سے سوچی ہوئی تدبیریں کارگر ہی کب ہوسکتی ہیں؟ وہ تو ماحول کو پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہی بناتی چلی جارہی ہیں۔ سوچتے سوچتے دماغ بھی تھکتا جا رہا ہے اور اُسی تناسب سے نادانی بھی بڑھ رہی ہے۔ عمل اور ردّعمل کا یہی سلسلہ جاری ہے۔ مستقبل بہت مشکوک و خوفناک ہے، قدرت کو دھوکا نہیں دیا جاسکتا، اُسے دھوکا دینا اپنے ہی کو دھوکا دینا ہے۔ دھوکے کا انجام بُرا ہے۔ لارڈ بیکن کا قول ہے: "یقیناً انسان اپنی جسمانی ساخت کے لحاظ سے حیوانی زمرہ میں ہے، اور اگر وہ اپنے روحانی وسیلے سے خدائی نوعیت میں شامل نہیں ہوتا۔ تو وہ ایک ذلیل اور کمینہ مخلوق ہی ہے۔" واقعی وہ مخلوق حیوانوں سے بھی حقیر و کمتر ہے۔ میری کوریلی نے بھی اپنے ونڈیٹا (انتقام) نامی ناول میں اسی امر کو اپنے دلچسپ اور مؤثر پیرایہ میں یوں واضح کیا ہے:-

"جسیم، سنگدل اور نادان شیر، جو اپنے بچاؤ کا ایک ہی ایماندارانہ ذریعہ اپنے دانتوں اور پنجوں کی صورت میں رکھتا ہے، اُس کو تے ہوئے، دو پیر اور چھوٹے قد والے کمینہ (انسان) کے جوڑ کا نہیں ٹھہرتا جو خود کو جھاڑیوں میں چھپا کر اُس اپنے سے بڑے جانور کے دل کو سیدھا اپنی بندوق کا نشانہ بناتا ہے۔ تاہم شیر کے لڑنے کا طریقہ زیادہ بہادرانہ ہے، توپیں، سُرنگیں اور جدید طریقۂ جنگ

کے دیگر آلات صرف انسان کی بزدلی اور بے رحمی کے نہیں، بلکہ اُس کی شیطانی حکمت کے ثبوت ہیں جب میں ٹھنڈے دل سے انسانی اور حیوانی زندگیوں میں مقابلہ کرتے ہوئے صرف اُن کے ٹھوس اوصاف پر منصفانہ غور کرتی ہوں تو میری رائے میں حیوان ہی زیادہ قدر و منزلت کا اہل قرار پاتا ہے!

بڑی عجیب بات ہے، مگر جب تک جسم روح پر حکمراں رہیگا، جب تک مادیت روحانیت پر غالب رہیگی تب تک یہ بوالعجبی بھی برابر قائم رہیگی۔ رفتار کے اُلٹتے ہی نادانی کا ناش ہوگا، عمل کی واپسی کا کام بند ہوگا، اور انسان انسان کہے جانے کا مستحق ہوگا۔ مگر اُس وقت اُس کی عجیب ترین بوالعجبی کا کیا ہوگا؟

اِس خیال سے انسان کو گھبرانے کی ضرورت نہیں، اُس کی یہ پشتہا پشت کی پیاری چیز کسی نہ کسی صورت میں تو سدا برقرار ہی رہے گی۔ البتہ وہ مخلوق کی دلچسپی اور تسکین کی چیز ہوگی، دل آزاری اور پریشانی کی نہیں۔ ایمرسن صاحب فرماتے ہیں:-

"انسان جسمانی اور دماغی طور پر ایک ایسی ہستی ہے جس کی ساخت اُن دھجیوں اور جوڑوں سے ہوئی ہے جو اُسے بھلے یا بُرے مورتوں سے نابرابری کے ساتھ ملے ہیں۔ اس طرح اُس میں شروع ہی سے ایک بے ڈھنگا پن ہے۔"

موصوف کی رائے کچھ بھی ہو مگر میرے خیال سے اس شروع والے بے ڈھنگے پن یا ازلی بدنمائی کا ازالہ بھی ممکن ہے، خصوصاً جہاں تک انسان کا انسانی اوصاف سے تعلق ہے۔ امرسن صاحب کا بیان مادیت کا پہلو لئے ہوئے ہے اور اُنھوں نے اُس روحانیت والے پہلو کا خیال ذرا بھی نہیں کیا جس میں برابری یا نابرابری کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ حصول کی کمی بیشی ایک جزو کا درجہ رکھتی ہے جس کا تعلق ایک ایسے کُل سے ہے جس میں کوئی خامی نہیں، اور جزو کے حصول کی کوشش انسان کو یقیناً اُس کُل کی طرف لے جائیگی جس کے حصول پر وہ آدمی سے دیوتا بن جائے گا۔ آدمی سے دیوتا اِس حالت میں بھی اُس کی بوالعجبی قائم رہیگی، اور وہ برابر "خلقت کا عجیب ترین مخلوق" ہی بنا رہیگا

موت

بحرِ غم میں پیر کے حیرت مجھے زندگی کا جو تھا حاصل مل گیا
یعنی اِک مدت بھٹک لینے کے بعد کشتیِ ہستی کو ساحل مل گیا

"بچّے سے"

پنڈت اندرجیت شرما۔ ماچھرہ ضلع میرٹھ

مرے پیارے ننھّے منّے
مرے چاند دل کے ٹکڑے

ترے پاس غم نہ آئے — تجھے فکر بھی نہ کھائے
نہ تجھے فلک ڈرائے — نہ تجھے زمیں ستائے
نہ تجھے کوئی رولائے — مری روح چین پائے

مرے پیارے ننھّے مُنّے
مرے چاند دل کے ٹکڑے

ترا دیس کا چلن ہو — تجھے قوم سے لگن ہو
تجھے غم ہو یا محن ہو — ترے سامنے وطن ہو
ترے پاس علم و فن ہو — مری روح بھی مگن ہو

مرے پیارے ننھّے مُنّے
مرے چاند دل کے ٹکڑے

ہو جگت میں تیری شہرت — ہو دلوں میں تیری عزّت
رہے پاک تیری طینت — ہو نصیب نیک سیرت
رہے دل میں جوشِ ہمّت — مری روح پائے راحت

مرے پیارے ننھے منّے
مرے چاند دل کے ٹکڑے

تجھے پاؤں فیض گستر — تجھے دیکھوں لطف پرور
ترا راستی ہو جوہر — ترا حُرّیت ہو زیور
ہو غریب یا تونگر — ترا فیض ہو سبھی پر

مرے پیارے ننھّے منّے
مرے چاند دل کے ٹکڑے

نور و ظلمت

(پروفیسر سنت پرشاد مدہوش ایم اے)

شبہ نہیں اگرچہ ہے جوشِ نمو حیات میں
آٹھ پہر اجل بھی ہے روحِ بشر کی گھات میں

بیم و رجا کے بین بین کشمکشِ حیات میں
قطعِ منازلِ مہیب عین اندھیری رات میں

رہ نہ سکے گا ذوقِ عشق قیدِ تعینات میں
پڑ نہ سکیں گی رندیاں رسمِ تکلفات میں

بڑھ چلیں ہم صفات سے محو ہوں حسنِ ذات میں
آؤ لگا دیں چار چاند حسنِ تعلقات میں

غفلتوں کی ہیں لالیاں ظلمتِ کائنات میں
آنکھ جھپک کے رہ گئی چھائی گھٹا جو رات میں

عیش پرستیاں نہیں پھوٹ پڑی ہیں غفلتیں
جو کہ تھیں موجزن مگر قیدِ غمِ حیات میں

چونک کے دیکھ لُٹ نہ یوں رہروِ منزلِ حیات
لوٹ رہے ہیں تجھ کو چور گھور اندھیری رات میں

دورِ حیات تھی عذاب بعدِ ممات بھی عذاب
چھوٹ مصائبات سے پڑ نہ مصائبات میں

خون سے اپنے ہی تو ہے رونق و رنگِ کائنات
لذتِ زندگی کہاں قیدِ غمِ حیات میں

عیشِ جہاں کی ہڈیاں خون کی اپنی چسکیاں
چھوڑ بھی دے سگِ جہاں تو ہے کس التفات میں

ذوقِ لطیف تر جگا، درد میں ڈوب، لطف اٹھا
لطف ہے زندگی کا کیا لذتِ بے ثبات میں

ظلمتِ کائنات کی عمر ہے کتنی؟ ایک رات
قافلے کتنے لٹ گئے پر یہاں رات رات میں

پردے اٹھا، حجاب اٹھا ظلمتِ غم جو ہے مٹا
آبِ حیات پی پلا نغمۂ خمریات میں

سہل پسندیاں کہاں ہوں گی حریفِ مشکلات
مشکلیں اور رکاوٹیں ہیں یہاں بات بات میں

"فانی اور آرزو سیماب صاحب کی نظر میں"

(جناب شوکت اعظمی)

قدرت نے انسانی فطرت میں غلطیوں کو کیوں لازم قرار دیا ہے؟ اس کا جواب تو کوئی ماہر نفسیات ہی دے سکتا ہے ہر شخص کے بس کی بات نہیں، لیکن اتنا ضرور ہے کہ چونکہ غلطی ہو جانا فطری ہے لہذا سچے اور جھوٹے کا معیار اکثریت پر رکھا گیا ہے۔ جو سچ زیادہ بولے گا وہ سچا ہے اور جو اٹھتے بیٹھتے جھوٹ بولنے کا عادی ہے وہ جھوٹا ہے۔ غلطیوں کی نوعیت بھی جداگانہ ہوا کرتی ہے، ایک وہ غلطی جس سے صرف اپنی ذات کو نقصان پہونچے اور دوسری وہ جس سے دوسروں کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہو۔ اور اگر ایسی غلطی دانستہ ہو تو اس سے یقیناً ہماری تمام اچھائیاں خاک میں مل جائیں گی اور ہم انسانیت کے درجے سے گر جائیں گے ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ اپنے کو اچھا سمجھے لیکن اُسے دوسروں کو بُرا کہنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ ہر شخص دوسرے پر رائے زنی کر سکتا ہے اور حسب لیاقت اُس کو اپنی مجلس میں جگہ دے سکتا ہے لیکن اگر وہ شخص یہ سمجھے کہ وہ تمام دنیا کو اپنے معیار پر لاکر اپنے شعور کے مطابق اُن کو جگہیں تقسیم کر سکتا ہے تو وہ محض ایک لطیف دھوکہ میں ہے۔ اُس کو ہر حال میں زمانہ کے ساتھ چلنا ہوگا۔ کامیاب انسان وہی ہے جو اپنے کو ماحول کے مطابق بنالے لیکن دستور الاصلاح کا مطالعہ اس قاعدۂ کلیہ کی تردید کرتا ہے

جناب سیماب کے لئے ادبی مجلس میں کونسی جگہ ہے؟ اس کا جواب نگار لکھنؤ کا وہ نمبر دیگا جسمیں شعرائے عہد حاضر پر اہل فن حضرات نے اپنی رائیں دی ہیں۔ اس کے علاوہ شباب اُردو آگرہ کا مطالعہ یا "موحد اعظم" کے متعلق مدینہ بجنور کی متعدد اشاعتیں دینگی۔ بہرحال ہم کو اس سے بحث نہیں کہ نگار کی رائے موصوف کے متعلق صحیح ہے یا شباب اُردو اور مدینہ آپ کی شان میں کیا گستاخیاں کر رہے ہیں۔ ہم کو تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ جناب خود ان اصولوں کے کہاں تک پابند ہیں جن کے توڑنے پر فانی اور آرزو ہدف ملامت بنائے گئے ہیں۔ یا اُن کی اصلاحوں میں جو عیب نکالے گئے ہیں اُن کی نوعیت کیا ہے اور وہ کہاں تک قابل سماعت ہیں، پہلے حضرت فانی کی اصلاح اور سیماب صاحب کی توجہات ملاحظہ ہوں:-

شوق:- چمن کی سیر سے کیا خاک اپنا جی بہلے — کہ ہم یہاں ہیں مگر دل تو کوئے یار میں ہے

اصلاح فانی:- چمن کی سیر سے کیا خاک اپنا جی بہلے — کہ ہم چمن میں ہیں دل اپنا کوئے یار میں ہے

ارشاد سیماب:- شعر میں "اپنا" کی تکرار اب بھی بے لطف رہی (دستور الاصلاح صفحہ ۹۲)

عرض خاکسار:- چشم ما روشن دل ما شاد، اعتراض تسلیم لیکن صفحہ ۱۰۳ پر جو حضرت آرزو کی اصلاح میں عیب نکالکر اپنی

اصلاح پیش کی گئی ہے اس کو پھر ملاحظہ فرمایا جائے۔

اندازۂ شوق کیا بتاؤں — اب شوق کی انتہا نہیں ہے

اس "شوق" کی تکرار سے جو لطف پیدا ہوا اس کو سیماب صاحب ہی محسوس کر رہے ہونگے، سیماب صاحب اپنی دوسری اصلاحوں پر غور فرمائیں، فدا کا شعر ہے:-

فدا :- دُہرائیے فسانۂ برق و کلیم پھر — دل کو بھی پھونک دو اسی برقِ شرار سے

اصلاح سیماب :- دُہرائیے فسانۂ برق و کلیم پھر — اب مجھ کو پھونک دیجئے برق و شرار سے

سمجھ میں نہ آیا کہ "برق" کی تکرار اصلاح دیتے وقت کیوں نظر انداز کر دی گئی۔ اسی طرح اثر کو اصلاح دی گئی ہے

اثر :- یہ عالم ہے تمھاری جلوہ گاہِ ناز کا پھر تو — ہم اس کے بعد اب عالم کوئی ایجاد کیا کرتے

اصلاح سیماب :- یہ عالم ہے کمالِ جلوہ گاہِ ناز کا پھر تو — نیا عالم اب اس کے بعد ہم ایجاد کیا کرتے

اس "عالم" کی لطیف تکرار بارِ سماعت ہے۔

شوق سندیلوی :- ہوائے سرد نے ٹھنڈا کیا اسیروں کو — پیامِ موت نہاں مژدۂ بہار میں ہے

اصلاح فانی :- ہوائے باغ نے ٹھنڈا کیا اسیروں کو — پیامِ موت نہاں مژدۂ بہار میں ہے

ارشاد سیماب :- فانی صاحب اس عیب کو نظر انداز کر گئے کہ "کیا" اور "ہے" میں مطابقتِ زمانہ نہیں۔ (دستور الاصلاح ص ۹۲)

عرضِ خاکسار :- سیماب صاحب کی سمجھ میں جب کچھ نہیں آتا اور وہ عیب نکالنا ہی چاہتے ہیں تو اس وقت ان کو مطابقتِ زمانہ کی یاد آتی ہے۔ اس سلسلہ میں کافی اشعار ثبوت کیلئے پیش کئے جا چکے ہیں، ملاحظہ ہو زمانہ ماہ اگست ۴۲ء

شوق سندیلوی :- زبان نہیں کہ تجھے سوزِ عشق دوں میں دُعا — عجب مزے کی تپش قلبِ بیقرار میں ہے

اصلاح فانی :- زباں نہیں کہ تجھے دردِ عشق دوں میں دُعا — عجب مزے کی خلش قلبِ بیقرار میں ہے

ارشاد سیماب :- مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ اصل شعر میں کیا خرابی تھی۔ فانی صاحب نے "سوز" کو "درد" سے اور "تپش" کو "خلش" سے بدلکر شعر میں کسی خاص جذبہ یا اثر کا اضافہ نہیں کیا (دستور الاصلاح ص ۹۳)

عرضِ خاکسار :- سیماب صاحب کو کوئی خاص بات نہ معلوم ہوتی ہو لیکن اہلِ فن حضرات "تپش" اور "خلش" کا نازک فرق خوب جانتے ہیں۔ "تپش" کو "خلش" سے بدل دینے کے بعد جس خاص جذبہ کا اضافہ ہوا ہے، اس کا تعلق قوتِ احساس سے ہے "تپش" میں مزہ نہیں ہوتا بلکہ تکلیف ہوتی ہے اور طبیعت کو ایک قسم کی ناگواری پیدا ہوتی ہے۔ "خلش" میں لطف آتا ہے اور مزاج میں ناگواری پیدا نہیں ہونے پاتی۔ اور "خلش" کے لئے "درد" ہونا چاہیئے تھا اسی لئے "سوز" کو "درد" سے بدلا گیا۔

شوق سندیلوی :- وہ دل کہ چین نہ لیتے دیا کبھی جس نے — غضب کہ ساتھ ہی دفن ایک ہی مزار میں ہے

اصلاح فانی :- وہ دل کہ چین نہ لینے دیا کبھی حسن نے غضب کی بات ہے وفن ایک ہی مزار میں ہے

ارشاد سیماب :- دوسرے مصرع کی اصلاح سے مفہوم یہ پیدا ہوا کہ دل ایک ہی مزار میں دفن ہے، کئی مزار دل میں نہیں۔ (دستور الاصلاح صہ ۹۳)

عرض خاکسار :- اس سخن فہمی کی تو داد دینا پڑے گی۔ شاید ہی کوئی ایسا فہیم ہو جو یہ سمجھے کہ دل ایک جگہ نہیں بلکہ کئی جگہ کھود کھود کر گاڑا گیا ہے۔

شوق سندیلوی :- جدھر نگاہ پھری سامنے وہ شکل تھی شوق یہ رنگ آنکھ کا اب جوشِ انتظار میں ہے۔

ارشاد سیماب :- اس شعر کو علیٰ حالہ چھوڑ دیا گیا۔ حالانکہ اس میں ضرورتِ اصلاح تھی، ایک تو "نگاہ پھری" اس میں غلط ہے "نگاہ اٹھی" ہونا چاہیئے، دوسرے مصرع اولیٰ میں "تھی" اور ردیف "ہے" دو متضاد افعال ہیں، اگر پہلا مصرع یوں بدل دیا جاتا تو یہ سب عیب دور ہو جاتے :-

نظر جدھر بھی اُٹھے سامنے ہیں وہ لے شوق

عرض خاکسار :- پھر وہی متضاد افعال کا ذکر! جس کے لئے خاموشی سب سے زیادہ موزوں ہے۔ رہا "نگاہ پھری" پر اعتراض تو اس کے لئے اتنا ضرور عرض کرونگا کہ شوق صاحب کے اس مقطع پر کم و بیش اٹھارہ[۱۸] اساتذہ[۱] کی اصلاحیں ہیں جن میں سے تین[۳] نے علامت صہ بنائی ہے اور دس[۱۰] نے بالکل سکوت اختیار کیا یعنی ان کو "نگاہ پھری" پر کوئی اعتراض نہیں ہے باقی پانچ[۵] نے شاید اس کو غلط سمجھکر اصلاح دی ہے۔ اس طرح تیرہ[۱۳] اساتذہ نے اس محاورہ کو تسلیم کرلیا۔ اب فیصلہ فرمایئے کہ سیماب صاحب کے اعتراض کی کیا اہمیت ہے۔

حضرت آرزو لکھنوی جانشین حضرت جلال کا نمونۂ اصلاح اور سیماب صاحب کی زبردستیاں ملاحظہ ہوں[۲]

شوق سندیلوی :- اندازۂ شوق کیا بتاؤں بس حد ہے کہ انتہا نہیں ہے

اصلاح آرزو :- اندازۂ شوق کیا بتاؤں قابو میں دل اب رہا نہیں ہے

ارشاد سیماب :- اگر جزوی ترمیم کی جاتی تو مصرع یوں بھی لطیفہ ہو جاتا کہ :-

اب شوق کی انتہا نہیں ہے

عرضِ خاکسار :- فانی پر غیر ذمہ دارانہ اعتراض جڑ دیا گیا تھا مگر سیماب صاحب اب اپنے دامن میں منھ ڈال کر نہیں دیکھتے کہ "شوق" کی تکرار کس قدر معیوب ہے۔

شوق سندیلوی :- دل اور طریق عشق ہشیار رہزن ہے یہ رہنما نہیں ہے

اصلاح آرزو :- دل خضر طریق کیا بنے گا رہزن ہے یہ رہنما نہیں ہے

---

[۱] مقطع پر حضرت فانی نے کوئی اصلاح نہیں دی۔ [۲] ملاحظہ ہو اصلاح سخن از شوق سندیلوی

ارشاد سیماب:۔ طریق کے ساتھ عشق کی ضرورت تھی، یہ چیز نظر سے رہ گئی ہے، مصرع یوں بھی بن سکتا تھا:۔

"لے دل کو نہ راہِ عشق میں ساتھ"

عرض خاکسار:۔ ظاہر ہے کہ دل عشق کے سوا اور کسی راستہ کا خضر نہیں بن سکتا ہے، ہاں اگر یہ ڈر ہوتا کہ دل اور کہیں لے جا سکتا ہے تو عشق کا نام لے کر پابند بنایا جاتا۔

شوق سندیلوی:۔ دل کھو کے بھی باز عشق سے آ   ناداں ابھی کچھ گیا نہیں ہے

اصلاح:۔ دل کھو کے بھی عشق سے باز آ   ناداں ابھی کچھ گیا نہیں ہے

ارشاد سیماب:۔ پہلے مصرع میں تعقید تھی وہ اصلاح کے بعد نکل گئی۔

عرض خاکسار:۔ حضرت آرزو ہمیشہ ایسے شعر قلمزد کر دیا کرتے ہیں۔ سیماب صاحب اصلاح سخن ایک بار پھر دیکھنے کی تکلیف فرمائیں۔ "دل کھو کے بھی عشق سے باز آ" کی اصلاح آزاد کی ہے آرزو صاحب کی نہیں۔

بچّے کی پہلی درسگاہ

(از پنڈت اندرجیت شرما)

اُستاد کے لئے ہے جس علم کی ضرورت   ماں کے بھی دل کا روشن اُس نور سے دیا ہو

پُتلی ہو خُلق کی وہ تادیب کی ہو پیکر   چہرے سے اُس کے ظاہر تقدیس کی ضیا ہو

بغض و حسد کی لہریں اُٹھیں نہ اُسکے دل میں   اُلفت کی مے کا اُس نے اِک جام پی لیا ہو

عفت کی ہو وہ دیوی عصمت کی ہو وہ مورت   صورت میں پارسا ہو سیرت میں پارسا ہو

چہرہ سے اُس کے ظاہر غصّے کے ہوں نہ آثار   ہنس بول کر ہر اک دل مٹھی میں لے لیا ہو

ہوں نقش کارنامے دل پر بہادری کے   خوف و ہراس سے وہ شعلہ نہ بجھ گیا ہو

گھر میں کبھی نہ اُٹھیں اُس کے لڑائی جھگڑے   فردوس کا نمونہ وہ گھر بنا ہوا ہو

سُم ہو کسی طرح کا داخل نہ اُس فضا میں   تب ہاں کسی کے گھر میں بوٹا اُمید کا ہو

پروان وہ چڑھے گا تقدیر کے مقابل

چمکے گا آسماں پر پھر بن کے ماہِ کامل

دیہات کا ایک نظارہ

(ابوالفطرت میر زیدی خیرپور میر)

یاد آ گیا فوراً مجھے راوی کا کنارا
کل گاؤں میں دیکھا ہے وہ پُرکیف نظارا

آموں کے درختوں سے کچھ آگے کوئی لڑکی
لیتی ہوئی مخمور جوانی کا سہارا

آئی نظر آتی ہوئی وہ باغ کی جانب
کرتی ہوئی آنکھوں سے محبت کا اشارا

اٹھلائی ہوئی چال میں بھرتی ہوئی شوخی
بڑھتی ہی چلی آتی تھی وہ شوخ دل آرا

نکھرے ہوئے مکھڑے پہ وہ رنگین دوپٹا
جس طرح کہ لپٹا ہوا "ململ" میں ستارا

ہنستے ہوئے ماتھے پہ مچلتا ہوا جھومر
انصاف سے دیکھو تو ہے یہ چاند وہ تارا

پاس آ کے درختوں کے کھڑی ہو گئی آخر
اِک ہاتھ سے رنگین دوپٹے کو اُتارا

کچھ دیر اِدھر اور اُدھر غور سے دیکھا
پھر ہاتھ سے بکھرے ہوئے بالوں کو سنوارا

انداز سے ہنستی ہوئی آگے کو بڑھی وہ
اِک سوکھی سی لکڑی کی طرف ہاتھ پسارا

اور لکڑیاں چُن چُن کے وہ کرتی گئی یک جا
پھر بیٹھ کے ایک ایک کو ہاتھوں سے سنوارا

ہاتھوں میں دوپٹا لیے ہنستی ہوئی اُٹھی
اور بہتے ہوئے پانی سے منہ ہاتھ نکھارا

پھر ناز سے بھیگے ہوئے آنچل کو سنبھالا
لکڑی کی طرف جھوم کے ہاتھوں کو پسارا

وہ سر پہ اُٹھا بستی کی جانب ہوئی راہی
ہر گام پہ لیتی ہوئی شوخی کا سہارا

دیکھا نہ گیا آنکھوں سے میری جو یہ منظر
ہاتھوں سے سنبھالے ہوئے دل کو یہ پکارا

اِس منظرِ رنگین پہ سو شہر ہوں قرباں
اللہ رے دیہات کا یہ ایک نظارا

اضدادِ انسانی

(پروفیسر سنت پرشاد مدہوش، ایم۔ اے)

خودیِ وحشت افزا کی بیابانی نہیں جاتی
جنونِ مرکزی کی پابجولانی نہیں جاتی

سکوں پا کر بھی تو دل سے پریشانی نہیں جاتی
کبھی جمعیّت اضدادِ انسانی نہیں جاتی

غم و راحت کی یہ دست و گریبانی نہیں جاتی
زمانِ عیش میں بھی گریہ سامانی نہیں جاتی

نہیں، شکلِ حزیں کی نور افشانی نہیں جاتی
کہ عہدِ رنج میں بھی اس کی تابانی نہیں جاتی

تمنائے سر و ساماں یہ عریانی نہیں جاتی
ہمارے خانۂ دل سے یہ دیوانی نہیں جاتی

یہ حرص و آز کی بندی گریباں گیر رہتی ہے
بمشکل یہ نہیں جاتی بہ آسانی نہیں جاتی

ہماری خودپرستی کی یہ وحشت، یہ جنوں خیزی،
نہیں جاتی، ہماری چاک دامانی نہیں جاتی

تمناؤں کی تابانی، غم و حسرت کی تاریکی،
یہ اپنی شکل اب خود ہم سے پہچانی نہیں جاتی

گناہِ عشق کا رتبہ نہ سمجھا پاکبازوں نے
یہ وہ عصیاں ہے جس سے پاکدامانی نہیں جاتی

نکھر آیا ہے غم میں نورِ تاریکی، معاذاللہ!
سیہ بختی میں بھی مدہوش تابانی نہیں جاتی

طوفانِ جذبات

از حضرت اختر رضوانی

دہر کے التفات کو اصلِ ستمگری سمجھ
حسن کی خودسری کو دیکھ عشق کی سادگی سمجھ

حسنِ زمانہ ساز ہے یہ بھی جہاں کا راز ہے
میرے مشاہدات کی اس کو بھی اِک کڑی سمجھ

آگیا ہے فنا کا دور بگڑے ہیں کیوں نظر کے طور
سانس کی ہر شکست کو دعوتِ زندگی سمجھ

میں ہوں فقیرِ بے نوا دل ہے مرا جہاں نوا
میری نوائے درد کو درسِ قلندری سمجھ

زندگی ہے جنوں کا نام زندگی ہے غم تمام
جز غم و سوز زندگی زندگی میں کمی سمجھ

آنکھ فسردہ، دل اداس اب کہاں زیست کے حواس
حسن فسوں طراز کی یہ بھی فسوں گری سمجھ

حسنِ فریب دوجہاں حسن ہے نقش بے نشاں
اخترِ غم پرست نے لاکھ کی اِک کہی سمجھ

آہ! منشی دیانراین صاحب نگم

پہلی اور دوسری نومبر ۱۹۴۲ء کی درمیانی رات ادب اور صحافت اُردو کے لئے ایک ماتم کی رات تھی کیونکہ اس شب کو دو بجے کے قریب منشی دیانراین نگم صاحب ایڈیٹر رسالہ زمانہ نے چالیس سال کی ان تھک ادبی خدمات کے بعد جانِ شیریں جان آفریں کو سپرد کی.

یہ چالیس برس کتنی محنت وجاں فشانی اور دماغی کاوشوں میں گذرے، اور اُن میں اپنا ذاتی عیش و آرام تج کر کس قدر ایثار و قربانی سے کام لینا پڑا، اس کا اندازہ کچھ وہی حضرات کر سکتے ہیں جنھیں اُردو ادب اور صحافت سے کچھ لگاؤ رہا ہو۔ ہندوستان میں ادبی خدمت فی زمانہ بھی قطعی بے سود اور بے فیض ہے۔ خصوصاً جبکہ وہ اُردو ادب کی خدمت ہو۔ لیکن چالیس سال قبل تو یہ راہ اور بھی زیادہ دشوار گذار اور حوصلہ شکن تھی، پھر بھی اس مسلسل قربانی اور بے لوث خدمت کا صحیح اندازہ اُسی وقت کیا جا سکتا ہے، جب آپ اُس وقت کے حالات اور زندگی کے پس منظر کو پیش نظر رکھیں.

منشی دیانراین نگم ۲۲۔ مارچ ۱۸۸۲ء کو کانپور میں ایک معزز اور سرآوردہ خاندان میں پیدا ہوئے تھے وکالت کا پیشہ اس خاندان میں پشتوں سے چلا آتا تھا۔ اُن کے دادا منشی شیو سہائے صاحب کانپور کے ایک نامور وکیل، ڈسٹرکٹ بورڈ کے وائس چیرمین اور وکیل سرکار تھے۔ اور اُن کے پردادا منشی شیو پرشاد صاحب اچھے وکیلوں میں شمار ہوتے تھے.

منشی دیانراین نگم ۱۸۹۴ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول کانپور میں داخل ہوئے، اور ۱۸۹۹ء میں انٹرنس پاس کر کے کرائسٹ چرچ کالج کانپور میں داخل ہوئے۔ طالب علمی ہی کے زمانہ سے اُن کا رجحان لٹریچر کی طرف تھا چنانچہ اُن ہی کی کوشش سے اسکول اور کالج میں ڈبیٹنگ سوسائیٹیاں قائم ہوئی تھیں۔ منشی جی نے ۱۹۰۳ء میں کرائسٹ چرچ کالج کانپور سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ایک گریجویٹ کے لئے کامیاب زندگی کی تمام شاہراہیں کھلی ہوئی تھیں، اور وہ آسانی سے اُن تمام چیزوں کے خواب دیکھ سکتا تھا جو زندگی کے احساس کو لطیف بنا سکتی ہیں۔ اور وکالت کے لئے تو یہ دَورِ زرّیں تھا۔ چنانچہ منشی دیانراین نگم کے والدین اور تمام عزیزوں کی یہی خواہش تھی کہ وہ اپنا خاندانی پیشہ وکالت اختیار کریں، مگر اُنھیں اُردو ادب کا کچھ ایسا ذوق پیدا ہو گیا تھا کہ وکالت کی طرف طبیعت مائل نہیں ہوئی۔ یہ کشمکش کئی سال تک جاری رہی،

اور خاندان والوں سے بھی ایک عرصہ تک کشیدگی کا باعث رہی۔ اس اثنا میں "زمانہ" کی ایڈیٹری کا بار مستقل طور پر مرحوم کے کندھوں پر آپڑا، اور رسالہ مذکور کا دفتر بریلی سے کانپور منتقل ہو گیا۔

اس وقت سے لیکر مرتے دم تک مرحوم نے اپنے کو "زمانہ" میں کچھ ایسا جذب کر لیا تھا کہ رسالہ کی حالت خود انکی حالت کا عکس ہو گئی تھی۔ موروثی جائداد میں جو حصہ ملا تھا وہ بھی مرحوم نے اسی شوق کی نذر کر دیا تھا اور اسکے علاوہ بھی بہت کافی قرضہ کا بار ہو گیا تھا جس کا سلسلہ چند سال ہوئے ختم ہوا ہے۔ رسالہ "زمانہ" کے نقصان کو پورا کرنے کیلئے مرحوم نے ۱۹۱۲ء سے ایک ہفتہ وار اخبار "آزاد" بھی جاری کر دیا تھا جو بفضلہ ابھی تک کامیابی سے جاری ہے۔

چالیس برس تک مسلسل اردو زبان میں کسی رسالہ کا قائم رہنا ایک معجزہ سے کم نہیں ہے۔ اگر آپ اردو صحافت کی گذشتہ چالیس سالہ تاریخ پر نظر ڈالیں تو آپ خود بخود ہمارے دعوے کی تائید فرمائیں گے۔ اس عرصہ میں کتنے ہی رسالے نکلے پھلے پھولے، پروان چڑھے مگر حوادث کی نذر ہو گئے، لیکن "زمانہ" تن تنہا پبلک کی ناقدردانی کا مقابلہ کرتا رہا۔ یہ محض مرحوم کی دن رات محنت شاقہ، ہمت مردانہ اور ذاتی قربانی کا نتیجہ ہے۔ باوجود مشکلات پریشانیوں اور خسارہ کے انھوں نے کبھی دامن ہمت نہ چھوڑا اور اپنے ذاتی آرام و راحت کا خیال نہ کر کے اپنی زندگی اردو کی خدمت کے لئے وقف کر دی تھی۔

منشی دیانراین نگم ستمبر ۱۹۴۲ء میں عارضہ قلب میں مبتلا ہوئے۔ اس سے پیشتر انکو اس قسم کی شکایت کبھی نہیں ہوئی تھی مگر مرض نے ایسا ساتھ دیا کہ باوجود دوا اور دعا کے جان ہی لیکر ٹلا۔ درد کے متعدد اور شدید دوروں نے بہت ہی کمزور اور نڈھال کر دیا تھا، تاہم ۲۲۔ اکتوبر سے طبیعت روبہ اصلاح ہو چلی تھی مگر ۱ و ۲۔ نومبر کی درمیانی شب کو ایک بجے کے قریب ایسا درد اٹھا کہ ابدی نیند جا سوئے۔

ان سطور میں ہمیں مرحوم کی ادبی خدمات پر تبصرہ کرنا مقصود نہیں ہے۔ یہ زمانہ حال اور مستقبل کے مؤرخین ادب اردو کا کام ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے سب سے بڑا سوال "زمانہ" کے مستقبل کا ہے۔ مرحوم کے چار صاحبزادے برسر کار ہیں اور پانچویں ابھی تعلیم پا رہے ہیں۔ "زمانہ" کی فکر مرحوم کو بہت تھی۔ اور انھوں نے کافی غور و فکر کے بعد "زمانہ" کے مستقل قیام کیلئے ایک لمیٹڈ کمپنی بنانے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اور اپنے چند علم دوست اور ہمدرد احباب سے وقتاً فوقتاً تذکرہ و مشورہ کر کے اس بارہ میں ابتدائی مسودات بھی مرتب کرالئے تھے مگر افسوس کہ ان پر نظر ثانی کی نوبت نہ آئی اور موت کے بے رحم ہاتھ نے تکمیل کی مہلت نہ دی۔ اب ہمارا فرض یہ ہے کہ اس اسکیم کو جلد سے جلد عملی شکل دی جائے تاکہ اردو زبان کے اس دیرینہ خادم رسالہ کا مستقبل محفوظ ہو جائے اور وہ پہلے سے بھی زیادہ ملک اور زبان کی خدمت انجام دیتا رہے۔

اس اسکیم کی پوری تفصیلات آپ کی خدمت میں عنقریب پیش کی جائیں گی اور ہمیں قوی امید ہے کہ کمپنی کا قیام ایک واقعہ مسلمہ ہو جائیگا۔ کیونکہ اب رسالہ کا بند ہو جانا ایک سانحہ عظیم سے کم نہ ہوگا۔

ادارۂ "زمانہ"

تنقید کتب

اُردو مثنوی کا ارتقا

اُردو کے اصنافِ سخن میں مثنوی کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ یہی وہ صنف ہے جس میں کسی واقعہ، منظر، روایت یا قصّہ کو مربوط اور مسلسل طریقہ پر بیان کیا جا سکتا ہے۔ اور اس لئے اس کے دامن میں شاعر کو جولانیِ طبع دکھانے کا وسیع میدان مل جاتا ہے۔ قدیم اُردو کی مثنویاں عموماً قصوں یا روایتوں کی منظوم صورت ہوتی تھیں۔ یا کسی قصہ یا روایت کے پردہ میں درس اخلاقیات دیا جاتا تھا۔ رزمیہ مثنوی کی مثال شاہنامہ اُردو ہے۔ بزمیہ کی مثال گلزارِ نسیم اور سحر البیان ہیں، حُزنیہ کی مثال زہرِ عشق اور تمثیلیہ یا اخلاقیہ کی مثال گلزارِ ابراہیم اور تفسیر سورہ یوسف منظوم ہیں۔ اس کے علاوہ مثنوی اُس زمانہ کے تمدن و تہذیب کا بھی مرقع ہوتی ہے جس زمانہ میں وہ لکھی جاتی ہے اس لئے کسی قدر تاریخی اور تمدنی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ گویا مثنوی مسلسل بیان کے لئے بہترین صنف سخن ہے، مثنوی کب سے شروع ہوئی، اس نے کیا کیا تدریجی ترقیاں کیں اور اب کیا حالت ہے۔ ان تمام باتوں کا سیر حاصل جواب آپ کو زیرِ نظر کتاب کے مطالعہ سے ملیگا۔ جو حضرت عبدالقادر ایم۔ اے، ایل ایل۔ بی، پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کے قلم کی رہینِ منت ہے۔ اس کتاب میں اُردو مثنوی کی پیدائش سے لیکر موجودہ زمانہ تک اس کی ترقیوں اور تبدیلیوں کی مختصر تاریخ پیش کی گئی ہے۔ ہر عہد کے عام رجحانات اور خصوصیات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ قدیم و جدید مثنویوں کے اقتباسات بھی پیش کئے گئے ہیں تاکہ اُردو زبان کی تدریجی ترقیوں اور تبدیلیوں پر کافی روشنی پڑے۔ گویا یہ کتاب نہ صرف مثنوی بلکہ اردو ادب کی ایک مختصر سی ارتقائی تاریخ ہے۔ امید ہے کہ اس کے مطالعہ سے شائقینِ ادب کو بہت مفید معلومات حاصل ہونگی۔

کتابت و طباعت روشن، کاغذ قیمتی ۲۹+۲۲ کی بڑی تقطیع کے ۴۳ صفحات ضخامت، قیمت سوا روپیہ ۱؎ ملنے کا پتہ:۔ سب رس کتاب گھر، ادارۂ ادبیات اُردو۔ خیریت آباد، حیدرآباد دکن۔

عروج کے سَو شعر

یہ جناب عروج زیدی بدایونی کے سو شعروں کا ایک دلپسند مجموعہ ہے۔ ان کے شعر پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے بشرطیکہ شوقِ سخن جاری رہا، کہ وہ کسی نہ کسی دن ضرور عروج پر پہونچیں گے۔ عروج کے شعر کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے الفاظ سادہ، سلیس، مترنم اور پُر معنی ہوتے ہیں، بلند سے بلند تخیل کو چھوٹے چھوٹے عام فہم لفظوں میں ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سوز و گداز کی بھی کمی نہیں ہے۔ نمونہ کے طور پر صرف چند شعر کافی ہونگے۔

رفتہ رفتہ اس قدر مشقِ تصور بڑھ گئی — آپ جس محفل میں ہیں، میں بھی اسی محفل میں ہوں
اِک لفظ میں نہیں ہے طوفاں کی وسعتیں ہیں — جب چاہے تم ڈبو دو امید کا سفینہ
آپ کی پہلی نظر نے دل کی دنیا لوٹ لی، — ابتدا کی ابتدا، انجام کا انجام تھا
نامۂ الفت کا یہ کتنا جواب صاف ہے — حسن نے بھیجا ہے اِک سادہ ورق میرے لئے
مٹانا چاہو تو مجھ پہ ستم کی حد کر دو — چراغ ہلکی ہوا سے بجھا نہیں کرتے

لکھائی، چھپائی، کاغذ عمدہ، جیبی تقطیع، ۳۲ صفحے ضخامت، قیمت چار آنے،
ملنے کا پتہ:۔ سید عروج زیدی، محلہ شہباز پور بدایوں۔ نیز، محشر خیال بُک ڈپو، اُردو بازار دہلی،

حُسن و عشق

یہ عجیب و غریب چھوٹی سی کتاب مختلف موضوعات حُسن و عشق پر نئے اور پرانے شاعروں کے ایک ہی خیال کے شعروں کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ مثلاً پہلا موضوع "حمد" ہے۔ اس پر فارسی و اردو کے سولہ۱۶ شاعروں کے اشعار درج کر دیئے گئے ہیں، یہی حال "نعت" کا ہے۔ بقیہ کتاب کو حُسن اور اُس کے متعلقات و عشق اور اُس کے متعلقات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ مثلاً متعلقات حُسن میں (۱) جمال (۲) شباب، (۳) رخ و عارض، (۴) لب و دہن، (۵) تکلم و تبسم، (۶) چشم و نظر، (۷) مژگان و ابرو، (۸) زلف و گیسو (۹) قد و قامت (۱۰) رفتار و خرام (۱۱) ادا و غمزہ (۱۲) شرم و حیا (۱۳) محجوبی و پشیمانی (۱۴) نزاکت و نازک طبعی (۱۵) خواب و بیداری (۱۶) متفرقات۔ سولہ عنوان قائم کرکے ہر عنوان کے ماتحت اسی موضوع پر مختلف شاعروں کے شعر درج کر دئے گئے ہیں۔ اسی طرح متعلقاتِ عشق کے بائیس۲۲ عنوانات قائم کرکے اشعار درج کئے گئے ہیں۔ واقعی جناب محمد صدیق صاحب خیرآبادی صاحب مؤلف کتاب ہذا کی نظر انتخاب بھی تحسین ہے کیونکہ جو اشعار آپ نے درج کئے ہیں وہ ابتذال سے پاک، عریانیت سے دور اور سوقیت سے صاف ہیں۔ یہ کتاب پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

لکھائی چھپائی، کاغذ عمدہ۔ چھوٹی تقطیع ۸۴ صفحے ضخامت قیمت ۸/
ملنے کا پتہ محمد صدیق صاحب خیرآبادی، کارخانہ عطر محمد زکریا محمد ایوب تاجرانِ عطر چوک لکھنؤ۔

جناح صاحب!

JINNAH SAHEB PLEASE.

مسٹر چرچل وزیر اعظم برطانیہ اور مسٹر ایمری وزیر ہند نے جو تقریریں وقتاً فوقتاً پارلیمنٹ میں کی ہیں، اُن سے ہندوستان کو شک ہو گیا ہے کہ برٹش گورنمنٹ ہندوستان پر سے اپنی گرفت ہٹانا اور اپنے اختیارات حکومت ہندوستان کو منتقل کرنا نہیں چاہتی ہے۔ ان ذمہ دار حضرات اور اُن کے ہم خیال سیاست دانوں نے ہندو مسلم اختلافات کا

ایک تو اپنا لیا ہے، اور آئے دن یہی طعن دیا جاتا ہے کہ پہلے ہندو مسلم اور دوسری سیاسی پارٹیاں آپس میں اتفاق و اتحاد کر لیں، تب آزادی و خود مختاری کا مطالبہ کریں۔ اس کتاب میں جے۔ پی۔ گپتا صاحب نے انگریزی زبان میں بہت سی تقریریں اور مضامین جمع کر دیئے ہیں جو ہندوستان اور ہندو مسلم مسئلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ کتاب کا مقصد نہایت مبارک یعنی ملک میں ہندو مسلم اتحاد پیدا کر کے آزادیٔ وطن کے لئے متفقہ کوشش کرنا ہے۔ کانگریس اور مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹیوں کے رزولیوشن اور اُن پر مختلف اہل الرائے حضرات کے بیانات بھی اسی کتاب میں موجود ہیں۔ جو حضرات ہندو مسلم اتحاد کو پسند کرتے ہیں اور آزادیٔ وطن کے دلدادہ ہیں، ان کے لئے یہ کتاب بہت مفید ثابت ہوگی۔

زبان انگریزی، کاغذ سمی، ٹائیٹل دیدہ زیب، تقریباً سوا تین سو صفحات ضخامت قیمت آٹھ آنہ ۸؍

ملنے کا پتہ:- "Hamara Hindustan." Publication, 23, Hamam Street, Fort Bombay.

ہمارے بچے

آج کے بچے کل کے ماں باپ اور آنے والی "قوم" ہوتے ہیں۔ اس لئے جس قدر عمدہ غور و پرداخت بچوں کی ہوگی اتنی عمدہ اور تندرست ہماری نسل ہوگی۔ بچوں کی جسمانی اور دماغی تربیت ہی قوم کی ترقی کا واحد ذریعہ ہے، انہی باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پروفیسر جگدیش سنگھ نے زیرِ نظر کتاب پنجابی زبان میں لکھی تھی جسے سوار شمشیر سنگھ خنجر بی۔ اے اسسٹنٹ اڈیٹر "پریت لڑی" لاہور نے اُردو کا لباس پہنایا ہے۔ اس کتاب میں حمل سے لیکر سنِ شعور تک بچوں کی تمام باتوں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے، عنوانات بھی بہت مناسب رکھے گئے ہیں۔ مثلاً بچہ کا انتظار، زچہ، پیدائش کے بعد، چھوٹے بچے کے عادات، کھلونے، بچہ کا ماحول، بچہ پر والدین کی زندگی کا اثر، چھوٹی چھوٹی باتوں کی تربیت، بچہ کی بہتری اور بہبودی کا خیال، بچہ کے دل کی گہرائیاں، ہمارے اسکول، بُری عادتیں چھڑانے کے طریقے، تعلیم کا نصب العین، والدین کی خدمت۔ اس سبق آموز کتاب کا مقصد مصنف کے الفاظ میں حسبِ ذیل ہے:-

"ضرورت ہے کہ والدین کو آئندہ بننے والے والدین اور اُستادوں کو جھنجھوڑا جائے اور انھیں ترغیب دی جائے کہ وہ بچہ کی شخصیت کو سمجھیں اور اُس کے دل کی کیفیت سے واقف ہوں تاکہ ملک کے ناشگفتہ غنچے چٹک کر خوشنما و دلکش پھولوں کی صورت اختیار کر لیں، جن پر ہمیں بھی فخر ہو اور ملک کو ناز ہو۔"

فاضل مصنف نے آخر میں ایک باب رکھا ہے جس میں بتایا ہے کہ سوویٹ روس میں والدین اور بچوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کس طرح کیا جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ کتاب بہت عمدہ اور قابلِ مطالعہ ہے۔ کتابت، کاغذ سب عمدہ، گرد پوش دیدہ زیب، انگریزی جلد ۱۵۶ صفحات ضخامت، قیمت سوا روپیہ ۱؍۴

ملنے کا پتہ:- پریت نگر شاپ ۳۳ نسبت روڈ۔ لاہور۔

رامائن صداقت

یہ مقدس کتاب رامائن کے کسکندھا کانڈ کا منظوم ترجمہ ہے، جسے بابو انوکھے لال صاحب صداقت نے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ کچھ حصہ مثنوی کی صورت میں ہے کچھ مسدس کی اور کچھ مسلسل غزل کی۔ تمام نظمیں شگفتہ اور ترنم سے معمور ہیں۔ آخر میں رامائن سے متعلق بحر طویل میں ایک غزل بھی دی گئی ہے۔ شروع میں فاضل مصنف نے رامائن کتاب پر نثر میں اپنے پاکیزہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس کے بعد رامائن کے اس حصہ کو شگفتہ نظم میں ترجمہ کیا ہے۔ جس کا تعلق جنوبی ہند کے واقعات سے ہے۔ اس کتاب کے وہ حصے بہت دلکش اور قابل داد ہیں جن میں وقتاً فوقتاً مختلف مناظر قدرت کا مرقع کھینچا گیا ہے۔ برسات اور موسم سرما کا سماں جو دکھایا گیا ہے ان میں تشبیہات و استعاروں کے علاوہ گیان دھیان کی سبق آموز باتیں کوٹ کوٹ کر بھر دی ہیں۔ لکھائی چھپائی، کاغذ معمولی، ضخامت دو جز۔ قیمت دو آنے

ملنے کا پتہ: انوکھے لال صداقت یحییٰ گنج ٹاٹ پٹی لکھنؤ۔

مرقع طلب ہند

یہ کتاب مسٹر سی۔ پی۔ چندر زمیندار و رئیس بنارس کی لکھی ہوئی ہے جسمیں ملکی حالت، مروجہ قوانین، رسم و رواج، پولیٹیکل جماعتوں، فرقہ وارانہ نیابت، حقوق رعایا، کاشتکاران و زمینداران وغیرہ وغیرہ پر سرسری نظر ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب بطور Sketch Book کے ہے۔ لیکن عبارت کچھ اس قدر الجھی ہوئی اور اسلوب بیان ایسا غیر معمولی ہے کہ بعض اوقات مطلب گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ کتابت میں اتنی غلطیاں ہیں کہ دس صفحہ کا غلط نامہ لگانا پڑا۔ مصنف نے بکثرت انگریزی الفاظ عبارت میں استعمال کئے ہیں لیکن اُن کا اردو بدل تحریر نہیں کیا۔ جس کی وجہ سے جو شخص انگریزی نہیں جانتا ہو وہ اُس سے مستفید نہیں ہو سکتا ہے قیمت دو روپیہ ہے،

ملنے کا پتہ: مسٹر سی۔ پی۔ چندر وارث منزل نندلیسر بنارس، و نیز بھارگو برادرس سلیمانی پریس بنارس۔

عورتوں کی آزادی اور ہندو

اس کتاب کے مصنف لالہ ہرگلال موجودہ تحریک آزادیٔ نسواں کے خلاف ہیں، وہ پردہ کے حامی اور عورتوں کو "چراغ خانہ" سمجھتے ہیں۔ اُن کی رائے میں عورتوں کو حیا و شرم اور عفت و عصمت کی پتلی ہی رہنا چاہیئے۔ انھوں نے فیشن پرستی و سینما کے اثرات کی مذمت کی ہے اور موجودہ تعلیمی کورس کے نقائص پر نظر ڈالی ہے مصنف کی تحریر میں زور اور بیان میں جوش ہے جسکا اثر پڑھنے والے کے دل پر ہوتا ہے خواہ اُسکو اُن کے نظریہ سے پوری طور سے اتفاق رائے ہو یا نہو۔ مصنف اپنے جوش کی رَو سے بعض جگہ قابل اعتراض سخت الفاظ استعمال کر گئے ہیں۔ بہرحال کتاب بحیثیت مجموعی مفید ہے۔

قیمت ۸ر ملنے کا پتہ:- بابو رام رئیس جھنگ ڈاکخانہ سرایہ پنجاب

ارتقاء

(حضرت محمود اسرائیلی)

دہر کے ذرے نمو کے واسطے بیتاب ہیں
چشمِ عالم سے نہاں لاکھوں ابھی مہتاب ہیں
نخل کے ہر خلیہ میں پنہاں ہے سامانِ حیات
سینکڑوں عالم دکھائیگی ابھی یہ کائنات
ہیں فضا کے پردۂ رنگیں پہ لاکھوں گلستاں
آج تک مرغِ تخیل بھی نہیں پہونچا جہاں
دیدۂ عالم سے اُن کی تابشیں مستور ہیں
اُن کی نکہت سے عدم کی گھاٹیاں معمور ہیں
دیکھتا ہوں ان کے نقشِ آئینۂ ایام میں
سوئے مشرق وہ چھلکتے ہیں شفق کے جام میں

دہرِ رقصاں عقلِ انسانی کا اِک گہوارہ ہے
عقلِ انسانی فضائے دہر کا طیارہ ہے

غزل

(حضرت خمار بارہ بنکوی)

بڑھا جس قدر اجتنابِ محبت
محبت ہوئی بے حجابِ محبت
بہم لڑ رہی ہیں مری اُن کی آنکھیں
گلے مل رہے ہیں خرابِ محبت
پیئے جا اِسی طرح آنسو پیئے جا
ٹپکنے نہ پائے شرابِ محبت
محبت کی طفلی ہے جب آئی چنچل
قیامت کرے گا شبابِ محبت
تغافل بہ ظاہر، تلطف بہ باطن،
سلامت رہے یہ حجابِ محبت
محبت ہے کیا چیز؟ وہ پوچھتے ہیں
بتا دے ذرا انقلابِ محبت
ٹپکنے ہی کو ہیں اب آنکھوں سے آنسو
اُٹھا چاہتی ہے نقابِ محبت
بھلاتے تھے اُن کو بھلا بیٹھے خود کو
ہمیں پر پڑا خود عذابِ محبت
خمارِ حزیں کی بھی کیا زندگی ہے
خراب جوانی خرابِ محبت

رفتارِ زمانہ

جنگ اپنی پوری خونریز ہولناکیوں اور تباہ کاریوں کے ساتھ یورپ، افریقہ اور مشرقی ایشیا میں جاری ہے۔ یورپ میں روس، افریقہ میں ٹیونس، ایشیا میں چین اور بحرالکاہل میں جزائر سلیمان اور نیوگنی کے علاقے اور نواحی سمندر انسانی خون سے لالہ زار بن رہے ہیں۔ لیکن کسی جگہ کی بھی جنگ ابھی تک اپنے آخری مرحلہ یا فیصلہ کن نتیجہ تک نہیں پہونچی ہے۔

روس روس کی حالت نومبر کے پہلے ہفتہ تک نہایت تشویشناک رہی۔ جرمن فوجیں تمام جنوبی روس، کریمیا، اور قفقاز میں چھا گئیں۔ ایک طرف روس کے مشہور و معروف صنعتی شہر اسٹالین گراڈ کو خطرہ پیدا ہو گیا، ادھر قفقاز میں گروزنائی کے تیل کے چشمے معرض خطر میں آ گئے جس کی وجہ یہ تھی کہ برطانیہ اور امریکہ کی طرف سے ہٹلر کو دوسرا محاذ قائم کرنے کا کھٹکا تھا اور وہ ہر قیمت پر اسٹالین گراڈ اور قفقاز فتح کر لینا چاہتا تھا، مگر روسیوں نے نہایت بہادری اور بے جگری سے ہر جگہ دشمن کا مقابلہ کیا۔ اب سردی کی آمد نے جرمنوں کے حوصلے پست کر دیے اور روسیوں کے دل بڑھا دیے ہیں جس طرح ۱۹۴۱ء کے جاڑوں میں روسیوں نے لینن گراڈ اور ماسکو کے تحفظ کے لئے اپنی جانیں قربان کر دی تھیں، اور ان مقامات کو بچا لیا تھا، اسی طرح ۱۹۴۲ء کے جاڑوں میں بھی دشمن کو اسٹالین گراڈ اور گروزنائی کے فتح کرنے کی حسرت کے سوا اور کچھ ہاتھ نہ آئیگا۔ روس میں شدت کے ساتھ برفباری شروع ہو گئی ہے جس کی وجہ سے جرمن فوجوں کو مدافعانہ پوزیشن اختیار کرنی پڑ رہی ہے۔ اور وہ روسی فوجیں جو اب تک مختلف مقامات میں مدافعانہ کارروائیاں کر رہی تھیں اب حملہ کر کے دشمن کو پیچھے بھگا رہی ہیں۔ چنانچہ جھیل المن، رزیف، وار ونیز اور اسٹالین گراڈ کے محاذوں پر ہر جگہ روسیوں نے حملے شروع کر دیے ہیں۔ اور بہت سے مقامات میں دشمنوں کی لائنیں توڑ کر آگے بڑھ گئے ہیں۔ جرمن فوجیں ہر جگہ دبتی اور نقصان اٹھاتی جاتی ہیں۔ لاکھوں جرمن ہلاک و زخمی اور قید ہو چکے ہیں، اور ان کا سامان جنگ جس قدر تباہ ہوا ہے وہ اندازہ سے باہر ہے۔

افریقہ شمالی افریقہ میں العلمین کے محاذ پر برطانوی اور دشمن کی فوجیں عرصہ سے ایک دوسرے کے مقابلہ پر ڈٹی ہوئی تھیں جن میں برابر جھڑپ ہوتی رہتی تھی۔ اسی اثنا میں برطانوی فوجوں کی کمان جنرل آچنلک سے لیکر جنرل الگزینڈر کو دیدی گئی اور نمبر ۸ برطانوی لشکر کی کمان جنرل منٹگمری کے سپرد کر دی گئی۔ اکتوبر کے اخیر تک اس محاذ پر کوئی بڑی کارروائی نہیں ہوئی لیکن چند ہی ماہ کی ضروری تیاریاں کرنے کے بعد جنرل الگزینڈر نے اچانک بحری، بری اور ہوائی فوجوں سے دشمنوں پر اس قدر زبردست حملہ کیا کہ محوریوں کے پاؤں اکھڑ گئے، اور وہ شدید نقصانات اٹھا کر نہ صرف سرزمین مصر بلکہ تمام لیبیا خالی کرنے پر مجبور ہوئے اور برطانوی فوجیں صوبۂ طرابلس کے مقام العقیلہ تک بڑھتی چلی گئیں۔ اس وقت تمام لیبیا انگریزوں کے

قبضہ میں ہے، اور العقیلہ کے مورچہ پر معرکہ آرائیاں ہو رہی ہیں۔ اس کامیابی کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ مراکش اور شمالی فرانسیسی افریقہ میں امریکن اور برطانوی فوجیں کثیر تعداد میں مع سازوسامان اترنے میں کامیاب ہو گئیں اور انہوں نے ٹیونس کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ تاکہ محوری فوجوں کو مشرق اور مغرب دونوں طرف سے نرغہ میں لے لیا جائے۔ ایسی حالت میں جنرل رومیل کے لئے پسپائی کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔ کیونکہ اس کی فوجیں مصر کی طرف بہت آگے بڑھ گئی تھیں جنھیں سہولت کے ساتھ کمک اور سامان نہیں پہونچایا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اتحادی فوجوں کو روکنے کے لئے ہٹلر کو مجبوراً روسی محاذ سے فوجیں اور ہوائی جہاز ہٹا کر ٹیونس میں بھیجنے پڑے۔ اس طرح جرمن محاذ روس میں بھی کمزور پڑ گیا اور روسیوں کو پیش قدمیاں کرنے کا موقعہ مل گیا اتحادیوں کی اس چال سے نہ صرف روس بلکہ مصر اور وشرق وسطیٰ بھی محوریوں سے بچ گئے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ تمام شمالی استوائی اور مغربی افریقہ اتحادیوں سے مل گئے ہیں۔ فرانسیسی، برطانوی اور امریکن فوجیں ملکر جرمن اور اطالوی فوجوں سے لڑ رہی ہیں۔ سفاکس سے لیکر بزرطہ تک جو مختصر سا ساحلی علاقہ ہے وہ تو ابھی محوریوں کے قبضہ میں ہے ورنہ تمام ملک اتحادیوں کے قبضہ میں آگیا ہے۔ ادھر ہٹلر نے تمام فرانس پر قبضہ کر لیا ہے۔ فرانسیسی بیڑہ جو بندرگاہ طولون میں لنگر انداز تھا وہ خود فرانسیسی افسروں نے ڈبو دیا ہے اور دشمن ہاتھ ملتا رہ گیا۔ ٹیونس اور بزرطہ پر جو ٹیونس کی بہت بڑی بندرگاہ ہے ہر طرف سے اتحادی فوجوں کا نرغہ ہو رہا ہے اور صرف چند دنوں کی دیر ہے کہ تمام افریقہ محوریوں سے پاک ہو جائیگا۔

اس کے بعد کیا ہوگا؟ اس سوال کا جواب خود مسٹر چرچل وزیر اعظم برطانیہ نے اپنی تازہ براڈکاسٹ تقریر میں دیدیا ہے یعنی ٹیونس میں ہوائی اڈے قائم کر کے تمام اٹلی پر ہوائی حملے کئے جائیں گے اور جب موقعہ ملیگا تو اٹلی میں فوجیں اتار کر یورپ میں ایک دوسرا محاذ قائم کر دیا جائیگا۔

مشرق مشرق میں دو محاذ ہیں، ۱ چین اور ۲ جنوب مغربی بحرالکاہل۔ چین میں سالہا سال سے جنگ کا سلسلہ جاری ہے اور موجودہ صورت حال یہ ہے کہ چین کے شمالی صوبوں اور تمام بندرگاہوں پر جاپانیوں کا قبضہ ہو چکا ہے۔ مشرقی اور جنوب مغربی علاقوں میں ابھی لڑائیوں کا سلسلہ جاری ہے۔ مگر پہلی سی سرگرمیاں باقی نہیں رہیں۔ کبھی کوئی مقام جاپانی فتح کر لیتے ہیں اور کبھی اسی مقام کو چینی دوبارہ دشمنوں سے چھین لیتے ہیں۔ لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ چینیوں کے دم خم بدستور باقی ہیں، اُنھوں نے آخر دم تک لڑنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ اتحادی چین کے ساتھ ہیں۔ اگرچہ چین کو مدد اور سامان پہونچانے کے تمام راستے بند ہو گئے ہیں مگر اب بھی ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے چین کو مدد پہونچائی جا رہی ہے۔

بحرالکاہل میں آجکل جزائر سلیمان، جزیرہ وادی الکنار اور نیوگنی میں لڑائیاں ہو رہی ہیں۔ جزائر سلیمان کے سمندر میں اور نیوگنی کے سامنے بہت سے جاپانی جہاز غرق کئے جا چکے ہیں۔ نیوگنی کے مقامات گونہ اور بونہ کے محاذوں پر سخت لڑائیاں ہو رہی ہیں جہاں اتحادیوں کا پلہ بھاری ہے۔ آسٹریلیا اور امریکہ کے ہوائی جہاز جاپانیوں کی مسلسل سرکوبی کر رہے ہیں۔ اور جہاں کہیں موقعہ پڑتا ہے جاپانی جہازوں کو ڈبو دیتے ہیں۔ امید ہے کہ بہت جلد جزائر سلیمان، نیوگنی، اور گرد و نواح کے

دو بھی جزیرے جاپانیوں سے خالی کرالئے جائیں گے۔

ہندوستان اگست کے مہینہ میں جب حکومت نے کانگریس کو خلاف قانون جماعت قرار دیکر مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہرلال نہرو اور تمام کانگریسی لیڈروں کو نظربند کردیا تھا تو تمام ملک میں شورش برپا ہوگئی، تار کاٹے گئے، ریلوے لائینیں اکھاڑی گئیں، تھانوں، ڈاک خانوں، اور دفتروں پر حملے کئے گئے اور نقصان پہونچایا گیا جس کا سلسلہ کہیں کہیں ابھی تک جاری ہے۔ حکومت نے بھی تشدد سے کام لیا۔ پولیس اور فوج کے ذریعہ گوشمالی کی گئی۔ کہیں کہیں ہوائی جہازوں سے بھی کام لیا گیا۔ اب شورش کسی قدر سرد پڑ گئی ہے اور اُمید کیجاتی ہے کہ بہت جلد دب جائیگی

لیکن سب سے بڑی مصیبت جو ہندوستان پر نازل ہورہی ہے، وہ سامانِ خوراک کی قلت اور دوسری اشیاءِ ضروریہ کی ناقابلِ برداشت گرانی ہے۔ نہ غلہ کافی ملتا ہے نہ لکڑی۔ غلہ، شکر، مٹی کے تیل، نمک اور تمام ضروری چیزوں پر گورنمنٹ کا کنٹرول ہوگیا ہے۔ گیہوں کا آٹا تین سیر ملتا ہے۔ چائے کی قیمت تین گنا زیادہ ہوگئی ہے۔ دیا سلائی کی قیمت برائے نام دو پیسے ہے لیکن درحقیقت وہ تین پیسے میں بھی مشکل سے ملتی ہے۔ کپڑے کی گرانی نے غریبوں کو صد درجہ پریشان کر رکھا ہے۔ جو لنکلاٹھ جنگ سے پہلے ساڑھے چار آنہ گز آتا تھا، وہ اب سوا روپیہ میں بھی نصیب نہیں ہوتا۔ ہندوستانی ملوں میں بنا ہوا لنکلاٹھ بھی ایک روپیہ گز سے کم نہیں ہے۔ گرم اُونی کپڑے غربا تو درکنار اوسط طبقہ کی بھی دسترس سے باہر ہوگئے ہیں۔ غریب لوگ اگر کسی نہ کسی طرح روئی دار کپڑے بنوا کر جان بچانا چاہتے ہیں تو وہ بھی مشکل ہوگیا ہے کیونکہ روئی بھی ایک روپیہ سیر ملتی ہے۔ الغرض اگرچہ جنگ ہندوستان سے باہر ہے لیکن ہندوستان جنگ کے اثرات سے سخت پریشان ہو رہا ہے۔ دنیا کا کاروبار سکّوں سے چلتا ہے، آجکل نوٹوں اور روپیوں کی تو کوئی کمی نہیں ہے لیکن ریزگاری کمیاب ہوگئی ہے اور پیسہ تو ملتا ہی نہیں ہے، خوانچہ فروش اور چھوٹے چھوٹے دکانداروں کی تجارت کو ریزگاری کی قلت کے باعث سخت صدمہ پہونچ رہا ہے۔ حکومت نے اپنے ایک اطلاعنامہ میں بیان کیا ہے کہ حکومت اربوں روپیہ کے چھوٹے سکے یعنی ریزگاری جاری کرچکی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود غرض لوگ پبلک کو پریشان کرنے کے لئے غلہ کی طرح ریزگاری کا بھی ذخیرہ جمع کر رہے ہیں۔ حالانکہ قانونی قیمت سے کم و بیش کرکے ریزگاری فروخت کرنا یا اپنی ذاتی ضرورتوں سے زیادہ ریزگاری جمع کرنا قانون قواعد تحفظ ہند کی رُو سے جرم ہے۔

جہاں تک ہندوستان کی اندرونی یا داخلی سیاست کا تعلق ہے ہز اکسیلنسی وائسرائے کی اگزیکیٹو کونسل میں مزید توسیع کردی گئی ہے۔ اور اب تین ممبروں کے سوا سب ممبر ہندوستانی ہیں، لیکن ڈیفنس، فائنانس اور ٹرانسپورٹ وغیرہ جو اہم ترین محکمے ہیں وہ ہندوستانیوں کے قبضے سے باہر ہیں۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا کے ہوم ممبر بہت جلد ریٹائر ہونے والے ہیں، جن کی جگہ مدراس کے سر محمد عثمان کو دی جانے والی ہے، اس طرح گویا ایک

اور اہم محکمہ ہندوستانیوں کے سپرد ہو جائیگا۔

جہاں تک صوبجات کا تعلق ہے کچھ تبدیلیاں ضرور ہو گئی ہیں، یعنی صوبۂ اڑیسہ میں راجہ صاحب پارلے کی میڈی کی اور آسام میں سر محمد سعد اللہ کی وزارتیں قائم ہو کر آئینی حکومتیں پھر شروع ہو گئی ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ سندھ اور بنگال میں دو افسوسناک واقعات بھی پیش آ گئے ہیں۔ سندھ میں خان بہادر اللہ بخش وزیر اعظم تھے جنھوں نے اپنے نیشنلسٹ خیالات کی رو میں آکر سرکاری خطابات واپس کر دیے، اور ایک بیان بھی ایسا دیا جو حکومت کو پسند نہیں آیا، نتیجہ یہ نکلا کہ سندھ کے گورنر نے اللہ بخش صاحب کو برطرف کر دیا۔ اب وہاں سر غلام حسین ہدایت اللہ کی سرکردگی میں نئی وزارت قائم ہو گئی ہے جس میں دو صاحب ہندو ہیں جن سے سندھ کے تمام ہندو اس لئے ناخوش ہیں کہ اُنھوں نے اپنی پارٹی کی مرضی کے خلاف وزارت قبول کر لی ہے۔ اس کے علاوہ سر غلام حسین ہدایت اللہ اور اُن کے بعض مسلم رفقاء کار مسلم لیگ میں شامل ہو گئے ہیں۔

دوسرا ناگوار واقعہ بنگال میں پیش آیا ہے۔ جہاں ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی نے وزارت سے استعفا دیدیا ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ انھیں اپنے وزیر اعظم مسٹر فضل الحق اور دوسرے وزیروں سے تو کوئی اختلاف نہیں لیکن گورنر کی طرف سے وزارت کے روزمرہ کے کاموں میں اس قدر دخل دیا جاتا ہے کہ اس کے باعث کوئی خوددار شخص وزارت پر قائم رہنا گوارا نہیں کر سکتا۔ بنگال کے دو اور ہندو وزیروں نے بھی استعفا دینے کی دھمکی دی ہے۔ ان واقعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قانون حکومت ہند مجریہ ۱۹۳۵ء کی رو سے صوبوں کو جو آزادی و خودمختاری دی گئی ہے، وہ محض نمائشی ہے، ورنہ درحقیقت سیاہ و سفید کے تمام اختیارات گورنروں کو حاصل ہیں۔ اور وہ جب چاہیں وزارت کے کاموں میں روڑے اٹکا سکتے ہیں۔ یہ حالت واقعی قابل افسوس ہے خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ جنگ بنگال کی سرحد تک پہونچ گئی ہے، دشمن ہندوستان کا دروازہ توڑ کر گھس آنا چاہتا ہے۔ اگر خدانخواستہ اس وقت بنگال کی وزارت ٹوٹ گئی تو سخت مشکل پڑ جائے گی۔

اوپر کی سطروں میں جنگ کا ذکر آ گیا ہے۔ جب برما میں لڑائیاں ہو رہی تھیں، اُس وقت ہندوستان کی ڈیفنس بہت کمزور تھی، لیکن برسات کے مہینوں میں گورنمنٹ کو اتنی کافی مہلت مل گئی کہ لاکھوں اتحادی فوجیں مع اسلحہ، آلات وسامان جنگ سمندر پار سے ہندوستان میں آ گئی ہیں۔ آسام اور بنگال کی سرحدوں کو مضبوط کر لیا گیا ہے۔ ہوائی طاقت اتنی اچھی ہو گئی ہے کہ اتحادیوں کے ہوائی جہاز آئے دن جاپانیوں کے مقبوضات برما پر بمباری کر کے نقصانات پہونچاتے رہتے ہیں۔

اسی سلسلہ میں اس قدر اور عرض کر دینا بھی غالباً بے محل نہ ہوگا کہ اب درحقیقت ہندوستان کو لڑائی کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے

چینی سمندروں میں جاپانی جنگی بیڑہ کی نقل و حرکت دیکھی گئی ہے اور چونکنگ گورنمنٹ کے ایک ترجمان نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ ہند چینی اور سیام کے راستوں سے جاپانیوں نے بہت سی سپاہ، ٹینک اور سامان جنگ برما پہونچا دیا ہے۔ جاپانی جنگی بیڑہ کی نقل و حرکت سے خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ شاید آسٹریلیا پر حملہ کی تیاریاں کی جا رہی ہوں، لیکن یہ خیال غلط ہے۔ کیونکہ جب تک جزائر سلیمان اور نیو گنی پر جاپانیوں کا قبضہ نہ ہو جائیگا اُس وقت تک آسٹریلیا پر حملہ نہیں ہو سکتا۔

دوسرا خیال یہ ہے کہ شاید چین پر حملہ کیا جائیگا، لیکن جب چین کے تمام سمندری ساحل پر جاپانیوں کا پہلے ہی قبضہ ہے پھر جنگی بیڑہ کو نقل و حرکت میں لانے کی کیا ضرورت ہے۔ اس لئے گمان غالب ہے کہ یہ بیڑہ فوج بردار جہازوں کو اپنی پناہ میں لیکر جنوب کی طرف آ رہا ہوگا۔ اس کے بعد دو ہی صورتیں باقی رہ جاتی ہیں، یعنی یا تو جاپان جنوبی چین پر حملہ کریگا یا جنوبی چین کی سرحد پر چینیوں کو روکنے کے لئے کسی قدر فوجیں تعینات کر کے ہندوستان پر حملہ کریگا۔ یہ خیال کسی قدر وزن دار ہے۔ کیونکہ اسی اثنا میں جاپانی ہوائی جہاز کئی بار آسام اور چاٹگام کی فضا میں نمودار ہو کر بمباری کر چکے ہیں اور جاپانیوں کے ہر اول دستوں کی بھی ہندوستان اور برما کی سرحد پر کئی مرتبہ ٹکر ہو چکی ہے جس میں ہندوستانی فوجوں نے دشمن کو گوشمالی کر کے بھگا دیا ہے۔

لیکن اب ہندوستان کی ڈیفنس ایسی نہیں ہے جیسی چند ماہ پیشتر تھی۔ اب اتحادیوں نے تمام سرحدوں کو مضبوطی سے قلعہ بند کر دیا ہے۔ ہندوستان کی کمان جنرل واول جیسے تجربہ کار اور جنگ آزما جنرل کے سپرد ہے، جو ملایا اور برما میں جاپانیوں کے داؤں گھات اور اُن کی جنگی چالوں سے بخوبی واقف ہو گئے ہیں۔ ہندوستان کی اندرونی یعنی سول ڈیفنس بھی تکمیل کو پہونچ گئی ہے۔

ہز اکسیلنسی لارڈ لنلتھگو کی میعاد ملازمت اپریل ۱۹۴۳ء میں ختم ہو جاتی۔ آپ کی جانشینی کے لئے برطانیہ کے متعدد مدبرین کو دعوت دی گئی لیکن بعض وجوہ سے جنہیں بتایا نہیں گیا کسی نے بھی ہندوستان کی وائسرائلٹی منظور نہیں کی۔ اس لئے ہز مجسٹی ملک معظم نے یہی مناسب خیال فرمایا کہ موجودہ وائسرائے کی ہی میعاد ملازمت میں مزید چھ ماہ کی توسیع کر دی جائے۔ چنانچہ اب لارڈ لنلتھگو کی وائسرائلٹی اکتوبر ۱۹۴۳ء میں ختم ہوگی۔

میری کہانی

پنڈت جواہر لال نہرو کی آپ بیتی کا ترجمہ نہایت سلیس اور شگفتہ زبان اور اصل انگریزی کی طرح زور بیان، ہندوستان کی موجودہ سیاسی تاریخ پر ایک منظر لاتا ہے جس میں نوجوانوں کے قائد اعظم نے ہماری تحریکوں اور ہمارے رہنماؤں کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ کتاب کی ضخامت تقریباً گیارہ سو صفحات ہے۔ لکھائی چھپائی کاغذ سب عمدہ۔ بہت سی تصویریں بھی ملحق ہیں۔

قیمت مجلد کتاب صرف چار روپیہ (للعہ)

میدان عمل

منشی پریم چند آنجہانی کا یہ بے نظیر ناول حال ہی میں مکتبہ جامعہ نے خاص اہتمام سے شایع کیا ہے۔ اس میں ملک کی موجودہ بیداری بے چین روح کی جیتی جاگتی تصویریں، فطری عشق و محبت کے سادہ، دلکش اور بناوٹ سے پاک نقشے ملیں گے۔ بیحد دلچسپ اور نتیجہ خیز ناول ہے۔ صفحات پانسو۔ کتابت اعلے۔ کاغذ نفیس۔ طباعت دیدہ زیب و خوبصورت اور مضبوط جلد مصور ڈسٹ کور۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ (عہ)

ملنے کا پتہ: زمانہ بک ایجنسی کانپور

گلشن صحافت میں ایک غنچۂ نو کا اضافہ
شباب

رود ادب کا ایک ترقی پسند ماہنامہ

ملک کے مشاہیر اہل قلم حضرات کے بلند پایہ مقالے ترقی یافتہ ادب کے اعلیٰ مضامین دلچسپ معیاری افسانے اعلیٰ نفسیاتی، ڈرامے، تاریخی شہ پارے، روح نواز پر کیف غزلیں، وجد آفرین اور سرمدی نظمیں، دلاویز سیاسی گیت ماہ بماہ اپنی تمام رعنائیوں و دلفریبیوں کے ساتھ مطلع صحافت پر عنقریب جلوہ گر ہوگا۔ نمونہ کا پرچہ بالکل مفت روانہ ہوگا۔ فوراً اپنے اسم گرامی اور مکمل پتہ سے مطلع کریں۔

مینیجر شباب پوسٹ بکس نمبر ۱۲۶ ا بمبئی نمبر ۳

یادگار حالی

مشہور رسالہ زمانہ کا دسمبر ۱۹۳۵ء نمبر شمس العلما مولانا حالی کی صد سالہ سالگرہ کی یاد میں حالی نمبر کی حیثیت سے کتابی صورت میں شایع کیا گیا ہے جس میں مولانا کے سوانحی حالات کے علاوہ انکی نظم اور نثر پر متعدد تنقیدی مضامین درج ہیں۔ موجودہ زمانے کے کئی نامور شاعروں اور انشاپردازوں نے اس کے لئے خاص مضامین لکھے ہیں۔ جشن پانی پت کا بھی مفصل تذکرہ ہے کئی عکسی تصاویر بھی زیب رسالہ ہیں۔ غرض ہر حیثیت سے یہ پرچہ حالی نمبر کہلانیکا مستحق ہے۔ حجم ۱۰۴ صفحات قیمت ۱۲ر محصولڈاک علاوہ

زمانہ بک ایجنسی کانپور

نئی کتابیں

انتظام کتبخانہ اس مختصر رسالہ میں لائبریری شپ اور اس کے متعلق تمام ضروری اصناف کا تذکرہ ہے۔ کتبخانہ کی عمارت اور فرنیچر، کتبخانہ کے شعبوں، کتابوں کے انتخاب اور خریداری اور پھر ان کی فن وار تقسیم، ترتیب فہرست کتبخانہ اور جلد سازی پر مختصر مگر جامع بیان۔ قیمت صرف ۸

صحت وصفائی اس چھوٹی سی کتاب میں ہوا، پانی، خوراک، لو، بخار اور دیگر بیماریوں جیسے ۱۳ عنوانات پر افسانہ کی شکل میں مفید عام معلومات پیش کی گئی ہے۔ قیمت صرف ۴

زرّین حکایات از مرزا عصمت اللہ بیگ، مصنف نے مثنوی مولوی معنوی سے بچّوں کے فائدے کے لئے ان کہانیوں کو جو اُنھیں مطلب کی نظر آئیں اردو جامہ پہنا کر یہ مجموعہ مرتب کیا، مولوی معنوی کا بیان کیا ہوا قصہ اور پھر مرزا عصمت اللہ بیگ کی اردو۔ سچ تو یہ ہے کہ ان قصوں کا لطف دوبالا ہو گیا ہے۔ صفحات ۲۲۰ مجلد قیمت عہ

وجدانیات فانی یہ مجموعہ کلام بہتر (۷۲) صفحوں پر مشتمل ہے۔ کتاب کے حجم کو دیکھتے ہوئے اس کی قیمت بہت زیادہ ہے لیکن فانی کا یہ لافانی کلام اپنا مول آپ ہے۔ قدردان شاید اسے ہر قیمت پر خریدیں گے۔ قیمت عہ

مکتبہ جامعہ قرول باغ نئی دہلی

شاخیں اور ایجنسیاں

(۱) مکتبہ جامعہ، جامع مسجد دہلی
(۲) مکتبہ جامعہ، امین آباد لکھنؤ
(۳) مکتبہ جامعہ پرنسس بلڈنگ بمبئی نمبر ۳
(۴) کتب خانہ عابد شاپ، حیدر آباد دکن، (۵) سرحد بک ایجنسی، بازار قصہ خوانی پشاور

ایڈیٹر و پبلشر منشی دیا نرائن نگم
پرنٹر خواجہ عبدالوحید نامی پریس کانپور